ماہنامہ برہان کی تاریخی اشاعت

مفکرِ ملت

مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی نمبر

نگرانِ اعلیٰ

حضرت مولانا حکیم محمد زماں حسینی

مدیر اعزازی

قاضی اطہر مبارکپوری

مرتب

جمیل مہدی

باہتمام عمید الرحمٰن عثمانی

جنرل منیجر ندوۃ المصنفین و ماہنامہ برہان، اردو بازار دہلی

خلیق

طبع اوّل عکسی

تعداد اشاعت ـــــــ چھ سو ۶۰۰

ماہ ربیع الاوّل سنہ ۱۴۰۸ھ مطابق نومبر سنہ ۱۹۸۷ء

اردو اکادمی دہلی کے تعاون سے یہ کتاب طبع کی گئی۔

قیمت غیر مجلد پچاس ۵۰ روپئے

قیمت مجلد عمدہ رنگین باسٹھ ۶۲ روپئے

نعمانی پریس دہلی

جمیل مہدی

جب مفکرِ ملّت نمبر کا اعلان کیا تو جہاں اس بات کا شدید احساس تھا کہ برہان کی آدھی صدی پر محیط اشاعتی زندگی میں یہ پہلا واقعہ ہوگا کہ اس کا خاص نمبر نکالا جائے، وہاں یہ ارادہ بھی تھا کہ مفتی صاحبؒ کی زندگی پر ایک مبسوط مضمون اپنے قلم سے یہ اس خاص اشاعت میں شامل کیا جائے جس میں ان کے کمالات اور خصائص کی اس طور پر نشان دہی ہو کہ کوئی خالی اور اور تشنہ نہ رہ جائے۔ پانچسو صفحات کی ضخامت کا پیشگی اعلان بھی، عام لوگوں اور رفقاء کار کو نامناسب معلوم ہوتا تھا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اتنی ضخامت کا ایسا مواد جو معیار کے لحاظ سے فی الواقع اہمیت رکھتا ہو۔ فراہم کرنا دشوار ہو جائے گا۔ لیکن میرا اندازہ یہ تھا کہ اگر کام واقعتاً باقاعدگی اور سنجیدگی سے شروع ہو تو پانچسو صفحات کی ضخامت نہ صرف کم رہے گی بلکہ اس اعلان شدہ ضخامت میں نمبر کے مواد کو سمیٹنا دشوار

ہو جائے گا۔ تاہم اندازوں پر پورے طور پر بھروسہ کرنا ہمارے نزدیک نہ صرف غلط، بلکہ بعض اوقات خطرناک بھی ہو جاتا ہے اس لیے خاص نمبر کے ذہنی خاکہ میں اس بات کی گنجائش رکھ لی تھی کہ ضرورت ہوئی تو ایک طویل اور مفصل مضمون، سوانحی خاکہ کے طور پر خود اپنے قلم سے مرتب کر کے نمبر میں شامل کر دیا جائے گا۔ لیکن کام جوں جوں آگے بڑھا تو اس مجوزہ مفصل مضمون کی نہ صرف گنجائش کم ہوتی چلی گئی بلکہ مفتی صاحبؒ کے مخلص معاصروں اور قدر دانوں کی تحریروں میں ان تمام گوشوں کے آجانے سے جن کی نشاندہی میرے اس مجوزہ مضمون کے منصوبہ میں شامل تھی، اس مضمون کی ضرورت بھی کم سے کم ہوتی چلی گئی

خصوصاً مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی، ڈاکٹر رضی الدین احمد، مولانا حنیف ملّی، قاضی اطہر مبارکپوری، ڈاکٹر تنویر احمد علوی، مولانا اخلاق حسین قاسمی، اور ڈاکٹر یوسف الدین کے مبسوط مضامین نے اس ضرورت کو تمام و کمال پورا کر دیا، جو الگ سے کسی مبسوط مضمون کی متقاضی ہو سکتی تھی۔ ان حضرات کے اسمار گرامی کے تشخص کے یہ معنیٰ ہرگز نہیں کہ دوسرے اہلِ قلم کے مضامین اہمیت کے لحاظ سے کسی درجہ میں بھی کم ہیں جو اس نمبر کی زیب و زینت میں کام آئے ہیں، بلکہ مقصد چند مثالوں کے ذریعہ صرف اتنی بات کو واضح کرنا تھا کہ اس صورت میں کہ مضامین کی اتنی کثرت ہوگئی

ہو کہ مجبوراً ایسے مضامین کو جنہیں ابتدائی مرحلے میں، نمبر میں شمولیت کے فیصلہ کے تحت کتابت کرالیا گیا تھا، روک دینا پڑا۔ بلکہ کبھی اہلِ قلم کی تحریروں کے دائرے میں تقریباً وہ تمام گوشے بھی سمٹ کر آگئے، جن کا تذکرہ مفتی صاحبؒ کی شخصیت اور ان کے اختصاصی کمالات کے سلسلے میں ضروری تھا۔ اس لیے اب نہ تو ان کی شخصیت پر مرتب کے قلم سے کسی الگ اور مستقل مضمون کی حاجت ہے نہ ہی محض ذاتی نمائش کی غرض سے پہلے سے ظاہر شدہ تاثرات کی تکرار اور بار بار کے دہرائے ہوئے تاثرات کو دہراتے چلے جانے کو ہماری طبیعت کبھی گوارا کرتی ہے، اس لیے مختصر طور پر صرف اُن چند باتوں کی نشاندہی تک ہم اپنی تحریر کو محدود رکھیں گے، جو ہماری نظر میں یا تو مشمولہ تاثرات میں جگہ نہیں پاسکی ہیں یا پوری طرح اجاگر ہونے سے رہ گئی ہیں۔

یاد نہیں کہ مفتی صاحبؒ سے شناسائی اور قربت کا آغاز کب ہوا تھا۔ ہم وطن اور ہم قبیلہ ہونے کے ناطے غیریت کا تصوّر تو کبھی ذہن میں بھی نہیں آسکتا تھا لیکن باہمی اعتماد اور ذہنی وابستگی کا سلسلہ آزادی کے بعد شروع ہوا جبکہ قرولباغ کی تباہی کا واقعہ ہوچکا تھا اور مفتی صاحبؒ ندوۃ المصنفین کے قرول باغ والے جلسے سے جامع مسجد کے علاقے میں نئی عمارت کی تعمیر کا منصوبہ تیار کر رہے تھے اور انکے قریب قریب ساتھی بھی انکے خیال کو

ع: ایں خیال است و محال است و جنوں

قرار دے رہے تھے۔

خوب اچھی طرح یاد ہے کہ مفتی صاحبؒ نے ندوۃ المصنفین کی احیاءِ جدید کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا حفظ الرحمان سیوہاروی اور مولانا اکبرآبادی دونوں کے عدمِ اتفاق کی بات کہی تو میں نے کسی قدر جھنجھلاہٹ کے ساتھ جواب میں کہا۔

"مولانا حفظ الرحمان اور بھائی سعید کے پاس تو اپنی مشغولیتوں اور مصروفیتوں کے میدان موجود ہیں اس لیے انہیں تو یہ سب کچھ ناقابلِ عمل، ضیاعِ اوقات اور بے معنی دکھائی دیتا ہے لیکن "ندوۃ المصنفین" نہ ہوگا تو آپ کیا کریں گے؟ اس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ جو لوگ اب تک آپ پر انحصار کرنے پر مجبور ہوتے آئے ہیں، ان ہی لوگوں پر آپ خود انحصار کرنے پر مجبور ہو جائیں"

انہیں شاید اتنی صاف گوئی اور بے لاگ گفتگو کی توقع نہیں تھی سُن کر بالکل چپ اور لب بستہ ہو گئے بہت دیر کے بعد جب ہم اُٹھ کر جانے لگے تو انھوں نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔

ایک پتہ کی بات کہی ہے تم نے۔ بڑی خوشی ہوئی تمہاری ذہانت پر"

یہاں اتنی بات کہنے کی اور ہے اور وہ یہ کہ "ندوۃ المصنفین" کی احیاءِ جدید کی کوششوں کے سلسلے میں جب مفتی صاحبؒ مولانا ابوالکلام آزاد سے ملے تو انھوں نے اپنی عادت کے بالکل برخلاف واضح الفاظ میں ندوۃ المصنفین کے احیاءِ جدید کے سلسلے میں حکومتی امداد کی پیشکش کی۔ لیکن مفتی صاحب نے اس پیش کش کو منظور نہیں کیا۔ اس ملاقات کی یاد کبھی آتی تو وہ بڑے فخر اور

مسرت کے ساتھ کہتے کہ جب میں نے مولانا سے کہا۔

"حکومت کی امداد میں چند نزاکتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا پتہ امداد کے قبول کرنے کے بعد ہی چلتا ہے تو مولانا چپ ہو گئے۔"

جی ہاں! ۔ یہ انکا مخصوص جملہ تھا، جسے کبھی وہ اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کے لیے تمہید کے طور پر استعمال کرتے۔ کبھی مخاطب کی لمبی تقریر کے بعد، اس سلسلہ کو ختم کرنے کے لیے کام میں لاتے، کبھی اختلافی بحثوں میں مفاہمتی فضا پیدا کرنے کے لیے بحث کو کاٹنے اور پیچ بچاؤ کے لیے یہ جملہ کام میں آتا۔ کبھی سیدھی سادی تائید اور کبھی عدم اتفاق ظاہر کرنے کے لیے وہ اس جملہ سے کام لیتے۔ مختلف محلِ استعمال کے لحاظ سے اس کا سائز بھی کم زیادہ ہوتا رہتا اور اسلوبِ بیان میں بھی صاف اور صریح فرق وہ اسی کے ذریعہ پیدا کرنے میں حیرت انگیز طریقہ سے کامیابی حاصل کر لیتے۔

ایک بار ایک ایسے امیدوار کی ناکامی کے سلسلے میں وہ ان صاحب سے گفتگو کر رہے تھے جنہوں نے انٹرویو میں ان کو ناکام قرار دیا تھا، تو یکایک انھوں نے ان کی بات کاٹ کر کہا۔

جی ہاں، انٹرویو میں ناکامی بھی ایک بہت بڑی وجہ ہوتی ہے لیکن اس کو بھی دیکھ لینا چاہیئے کہ کامیابی اور ناکامی بجائے خود کوئی چیز نہیں ہوتی۔ اب آپ اتنے بڑے قابل اور اتنے بڑے عالم ہیں لیکن انٹرویو میں، میں خود آپ کو فیل کر سکتا ہوں۔ اسی

کے ساتھ یہ بات بھی ٹھیک ہے کہ آپ بھی مجھے فیل کر سکتے ہیں۔"
وہ صاحب سپٹائے تو بہت، جھنجھلائے بھی بہت، لیکن لاجواب
اور چپ ہو جانے کے سوا، ان سے کچھ اور نہ بن نہیں پڑا۔

اسی طرح ایک بڑے ملی اجتماع میں، جب ہمارے دو اکابرین
کے درمیان لفظی مجادلے کی شدت اس درجہ پر پہنچ گئی کہ اس کے
نتیجہ میں ایک بحرانی کیفیت کے ابھر آنے کا خطرہ پیدا ہو گیا تو
مفتی صاحب نے حسبِ معمول۔ ایک لمبی "جی ہاں" کے ذریعہ
اس بحث میں مداخلت کرتے ہوئے پہلے تو ایک فریق کے موقف
کی بہت دور تک تائید کی اور اس کے فوراً بعد ۔ اور یہ بات بھی
غلط ہے، کہہ کر دوسرے فریق کی تائید کا سلسلہ شروع کیا تو چند ہی
منٹ پر وہ صورتِ حال جو شدتِ اختلاف سے بوجھل اور
گلو گرفتہ محسوس ہو رہی تھی، مفاہمت اور خوشگواری کے خوشبو
سے معطر نظر آنے لگی۔

مفتی عتیق الرحمان عثمانیؒ کے شخصی خصائص اور کمالات کا شمار
یوں تو بہت مشکل کام ہے، مگر ہمارے نزدیک ان کی سب سے
بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ خود شناسی میں اختصاص رکھتے تھے اس
سلسلہ میں وہ بلا مبالغہ عرفانِ ذات کے مقام تک پہنچ چکے
تھے، اور یہی وجہ تھی کہ اپنی خوبیوں اور کمزوریوں کا احساس خود
ان سے زیادہ کسی کو نہ تھا۔ جہاں تک ان کی انتظامی صلاحیتوں
کا سوال ہے، خود "ندوۃ المصنفین" کا وجود اس کے ثبوت کے لیے

کافی ہے، جسے انھوں نے ایک بار تعمیر کیا اور دوسری بار اس کی راکھ سے دوبارہ پیدا کر دینے کا وہ کارنامہ کر دکھایا جسے سب لوگ ناممکن اور خارج از امکان سمجھتے تھے، لیکن اجتماعی میدان میں انھوں نے اس ذمہ داری کے بوجھ کو تنہا اٹھانا کبھی پسند نہیں کیا اور ہمیشہ اس سے بڑے سلیقہ کے ساتھ دامن سمیٹ کر گزرتے رہے۔

میرٹھ اجلاس کے بعد۔ ان کے لیے پورا موقع تھا کہ وہ جمعیۃ العلماء کی تقسیم کر کے، اس تنظیم کے بڑے اور فعال حصّے پر قابض ہو جاتے لیکن انھوں نے عین اس وقت جب کہ بھوپال اجتماع کے وقت اس کے لیے بظاہر بڑا ساز گار موقع نکل آیا تھا، خود اپنی ذات کو اس تقسیم کا سبب بنانے سے انکار کر دیا اور اپنے اس موقف میں ادنیٰ سی لچک پیدا کرنے پر تیار نہ ہوئے کہ تقسیم کی ذمہ داری کوئی اور اٹھائے اور اس کے مشیر کار اور ایڈوائزر تک اپنے کردار کو محدود رکھیں لیکن مصیبت یہ تھی کہ ان کے حامیوں اور ساتھیوں میں کوئی ایسی باہمت اور بڑی شخصیت موجود نہ تھی جو پہل اقدامیت کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکتی، اس لیے وہ موقع ہاتھ سے نکل گیا لیکن مفتی صاحبؒ کو اس موقع کے ہاتھ سے نکلنے کا پچھتاوا کبھی نہیں ہوا۔ جب بھی کوئی موقع آیا تو انھوں نے ہمیشہ اپنے اس موقف کو جائز اور اطمینان بخش قرار دیا جو انھوں نے بھوپال میں اختیار کیا تھا۔ ۱۹۷۰ء میں کانگریس (۱) کی دوسری بار کی تقسیم کے موقع پر، ان سے بات

ہوئی تو انھوں نے بڑے فخر کے ساتھ اپنے مخصوص انداز میں بھوپال اجلاس کے حوالے سے کہا۔

جی ہاں! ۔ اُس وقت میں تیار ہو جاتا تو تقسیم در تقسیم کے اس مرحلے سے مجھے گذرنا پڑتا، جو اس وقت اندرا گاندھی کو درپیش ہے غلط بات ایک بار شروع ہو جائے تو پھر کسی جگہ رکتی نہیں نئی نئی غلطیوں کو پیدا کرتی چلی جاتی ہے ۔ اب دیکھو انڈین نیشنل کانگریس اندرا کانگریس تک محدود ہو کر رہ گئی ۔ رہا اکثریت اور حکومت پر قبضہ کا معاملہ تو یہ چلتا ہی رہتا ہے، اصل اور اصول سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔

ان کی صلح کن فطرت اور مرنجان مرنج طبیعت کو دیکھ کر بعض لوگ انہیں کمزور اور بے ہمت سمجھتے تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان جیسا باہمت اور جری اور بہادر آدمی ان کے معاصروں میں کوئی دوسرا موجود نہ تھا ۔ جن لوگوں نے ۱۹۶۶ء کے مجلس کے مجلسِ مشاورت دیوبند کے ہنگامے کے دوران، انہیں قاتلانہ عزائم کے حامل ہجوم اور برستی ہوئی لاٹھیوں کے درمیان پُرسکون اور بے خوفی کی حالت میں، پامردی کے ساتھ کھڑا دیکھا ہے جن میں سے ایک ہم خود بھی ہیں ۔ وہ لوگ انھیں کمزور اور بے ہمت کہنے اور سمجھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے ۔ پھر یہ بھی نہیں کہ اس طرح کی بات اور ان کے کردار کا یہ پہلو اتفاقاً ابھر کر سامنے آگیا ہو بلکہ جہاں کہیں، بے خوفی، اور جرأت کے ساتھ کوئی بات کہنے اور فیصلہ کن موقع پر فطرت کا مقابلہ کرنے کی ضرورت

پیش آئی۔ انہوں نے ادنیٰ سے تامّل اور پس وپیش کے ساتھ انکے کردار کا یہ پہلو نمایاں ہوکر سامنے آیا جمعیتہ علماء ہند کے دوسرے مسلم کنونشن کے موقع پر جس وقت اس زمانہ کے نائب وزیرِ اعظم اور بظاہر سب سے زیادہ مضبوط سیاسی شخصیت مرارجی ڈیسائی نے اس کنونشن میں شریک ہوکر مسلمانوں کو اپنی تقریر میں ڈرانا دھمکانا شروع کیا اور اس سلسلے میں بار بار یہ کہنا شروع کیا کہ مسلمانوں کا فلاں رویہ برداشت نہیں کرسکتے اور ان کا فلاں طریقہ انہیں پسند نہیں، اور مسلمان فلاں معاملہ میں ملک کے مفاد کو ملحوظ نہیں رکھتے تو وہ کچھ دیر تو تحمل اور ضبط کے ساتھ ان کی تقریر کو سنتے رہے لیکن جب پانی بالکل ہی سر سے گزرنے لگا تو انھوں نے کھڑے ہوکر مرارجی ڈیسائی کو ٹوکتے ہوئے یہاں تک کہدیا کہ :

"آپ تو گویا اس ملک کے بادشاہ ہیں، جو اپنی پسند اور مرضی پر مسلمانوں کو چلنے کا فرمان سنانے یہاں آئے ہیں، آپ کو یہ بات پسند نہیں، وہ بات پسند نہیں، یہ بات آپ گوارا نہیں کرسکتے، وہ بات آپ برداشت نہیں کرسکتے، آپ ہیں کیا جو مسلمان آپ کی مرضی، اور آپ کی پسند اور آپ کے فرمان کی تعمیل پر اپنے آپ کو مجبور سمجھیں؟"

ان کی اس موقع پر جرأت کے مظاہرے سے نہ صرف مرارجی بھائی دم بخود رہ گئے بلکہ مسلمانوں پر خوف اور اضطراب کی جو کیفیات ان کی تقریر سے طاری ہوگئی تھیں وہ چند ہی منٹوں میں غائب ہوگئیں، اُس کے بجائے خود اعتمادی کی فضا پورے اجتماع پر لوٹ آئی۔

اس طرح کے بیسیوں واقعات ہمارے علم میں ہیں جن کا ایک مفصل اور مبسوط مضمون ہی متحمل ہو سکتا ہے۔ یہاں صرف اتنی بات کہہ کر ہم اس موضوع کو ختم کرتے ہیں کہ مفتی صاحبؒ کے شخصی اور ذاتی کمالات کا بہت تھوڑا حصہ لوگوں کے سامنے آسکا ہے جبکہ ایک بہت بڑا حصہ اس دور کے تقاضوں اور اسکی لائی ہوئی مشغولیتوں کی بنا پر لوگوں کی نظر سے اوجھل رہ گیا جس آزادی کے بعد ان کی وفات تک کے وقت تک انہیں مختلف میدانوں میں رواں دواں رکھا حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنی خداداد صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنے کی بہت کم مہلت اس دور میں حاصل کر سکے، جو سیاسی ابتلا و رست وخیز کے لحاظ سے ایک تاریخی دور تھا۔ سیاسی ہنگاموں اور اُن کے لائے ہوئے بے شمار مسائل نے انہیں کسی دوسری طرف متوجہ ہونے کا موقع ہی آزادی کے بعد نہ دیا، پھر بھی ذاتی حیثیت میں وہ جتنا کام کر گئے وہ اُن کے نام کو ملّی تاریخ میں ہمیشہ محفوظ رکھنے کے لیے یقیناً کافی ہے اور خدا نے چاہا تو وہ مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کی تاریخ کے اونچے مقام پر نہ صرف بدستور رہیں گے بلکہ دن گزرنے کے ساتھ ان کی شخصی افادیت اور اجتماعی خدمت کی اہمیت میں بھی اضافہ ہی ہوتا چلا جائے گا۔

ترتیب کے اعتبار سے مفکرِ ملّت نمبر کو چار حصّوں میں تقسیم کیا جا رہا ہے۔ پہلا حصہ ان مضامین پر مشتمل ہے جو اُن کے قابلِ احترام معاصرین قدردانوں اور رتبہ شناسوں کے قلم سے ہیں اور جن کے ذریعہ ان کی شخصیت اور ان کے خصائص اور اُن کے

کمالات پر بھر پور یا مجمل انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے، دوسرا حصہ خود ان کی ایسی تحریروں پر مشتمل ہے جن سے ان کی زندگی، ان کی فکری نشوونما، اور ان کے اسلوبِ نگارش کے بارے میں بھرپور معلومات پڑھنے والوں کے سامنے آئیں گی۔ دوسرا اور چوتھا حصہ زیادہ تر مولانا انیس الحسن ہاشمی کا مرتب کردہ ہے، اسی لیے اُس کی ترتیب کا انداز بھی پہلے حصہ سے مختلف ہو گیا ہے۔ مولانا انیس الحسن ہاشمی مفتی صاحبؒ کے قریبی اور معتمد ساتھیوں میں رہے ہیں اس لیے اس حصے کو اپنی طرف سے کوئی ترمیم تنسیخ کے بغیر اسی طرح شائع کر رہے ہیں جس طرح انھوں نے کتابت کرا دیا تھا۔ اس حصے میں مفتی صاحبؒ کی خود نوشت سوانح پر مشتمل وہ مضمون جو ہفتہ وار 'عزائم' کے ۱۹۷۲ء کے خاص نمبر میں شائع ہوا تھا اور مولانا غلام محمد نورگت کے نام ان کے چند ذاتی خطوط کا اضافہ ہماری طرف سے کیا گیا ہے تاکہ ان کی ذاتی زندگی اور دنیا جہان کی فکر رکھنے کے اس پہلو کی جھلک بھی سامنے آ سکے جو ان خطوط کے بغیر یقیناً اوجھل رہ جاتا۔

تیسرے حصے میں جو نیم ذاتی اور نیم اجتماعی نوعیت رکھتا ہے، کچھ ایسی تحریروں پر مشتمل ہے جن میں شیخ محمد عبداللہ، ڈاکٹر سید محمود اور مولانا محمد مسلم مرحوم کی تحریریں بھی شامل ہیں جن سے ایسے معاملات پر روشنی پڑتی ہے جو ہمارے نزدیک قابلِ تذکرہ اور ضروری تھے، چوتھا حصہ ان تحریروں پر مشتمل ہے جو اُن پیغامات اور تعزیتی تحریروں سے تعلق رکھتی ہیں جو مفتی صاحب کی وفات کے بعد ذاتی اور سیاسی و صحافتی تاثرات کی شکل میں سامنے آئیں۔ یوں وہ تصویر

مکمّل ہوجاتی ہے، جو اس خاص نمبر کے ذریعے ہم بنانا چاہتے تھے ہمیں احساس ہے، اس تصویر میں وہ رعنائی وہ دلکشی اور وہ آب و تاب پیدا نہیں ہوسکی ہے جو صاحبِ تصویر کے زندہ پیکر میں موجود تھی، تاہم اس کا اطمینان ہے کہ تصویر کی حد تک ان خصوصیات کی تھوڑی بہت جھلک ضرور آئے گی۔

آخر میں ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ مولانا انیس الحسن ہاشمی اور مولانا فقیہ الدین اور عزیزی عمید الرحمان عثمانی کی ان محنتوں اور تعاون کا شکریہ ادا کریں جو برہان کے خاص نمبر کے مواد کے جمع کرنے اور اس کی ترتیب و تشکیل کے سلسلے میں حاصل ہوا، اور جس کے بغیر اس تکمیل و اشاعت ممکن نہیں تھی ٭...

نوٹ

ذیل کے تینوں مضامین ہمیں اس وقت ملے جب کہ مفتی اعظم نمبر کے نگیٹو بن چکے تھے، لیکن چونکہ یہ مضامین اہم تھے جن کا اس نمبر میں آنا ضروری تھا لہٰذا ترتیب مضامین کے برعکس جہاں گنجائش ملی وہیں ان کو شامل کرلیا۔

(۱) ڈاکٹر معین الدین بقائی

(۲) احمد سعید ملیح آبادی

(۳) حکیم محمد عرفان الحسینی

عرضِ حال

جن لوگوں کو طباعتی اور اشاعتی کام کا تجربہ ہے وہ اُس راہ کی دشواریوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔ وہ اس بات کو بھی جانتے ہیں کہ فی زمانہ کسی خاص نمبر کا مرتّب کرنا اور اسے کتابت و طباعت کی جاں کاہ منزلوں سے گزارنا کتنا مشکل کام ہے۔ برہان نے "مفکرِ ملّت نمبر" کا اعلان اگرچہ بنامِ خدا، حضرت مفتی صاحبؒ کی رحلت کے فوراً بعد ہی کر دیا گیا تھا اور برہان کے ایڈیٹر محترم جمیل مہدی صاحب نے اس کی ذمہ داری بھی پوری طرح لیکر، مجھے اس کی فکر و تشویش سے نجات دلادی تھی لیکن ذمہ داری کے احساس نے پوری طرح بے فکر ہونے سے باز رکھا، کیونکہ مضامین کی فراہمی و ترتیب و تزئین کے علاوہ کتابت و طباعت کے مرحلوں کا انتظام تو بہر حال مجھی کو کرنا تھا۔

اس سلسلے میں ایک بڑا کام مفتی صاحبؒ سے متعلق تحریروں اور مسودوں کو چھانٹنے کا کام بھی بڑا اہم تھا جو ان پشتاروں کے نیچے دبے پڑے تھے، جو دفترِ برہان میں نہ معلوم کب سے جمع ہو رہے تھے، اس سلسلے میں مولانا فقیہ الدین کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے، جنہوں نے میری درخواست کو قبول کرکے کاغذات کے انبار میں سے کارآمد کاغذوں کو چھانٹنے کا کام شروع کیا، اور کئی مہینے کی محنت شاقہ کے بعد اس کام کو مکمل کر دیا۔

دوسرے نمبر پر مولانا انیس الحسن ہاشمی کا شکریہ واجب ہے جنہوں نے ابتدائی تیاریوں میں ہاتھ بٹایا اور خط وکتابت سے لے کر مضامین کے انتخاب اور ترتیب میں تعاون کیا۔

اس دوران میں نے مضامین کی فراہمی کے لیے خود بھی کوشش کی اور اس سلسلہ میں مختلف اکابرین کی خدمت میں حاضر ہوکر ان سے مضامین لکھنے کی ذاتی طور پر بھی درخواست کی، اس سلسلہ میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا خاص طور پر شکریہ واجب ہے جنہوں نے نہ صرف مضمون لکھنے کی زحمت اٹھائی بلکہ ایسے حوصلہ افزا کلمات اپنی زبانِ مبارک سے ارشاد فرمائے کہ اس سے ہمت بلند ہوئی اور کام آسان معلوم ہونے لگا۔

حضرت مولانا علی میاں نے ازراہِ خورد نوازی مجھ سے یہ وعدہ بھی فرمایا کہ وہ مفکرِ ملت نمبر کی اشاعت کے بعد اس کے اجرا کی تقریب کی مسندِ صدارت کو بھی رونق بخشیں گے امید ہے کہ نمبر کی اشاعت کے بعد ہمیں مولانا موصوف کی سرپرستی کے جذبہ سے ایک بار پھر مفتخر ہونے کا موقع ملے گا۔

زیرِ نظر نمبر کی اشاعت کے سلسلے میں ہمارے کرم فرما اور مفتی صاحبؒ کے مخلص اور قدرداں سید اقتدار حسین (بمبئی) اردو اکادمی دہلی کے صدر محترم ڈاکٹر خلیق انجم اور عالی جناب حکیم عبدالحمید صاحب کا شکریہ بھی ضروری ہے جن کی مساعی نے برہان کے مفکرِ ملت نمبر کی اشاعت میں مالی استعانت کے ذریعہ ہمارا کام بہت آسان کر دیا۔

آخر میں، میں برہان کے تمام مضامین نگار حضرات سرپرستوں قارئین اور خاص کر مولانا حکیم محمد زماں حسینی صاحب کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں جن کی مسلسل توجہات اور قدر افزائی سے یہ مشکل منزل آسان ہوئی اور تقریباً ایک سال کی سخت محنت اور ذہنی پریشانی سے بالآخر نجات مل گئی۔ خدا کرے یہ نمبر قبولِ عام کی سند حاصل کرے۔ آمین

عمید الرحمٰن عثمانی۔ منیجر و مہتمم ندوۃ المصنفین، رسالہ برہان جامع مسجد دہلی

فہرست مضامین

پہلا حصّہ

دوسرا حصّہ

آپ بیتی، سفرناموں، ریڈیائی تقریروں، متفرق مضامین اور سوسائٹی خاکوں سے متعلق مفتی صاحبؒ کے اسلوب تحریر کے نمونے۔

تیسرا حصّہ

مفتی صاحبؒ کے نام اہم اور تاریخی شخصیتوں کی کچھ اہم اور تاریخی تحریریں
خطوط: شیخ عبداللہ، ڈاکٹر سید محمود، مولانا محمد مسلم (سابق ایڈیٹر دعوت دہلی)

چوتھا حصّہ

سیاسی، علمی، دینی، اور صحافتی شخصیتوں کے تاثرات اور پیغامات

مندرجات

پہلا حصّہ

کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا

چند یادیں چند باتیں

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی

مگو گزشتہ رفیقاں ز دل فراموشند
کدام نالہ کہ در پردہ اش نمی جوشند
چراغِ انجمن حیرتِ نظر بودند
کنوں بہ پردۂ دل داغہائے خاموشند

میں نے اپنے بچپن میں اپنے بزرگوں سے جن حضرات کا نام عقیدت و عظمت کے ساتھ سُنا، ان میں مفتی صاحب مرحوم کے والدِ بزرگوار حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰنؒ صاحب کا نامِ نامی تھا، جو سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ کے جلیل القدر مشائخ میں سے تھے آپ کو مولانا شاہ رفیع الدین صاحب دیوبندی، خلیفہ حضرت شاہ عبد الغنی صاحب مجددیؒ سے خلافت حاصل تھی، میرے مُربّی و ولی نعمت اور برادر بزرگ مولوی حکیم ڈاکٹر سید عبد العلی صاحبؒ (سابق ناظم ندوۃ العلماء) جب سنہ ۱۳۲۸ھ (سنہ ۱۰ء) میں حدیث کی تکمیل اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ سے استفادہ کے لئے والدِ ماجد مولانا حکیم سید عبد الحیؒ صاحبؒ کے حکم و ایماء سے دیوبند گئے، تو والد صاحب

نے ان کو متعدد خطوط میں حضرت مفتی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتے رہنے کی ہدایت فرمائی"، اس کی وجہ حضرت مفتی صاحب کی جلالت شان کے ماسوا سلسلۂ طریقت کا اشتراک اور مناسبت بھی تھی، والد ماجد نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "نزہۃ الخواطر" کی (جو آٹھ جلدوں میں عربی میں غیر منقسم ہندوستان کے ہزار بارہ سو سال کے اسلامی دور کے مشاہیر ہند اور ممتاز شخصیتوں کے تعارف و تذکرہ پر مشتمل ہے آٹھویں جلد میں حضرت مفتی صاحب کا بلند الفاظ میں قدرے شرح وبسط کے ساتھ تذکرہ کیا ہے۔ مجھے حضرت مفتی صاحب کی زیارت کا شرف تو حاصل نہیں ہوا، کہ سنہ ۱۳۴۷ھ میں آپ کی وفات ہوگئی، اور میں دیوبند ۱۹۳۱ء (سنہ ۱۳۵۰ھ) میں حاضر ہوا، اور مولانا مدنی رحمۃ اللہ کے درس حدیث میں شرکت کی سعادت حاصل کی، دیوبند کے ایک سفر کے موقعہ پر مفتی صاحب کے عم محترم مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ دیوبند ہی تشریف رکھتے تھے، مولانا مدنیؒ کے دولت کدہ پر ان سے نیاز حاصل ہوا، پھر کئی بار دولت خانہ پر بھی حاضر ہوا، مولانا کے ان حواشی کے بارے میں جو حضرت شیخ الہند کے ترجمۂ قرآن پر ان کے قلم سے ہیں، میں نے اپنے تاثرات اور بحیثیت مدرس تفسیر کے اپنے تجربہ کا اظہار کیا۔ اور ان کی افادیت اور علمی و تحقیقی امتیاز کے بارے میں اظہار خیال کیا، تو مولانا کی خصوصی توجہ ہوئی اور خصوصی شفقت فرمانے لگے، اس وقت تک جہاں تک یاد ہے مفتی عتیق الرحمٰن صاحب سے ملاقات اور تعارف کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔

مفتی صاحب کے نیاز اور براہ راست ملاقات کا سلسلہ (جہاں تک حافظہ کام کرتا ہے) سنہ ۱۹۴۰ء کے بعد سے شروع ہوا، جب حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ کی خدمت میں پہلی بار حاضری ہوئی اور پھر مستقل ربط قائم ہو جانے کی بنا پر تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد دہلی کا سفر پیش آتا رہا۔ اس وقت تک دہلی کے نامور اور ممتاز علماء اور علمی اشتغال اور سیاسی ذوق رکھنے والے فضلاء (حضرت مفتی کفایت اللہ

صاحبؒ کو مستثنیٰ کر کے) مولانا سے زیادہ متعارف و مانوس نہیں تھے۔ اوران کی نظام الدین کے تبلیغی مرکز میں آمد و رفت شروع نہیں ہوئی تھی، میں اپنی بے بضاعتی اور کم مائگی کے باوجود دارالعلوم ندوۃ العلماء سے درس و تدریس کا انتساب رکھنے اور کچھ لکھنے پڑھنے کی مناسبت سے دہلی کے ان علماء اور مولانا کے درمیان رابطہ بننے کی کوشش کرتا تھا۔ اُسوقت جامع مسجد پر مولانا سمیع اللہ صاحب مرحوم کا مکتبہ عزیزیہ باذوق و سنجیدہ علماء اور علمی و سیاسی ذوق رکھنے والے احباب کی (جن کا زیادہ تر جمعیۃ العلماء سے تعلق تھا) نشست گاہ اور بزم احباب تھی، مولوی سمیع اللہ صاحب کے اخلاق، خوش گفتاری اور زندہ دلی کی وجہ سے میری بھی آمدورفت شروع ہوئی، وہاں مفتی صاحب اور مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی بھی تشریف لایا کرتے تھے، میں نے دونوں کو نظام الدین آنے کی دعوت دی، اور دونوں حضرات میری دعوت پر وہاں تشریف لائے، میں نے مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مفتی صاحب کے بارے میں یہ بلند الفاظ سُنے تھے، فرماتے تھے کہ "حضرت مفتی عزیزالرحمٰن صاحب کو مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کی فقہی صلاحیت اور نظر پر بڑا اعتماد تھا، اور وہ ان کے فقہی جوابات سے مطمئن ہوتے تھے، مجھے ان کا فقہ و افتاء کے علاوہ کسی اور چیز میں مشغول ہونا، اچھا نہیں معلوم ہوتا، کہ ان کو اس فن سے خصوصی مناسبت اور امتیاز حاصل ہے"۔

مفتی صاحب سے اصل ربط و تعلق ۱۹۴۴ء سے شروع ہوا، اس وقت "ندوۃ المصنفین"، قرولباغ دہلی میں تھی حُسنِ اتفاق کہ اس زمانہ میں اس کے مرکز کے قریب ہی میرے والد مرحوم کے ایک مخلص دوست عم مخدوم و محترم الحاج سیّد محمد خلیل صاحب ہنٹوری مرحوم مقیم تھے، ان کے صاحبزادۂ گرامی قدر برادر محترم سیّد محمد جمیل صاحب (جو بعد میں پورے پاکستان کے اکاؤنٹینٹ جنرل ہوئے) ریلوے کے آڈیٹر تھے اور ایک زمانہ میں دہلی میں انکی پوسٹنگ تھی، اس تعلق و مناسبت سے میرا بار بار وہاں

آنا جانا ہوتا تھا، سید محمد خلیل صاحب اور سید محمد جمیل صاحب دونوں مفتی صاحب اور مولانا سعید احمد صاحب اور ندوۃ المصنفین سے ربط و تعلق رکھتے تھے، اسی زمانہ میں مولانا محمد سلیم صاحب ناظم مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ جو حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی بانی مدرسہ و مصنف ''اظہار الحق'' کے خاندان کے چشم و چراغ اور ''آثار رحمۃ اللہ'' میں سے تھے، بعض سیاسی حالات و مصالح کی بنا پر مکہ مکرمہ سے آکر قرولباغ دہلی میں اسی ماحول و جوار میں جس کا تذکرہ کیا گیا مقیم تھے، یہیں سے وہ رسالہ ''ندائے حرم'' کی ادارت و اشاعت بھی فرماتے تھے۔ اور مدرسہ صولتیہ کی رہنمائی و نگرانی بھی، اتفاق سے انہیں دنوں ہمارے مخدوم مولوی ظہیر الحسن صاحب کاندھلوی ایم۔ اے علیگ بھی دہلی میں مقیم تھے اور ان کا زیادہ وقت یہیں گزرتا تھا، وہ مجھ پر خاص کرم فرماتے تھے، اور مجھے بھی ان سے بڑی موانست و مناسبت تھی، میں قرولباغ جاتا تو آدھے دن رہ جاتا، علم و ادب، زندہ دلی اور مجلس آرائی، چشم و گوش اور کام و دہن سب کی لذت سب کا سامان ایک جگہ بہم ہوتا مفتی صاحب اور مولانا سعید احمد صاحب بھی شریک بزم ہوتے، انھوں نے کبھی اپنی قیام گاہ پر بلا کر کھانے کی ضیافت بھی فرمائی۔

اس کے بعد مفتی صاحب سے صرف اہم اجتماعات میں ملاقات ہوتی، مثلاً بمبئی کا تعلیمی کنونشن جو مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے ۱۹۵۵ء میں بلایا تھا، تقسیم ہند کے بعد جمعیۃ العلماء کا پہلا جلسہ جو ۱۳۶۷ھ (اپریل ۱۹۴۸ء) میں مولانا مدنیؒ کی صدارت میں لکھنؤ میں منعقد ہوا تھا۔ اور اس کے اکثر مہمان دار العلوم ندوۃ العلماء میں مقیم تھے نومبر ۱۹۵۳ء میں مولانا سید سلیمان ندویؒ کا پاکستان میں حادثہ ارتحال پیش آیا۔ دار العلوم ندوۃ العلماء میں ہم نیازمندوں نے مولانا کی یاد میں ۱۹۵۴ء میں ایک سنجیدہ اور علمی اجتماع منعقد کیا، جس کی شرکت کے لئے ضعف و علالت کے باوجود مولانا سید

مناظر احسن صاحب گیلانی مرحوم اپنے وطن سے لکھنؤ تشریف لائے مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب اپنی شرافت نفس، سیّد صاحب کے ساتھ تعلقات، اور دارالمصنفین ندوۃ المصنفین کے علمی ورسمی رشتہ واشتراک کی بنا پر کیسے شرکت نہ فرماتے؟ تشریف لائے اور بڑے ذوق ودلچسپی کے ساتھ پورے اجتماع میں شریک رہے، سیّد صاحب کا ہندوستان کو خیر باد کہہ کر پاکستان تشریف لے جانا اور وہیں قیام اختیار کر لینا ایک علمی ادبی اور ملّی سانحہ تھا، لیکن حالات اور مجبوریوں اور خانگی نزاکتوں کی "سنگین منطق" میں "دخل در معقولات" کی کیا گنجائش؟ مفتی صاحب نے اپنے ہی تاثر نہیں بلکہ ہندوستان کی، ملّت اسلامیہ اور علمی وتصنیفی اداروں کی اس ملی جُلی حیرت وحسرت کو جس خوبی ذہانت ولطافت کے ساتھ اپنی تعزیتی تقریر میں ادا کیا وہ مفتی صاحب ہی کا حق تھا، اور ذوق و گوش ابھی تک اس کی لذت لے رہے ہیں، مفتی صاحب نے فرمایا کہ "ہم عقیدت مندوں اور نیاز مندوں کی تمنا تو یہ تھی کہ سیّد صاحبؒ کی آخری آرام گاہ یا اپنے محبوب ومحسن استاد ومربی علامہ شبلیؒ کے پہلو میں ہوتی، یا اپنے مرکز عقیدت شیخ ومرشد حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے پہلو میں، مگر تقدیر الٰہی کچھ اور تھی ؎

من چناں خواہم، خدا خواہد چنیں

آج بھی اہل ذوق اور محرمان حقیقت اس بلیغ جملہ کا لطف اٹھا سکتے ہیں جس میں مرثیہ کا سوز بھی ہے اور غزل کی لطافت بھی ویسے تو مفتی صاحب کی رفاقت دارالعلوم دیوبند کے جلسہ شوریٰ میں اور ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامی میں حاصل ہوتی رہتی تھی لیکن اصلاً مفتی صاحب کی رفاقت اور وسیع وجامع معنی میں خدمت دین وملت کے میدان میں ہم سفری کی سعادت ۱۹۶۴ء سے حاصل ہوئی۔

جب راؤرکیلا، رانچی، جمشید پور کے فسادات نے ملت کا درد رکھنے والوں اور ہندوستانی مسلمانوں کے رہنماؤں اور کارکنوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور یہ صاف نظر آنے لگا کہ اگر

بروقت اس کا مداوا نہ کیا گیا اور مسلمانوں کی مختلف سیاسی جماعتوں، تنظیموں، اور ان کے قائدین رہنماؤں نے ملت ہی کو نہیں بلکہ ملک کو بچانے کے لئے منظم و متحد جد وجہد کا آغاز اور مشترک پلیٹ فارم کو وجود میں لانے کا کام نہ کیا تو اس ملت پر جو کچھ گذرے گی سو گذرے گی ملک کی بھی خیریت نہیں، اس تأثر کا سب سے زیادہ غلبہ اور اس صدمہ کی چوٹ سب سے زیادہ (خدا مغفرت کرے اور ان کے درجے بلند کرے) ڈاکٹر سیّد محمود صاحب مرحوم کے دل پر تھی، انھوں نے ان سب فکرمند اور درد مند حضرات سے رابطہ قائم کیا جو اس سلسلہ میں ان کے ہم سفر ہو سکتے تھے، لیکن ڈاکٹر صاحب کے دہلی میں ہونے کی وجہ سے ان کا سب سے زیادہ اور پہلا ربط مفتی صاحب اور مولوی محمد مسلم صاحب ایڈیٹر "دعوت" سے رہا، باہر کے لوگوں میں راقم سطور اور مولانا محمد منظور صاحب سے

اس سلسلہ کا پہلا قدم مشاورت کا وہ تاسیسی جلسہ تھا جو ۸، ۹ اگست ۱۹۶۴ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں منعقد ہوا، اور جس کے نتیجہ میں مسلم مجلس مشاورت وجود میں آئی، اسی جلسہ میں طے پایا کہ ملک کی فضا کو درست کرنے اور احترام انسانیت اور امن آشتی کا پیغام پہونچانے اور بجائے سیاسی جماعتوں اور ان کے رہنماؤں کے (جن کے ذہن بہت کچھ مسموم ہو چکے ہیں) ملک کی عام آبادی اور ہندو مسلم عوام سے براہِ راست رابطہ پیدا کیا جائے، اس کے ساتھ مسلمانوں میں خود اعتمادی پیدا کی جائے اور ان کو محسوس کرایا جائے، کہ وہ دین حق اور خدا کے آخری پیغام کے حامل، انسانیت کے بے لوث خادم و معمار ہونے اور اپنی ان خصوصیات اور دینی ذمہ داریوں کی بنیاد پر اس ملک کے محافظ و پاسبان بھی ہیں۔

اس سلسلہ میں پہلا سفر بہار و اڑلیسہ کا ہوا، اور ایک موقر اور متنوع الافراد وفد نے ستمبر ۱۹۶۴ء میں رانچی، چکر دھر پور، چائباسہ، جمشید پور، اور راؤڑکیلا کا دورہ کیا۔ ہر جگہ وفد کا شاندار اور پرجوش استقبال ہوا، مقرروں میں ڈاکٹر صاحب

کے بعد مفتی صاحب پیش پیش اور نمایاں ہوتے تھے۔ نومبر ۶۴ء میں مجلس نے مہاراشٹر کا دورہ کیا، دسمبر ۶۴ء میں گجرات کا دورہ ہوا۔ جسمیں پنڈت سُندرلال بھی شریک تھے اس سفر میں پالن پور، احمد آباد، نڈیاڈ، گودھرا، بڑودہ، سُورت اور بھڑوچ پر یہ پروگرام اختتام کو پہونچا، گجرات کے دورہ کا ذکر آگیا ہے تو دو واقعات کے تذکرہ کئے بغیر آگے نہیں بڑھا جاتا۔

پہلا واقعہ یہ ہے کہ احمد آباد کے قریب ایک مرکزی اور اہم قصبہ میں جس کا نام (اگر حافظہ کوتاہی نہیں کرتا) بیس نگر تھا، میں نے منتظین جلسہ اور رفقائے سفر سے درخواست کی کہ چونکہ میں کئی راتوں سے دیر میں سو رہا ہوں اور بہت تھکا ہوا ہوں مجھے تقریر کا پہلے موقعہ دیدیا جائے، ذمہ داروں نے منظور کرلیا، اور پہلی تقریر میری ہوئی میں نے اس تقریر میں ہندوستان کی جغرافیائی وسعت، تاریخی عظمت اور سیاسی اہمیت وغیرہ بیان کرنے کے بعد ایک محبِ وطن ہندوستانی کی حیثیت سے اس پر حسرت وقلق کا اظہار کیا کہ اتنے عظیم ملک کی قیادت اور انتظام کے لئے ملک کے آزاد ہونے کے بعد جس بالغ سیاسی شعور، وسیع النظری، سیرت و اخلاق کی بلندی اور اصول پسندی کی ضرورت تھی، اسکی کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے، شاید جنگ آزادی کی مصروفیت میں قومی سیرت و اخلاق کی تعمیر کا وہ کام نہیں ہوسکا، جس کی اتنے بڑے ملک کے سنبھالنے کیلئے ضرورت تھی، ملک میں ذہنی و اخلاقی انتشار، دولت کی حد سے بڑھی ہوئی محبت اور رشوت و کرپشن پھیلا ہوا ہے، ملک کے بے لوث کارکنوں، سیاسی رہنماؤں، اور قائدین کو اسکی طرف توجہ کی ضرورت ہے، ورنہ اس آزادی کا برقرار رہنا مشکل ہوجائے گا میں یہ تقریر کرکے اپنی قیام گاہ پر آگیا، واپسی پر مُلّا جان صاحب نے بتایا (جو تحریک خلافت کے ایک پرانے کارکن اور مجلس مشاورت کے ایک اہم رکن تھے اور کلکتہ میں ان کا قیام تھا) کہ تمہاری تقریر پر پنڈت سُندرلال جی نے سخت تنقید اور احتجاج کیا، اور کہا کہ مولانا کو اتنے

تُند اور تیز لہجے میں ہندوستان پر تنقید کرنے کا کیا حق تھا؟ انھوں نے ملک کی توہین کی خیریت ہوئی کہ مجمع نے اس پر اپنے غم و غصہ کا اظہار نہیں کیا، مجھے یہ سُن کر تعجب ہوا کہ یہ باتیں ایک محبِ وطن ہندوستانی کے ناتے اور ملک کی خیرخواہی میں خلوص سے کہی گئی تھیں اس پر اتنا بُرا ماننے کی کیا بات تھی؟ فجر کی نماز کی تیاری کے لئے ہم سب لوگ اُٹھے تو دیکھا کہ پنڈت جی اب بھی اس تقریر پر تنقید و تبصرہ کر رہے ہیں، اور مسلمانوں کے بارے میں طنزیہ الفاظ بھی استعمال کر رہے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ مسلمان زمزم کو مقدس پانی مانتے ہیں۔ لیکن گنگا جل کی انکے یہاں کوئی عزت نہیں، وغیرہ وغیرہ میں نے طے کر لیا کہ میں اخیر تک خاموش رہوں گا۔ تاکہ سفر کے مقصد کو کوئی نقصان نہ پہونچے، اور اس وفد میں جو مختلف الخیال لوگوں پر مشتمل ہے کوئی انتشار نہ پیدا ہو، لیکن حیرت ہوئی کہ رفقائے سفر میں سے جن میں بعض خالص مسلم جماعتوں کے رہنما تھے[1] کوئی ایک لفظ نہیں بولا، اور پنڈت جی کا سلسلہ کلام جاری رہا، اتنے میں مفتی صاحب کی آواز آئی جو ابھی بیدار ہی ہو رہے تھے کہ پنڈت جی آخر مولانا نے کیا بے جا بات کہی آپ اتنے گرم کیوں ہیں الخ اس وقت مجھے مفتی صاحب کی قدر ہوئی کہ انھوں نے نہ صرف دینی حمیت بلکہ اخلاقی جرأت سے کام لیا، اور میری تائید کی، پنڈت جی اس پر خاموش ہو گئے اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

سفر گجرات کا دوسرا قابل ذکر واقعہ یہ ہے کہ ہم لوگ بڑودہ میں نماز فجر وغیرہ سے فارغ ہو کر بیٹھے تھے کہ چند اہل محلہ گھبرائے ہوئے آئے، اور انھوں نے کہا کہ قریب ہی ایک مکان ہے جو زمین میں دھنس رہا ہے اُس کے آثار نظر آتے ہیں کئی روز سے اس مکان کے مکین خواب دیکھ رہے ہیں کہ اس مکان میں نامناسب کام ہوئے ہیں اور انکی

---

[1] اس موقع پر ڈاکٹر سید محمود صاحب صدر مجلس اور مولانا ابواللیث صاحب ندوی امیر جماعت اسلامی ہند موجود نہ تھے وہ دونوں احمد آباد رہ گئے تھے۔

نحوست ہے یہ مکان زمین میں دھنس جائے گا، آپ حضرات چلیں اور وہاں دعا کریں ہم سب لوگ اپنی حقیقت سے واقف تھے "ایاز قدر خود راشناس" لیکن یہ خیال ہوا کہ ملت کے خادموں اور مختلف مسلم جماعتوں کے نمائندوں کی جماعت ہے، اور یہ ایک نیک مقصد سے سفر کر رہے ہیں کیا عجب ہے کہ اللہ تعالیٰ رحم فرمائے، اور یہ بلا ٹل جائے، کچھ نظر پڑتی تھی تو حضرت مفتی صاحب پر کہ عالم، حافظ، فقیہ اور اللہ کے ایک مقبول بندہ اور صاحب نسبت شیخ کے فرزند ہیں، ہم لوگ ہمت کر کے گئے اور وہاں کھڑے ہو کر دعا کی، اور چلے آئے، لوگوں نے بتایا کہ وہ کیفیت ختم ہو گئی۔ مکان اب بھی اسی حالت میں اس جگہ موجود ہے، محبی غلام محمد میمن صاحب سے (جن کا بڑودہ میں قیام ہے، اور مفتی صاحب سے خاص تعلق رکھتے ہیں) جب کبھی پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ الحمدللہ مکان اپنی جگہ پر قائم اور محفوظ ہے۔ مشاورت کا سب سے بڑا دورہ ریاست میسور میں ہوا، جو ۱۱ نومبر سے شروع ہو کر ۲۲ نومبر ۱۹۶۶ء کو ختم ہوا۔ اس کی مجموعی مسافت کا انداز ساڑھے چار ہزار میل ہے جس میں تقریباً ڈیڑھ ہزار میل کی مسافت بس سے طے کی گئی مدراس سے شروع ہو کر یہ دورہ گلبرگہ پر ختم ہوا، جہاں سی ہی سے راقم السطور کی سفر میں رفاقت ہو گئی۔ یہ تحریک خلافت کے بعد شوکت اسلامی کا پہلا نظارہ تھا، اس کے اہم مقامات میں بنگلور، سرنگاپٹن (مدفن سلطان ٹیپو) میسور، مرکارہ، منگلور، ہاسن، بیجاپور، شیموگا وغیرہ تھے۔

اس تاریخی دورہ میں اختتامی تقریر مفتی صاحب کی تھی، انھوں نے فرمایا کہ صحیح آزادی اور جمہوریت وہ ہوتی ہے جس کا فیض یکساں طور پر آبادی کے تمام عناصر اور ملک کے تمام فرقوں اور طبقوں کو پہونچے، اس کی انھوں نے مثالیں دیں، اور اس سلسلہ میں مسلمانوں کو جو شکایات ہیں اس کا ذکر کیا، پھر اپنے پسندیدہ (جگر مرحوم) کے اشعار پڑھے، جو اس دورہ میں اکثر پڑھا کرتے تھے۔

بہار آئے اور اس شان کی بہار آئے ۔۔۔ کہ پھول ہی نہیں کانٹوں پہ بھی نکھار آئے

چمن چمن ہی نہیں جس کے گوشہ گوشہ میں ـــــ کہیں بہار نہ آئے کہیں بہار آئے

مفتی صاحب کی تقریروں میں رجائیت اور تعمیری وایجابی نقطۂ نظر غالب ہوتا تھا ان کی تقریریں جذبات میں اشتعال، اور غم وغصہ پیدا کرنے کے بجائے مسائل سلجھانے اور حالات کی طرف سے پُراُمید رہنے پر آمادہ کرتی تھیں، اکثر دوسرے مقررین کے مقابلہ میں ان کی تقریریں زیادہ تعمیری اور غیر مسلم سامعین کے لئے جو اکثر مقامات پر بڑی تعداد میں ہوتے تھے) مفید اور قابل فہم اور قابل قدر ہوتی تھیں اور انکو قریب کرنے کا کام کرتی تھیں، جوان دوروں کا ایک بڑا مقصد تھا۔

افسوس ہے مجلس کی ان تعمیری سرگرمیوں اور اس کے دوروں کا مفید سلسلہ زیادہ دنوں تک جاری نہیں رہا، میسور کا دورہ مجلس مشاورت کی شہرت ومقبولیت کا نقطۂ عروج تھا، ۶۷ء کے عمومی انتخابات بلا واسطہ مجلس کے لئے اور بالواسطہ مسلمانان ہند کے لئے ایک نازک ابتلا ثابت ہوئے جماعتوں کے ذمہ داران اور ارکان مجلس نے اپنے اپنے طور پر کہیں کہیں کام کیا اور اس سے مجلس کا شیرازہ جو ابھی تک مرتب ومنظم تھا کسی قدر انتشار وتضاد کا شکار ہوا، ۲-۳- اپریل ۶۷ء کو مجلس کا جلسہ دہلی میں منعقد ہوا، ڈاکٹر سید محمود صاحب استعفٰی پر مصر تھے، لیکن ان کو بڑی مشکل سے اس سے باز رکھا گیا لیکن اُن میں اب پہلی سی اُمنگ اور ولولہ باقی نہیں رہا تھا۔ اس میں ان کی صحت کے روز افزوں انحطاط اور اضمحلال طبع کو بھی دخل تھا، بالآخر انھوں نے ایک جلسہ میں ہم لوگوں کے عرض ومعروض کے باوجود صدارت سے استعفٰی دیدیا، اور باتفاق آراء مفتی صاحب صدر منتخب ہوئے، جن سے زیادہ اس پُرآشوب دور اور اختلاف خیال کی فضا میں کوئی اور شخصیت موزوں نہ تھی، اللہ تعالیٰ نے ان کو دو خاص امتیازی جوہر عطا فرمائے تھے، ایک ذہانت، دوسرے مختلف الخیال افراد اور

جماعتوں، اور بعض اوقات متضاد و متناقض رُجحانات میں مصالحت و مفاہمت کی کامیاب کوشش، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مولانا رُومؒ کی اس حکیمانہ وصیت پر پورا عمل تھا ؎ تو برائے وصل کردن آمدی :: نے برائے فصل کردن آمدی

نیز خواجہ حافظؒ کے اس شعر پر بھی وہ پورے طور پر کاربند تھے ؎
آسائش دو گیتی تفسیر این دو حرف است :: با دوستاں تلطّف با دشمناں مدارا

بارہا اس کا تجربہ ہوا کہ مختلف نقطۂ نظر پوری خطابت اور زورِ استدلال کے ساتھ سامنے آئے، اور نظر آنے لگا کہ شاید آستینیں چڑھ جائیں۔ کہ مفتی صاحب کے چند فقروں نے اس جوش کو ٹھنڈا کر دیا۔ مختلف جماعتوں کو سانھ لے کر چلنے کی جیسی صلاحیت ان میں دیکھی گئی، کم قائدین میں دیکھنے میں آئی ممکن ہے بعض "ماہرین نفسیات" اور ناقدین اس کو ان کی کمزوری اور ضرورت سے زیادہ بڑھی ہوئی خوش خلقی و مروّت پر محمول کریں، لیکن جب ملت میں انتشار ہو مختلف جماعتیں اور مکاتبِ خیال کسی نہ کسی درجہ میں عصبیت سے متاثر ہوں تو ایسی "مرنجان و مرنج"، حلیم و بردبار اور دلے بہم شخصیت کی ضرورت شدت سے محسوس کی جاتی ہے، اور آج یہ خلا مفتی صاحب کے انتقال کے بعد نہ صرف مجلس مشاورت کے دائرہ میں (جس کا منصب صدارت ابھی تک خالی ہے) بلکہ ملت کے دائرہ میں بھی محسوس ہوتا ہے۔

مضمون ختم کرنے سے پہلے اتنا عرض کرتا چلوں کہ مجلس کے طویل و وسیع دوروں میں میں دو باتوں کی خاص کوشش کرتا تھا، ایک یہ کہ قیام (علمی، دینی اور طبعی مناسبت کی وجہ سے) ہمیشہ مفتی صاحب کے ساتھ رہے، دوسرے نمازیں (خصوصاً جہری) انھیں کی امامت اور اقتدا میں پڑھی جائیں، اس لئے کہ مفتی صاحب کی تلاوت میں بڑی حلاوت تھی، وہ بھی رفقاء سفر میں مجھ پر خاص طور پر شفقت

فرماتے تھے، اور مانوس و بے تکلف تھے، اسی تعلق و محبت کی بنا پر میری درخواست
پر سنہ ۱۹۷۸ء میں وہ رائے بریلی تشریف لائے اور واپس جاکر بڑی محبت کا خط
لکھا جس کے لفظ لفظ سے خلوص و مسرّت کا اظہار ہوتا ہے۔

مفتی صاحبؒ کی محبت اور تعلق کی بات تھی کہ انھوں نے کئی بار مجھ سے فرمایا
کہ تم اپنی کوئی تصنیف ندوۃ المصنفین کو دو، اور اس کی طرف سے اسکی اشاعت
ہو، سنہ ۱۹۷۵ء کی ابتدار کا کوئی مہینہ تھا، کہ تذکیر بجگرات میں محترمی مولانا غلام محمد صاحب
نورگت کے دولت خانہ پر جن کا مفتی صاحبؒ سے خاص تعلق تھا، اور میرے بھی بزرگ
اور کرم فرما ہیں، اس کا ذکر آیا، اور میں نے اپنی کتاب "حیاتِ عبدالحیؒ" جو انھیں
دنوں میں مرتب و مکمل ہوئی تھی۔ ندوۃ المصنفین کو پیش کرنے کا وعدہ کیا
مفتی صاحب نے اس پر اپنی بڑی خوشی کا اظہار کیا اور بڑی توجہ اور اہتمام کے ساتھ
وہ نومبر سنہ ۱۹۷۶ء میں ندوۃ المصنفین کی طرف سے شائع ہوگئی، مجھے بھی مفتی صاحب
کی ایک خواہش و فرمائش کی تعمیل کی مسرت وسعادت اور کتاب کو ندوۃ المصنفین
جیسے مؤقر تصنیفی ادارہ کی مطبوعات میں شامل ہونے کی عزت حاصل ہوئی، اور وہ
الحمدللہ علمی ادبی حلقوں میں پسند کی گئی، مفتی صاحب کی اجازت سے ادارۂ نشریات
اسلام نارتھ ناظم آباد نے اس کا پاکستانی ایڈیشن بھی شائع کیا۔

مفتی صاحب اخیر میں چند شدید بیماریوں کا شکار رہے، لیکن مزاج میں
جو مروّت اور لینت، پرانے تعلقات کا پاس و لحاظ اور اخلاق و ایثار کا جوہر
تھا وہ ضروری آرام و احتیاط میں بھی مخل ہوجاتا تھا، یہی وجہ تھی کہ انھوں نے
اپنے بہت سے قدیم عوارض اور جدید تکلیفوں کے باوجود دارالمصنفین کے اس
سمینار میں شرکت ضروری سمجھی "جو اسلام اور مستشرقین کے عنوان پر ۲۶ - ۲۸ ربیع
الآخر سنہ ۱۴۰۲ھ ۲۱-۲۳ فروری سنہ ۱۹۸۲ء کو دارالمصنفین کی طرف سے اس کے زیر اہتمام

شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج اعظم گڑھ میں منعقد ہوا، اسی سفر سے واپسی پر دریاآباد کے اسٹیشن پر ان پر اچانک فالج کا حملہ ہوا، یہ انتظام غیبی تھا کہ مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی اور چند مخلص احباب و رفقاء خاص ہمسفر تھے، لکھنؤ کے طبی امداد کے اسٹیشن پر پہونچ جانے کی اطلاع کردی گئی، وہاں مفتی صاحب کو اتارلیا گیا، مفتی صاحب کے نیازمندوں اور ندوۃ العلماء سے تعلق رکھنے والے احباب وخدام نے اپنی ذمہ داری کا پورا احساس کیا، اور حصول سعادت اور خدمت کو غنیمت سمجھا، راقم سطور بھی لکھنؤ میں موجود تھا، وہ بھی اس سعادت میں شریک رہا، مفتی صاحب کو بلرام پور ہسپتال میں داخل کردیا گیا دارالعلوم کے اساتذہ اور طلبہ نے دین وملت کے اس "ھما" کی پذیرائی میں کوتاہی نہیں کی، جو قسمت سے اڑکر ان کے پاس پہونچ گیا تھا، خیال تھا کہ جب تک آرام نہ ہوجائے مفتی صاحب یہاں سے تشریف نہ لے جائیں، لیکن گھر والوں کا تقاضہ غالب آیا اور یہ خیال ہوا کہ ان کا حق زیادہ ہے اور شاید وہاں مفتی صاحب کو قلبی وروحانی سکون اور طمانینت ملے اس لئے بادل ناخواستہ یہ جدائی گوارا کی گئی، لیکن کچھ عرصہ کے بعد ہی وہ ساعت مقرر آگئی، جس کے متعلق فرمادیا گیا ہے کہ

لا یستأخرون ساعۃ ولا یستقدمون

اور نہ صرف ندوۃ المصنفین بلکہ وہ سب دینی ادارے جس کے وہ رکن ومشیر اور معاون ورفیق تھے، نہ صرف دہلی جوان کا مسکن اور دیوبند جوان کا وطن تھا، بلکہ برصغیر ہند (ہندوستان وپاکستان) ان کی رہنمائی، اصابت رائے سلامت فہم، اور مختلف الخیال لوگوں میں وصل وجمع کی صلاحیت سے محروم ہوگیا، رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ

مفتی صاحب کے لئے تقدیر الٰہی میرے لئے توفیق وسعادت کی بات

تھی کہ مفتی صاحب کی وفات کا واقعہ پیش آیا تو میں حجاز مقدس میں تھا) مجھے دہلی کے ٹیلیفون سے اس کی بروقت اطلاع ملی، میں نے اسی وقت سعودی ریڈیو اسٹیشن سے رابطہ پیدا کیا اور عزیزی مولوی نصار رفیع ندوی انچارج شعبۂ اردو جدہ ریڈیو اسٹیشن کو اپنی قیام گاہ پر بلاکر مفتی صاحب کے حادثہ ارتحال اور ان کی شخصیت، خدمات وکمالات پر ٹاک ریکارڈ کرائی، جو اسی دن نشر ہوئی اور اسی کے ذریعہ حجاز مقدس اور سعودی عرب کے دوستوں اور اہل تعلق کو حادثہ کا علم ہوا مجھ سے جو کچھ بن آیا مفتی صاحب کے رفع درجات کے لئے دُعا اور طواف کی سعادت حاصل کی اور اپنے مخلص احباب کو بھی اس کی ترغیب دی۔ اندازہ ہے کہ بہت سے مخلصین نے یہ سعادت حاصل کی، اور مفتی صاحب کے لئے دُعا وطواف کے ذریعہ ایک جلیل القدر عالم اور خادم ملت کے لئے دعا اور ایصال ثواب کر کے اپنے لئے بھی قبولیت اور ترقی دینی کا سامان کیا، شاید کم مشاہیر و زعماء کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا ہو، کہ اس قدر جلد ان کے لئے دیار مقدسہ میں دُعائے مغفرت اور ایصال ثواب کا اہتمام ہوا ہو —

وذٰلك فضل الله يؤتيه من يشاء — — — —

The Saudi Arabian Ambassador
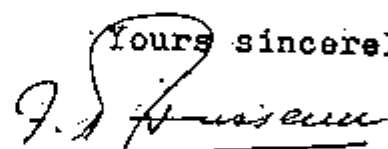
Dear Madame, 15th May 1984.

I noted with deep grief and sorrow, the demise of your late husband Mufti Atiqur Rehman.

I express my deep sorrow and sincere condolences to you and the family members on this irreparable loss of a great man who had rendered innumberable services to Islam and to the muslims.

I pray to God that his soul may rest in peace.

Yours sincerely,

F. S. Husseini

Fouad S. Husseini

TO:

Mrs. Atiqur Rehman
Maktaba Burhan
Urdu Bazar
Delhi-110006

پیر وقار شخصیت، سفید لباس، مناسب قد، سیاہ اونچی باڑ کی ٹوپی، پیکر اخلاق یہ تھی مفتی صاحب کی شخصیت، جیسا کہ سب سے پہلے بچپن میں میں نے انھیں دیکھا یہ غالباً ۳۵، ۳۶ سال پہلے کی بات ہے میرے والد حکیم شریف الدین بقائی صاحب کے پاس دواخانے میں اکثر حضرت تشریف لاتے اور نہایت متانت اور سنجیدگی کے ساتھ مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی، دوران گفتگو کبھی میں نے مفتی صاحب کو تیز آواز میں بولتے یا ہنستے نہیں دیکھا، مجھ سے بھی نہایت مشفقانہ انداز میں خیریت دریافت کرتے، میرے دل میں حضرت کیلئے بیحد احترام اور محبت پیدا ہوگئی۔ میں اسکول کی منزلوں سے گذر کر کالج تک پہونچا، پری میڈیکل کے بعد میڈیکل کالج میں داخلے کے لئے مختلف جگہوں پر درخواستیں اور کوششیں کیں، یہ اگست ۱۹۶۵ء کی بات ہے، اچانک ہندوستان اور پاکستان میں کشمیر کے مسئلہ کو لیکر اختلافات شروع ہو گئے۔ اور اگست کے اخیر میں پہلی ہند پاک جنگ شروع ہوگئی جس میں ہندوستان نے لاہور پر اور پاکستان نے کشمیر پر حملہ کر دیا۔ ۲ ستمبر ۶۵ء کو کشمیر میڈیکل کالج سے داخلے کی اطلاع بذریعہ ٹیلیگرام موصول ہوئی دل کی کیفیت عجیب کہ داخلہ بھی ملا تو ایسی حالت میں کہ گھر والے کسی قیمت پر بھی نہیں راضی ہونگے، ۵ ستمبر کو جنگ بندی ہوئی اور ستمبر کے دوسرے ہفتے میں حالات

ذرا بہتر ہوئے تو پھر خیال آیا کہ کوشش کریں شاید گھر والے اجازت دیدیں ڈرتے
ڈرتے والد صاحب کے سامنے ٹیلیگرام رکھدیا، نتیجہ ظاہر تھا فورًا انکار ہوگیا دماغ
پریشان کہ مستقبل خطرے میں ہے، تھوڑی دیر بعد حضرت مفتی صاحب تشریف لائے
مجھے افسردہ دیکھ کر پوچھا کیا بات ہے حکیم صاحب نے پوری بات بتائی، فورًا فرمایا
کہ حکیم صاحب جانے دیجئے یہ وہاں زیادہ محفوظ رہے گا اور نہ جانے کن الفاظ میں حکیم صاحب
کو سمجھایا کہ وہ نیم راضی ہو گئے میں نے اسی وقت جا کر جہاز کی سیٹ بک کرائی اور اگلے
دن سری نگر روانہ ہو گیا۔ مفتی صاحب کا یہ وہ احسان تھا جسے میں کبھی نہیں بھول سکوں گا
جب بھی میں دہلی آتا مفتی صاحب سے ضرور ملاقات ہوتی خیریت پوچھتے، حالات پوچھتے
اور دعاؤں سے نوازتے سنہ ۱۹۷۰ء میں ڈاکٹر بن کر جب واپس آیا تو مفتی صاحب بہت
خوش ہوئے اور فرمایا کہ اب یہیں مطب کرلو میرا بھی یہی خیال تھا، چتلی قبر پر ہی اپنے مطب
کا آغاز کیا جسکی افتتاحی تقریب میں مفتی صاحب مولانا قاری محمد طیب صاحب کے ہمراہ
پیش پیش تھے، اس کے بعد بھی جب ملاقات ہوتی نہایت شفقت کے ساتھ خیریت پوچھتے
اور دعائیں دیتے، تب ہی ایک روز مجھے معلوم ہوا کہ مفتی صاحب کو گاؤٹ (GOUT)
کی تکلیف ہے اور وہ کچھ دوائیں استعمال کرتے ہیں ایک روز مجھے فرمانے لگے یہ دوائیں
عرصہ سے استعمال کر رہا ہوں جسم میں خشکی ہونے لگی ہے، میں نے ان کی سب دوائیں بند
کر کے صرف ایک کیپسول تجویز کر دیا کچھ دن بعد ملاقات ہوئی تو افاقہ بتایا اس کے کچھ دن بعد
ہی مفتی صاحب کے گھر میں سے علیل ہوگئیں، دماغی دورے پڑنے لگے ایک روز مجھے گھر پر
بلایا اور فرمایا کہ ان کے لئے بھی کوئی دوا تجویز کروں میں نے دیکھنے کے بعد ان کے لئے بھی
نسخہ لکھدیا، الحمدللہ افاقہ ہوا اور وہ دوا اخیر دم تک انکی چلتی رہی دسمبر ۸۱ء میں مفتی
صاحب کی اہلیہ پر فالج کا حملہ ہوا فورًا ہی میرے پاس آدمی بھیجا کہ مطب کے بعد میں ان کو
دیکھ لوں میں گھر آیا تو مفتی صاحب کو کافی فکرمند پایا۔ عام حالات میں مفتی صاحب کے چہرے

سے کبھی یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ وہ پریشان ہیں،

بہرحال انکو دیکھنے کے بعد کچھ دوائیں تجویز کی گئیں کچھ ٹسٹ کرائے گئے اس فالج میں ان کا چہرہ اور آدھا جسم مفلوج ہو چکا تھا ایک ہفتہ بعد پھر مجھے فون کیا کہ ابھی تک زیادہ فائدہ نہیں ہے میں نے کہا کہ اس میں تقریباً چھ ہفتہ بعد صحیح شکل سامنے آئے گی علاج ہوتا رہا اور کافی حد تک افاقہ ہو گیا۔ چار ہفتہ بعد میں نے بتایا کہ اب انھیں (PHYSIO THERAPY) ایکسرسائز کی ضرورت ہے کچھ دن تو ایک ڈاکٹر صاحب آئے مگر مریض کی دماغی کیفیت کی وجہ سے وہ کچھ نہ کرا سکے اس لئے وہ سلسلہ پھر بند ہو گیا اور اہلیہ صاحبہ مستقل بستر سے لگ گئیں اس کے بعد سے ہی مفتی صاحب کو اکثر افسردہ دیکھا گیا یہ غالباً ۴ ۲ فروری ۱۹۸۲ء کا واقعہ ہے کہ مفتی صاحب کسی کانفرنس سے واپس آرہے تھے کہ لکھنؤ اور اعظم گڑھ کے درمیان کسی جگہ پر اچانک فالج کا حملہ ہوا اور طبیعت کافی بگڑ گئی لکھنؤ میں انکو گاڑی سے اتار کر فوراً مقامی ہسپتال میں داخل کر دیا گیا وہاں ڈاکٹروں نے ایمرجنسی ادویات دیکر دہلی میں ٹرانسفر کا مشورہ دیا چنانچہ مفتی صاحب کو اگلے روز دہلی کے جی بی پنٹ ہسپتال میں داخل کر دیا گیا جہاں ڈاکٹروں کی ٹیم نے معائنہ کے بعد بہت سے ٹیسٹ لئے اور نہایت تندہی سے علاج کیا، ۱۰ دن کے بعد حالت قدرتے بہتر ہو گئی تو ان کو گھر واپس لے آیا گیا مفتی صاحب ہسپتال میں رہنے سے گریز کرتے تھے گھر آنے کے بعد پھر وہ میرے علاج میں آگئے۔ گھر پر ہی ایکسرسائز کا انتظام کیا گیا ایک ماہ بعد الحمد للہ زبان اس قابل ہو گئی کہ الفاظ صاف سمجھ میں آنے لگے رفتہ رفتہ ہاتھ بھی ٹھیک ہو گئے مگر ٹانگوں کی کمزوری رہی جس پر اکثر کہا کرتے بس ٹانگیں اور ٹھیک ہو جائیں تو میں بالکل ٹھیک ہوں، اس فالج میں مفتی صاحب غالباً ڈیڑھ برس صاحب فراش رہے ایک روز گھر سے فون آیا کہ میں آکر دیکھ لوں ناک میں کچھ تکلیف بتاتے ہیں میں نے دیکھا کہ بائیں آنکھ کی جڑ میں ایک چھوٹا سا دانہ ہے۔ دو تین روز دوائیں دیں مگر وہ دانہ تیزی سے بڑھتا گیا اسکی

شکل سے اندازہ ہوا یہ کوئی معمولی دانہ نہیں، بلکہ کینسر کی ابتدا ہے میں نے مفتی صاحب کے صاحبزادے عمید الرحمن عثمانی سے اپنے خدشہ کا اظہار کیا کہ اس کا ٹسٹ ہونا چاہئے اگلے دن میڈیکل انسٹیٹیوٹ میں دکھایا گیا جہاں انھوں نے خون کے مختلف ٹسٹ لئے اور اسکی BIOPSY لی گئی جس سے بدترین خدشات درست ثابت ہوئے اور کینسر تجویز کیا گیا اور فوری طور پر بجلیاں لگوانے کا مشورہ دیا گیا، گھر والوں کا خیال تھا کہ ابھی بجلیاں نہ لگوائی جائیں مگر میرے مشورہ پر سب راضی ہو گئے نہایت پابندی کے ساتھ بجلیوں کا کورس پورا کیا گیا اس کے بعد انجکشن تجویز کئے گئے جن کے لئے ہفتہ میں ایک بار میڈیکل انسٹیٹیوٹ جانا ہوتا تھا اس تمام علاج سے مفتی صاحب کی صحت میں خاطر خواہ فائدہ ہوا اور وہ پہلے کی طرح بشاش نظر آنے لگے تقریباً سات ماہ تک یہ علاج چلتا رہا اچانک ایک روز جسم پر تین چار جگہ چھوٹی چھوٹی گلٹیاں نظر آئیں مجھے دکھایا تو میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا کیونکہ وہ کینسر کی ـــــ (SECONDRIES) تھیں اور اس بات کی علامت تھی کہ وہ موذی مرض عارضی طور پر دب گیا تھا مگر اندر ہی اندر پھیلتا رہا پھر میڈیکل کو رجوع کیا گیا جہاں اس بات کی تصدیق ہو گئی اب سب گھر والوں کی تشویش بڑھ گئی، مختلف معالجوں سے رجوع کیا گیا، اس وقت صفدر جنگ ہسپتال میں کینسر کے سب سے بڑے معالج پروفیسر ایم رحمٰن تھے میں ان کے گھر پہونچا، میرے ان سے تعلقات اس زمانے سے تھے جب میں خود صفدر جنگ میں تھا، اس کے بعد ان کے گھر کبھی کبھی جانا ہوتا تھا رحمٰن صاحب نے تمام رپوٹیں دیکھیں اور فرمایا کہ اب اس کا اختتام قریب ہے اور تقریباً لاعلاج ہے پھر بھی فرمانے لگے جمعہ کو میرے یہاں لے آنا داخل کر کے دیکھیں کہ اور کیا کر سکتے ہیں۔ میں واپس آ گیا اگلے دن منگل تھا اچانک شام کو معلوم ہوا کہ مفتی صاحب کی طبیعت بگڑ گئی ہے فوراً پہونچا دیکھا کہ بیہوش ہیں اور کچھ گلٹیاں گلے میں بھی پھیل گئی ہیں جس کی وجہ سے کوئی چیز حلق سے نہیں اتر رہی ہے انجکشن کے بعد کچھ حالت سنبھلی مگر نیم بیہوشی کی کیفیت رہی، میں نے RYLeee ٹیوب

منگاکر ناک کے راستے سے معدہ میں داخل کر دیا جس سے رقیق غذا دی جانے لگی رات تقریباً
۱۱ بجے تک میں وہاں موجود رہا ان کے سب لڑکے اور رشتہ دار اور مفتی صاحب کے عقیدت مند
وہاں جمع ہو گئے گھر والوں کی خواہش تھی کہ اب ہسپتال نہ داخل کرایا جائے بلکہ گھر کو ہی ہسپتال
بنا دیا جائے چنانچہ ان کو گھر پر ہی آکسیجن اور گلوکوز دیا جانے لگا اگلے دن ۱۱ مئی ۸۲ء
بدھ کو صبح طبیعت خراب ہی رہی، تقریباً ۱۲ بجے دوپہر پھر ایک سیاہ رنگ کی قے ہوئی جس کے
بعد حالت مزید بگڑنی شروع ہوئی، مطب کے بعد پھر پہونچا، پھر کچھ انجکشن دیئے اور ان کی
حالت میں افاقہ دیکھکر گھر واپس آگیا، پندرہ منٹ بعد ہی پھر اطلاع آئی کہ پھر طبیعت بگڑ
رہی ہے فوراً پہونچا تو دیکھا کہ مفتی صاحب ہم سب کو چھوڑ کر خالق حقیقی سے جا ملے ۔ میں نے
سب نلکیاں ان کے جسم سے الگ کیں اور انکو سیدھا لٹا کر چادر ڈال دی ہر طرف کہرام تھا
گھر والے سب برداشت کر رہے تھے مگر باہر شور تھا تھوڑی دیر بعد بازار گلی کوچے سیاہ
حاشیئے والے پوسٹروں سے ماتم کناں ہو گئیں ہر شخص افسردہ تھا ماحول افسردہ تھا
گھر والے نہلانے اور دوسرے انتظامات میں مصروف ہو گئے اگلے روز صبح سویرے جامع
مسجد میں نماز جنازہ ادا کی گئی اور اس کے بعد لاکھوں لوگوں کے کاندھوں سے گذر کر مفتی
صاحب کو سپرد خاک کر دیا گیا ۔یہی دنیا کا قاعدہ ہے انسان پیدا ہوتا ہے زندگی گذارتا ہے
اور چلا جاتا ہے اسی کو دیکھکر کسی نے کہا ہے ؎

موت اسکی ہے کرے جس کا زمانہ افسوس + ورنہ دنیا میں سبھی آئے ہیں مرنے کیلئے

آج مفتی صاحب ہم میں نہیں انکی نرم اور شائستہ گفتگو ہر وقت انکی یاد دلاتی ہے جب
ان کا تصور آتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مفتی صاحب مخاطب ہیں اور کہہ رہے ہیں
" کہئے مزاج تو اچھے ہیں "

حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ

(چند بعض خطوط کی روشنی میں)

★ مولانا حکیم محمد عرفان الحسینی ★

رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں: "موت سے کسی کو مفر نہیں" لیکن جو لوگ ملّی مفاد کی تائید و حصول میں تادم آخر کام کرتے رہتے ہیں وہ کتنی ہی طویل عمر کیوں نہ پائیں ان کی وفات قبل از وقت اور تکلیف دہ محسوس ہوتی ہے" (گنجہائے گرانمایہ)

حضرت مفتی عتیق الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ پر یہ جملہ مکمل طور پر صادق آتا ہے مفتی صاحب نے اپنی زندگی ملک و ملّت کی خدمت ہی کے لئے وقف کر دی تھی۔

حضرت مفتی صاحب ایک بڑے باپ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی (جن کے قلم سے ایک لاکھ اٹھارہ ہزار فتوے لکھے گئے) کے بڑے بیٹے تھے، مفتی صاحب کی پیدائش ۱۳۱۹ھ ہجری میں دیوبند میں ہوئی، تاریخی نام "ظفر الحق" ہے، ۹ سال کی عمر میں قرآن شریف حفظ کیا، شروع سے اخیر تک دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کی اور ۱۳۴۱ھ ہجری میں فارغ التحصیل ہوئے دو سال وہیں رہے، پھر دارالعلوم اسلامیہ ڈابھیل گجرات چلے گئے وہاں پانچ سال تک افتاء اور تدریس کے فرائض انجام دیئے ۱۹۳۰ء میں باقاعدہ سیاسی زندگی شروع کی اور انڈین نیشنل کانگریس کی تحریک نمک سازی کے زمانہ میں سیاسی دلچسپی کے باعث ڈابھیل چھوڑ دیا اس دور میں ان کے دو اہم فتوے شائع ہوئے جنھوں

نے تاریخ آزادی ہند میں بہت اہمیت حاصل کی ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۷ء تک کلکتہ میں قیام رہا درس وافتاء کا مشغلہ تھا دورانِ قیام کلکتہ حضرت مولانا ابوالکلام آزاد علیہ الرحمۃ سے بہت قربت ہوگئی تھی جو اخیر تک قائم رہی، ۱۹۳۸ء میں دہلی تشریف لے گئے اور ایک علمی ادارہ "ندوۃ المصنفین" کے نام سے قائم کیا اسی زمانے میں دو کتابیں علامہ ابن تیمیہ کی "الکلم الطیب" کا ترجمہ تشریحی نوٹ کے ساتھ اور علامہ ابن جوزی کی "صید الخاطر" کا ترجمہ کیا ایک سنجیدہ باوقار علمی پرچہ "برہان" کے نام سے جاری کیا ایڈیٹر خود رہے پھر کثرتِ مشاغل کی بنا پر مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی کو ایڈیٹر بنا دیا مولانا اکبرآبادی کی ادارت کے زمانے میں بھی بار ہا کے "نظرات" مفتی صاحب کے رشحاتِ قلم کے رہینِ منت رہے۔ حضرت مفتی صاحب نے غیر ممالک کے بھی کافی دورے کیے بعض جگہوں پر اپنے ملک ہندوستان کی نمائندگی کی اور بعض ممالک کا دورہ ذاتی دعوت پر کیا، رابطہ عالم اسلامی میں شرکت انڈونیشیا کا سفر اور روس و پاکستان و بغداد کے دورے خصوصیت کے حامل ہیں

ہندوستان کے اکثر و بیشتر علمی سماجی، ثقافتی، مذہبی اداروں سے منسلک رہے، دارالعلوم دیوبند، ندوۃ العلماء لکھنؤ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جامعہ ملیہ دہلی سے تو روح و جسم کا سا تعلق تھا، انجمن ترقی اردو، جامعہ اردو علیگڈھ، غالب اکیڈمی، دہلی سے بھی متعلق رہے کلکتہ کی ایران سوسائٹی کے ممبر رہے مسلم لیگ کو کبھی اختیار نہیں کیا بلکہ سب سے بڑی آزمائش یہ تھی کہ ان کے حقیقی چچا حضرت مولانا شبیر احمد رح عثمانی جو مسلم لیگ کے بانی و رہنما تھے ان سے سیاسی ناپسندیدگی مول لی جس کا حضرت مفتی صاحب رح کو بہت احساس تھا اس کے باوجود زہر ہلاہل کو قند نہیں کہہ سکے۔ ہمیشہ کانگریس میں رہے اور ملک کی دوسری سیاسی جماعتوں کے مقابلے میں کانگریس کے نظریات کو مسلمانوں کے لیے مفید سمجھتے رہے، جمعیۃ علماء ہند میں عمر کا بیشتر حصہ صرف کیا اور اخیر میں مسلم مجلس مشاورت میں شریک ہوئے مسلم پرسنل لاء بورڈ کی تاسیس میں پیش پیش تھے اسکے صدر بھی رہے۔

حسنِ تدبیر، خودداری، آزادی ضمیر، عزت نفس، معاملہ فہمی نکتہ رسی، اور فقہی دقیقہ سنجی ان کے مخصوص اوصاف تھے، نگارش میں مفتی صاحب ایک خاص طرز کے موجد ہیں، شگفتگی اور رنگینی سادگی و چاشنی اسکی بنیاد ہیں، چبھتے جملے جس میں تلخی وشیریں کا مناسب امتزاج تو ہوجاتا مگر تلملاہٹ سے مخاطب بچا رہتا ہے، مفتی صاحب کی تحریروں میں محبت آمیز طنز میں جو چاشنی ہوتی اس لذت سے آشنائی شاید ہی کسی دوسرے صاحب قلم کے یہاں ہو، مفتی صاحب کے بے شمار خطوط اس پر شاہد ہیں۔

ریڈیو پر تقریروں کا ایک مجموعہ جو لکھکر پڑھی گئیں "منارِ صدا" کے نام سے ڈاکٹر عنوان چشتی ریڈر جامعہ ملیہ دہلی نے مرتب کرکے شائع کیا ہے، تحریر ہی کی طرح تقریر پر بھی مفتی صاحب کو ملکہ حاصل تھا لمبے لمبے موضوعات پر بڑی دلکش بصیرت افروز اور فیصلہ کن اور دلوں میں گھر کر لینے والی انکی سیاسی، سماجی اور مذہبی تقریریں آج بھی لوگوں کے کانوں میں رس گھول رہی ہیں اور جنھیں سنکر بہت سے لوگوں کی زندگی میں انقلاب آگئے۔

حضرت مفتی صاحب نے حیات مستعار کے دن دیوبند سے باہر، گجرات، بنگال اور دہلی میں گذارے، تینوں جگہوں سے انھیں قلبی انسیت تھی کلکتہ تو ہر سال مفتی صاحب کی آمد ہوتی اور پندرہ دن کے لگ بھگ ضرور قیام فرماتے اور ان پندرہ دنوں میں اپنے کو ایسا محسوس کراتے کہ "بسنے والے تو کلکتہ ہی کے ہیں"، چند دنوں رہنے کے لئے باہر چلے گئے تھے، کلکتہ والے بھی انھیں ٹوٹ کر چاہتے تھے، مہینوں پہلے سے ان کا انتظار اور تذکرہ شروع ہوجاتا جب آتے تو لوگ حاضر خدمت ہوکر نیاز حاصل کرتے ہی مگر حضرت مفتی صاحب بھی بعض مواقع پر مجبوری اور آخیر میں پیرانہ سالی کے باوجود بھی اسکی کوشش کرتے کہ خود بھی تشریف لے جاکر ملیں۔

لحاظ و مروت کا تو گویا "پیکر" تھے بعض شفقتیں خود آگے بڑھکر فرمادیا کرتے دارالعلوم دیوبند کے صد سالہ کے موقع پر شدید بیمار تھے ایک لمحہ کیلئے بھی جلسہ گاہ نہ جاسکے، خاموش گم صم پلنگ پر پڑے ہوئے تھے، دن بھر کچھ بھی نہیں کھایا بھوکے پڑے رہے جب ہم لوگ کمرے

ہیں واپس آئے تو اپنے نہ کھانے اور بھوکے رہنے کا اشارہ تک نہیں کیا، کسی طرح رات کو پتہ چلا تو حضرت مفتی صاحب کو یہ احساس کہ ''میری خاموشی کیوجہ سے یہ سارے بچے شرمندگی میں پڑے ہیں''

میں جب اپنی پگڑی جو مجھے ملی تھی لے کر قیام گاہ پر آیا تو آواز دی، بلایا اور پگڑی ہاتھ میں لیکر دیکھی اور میرا سر اپنی طرف کر کے اپنے ہاتھوں سے عمامہ باندھ دیا اور فرمایا ''تھوڑی دیر ایسے ہی باندھے رہو دیکھنے کو جی چاہتا ہے''۔

میرے والد محترم الحاج حضرت مولانا حکیم محمد زماں صاحب حسینی حضرت مفتی صاحبؒ کے پچاس سالہ نیاز مند ہیں حضرت مفتی صاحبؒ نے ۱۹۸۲ء تک اپنے دست مبارک سے ان کے نام بے شمار خطوط جن میں گھریلو معاملات، ملکی حالات، مذہب و سیاست کی باتیں انھوں نے ایک خاص انداز میں سپرد تحریر فرمائی ہیں ۔اس مضمون میں ان کے چند خطوط کے اقتباسات درج ہیں مفتی صاحب مرحوم کی زندگی کے چند گوشے بھی اجاگر ہوتے ہیں۔

مرحوم مفتی صاحب افراد و اشخاص کے بارے میں اپنی نپی تلی جنچی رائے رکھتے تھے اس کا اظہار زبان اور تحریر سے بھی کرتے تھے ذیل میں چند وہ نگارشات ہیں، جن میں انھوں نے بعض لوگوں سے اظہارِ تعلق کیا ہے ۔کلکتہ کے مشہور تاجر شیخ فیروزالدین مرحوم کے بارے میں انکی وفات پر ایک خط میں تحریر کیا ہے:

''کیا لکھوں، دل پر کیا گزری ؟ دل بے قرار ہو گیا آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے مرحوم کو مجھ سے جو غیر معمولی علاقہ تھا آپ اس سے بخوبی واقف ہیں یہ تعلق کم و بیش چالیس سال سے تھا، اور لیل و نہار کی کوئی گردش اس کو مضمحل نہیں کر سکی، فیروز صاحب اس دنیا میں نہیں لیکن ان کے کمالات اور غیر معمولی خصوصیات ہمیشہ یاد رہیں گے، کیسے باوضع شریف کشادہ دست و خندہ جبیں بزرگ تھے سچ تو یہ ہے کہ اپنی مثال آپ تھے''

ان کے چھوٹے بھائی خان بہادر شیخ محمد جان مرحوم کی وفات پر ایک خط میں لکھتے ہیں:

"مرحوم سے میرے تعلقات کی مدت نصف صدی کے قریب ہے اس طویل مدت میں بڑے بڑے نشیب و فراز رہے مگر ہمارے تعلقات میانہ روی کے انداز سے قائم رہے بہت لحاظ کرتے تھے سیاسی اور مذہبی دونوں اعتبار سے راسخ العقیدہ تھے، ان کے اٹھ جانے سے ایک دور کا خاتمہ ہوگیا" کلکتہ ہی کے ایک اور صاحب تاجر منیجر شیخ محمد یعقوب صاحب کی وفات پر لکھتے ہیں: مرحوم غیر معمولی خصوصیات کے امین تھے، تجربہ کار، فہیم، کام کرنے والے"

راقم الحروف کے دادا حضرت مولانا حکیم وزیر علی علیہ الرحمہ جو صاحب رشد و ہدایت بزرگ حاذق طبیب تھے انکی وفات پر تحریر فرماتے ہیں: مرحوم سے بارہا ملاقاتیں ہوئی ہیں ان کی بزرگی اور سادگی کا نقشہ آنکھوں میں گھوم رہا ہے"

انہی دنوں میرے خاندان میں یکے بعد دیگرے موت کے کئی حادثے ہوئے اس پر یوں تسلی کے کلمات تحریر فرمائے "آپ کی آشفتگی اور پریشانی کا قدرتی طور پر ہم لوگوں پر بھی اثر ہے اللہ تعالیٰ اطمینان میسر فرمائے گردش لیل و نہار سے تو مفر نہیں تاہم یقین ہے کہ یہ پریشانیاں عارضی ثابت ہونگی اور آپ جیسا مخلص زیادہ پامال نہیں ہوگا اپنا تجربہ تو یہی ہے کہ ناگواریوں اور تلخیوں کی تیز و تند ہواؤں اور گھٹا گھوپ اندھیروں کے بعد نسیم سحر کے نرم و سبک گام جھونکے بھی ضرور آتے ہیں بشارت ہے ان کے لئے جو دونوں حالتوں پر دامن صبر و شکر تھامے رہتے ہیں، میرے خسر ممتاز عالم دین خادم قرآن، حافظ مولانا محفوظ الرحمن صاحب نامی کی وفات پر تحریر فرماتے ہیں "مرحوم کی خوبیاں رہ رہ کر یاد آتی ہیں، عالم با عمل اور دھن کے پکے اور سچے مسلمان تھے، حق و صداقت اور آزادی ضمیر کی راہ میں بڑی بڑی تکلیفیں اٹھائیں ذہن رسا، اور تعمیری پایا تھا، قلب جذبات اسلامی سے معمور تھا اپنے رنگ کے ایک ہی شخص تھے، خواجہ محمد یوسف صاحب (جو اب کلکتہ ہائی کورٹ کے جج ہو چکے ہیں) جب ڈی، آئی آر میں ۱۹۶۵ء میں گرفتار ہوئے تو راقم الحروف کے نام ایک خط میں حضرت مفتی صاحب ارقام فرماتے ہیں: خواجہ صاحب کو کارڈ لکھ دیا ہے تعلق خاص رکھتے ہیں شاہ وصی الدین احمد صاحب کی

وساطت سے گذشتہ سال انھوں نے خاصے اہتمام سے جاپکر بھی بلایا تھا شاید تم بھی ساتھ تھے خواجہ صاحب سے میرا سلام کہئے بڑی خوبیوں کے شخص ہیں ایسے حضرات کو جیل کا تجربہ ہو اس سے قوم میں زندگی آتی ہے مگر حکومت کی بے سمجھی پر افسوس ہوتا ہے ایک سیکولر جمہوری نظام میں ایسے اقدامات افسوسناک ہوتے ہیں بہرحال حالات کا مقابلہ کرنا ہے"۔

آزاد ہند اخبار کے ایڈیٹر جناب الحاج احمد سعید صاحب ملیح آبادی سے گھریلو تعلقات اور خاندانی روابط تھے اکثر وبیشتر خطوط میں ان کا ذکر اور سلام موجود ہے ان کے بارے میں لکھتے ہیں : احمد سعید صاحب نے دلچسپ مضمون بنالیا خوب سلیقہ رکھتے ہیں ان سے سلام کہئے ایک دوسرے خط میں ہے احمد سعید صاحب سے آپکی خیریت مجملاً معلوم ہوئی تھی، اس دفعہ یہاں (دہلی) ان سے ملاقات نہ ہونے کے برابر رہی دہ ٹھہرے بھی کم، ان کے پاس جانے کا ارادہ تھا مگر کاموں کے ہجوم میں موقع نہیں ملا۔ کسی روز آپ نو سلام فرما دیجئے اور ملاقات کے اختصار پر اظہار افسوس" حضرت مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی مرحوم جب دہلی چھوڑ کر کلکتہ آگئے تو ان کی جدائی پر اظہار رنج وغم کرتے ہوئے مفتی صاحب تحریر فرماتے ہیں: "ملیح آبادی صاحب سے ملاقات ہوتی ہوگی بہت یاد آتے ہیں احمد سعید صاحب کی معرفت ان سے سلام کہلایئے"

جمیعۃ العلماء ہند کا سالانہ اجلاس الہ آباد میں ہوا جس میں خطبہ حضرت مفتی صاحب مرحوم نے دیا، اس کا تذکرہ کس قدر سادگی اور بے تکلفی سے کرتے ہیں لکھتے ہیں: "الہ آباد کا اجلاس بڑا ہی شاندار رہا خطبہ عام طور پر توقع سے زیادہ پسند کیا گیا اور پڑھنا اس سے زیادہ۔ منتظمین نے ایک "عبا" بھی دی آپ سے پوری بے تکلفی ہے اس لئے لکھ رہا ہوں جمیعۃ علماء کے سالانہ اجلاس میں ہمارے قومی چیتوں اور شیروں نے اپنی بے ہنگام گرج کے جو جوہر دکھائے اس کے احساس سے اب بھی تکلیف ہوتی ہے " اچھا ہوتا "مجاہد ملت" اس طرح کی تجویزوں کو ہم جیسے ٹھنڈے دماغ لوگوں کے حوالہ کر دیتے لیکن شاید اس گھر کی رونق ہنگامے پر ہی موقوف ہے۔

مجاہدِ ملّت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن رحمۃ اللہ کے انتقال کے بعد جمعیۃ العلماء ہند میں انتشار پیدا ہوا حضرت مفتی صاحب اسکی زد میں آگئے جو انکی افتادِ طبع کے خلاف تھا، مختلف خطوں میں پریشانی اور بیزاری کا اظہار یوں کیا ہے: جمعیۃ کی صدارت کا مسئلہ بیٹھے بٹھائے میرے گلے کا ہار بن گیا شدید روحانی اذیت محسوس کر رہا ہوں۔ مولوی سعید نے تو لکھا ہے "سرے سے جمعیۃ ہی چھوڑ دو اور نام واپس لے لو" واقعہ یہ ہے کہ اگر مجھے اطمینان ہو جائے کہ نام واپس لینے سے انتشار دور ہو جائے گا تو ایک منٹ کی دیر نہیں لگاؤں گا، ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں: صدارت کے مسئلہ نے کیسی عجیب صورت حال اختیار کی ہے اور آدمی بھی کس طرح مصیبت میں پھنستا ہے، تینتالیس سال جمعیۃ سے وابستگی کو ہو گئے ہیں اس پوری مدت میں کبھی بھی کسی منصب اور عہدے کا قلب میں "خطور" تک نہیں ہوا، حالات کے موڑ سے اثر پذیر ہو کر کسی صوبے نے میرے علم واطلاع کے بغیر ازخود نام پیش کر دیا بس کیا تھا قیامت برپا ہو گئی، ایک اور خط میں تحریر فرماتے ہیں! میں کوئی بات دل میں نہیں رکھتا کیونکہ "خاک میں عشاق کے غبار نہیں ہے" جمعیۃ علماء سے میرا تعلق عہدے کا نہیں خدمات کا ہے اور عمر کا بڑا حصہ اسی چھانی ہوئی خاک کو سر پر ڈالنے میں گذرا ہے" اسی سلسلہ میں ایک دوسرے خط میں رقمطراز ہیں: مجھ پر جمعیۃ کی موجودہ گروہ بندی کا حد درجہ ناگوار اثر ہے اس لئے مزاج میں قدرے تلخی آگئی ہے ؎

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

مالداروں کی دریوزہ گری سے حضرت مفتی صاحب کو شدید نفرت تھی اس سے بچنے کی کوشش کرتے تھے، خصوصیت سے تو اپنی ذات کے لئے اس کو عار ہی سمجھا، تحریر فرماتے ہیں بڑی مشکل یہ ہے کہ روپیہ کی قیمت گرتی جا رہی ہے اور ضروریات ہیں کہ بڑھتی جا رہی ہیں لیکن طوفان کی انہی موجوں سے گذر کر اپنا راستہ بنانا ہے اللہ تعالیٰ کارسازِ مطلق ہے بلاشبہ وہ ہماری اور ہمارے حالات کی اور ہماری ضرورتوں کی نگرانی فرماتے ہیں، دعا ہے اپنے بچوں کی دیکھ بھال

حسب منشا کر سکیں اور ارباب ثروت کے چہرے کے شکنوں سے بے نیاز ہو جائیں، اسی سلسلہ میں ایک اور خط میں تحریر فرماتے ہیں: آزاد معاش قدرت کا نہایت ہی گراں قدر عطیہ ہے اور اس "جام سفال" کے مقابلے میں "جام جم" کی کوئی حقیقت نہیں ہے"۔ ندوۃ المصنفین کے بارے میں حضرت مفتی صاحب کی خواہش رہی کہ ارباب کلکتہ نے ہی بیج ڈلوایا تھا اب وہی اسے شجر باردار بنائیں اس سلسلہ میں ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں: کلکتہ بڑی جگہ ہے اور جہاں تک ندوۃ المصنفین جیسے ادارے کے حلقوں کا تعلق ہے بہت سے غیر تاجر حضرات بھی اس میں شریک ہو سکتے ہیں اس کام میں سالک صاحب بھی خاصی امداد کر سکتے ہیں۔

بے جستجو ملے گا نہ اے دل سراغ دوست
تو کچھ تو قصد کر، تیری ہمت کو کیا ہوا

ایک خط میں مختلف پریشانیوں سے بھرپور حالات لکھتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: ان حالات میں غور فرمایئے ادارے کی گاڑی کو کھینچنا کوئی سہل کام ہے؟ حالات کی ناسازگاریاں شباب پر ہیں تاہم اپنی لباط کے مطابق اس مفید اور اہم تعمیری خدمت کے سروں کو تھامے ہوئے ہوں، سچ تو یہ ہے کہ بام حرم کے کبوتر مرغ رشتہ بریاں کے تڑپنے کا اندازہ کر ہی نہیں سکتے"۔ ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں: حکیم صاحب محترم! واقعہ یہ ہے کہ آپکے اس ادارہ کی مثال نہ ہندوستان میں ہے اور نہ پاکستان میں جب کبھی اس کے علمی کارناموں کی تاریخ لکھی جائے گی تب لوگوں کو اندازہ ہوگا کہ ایک معمولی انسان نے ملت کیلئے کیا کام کیا؟ لیکن یہ سب باتیں اس وقت سامنے آئیں گی جب دنیا میں میں نہیں رہوں گا۔ حضرت مفتی صاحب نے دنیا کے بیشتر حصوں کا سفر کیا ہے جہاں بھی گئے وہاں اس ملک کا تاریخی، سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی جائزہ لیا اور مطالعہ کیا والد صاحب محترم کے نام بعض خطوط میں اس طرح کی بھی تحریریں ہیں، سفر روس سے واپسی پر ایک خط میں رقمطراز ہیں: یہ واقعہ ہے کہ رشین گورنمنٹ نے معاشی اور اقتصادی مسائل کو جس انداز سے حل کیا ہے اس کے نتیجہ میں بے روزگاری کے مصائب تقریباً ختم ہو گئے ہیں روزگار کام کرنیوالوں

کو آواز دیتا ہے، کسی چیز میں ملاوٹ کا نام نہیں ہے ضروریات زندگی کے حصول میں کوئی دشواری نہیں ہے جبر و قہر کا دور گذر چکا ہے سب لوگ اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں مذہبی حالت بھی پہلے سے بہتر معلوم ہوتی ہے ملک کی ترقی میں سب ہی شریک ہیں مذہب اور طبقے کی بنیاد پر کسی کے ساتھ کوئی امتیاز نہیں ہے اب علماء کی ذمہ داری یہ ہے کہ مذہب کی روحانی قدروں کو دل پذیر قالب میں بیان کریں، سعی و جہد کے فضائل و برکات ظاہر کریں اور یہ کہ مذہب معاشی اور اقتصادی ترقیات کے لئے کوئی رکاوٹ نہیں ہے " لیس للانسان الا ما سعیٰ " قرآن پاک کا دائمی اصول ہے، اسلام کو بے عملی اور جمود سے بیر ہے مگر ہمارے یہاں تو مذہب کی پیروی کا کچھ اور ہی مطلب ہے۔"

اس کے بعد ہندوستانی مذہبی ذہن کی عکاسی کرتے ہوئے حضرت مفتی صاحب لکھتے ہیں:

بے فکر تو اس وقت صرف خانقاہیں ہیں اور تعویذ گنڈے کے مرکز ہیں بے پناہ آمدنی اور بے حساب خرچ ــــ عقل حیران ہے کہ یہ کیا ہو رہا ہے کمال یہ ہے کہ دینے والے لاکھوں روپئے دے رہے ہیں اور اسی کو سب سے بڑا کار خیر سمجھتے ہیں مقصد کسی پر اعتراض نہیں، سوال یہ ہے کہ کیا مسلم قوم اسی کام کے لئے رہ گئی ہے؟ میری رائے میں تو یہ لچھن پنپنے کے نہیں ہیں، مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ قوم کی درماندگی اور پس ماندگی کی نشانی ہے۔

حضرت مفتی صاحب کے مذکورہ بالا چند خطوط کے اقتباس سے مفتی صاحب کے ایک خاص گوشۂ فکر اور حالات زندگی سامنے آتے ہیں نیز حضرت مفتی صاحب نے والد محترم سے کس قدر سادہ اور بے تکلف گیرائی اور گہرائی سے بھرپور تعلق عرصہ دراز تک رکھا اور نبھایا ہے اس کا اندازہ لگانے کے لئے بھی مذکورہ بالا اقتباسات کافی ہیں . . .

مفتی صاحب کی یادیں

تحریر: الحاج احمد سعید ملیح آبادی (مدیر آزاد ہند کلکتہ)

مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی صاحب اپنے دم سے ایک عہد تھے وہ اپنی ذات سے خود ایک انجمن اور ادارہ تھے دہلی میں "ندوۃ المصنفین" کے نام سے انھوں نے جو علمی ادارہ قائم کیا اس نے دین و ملت کی زبردست خدمت انجام دی۔ اس ادارے سے بہت سی عمدہ، مفید اور قیمتی کتابیں شائع کی گئیں "ندوۃ المصنفین" صرف ایک اشاعتی ادارہ نہیں رہا، مفتی صاحب کی حیات میں یہ علم و فضل کا ایک مرکز بھی تھا، جہاں علماء و فضلاء کی نشستیں اور مجلسیں جمتیں۔ مفتی صاحب مرحوم کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا ادنیٰ سے اعلیٰ تک سب ان کے تعلقات یکساں گہرے اور مخلصانہ ہوتے تھے، مفتی صاحب سے ملنے "ندوۃ المصنفین" میں بڑے بڑے لوگ آیا کرتے اور مفتی صاحب بھی لوگوں سے ملنے جاتے کبیر و تکلف چھو نہیں گیا تھا، سادہ زندگی، ہر کسی کے ساتھ خوش کلامی، مرنجان مرنج نکتہ رس معاملہ فہم، دقیقہ سنج، شگفتہ مزاج، علوم دینیہ پر گہری نظر، نپی تلی رائے، ملکی اور قومی حالات سے پوری طرح باخبر، صرف دُور کے تماشائی نہیں خود بھی سیاست کے بحر ذخار کے شناور، اعلیٰ پائے کے خطیب، مجلسی گفتگو میں اپنے ملائم اور نکتہ رس انداز کلام سے چھا جانے والے اور دلوں کو موہ لینے والے، بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں۔

مفتی صاحب کے ساتھ میرا بھی نیازمندانہ اور عزیزدارانہ تعلق تھا، مرحوم ہمیشہ شفقت کا برتاؤ رکھتے تھے والد مرحوم مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی اور مفتی صاحب مرحوم کے بیچ گہرے

دوستانہ اور مخلصانہ تعلقات تھے، بعض امور میں ہم رائے نہ ہونے کے باوجود دونوں ایک دوسرے کی محبت میں سرشار تھے اور باہمی احترام واعتماد کا جذبہ رکھتے تھے ۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۸ء تک مولانا ملیح آبادی مولانا ابوالکلام آزادؒ کے ساتھ دہلی میں رہے، ان دنوں ملیح آبادی صاحب انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز کے عربی مجلہ "ثقافۃ الہند" کو ایڈیٹ کرتے تھے اور آل انڈیا ریڈیو کے عربی یونٹ کو دیکھتے تھے، جامع مسجد دہلی میں نماز جمعہ کے بعد مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کے ہاں علماء وفضلاء کی محفل جمتی، کبھی کبھی دوپہر کا کھانا بھی وہیں ہوتا جس کا اہتمام قاضی سجاد حسین صاحب کرتے، عصر تک یہ مجلس رہتی پھر سب رخصت ہو جاتے،

والد مرحوم ملیح آبادی کے تعلق سے میرے ساتھ مفتی صاحب کا برتاؤ اسی بنا پر مربیانہ اور مشفقانہ تھا، دہلی جانا ہوتا تو مفتی صاحب کو سلام کرنے حاضری دینا ضروری تھا بارہا اصرار کر کے کھانا ساتھ کھلاتے، گھر بار کے احوال دریافت کرتے احباب اور واقف کاروں کی خیریت پوچھتے ملکی اور قومی مسائل پر گفتگو فرماتے یہ احساس نہ ہونے دیتے کہ ہمارے درمیان خوردی اور بزرگی کا رشتہ ہے پوری توجہ سے بات سنتے بات کو اہمیت دیتے رائے مختلف ہوتی تو اس کا اظہار بڑے ہی نفیس اور سلجھے ہوئے انداز میں کرتے تاکہ خود اعتمادی کو ٹھیس نہ لگنے پائے اور کسی تنقید کو بھی خندہ پیشانی سے برداشت کر لیتے، کسی بات سے درگذر کرنا ہوتا تو ایک لمبی سی "جی ہاں" کہکر خاموش ہو جاتے، تخاطب میں کبھی "تم" کا صیغہ استعمال نہ کیا، ہمیشہ آپ کہکر خطاب فرماتے (بزرگ اپنے چھوٹوں کو ادب اسی طرح سکھاتے تھے کہ پہلے خود ادب کرتے تھے) رخصت کرنے دالان سے اٹھ کر دروازے تک پہنچانے آتے کیا شفقت تھی، کیا انکساری تھی، —— مرحوم کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک تھی، جو ذہانت کی علامت تھی۔ اپنے دوست مولانا ملیح آبادی کو یاد کر کے ہمیشہ ہی ایک لمبی ٹھنڈی سانس ضرور لیتے اس وقت انکی آنکھوں کی چمک کچھ اور بڑھ جاتی ایسا لگتا کہ ساری محبت امنڈ کر آنکھوں میں اتر آئی ہے، —— جون ۱۹۷۵ء کی بات ہے ایمرجنسی لگی اور ساتھ ہی اخباروں پر سنسر بیٹھا تو اس وقت دہلی سے تمام ایڈیٹروں کا بلاوا آگیا دہلی پہونچے

تو دیکھا، دہلی بھائیں، بھائیں کر رہی ہے، ہر طرف سناٹا، ہُو کا عالم گرفتاریوں اور سخت گیری کی دہشت طاری اسی عالم میں جامع مسجد کے علاقے میں جانا ہوا تو وہاں بھی ایسی ہی کیفیت پائی، مفتی صاحب کے ہاں بھی ماحول بدلا ہوا تھا، تنہا بیٹھے تھے، دیکھ کر خوش ہو گئے، اسی بیچ میں محمد یونس خاں کا ٹیلی فون آگیا اور ان کے ساتھ مفتی صاحب کی تیز لہجے میں جو گفتگو ہوئی وہ ایمرجنسی کے ماحول سے جدا کوئی چیز تھی، مفتی صاحب اپنے کئی ساتھیوں کی گرفتاری اور نظر بندی پر سخت برہم تھے اور یونس خاں کو زور زور سے پھٹکار رہے تھے کیونکہ وہ مسز گاندھی اور سنجے گاندھی سے بہت قریب تھے جب ہر کسی کو اپنی اپنی پڑی تھی کوئی نہیں جانتا تھا کہ خود وہ کب پکڑ لیا جائیگا اور ایمرجنسی لگائی اسی لیے گئی تھی کہ زبان بندی ہو، حکومت کے خلاف تحریر و تقریر اور سیاسی سرگرمی سب بند، مگر ایک بوڑھا، کمزور اور ناتواں مولوی اپنے ٹھکانے پر تن تنہا بیٹھا حکومتِ وقت کو آنکھیں دکھا رہا تھا، اور کڑے لہجے میں سخت و سست کہہ رہا تھا یہ تھی شان مفتی عتیق الرحمن کی، یہ جرأت، یہ بے باکی، یہ حق گوئی اور شانِ بے نیازی اسی انسان میں پیدا ہو سکتی ہے جو سچا اور کھرا ہو، جس کے اندر ایمان کی حرارت ہو اور قوم و وطن کے جذبے سے دل لبریز ہو مفتی عتیق الرحمن کا تعلق بنیادی طور پر جمعیۃ العلماء ہند سے تھا کیونکہ وہ دار العلوم دیوبند سے تعلق رکھتے تھے استقلالِ وطن کی خاطر جاں بازی انھیں اپنے خاندان اور بزرگانِ دین سے ملی تھی، جنگ آزادی کے وہ ایک نڈر سپاہی تھے، مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمن کے رفیقِ کار بلکہ دستِ راست تھے، ۱۹۴۷ء کے دور ابتلاء و آزمائش کے بعد گلی قاسم جان میں جمعیۃ العلماء ہند کا دفتر مظلوموں کے کیمپ میں تبدیل ہو چکا تھا جس میں مولانا حفظ الرحمن صبح سے رات گئے تک مسلسل کام کرتے لگاتار بولتے اور بگڑتے الجھتے رہتے اس وقت مفتی صاحب انکی تقویت اور صلاح کاری کے لئے پاس موجود رہتے اکابرینِ قوم و ملت سے مفتی صاحب کے گہرے تعلقات تھے، مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو مولانا ابو الکلام آزاد، لال بہادر شاستری، ڈاکٹر راجندر پرشاد، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں۔

رفیع احمد قدوائی، شیخ محمد عبداللہ، فخرالدین علی احمد، مسز اندرا گاندھی وغیرہ سے مفتی صاحب کے قریبی تعلقات تھے اور یہ حضرات انکی عزت کرتے تھے اور انکی رائے پر سنجیدگی سے دھیان دیتے تھے، ایک مرتبہ سرینگر میں شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ ملکی و ملی حالات پر میری تفصیلی گفتگو ہو رہی تھی بات چیت میں کوئی ایسا سوال آیا جس کا فوری جواب شیخ صاحب کی سمجھ میں نہیں آیا تو فرمایا دہلی جاؤں گا تو مفتی صاحب سے مل کر بات کروں گا اور طے کروں گا۔"

مفتی صاحب کی وفات پر وزیراعظم مسز اندرا گاندھی نے جو تعزیتی پیغام جاری کیا تھا اس میں یہی جذبات موجود تھے علالت کے دوران بھی مسز گاندھی برابر مزاج پرسی کرتی رہیں اور آل انڈیا میڈیکل اینڈ سائنس ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں کچھ عرصہ رکھکر ان کا علاج بھی کروایا آخر ۸۳ سال کی عمر میں قضانے اپنا کام کیا اتنی عمر آدمی کے جینے کے لئے بہت سمجھی جاتی ہے مگر کام کے آدمی کے لئے یہ عمر بھی طبعی نہیں اور اس کے اٹھنے سے کارِ جہاں میں خلل واقع ہو جاتا ہے۔

مفتی صاحب مرحوم ملت بیضا کی شمع تھے ان کے رخصت ہونے سے یہ ایک روشن چراغ بھی گل ہوا اندھیرا اور بڑھ گیا، ان کے دم قدم سے دنیائے علم وادب میں جو رونق تھی وہ سونی پڑ گئی۔ ایک قیمتی متاع تھی جسے موت ساتھ لے گئی، ملت مسلمہ کا یہ ناقابل تلافی نقصان ہوا جب ان کی سب سے زیادہ ضرورت محسوس ہو رہی تھی تب ہی وہ نہ رہے مسلم مجلس مشاورت کے صدر کی حیثیت سے مفتی صاحب نے اپنے بس بھر ملت کی خدمات کی بعض وجوہ سے مسلم مجلس مشاورت کی کارکردگی کا دائرہ وسیع اور موثر نہ ہو سکا مفتی صاحب کو شدت سے اس کا احساس تھا انھیں ایک ایسے پلیٹ فارم کی ضرورت تھی جہاں سے وہ ملت مسلمہ کی شیرازہ بندی کر سکیں جمعیۃ علمائے ہند میں گروہی سیاست کی وجہ سے اسکے دروازے ان پر ہمیشہ کے لئے بند ہو چکے تھے کچھ عرصہ وہ جمعیۃ کے کارگذار صدر کی حیثیت سے کام کرتے رہے مگر یہ بندوبست چل نہ سکا اور انھیں کنارے ہونا پڑا جمعیۃ کی گروہی سیاست سے مفتی صاحب کو رنج تو بہت تھا مگر اس کا اظہار کبھی کھل کر نہیں کرتے تھے اور نہ کسی شخص کے بارے میں کوئی ایسی بات زبان

سے نکلتے جو اس شخص اور مفتی صاحب کے اپنے مقام و مرتبہ کے خلاف ہو۔

ایک مرتبہ مسلم مجلس مشاورت کے بارے میں گفتگو چلی تو مفتی صاحب نے اس حقیقت کو تسلیم کیا کہ وہ ایک ایسی تنظیم کے صدر ہیں جسکا عملاً کوئی وجود نہیں مجلس مشاورت میں شریک ہر جماعت اس پلیٹ فارم کو صرف اپنی مقصد براری کیلئے استعمال کرتی ہے اور اس سے زیادہ سروکار نہیں رکھتی۔ ان دونوں جماعت اسلامی کی سرگرمیاں بڑھی ہوئی تھیں اور جماعت نے مجلس مشاورت کے پلیٹ فارم اور اسکے مقتدر و محترم صدر کی ذات سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی کوشش کی بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ استحصال کیا ایمرجنسی اٹھنے کے بعد جماعت اسلامی کے تعلقات آر ایس ایس اور آنند مارگ کے ساتھ گہرے ہو گئے تھے، اسکی وجہ سے مفتی صاحب کو ایک مستقل ذہنی کوفت تھی اور انھیں تکلیف اٹھانا پڑتی تھی مفتی صاحب ایسے وضعدار آدمی تھے کہ اس تکلیف دہ صورت حال کو بھی ضبط و تحمل سے برداشت کرتے رہے وہ ان لوگوں میں نہیں تھے جو بات بات پر ترک تعلق کر کے الگ کھڑے ہو جاتے ہیں مفتی صاحب آخر تک اصلاح حال کی کوشش کرتے رہے اور کامیاب ہوئے جماعت اسلامی والوں کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور وہ آر ایس ایس اور آنند مارگ کی کھلی دوستی سے تائب ہو کر ٹھنڈے پڑ گئے۔

مفتی صاحب نے اپنی پبلک زندگی کا آغاز کلکتہ سے کیا تھا اور زندگی بھر کلکتہ کو نہیں بھولے غالب کی طرح مفتی صاحب کو بھی کلکتہ تمام عمر عزیز رہا، اور اسکی یاد ان کے دل میں باقی رہی غالب کو تو ایک بار کے سوا دوبارہ کلکتہ آنا نصیب نہ ہوا، مفتی صاحب سال کے سال کلکتہ ضرور آتے بیمار اور کمزور ہوتے تب بھی کلکتہ آجاتے اور یہاں آکر آرام و سکون محسوس کرتے کولوٹولہ میں حاجی مقبول احمد صاحب (سگریٹ والوں) کے گھر اترتے اور وہاں مہمان کے بجائے اپنے گھر کی طرح سکون سے رہتے، احباب سے فرداً فرداً ملنے ان کے گھر یا دفتر جاتے مولانا حکیم محمد زماں صاحب حسینی کا مطب مستقل نشست گاہ بنتی جن دنوں مفتی صاحب کلکتہ میں مقیم ہوتے تو حکیم صاحب

کا مطب احباب اور عقیدت مندوں سے بھرا رہتا ایک اٹھتا تو چار آکر بیٹھ جاتے ہر قسم کی مجلسی گفتگو ہوتی پرانی یادیں تازہ ہوتیں اور لوگوں کو مفتی صاحب سے استفادہ کرنے کا موقع ملتا یہ سلسلہ سال بہ سال جاری رہا اور اس وقت منقطع ہوا جب فالج کے عارضے سے معذور ہو کر انھیں دہلی میں صاحب فراش ہو جانا پڑا ہم لوگ کہتے بھی کہ "مفتی صاحب اب اس عمر میں اور بیماری کی نقاہت میں آپ اتنا لمبا سفر کر کے نہ آیا کریں" فرماتے "یہاں آکر ہی تو میں تازہ دم ہوتا ہوں" مفتی صاحب نہیں رہے مگر انکی باتیں رہ گئیں ہیں جو کبھی ختم نہ ہوں گی کچھ لوگ دنیا میں اپنے پیچھے اتنا کچھ چھوڑ جاتے ہیں کہ ان کی یاد مٹائے نہیں مٹتی۔ آنکھیں اب بھی انھیں ڈھونڈتی ہیں اور ان کی ضرورت اب بھی شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ خاص کر ان دنوں میں جب ہوا زیادہ گرم ہو جاتی ہے مفتی صاحب کی رفاقت اور قیادت بہت یاد آتی ہے دل اندر سے پکار اٹھتا ہے" کاش مفتی صاحب اس وقت ہوتے تو ان کے پاس چلتے، وہ آڑے وقت میں کام آتے ملت کی کشتی آج بھی بھنور میں ہچکولے کھا رہی ہے' ناخدا نہ رہا،،

محمد سلیمان ظفر القاسمی

ان کی ذات سے وابستہ جو ایک "برہان" ہے
اسکو قائم و دائم رکھنا اب ہمارا کام ہے

جان بھی دیدیں گے ہم اس ادارہ کی بقا کے واسطے
جس کا رہبر جس کا قائد آج "عمید الرحمن" ہے

آؤ مل کر آج باہمی اتحاد ہم قائم کریں
عمر بھر کرتے رہیں یوں خدمت "برہان" ہے

یہ دعا ہے آج ہر طالب ظفر میں
کامیابی، کامرانی یوں باہمی قائم رہے

مفتی صاحب کی یاد میں

پرنس ڈاکٹر یوسف نجم الدین[1] مرحوم

ہندوستان اور پاکستان میں اُن کے جاننے اور ماننے والے تو لاکھوں کی تعداد میں ہیں، لیکن کم لوگوں کو اندازہ ہوگا کہ مفتی عتیق الرحمن عثمانی کے اُٹھ جانے سے مسلمانانِ ہند کی زندگی میں کون سا کس قسم کا خلا پیدا ہوگیا۔

مفتی صاحب اُن علمائے دین کے وارث تھے جن کے نزدیک دین فروعی اختلاف اور فقہی نزاع کا نام نہیں رہا ـــــ وہ ارکانِ دین کی شرکت و اتفاق پر نظر رکھتے تھے۔

مفتی صاحب مرحوم اسلامی تاریخ کے اُن علمائے سَلَف کی ایک زندہ یادگار تھے جو مسلمانوں کے عروج و زوال کے رموز سے آگاہ ہو چکے تھے اور خوب سمجھتے تھے کہ وہ کیا اسباب و علامات ہیں جن سے حذر لازم ہے اور جن سے محتاط ہوکر چلنے میں حالاتِ حاضرہ کا سامنا کیا جاسکتا ہے۔

مفتی صاحب شرعی احکام اور فتاویٰ کو اپنی شخصیت اور اَنا کے فروغ کے لئے نہیں، بلکہ دین کے استیلا اور استقرار کے لئے لازم گردانتے تھے۔

زندگی کے کم و بیش چالیس سال انھوں نے فتاویٰ لکھے اور نہ صرف "استفسار کے باب" کو مطمئن کیا بلکہ حامیوں اور مخالفوں میں بھی اپنے بے غرض اور بے نفس ہونے کو تسلیم کرالیا۔

[1] افسوس کہ اس مضمون کی اشاعت سے پہلے پرنس ڈاکٹر یوسف نجم الدین کا انتقال ہوگیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون ۔ ر (عبید الرحمن عثمانی)

مفتی صاحب ایک نہایت اصولی، راست گو، راست باز، حق پسند اور مرنجاں مرنج طبیعت کے نیک سیرت بزرگ تھے۔ سلامتِ طبع کی نعمت انھیں وافر ملی تھی اور اسی سبب سے وہ مخالفت کے طوفان اور حالات کے ہیجان میں بھی کبھی تناسب و توازن سے محروم نہیں ہوتے۔

مفتی صاحب مرحوم اپنوں اور بیگانوں کو کھلے دل سے داد دینے میں بڑے فیاض واقع ہوئے تھے۔ طلاقۃ الوجہ (چہرے کی بشاشتی) ایمان کی نشانیوں میں سے ہے۔ مفتی صاحب کو یہ نشانی، بلکہ روشن نشانی میسر تھی جس کی برکت سے وہ وہ اہلِ علم، اہلِ قلم اور دیندار جو بعض اوقات ان سے اختلاف بھی کرتے تھے اُن کی اِس خوبی سے ضرور متاثر ہوتے تھے، مفتی صاحب کے دل میں کسی سے کینہ نہ تھا اور یہی ایک وجہ کافی تھی طلاقۃ الوجہ کے لئے۔

مفتی صاحب کی ایک بڑی صفت یہ تھی کہ وہ خوب و زِشت، سفید و سیاہ، دائیں اور بائیں جانب، سب طرف نظر رکھتے تھے۔ کسی سمت پر ان کی آنکھیں بند نہ تھیں۔ وہ حج و زیارات کے لئے گئے۔ علمائے باعمل کی صحبت سے مشرف رہے۔ اور سوویت یونین کے معروف لامذہب مرکزوں کی سیر کی۔ وہاں بھی انھوں نے نگاہ کھلی رکھی اور سیاحت کے بعد اپنے تاثرات اِس خوبی سے ظاہر کیے کہ دوست دشمن سبھی کو غور کرنا پڑا۔ اُن کی نیت پر کسی صاحب نظر نے کبھی شبہ نہیں کیا۔ اُن کی شخصیت ترغیباتِ دنیاوی سے بلند تھی۔ یہ بھی ایک وجہ تھی کہ وہ کسی سیاسی پارٹی سے باضابطہ منسلک نہیں ہوئے۔

مفتی صاحب مرحوم اختلافی مسائل میں اپنا وزن صلح پسندی اور معاملہ فہمی کی جانب رکھتے تھے۔ یہ انسانی بلکہ ایمانی صفت ان کی ذات میں یقیناً

اپنے والدِ بزرگوار (مفتی عزیزالرحمٰن) کا ورثہ رہی ہوگی، جن کے بارے میں محبت و عقیدت نے کافی کچھ لکھا ہے، تاہم ۱۹۴۷ء کے بعد کے حالات نے اِس صفت کو اور بھی چمکا دیا تھا۔ "مفتی" ہونے کی بدولت وہ نزاعی اور اختلافی مسائل میں فیصلہ کن شخصیت کا درجہ رکھتے تھے، لیکن ان کا فیصلہ یا فتویٰ ہمیشہ ایسی صورت حال کی نشان دہی کرتا تھا جس میں صلح صفائی کی راہ نکلتی ہو۔ وہ صدقِ دل سے عموماً سبھی جاننے اور ماننے والوں کے لئے اور خصوصاً ہندستانی مسلمانوں کی خاطر اپنی ذات اور ذاتی مفاد کو ذاتی حیثیت دے کر دوسروں کی اَنا کی تسکین کرتے اور اتحاد و اتفاق کی راہوں کو روشن کر دیا کرتے تھے۔

مفتی صاحب کم سے کم الفاظ کے آدمی تھے۔ کھانے پینے میں، سونے میں، لب کشائی کرنے میں، خرچ کرنے میں، اپنی ناگواری اور خوشی کے اظہار میں وہ بہت ہی محتاط انسان تھے۔ شاید ہی کسی نے اُن کو حدود سے گزرتے دیکھا یا سنا ہو۔

۱۹۴۷ء میں مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی مرحوم کے مکان، اثاثۃ البیت اور ادارہ "بُرہان" پر جو مصیبت آئی، جو کچھ بربادی انھوں نے سہی، سالہا کی محنت مشقت کا جو حاصل تباہ ہوا، اس کے بعد صبر و قناعت، ہمت و استقامت کا دامن جو انھوں نے تادمِ آخر تھامے رکھا ــــ وہ کچھ انہی کا حصہ تھا۔ وہ ذاتی مسائل اور مصائب کا بیان زبان پر لانا پسند نہیں کرتے۔ خدا جانے کن کن مشکلات سے دوچار ہوئے ہوں گے لیکن اُن کی استقامت دیکھ کر دوسروں کو حوصلہ ہوتا تھا۔ خوف و حزن کی تاریکی دُور ہوتی تھی۔

ہمارے خاندان اور مفتی صاحب کے درمیان ایک پرخلوص رشتہ کم و بیش چالیس سال پہلے قائم ہوا اور، مسلک کے اختلاف کے باوجود کوئی لمحہ ایسا نہیں

آیا جس میں ہم نے ایک دوسرے سے بے تکلف تبادلۂ خیال نہ کیا ہو اور اتفاق و اتحاد کی راہ نہ مل گئی ہو۔ وہ ہمارے دفتر (بدری محل، بمبئی) اور مکان سیفی محل میں تشریف لاتے۔ علمی مجالس میں شریک ہوتے۔ اپنی لب کشائی سے ہر محفل کو وقار بخشتے اور ہمارے بزرگوں کا احترام کرتے۔ خورد و کلاں سبھی ان کی صحبت سے فیض یاب ہوا کرتے تھے۔ بمبئی میں سیکڑوں اہلِ ثروت اور اربابِ تجارت اُن کے مُرید و معتقد تھے، مگر وہ سادگی کے ساتھ مہماں نوازی قبول کرتے اور اگر دو دن بھی یہاں قیام رہتا تو وضعدار بزرگوں کی آن برقرار رکھتے ہوئے کم از کم ایک وقت کا ماحضر ہمارے ساتھ تناول فرماتے۔ یہی وقت ہوتا تھا جب ان کی حسِّ مزاح اور شگفتگیٔ طبع کا فیض ہم بھی اٹھاتے تھے۔ ان کی بے تکلفی میں احتیاط، برتاؤ میں مروت، نگاہ میں گہرائی طبیعت میں معاملہ فہمی اور مسائل میں دُور اندیشی آپ اپنی مثال تھی۔ کئی صفات کا ایک ذات میں اس طرح مجتمع ہوجانا اور مشکل کے وقت میں اس کا ظاہر ہونا۔ یہ ہے وہ دولت جو ان کی وفات کے ساتھ ہم سب نے کھوئی ہے اور ان کے بعد خلا کا احساس ہوتا ہے۔

مفتی صاحبؒ کی زندگی کے چند گوشے

از قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی

اسلام نے کسی شخص کی عظمت کا دار و مدار اس کے علمی و عملی کمالات، اللہ تعالیٰ سے اس کے متعلق اور اس کی دینی خدمات پر رکھا ہے چنانچہ فرمایا گیا

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ تم میں سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہو۔

تقویٰ کے معنی صاحب مرقاۃ ملا علی قاریؒ نے علم و عمل کی یکجائی کے لیے ہیں مگر اس کے ساتھ ہی، اسلام نے نسبی عظمت کا بھی انکار نہیں کیا ہے چنانچہ فرمایا گیا

الناس معادن کمعادن الذھب والفضۃ خیارھم فی الجاھلیۃ خیارھم فی الاسلام اذا فقھوا (الحدیث)	انسان بھی اپنے اوصاف و کمالات کے لحاظ سے سونے اور چاندی کی کانوں کی طرح ہیں۔ جو لوگ زمانہ قبل اسلام میں اپنے اوصاف کے لحاظ سے بہتر سمجھے جاتے تھے وہ زمانہ اسلام میں بھی بہتر سمجھے جائیں گے۔ بشرطیکہ دین میں سمجھ رکھتے ہوں۔

مقصد یہ ہے کہ انسان کی نسبی عظمت بھی اپنی جگہ مسلم ہے۔ اگرچہ وہ ایسے وقت معتبر ہوگی جب وہ دینی اعتبار سے بھی بلند مرتبہ ہو، یہ بات عقلی اعتبار سے بھی صحیح ہے۔ جن خاندانوں میں علم، عمل، شجاعت، ذہانت یا کوئی وصف باپ دادا‌ؤں سے چلا آتا ہو اولاد بھی اس سے ضرور حصہ پاتی ہے۔ کیونکہ فرد کی جسمانی یا روحانی صلاحیتیں بہتر ماحول ہی میں ابھرتی ہیں۔ بچہ جن لوگوں میں نشو و نما پاتا ہے ان ہی کے اوصاف و خصائل سے وہ متصف

ہوتا ہے۔ چنانچہ مثل مشہور ہے "شیر کا بچہ شیر ہی ہوتا ہے"

بہر حال اصل چیز تو دینی و روحانی صلاح ہے مگر اس کے پنپنے اور درجہ کمال تک پہنچنے کے لیے ماحول اور خاندان بہت کچھ مؤثر ہوتا ہے۔ خلافت کے لیے جو قریش خاندان کی شرط لگائی گئی اور فرمایا گیا،

لایزال ھٰذا الامر فی قریش ما بقی منھم اثنان۔	خلافت قریش ہی میں رہے گی جب تک ان میں دو آدمی بھی اس کی اہمیت رکھنے والے رہیں گے۔

تو اس کی وجہ یہی ہے کہ اس زمانہ میں خاندان قریش اپنی عزت و شوکت کے اعتبار سے سارے عرب میں ممتاز و مفتخر تھا۔

میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ انسان کو بنانے اور اس کے اخلاق و اعمال کو سنوارنے میں اور اس کو عزت و عظمت کے مقام پر پہنچانے میں اسلامی نقطۂ نظر سے بھی خاندانی اثرات کا بہت کچھ دخل ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ہمارے ممدوح حضرت مفتی صاحب بڑے خوش نصیب تھے۔ قرنوں پہلے کے بزرگوں سے تو مجھے اس وقت تعرض نہیں کرنا۔ البتہ سو برس پہلے کی تاریخ میں مفتی صاحب کے بزرگ آسمان علم و عمل پر روشن ستاروں کی طرح جگمگاتے نظر آرہے ہیں۔

آپ کے جد امجد حضرت مولانا فضل الرحمان صاحبؒ دیوبند کے ممتاز عالم اور دارالعلوم کے بانیوں میں سے ایک تھے، حضرت نانوتوی کے دست و بازو تھے اور دارالعلوم کے ابتدائی ارکان شوریٰ میں ان کا ایک امتیازی مقام تھا۔

مفتی صاحب کے والد بزرگوار، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمان صاحبؒ ہندوستان کے نامور عالم، ممتاز فقیہ، دارالعلوم کے مفتی اعظم اور آسمان سلوک و معرفت کے ایک نیر رخشاں تھے۔ آپ کے مرید ہندوستان اور بیرون ہند ہزاروں کی تعداد میں پھیلے ہوئے تھے۔ آپ کے ایک حقیقی چچا دارالعلوم کے ایک سابق مہتمم حضرت

مولانا مفتی عزیز الرحمان صاحب ہندوستان کے نامور عالم، ممتاز فقیہ، دارالعلوم کے مفتی اعظم اور آسمانِ سلوک و معرفت کے ایک نیرِ رخشاں تھے۔ آپ کے مرید ہندوستان اور بیرونِ ہند ہزاروں کی تعداد میں پھیلے ہوئے تھے۔ آپ کے ایک حقیقی چچا دارالعلوم کے ایک سابق مہتمم حضرت مولانا حبیب الرحمان عثمانی تھے جو عربی زبان کے بہترین ادیب اور شاعر، ممتاز مورخ اور فہم و تدبر کے لحاظ سے ملک کی مسلم شخصیت تھے۔ دوسرے چچا حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی تھے جو دارالعلوم کے صدر مہتمم، شیخ الحدیث، مفسر قرآن اور آخر میں پاکستان کے شیخ الاسلام کی حیثیت سے عالمی شہرت کے مالک رہے۔

ہمارے مفتی صاحب نے انہی بزرگوں کی آغوش میں تربیت پائی اور وہ ان کے علمی و عملی کمالات سے بہرہ اندوز ہوئے تھے۔ حضرت مفتی صاحب ان اسلاف کرام کے خلف صالح تھے۔ مگر انہوں نے کبھی ان کی قبروں کا سودا نہیں کیا۔ وہ اگر اپنے والد بزرگوار مسند بیعت و ارشاد پر بیٹھنا پسند کرتے تو بے شبہ ہزاروں لوگ ان کے آگے سر نیاز جھکا دیتے اور ان کے سامنے بھی تحف و ہدایا کی رقوم کے ڈھیر لگ جاتے مگر انہوں نے ہمیشہ اس سے احتراز کیا۔ انہوں نے ہمیشہ بزرگوں کی استخواں فروشی سے اظہار بیزاری کیا اور اپنی ذاتی صلاحیتوں سے کام لے کر اپنے لیے کامیابی کی راہ نکالنے کو پسند کیا۔

دورۂ حدیث میں انہوں نے امتیازی نمبر حاصل کیے، پھر دارالعلوم میں معین المدرسین اور نائب مفتی کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ مگر ڈابھیل پہنچ کر وہاں فقہ و حدیث کی اعلیٰ کتابوں کی تدریس کے ساتھ "مفتی" کی مسند بھی حاصل ہوئی اور وہاں اپنے فاضل چچا حضرت مولانا عثمانی اور شہرۂ آفاق استاد علامہ انور شاہ کشمیری کی صحبت سے بڑا فائدہ اٹھایا۔ اگر وہ مسند درس و افتاء پر قناعت کرتے تو کوئی شبہ نہیں کہ وہ اپنے بزرگوں کے مکمل جانشین ہوتے مگر انہوں نے اپنے لیے ایک دوسرا راستہ تجویز کیا ندوۃ المصنفین کی تاسیس: کچھ عرصہ بعد وہ نامور ساتھی حضرت مولانا سیوہاروی کے ساتھ کلکتہ رہے۔ یہ غالباً

مولانا ابوالکلام آزاد کے مشورہ سے ہوا۔ وہاں کی مرکزی مسجدوں میں دونوں نے درس قرآن جاری کیا پھر وہیں کے دوران قیام میں "ندوۃ المصنفین" کا خاکہ بنایا۔ کلکتہ کے بعض مخیر اصحاب نے ان کی مالی مدد کی۔ پھر دہلی آکر اپنے ساتھیوں مولٰنا سہواروی اور مولٰنا سعید احمد اکبرآبادی کے ساتھ (جو ان دنوں مدرسہ عالیہ فتحپوری میں مدرس تھے اور انگریزی کے امتحانات بھی دے رہے تھے) اس خاکہ میں رنگ بھرا۔ طبیعت میں ہمیشہ نظم و ترتیب اور سلیقہ و نفاست تھی، قرولباغ میں عیدگاہ سے متصل ایک چھوٹی مگر خوبصورت کوٹھی کرایہ پر لی۔ قیمتی فرش فروش سے آراستہ کیا۔ شیشہ کی کواڑوں والی خوبصورت الماریاں کمروں میں سجائیں خوبصورت جلدوں کی کتابیں جن پر سنہری حروف میں کتابوں کے نام لکھے ہوئے تھے ان شیشوں میں سے جھانک کر دیدۂ و دل کو کھینچتی تھیں۔

اندر کے دالان میں تین چار نشستیں فرش پر قائم کی گئی تھیں جن پر رفقاء دارالمصنفین جلوہ افروز ہوتے حضرت مولٰنا حفظ الرحمان سہواروی، رفیق اعلیٰ کی نشست درمیان میں تھی۔ ادھر ادھر مولٰنا سعید احمد اکبر آبادی مدیر برہان، حضرت مولانا بدر عالم میرٹھی مولٰنا حامد الانصاری غازی، مولٰنا عبدالرشید نعمانی اور اس خاکسار کی نشست تھی۔ مجھے انہوں نے بالکل شروع ہی میں رفاقت مجلس کی دعوت دی تھی میں مستقل طور پر تو نہیں مگر مہینے میں کئی کئی روز وہاں رہتا اور رفقاء کرام کی علمی و ادبی و مجلسی صحبتوں سے محظوظ ہوتا۔

مفتی صاحب کے حسن انتظام و تدبر اور مولٰنا سہواروی کی علمی و سیاسی شہرت کی وجہ سے ندوۃ المصنفین بہت جلد ہندوستان میں مشہور ہوگیا۔ ابناء دارالعلوم نے دارالعلوم کے ایک ضمنی ادارہ کی حیثیت سے اس کا پرجوش خیر مقدم کیا۔ اگرچہ دارالعلوم، حضرت شیخ الاسلام مولٰنا سید حسین احمد مدنی جیسے محدث جلیل اور شہرۂ آفاق ماہر سیاست کی رہنمائی میں ہندوستان کے علمی و دینی اداروں کا سرتاج تسلیم کیا جاتا تھا اور کوئی

شک نہیں ہندوستان کے مدرسوں میں ہر جگہ اس کے فیض یاب درس و افتار کی خدمات انجام دے رہے تھے اور جمعیۃ علماء ہند کے زیر علم آزادی ہند کی تحریک میں بھی پیش پیش تھے اور اگرچہ ذاتی طور پر تصنیف و تالیف سے بے تعلق بھی نہ تھے بلکہ ان کے ایک فرد (حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ) کی تصنیفات و تالیفات کی تعداد دوسرے علمی اداروں کی مجموعی تعداد سے افزوں تھی۔ مگر کوئی ایسا تصنیفی مرکز نہ تھا جہاں جماعتی طور پر تصنیفی کام کیا جاسکے۔ فرزندان دارالعلوم نے ندوۃ المصنفین کا اسی حیثیت سے خیر مقدم کیا اور بہت جلد علمی و دینی و تاریخی بلند پایہ کتابیں اس مرکز سے شائع ہوکر ملک میں پھیل گئیں۔

ندوۃ المصنفین نے ہر سال چار کتابیں اپنے معاونین کو مہیا کرنے کا اعلان کیا تھا۔ یہ کتابیں التزام کے ساتھ شائع ہوتی رہیں۔ اور اب حضرت مفتی صاحب کے انتقال تک ان کی تعداد ڈھائی سو سے زیادہ متجاوز ہوچکی تھی۔ ان میں حضرت مولانا سیوہاروی کی قصص القرآن اور اسلام کا اقتصادی نظام، مولانا سعید احمد اکبرآبادی کی فہم قرآن اور مسلمانوں کا عروج و زوال اور مولانا بدر عالم میرٹھی کی ترجمان السنۃ بہت مقبول ہوئیں میری بھی تین کتابیں نبی عربی، خلافت راشدہ اور خلافت بنی امیہ ابتدائی سالوں ہی میں شائع ہوئیں جو میری اولین قلمی کاوش ہیں۔ مگر بعد میں اپنے نجی علمی کاموں کی وجہ سے اس سلسلہ کو جاری نہ رکھ سکا۔ مگر حضرت مفتی صاحب اور ادارہ سے میرا تعلق برابر قائم رہا۔

ادھر مولانا سعید احمد اکبرآبادی جو ادارہ کے ترجمان مجلہ برہان کے شروع ہی سے مدیر قرار پائے تھے، ان کے نوجوان قلم کی جولانیوں نے برہان کو ملک کے صف اول کے ماہ ناموں میں شامل کردیا اور اس کے نظرات کی اہمیت اہل علم و نظر کے حلقوں میں تسلیم کی جانے لگی۔

جامعیت

حضرت مفتی صاحب سیاسی خیالات کے اعتبار سے کانگریسی تھے مگر ان کا حلقہ

احباب عام تھا جس میں مسلم لیگی، احراری اور بعد میں مسلم مجلسی سب ہی شامل تھے اور سب سے مفتی صاحب کے گہرے ذاتی تعلقات تھے۔

ندوۃ المصنّفین کے دفتر میں جب کانگریسی خیالات کے لوگ آتے تو ان سے گفتگو کے لیے مولانا حفظ الرحمٰن تجویز ہوتے اور جب مسلم لیگی حضرات آتے تو ان سے بات کرنے کے لیے مولانا بدر عالم صاحب کو تکلیف دی جاتی۔ دسترخوان سب کے لیے یکساں فراخ تھا۔ اس لیے ہر نقطۂ نظر کے لوگ مطمئن واپس جاتے۔

ندوۃ المصنفین کی نشاۃ ثانیہ

۱۹۴۷ء کے ہولناک فسادات سے ندوۃ المصنّفین محفوظ نہ رہ سکا۔ وہ شہر سے دُور غیر مسلم آبادی سے گھرا ہوا تھا۔ دفتر پر حملہ ہوا۔ اس کا خاصہ مالی نقصان بھی ہوا۔ مگر مولانا حفظ الرحمان کے سیاسی اثرات کی وجہ سے اس کا زیادہ تر اثاثہ منتقل کر دیا گیا۔ پاکستان جانے والے مسلمانوں نے جو مکانات خالی کیے تھے، جمعیۃ علماء کا ایک کام یہ بھی تھا کہ حتی الامکان انھیں مسلمانوں کو الاٹ کرائے۔ مفتی صاحب نے قرول باغ کی کوٹھی کو خالی کر کے جامع مسجد کے قریب دو شاندار مکانات (ایک دفتر کے لیے اور دوسرا اپنی رہائش کے لیے) الاٹ کرائے۔ یوں ندوۃ المصنفین اب جامع مسجد کے مرکزی علاقہ میں آگیا۔ مفتی صاحب نے اپنی حُسنِ تدبیر اور مولانا سیوہاروی کے اثرات سے کام لے کر دفتر کو نئے سرے سے منظم کیا اور نئے جوش و خروش سے دوبارہ کام جاری کر دیا۔ یہ مفتی صاحب کا دوسرا عظیم الشان کارنامہ ہے۔

سادگی و بے تکلفی:۔

مفتی صاحب کی ایک خاص صفت ان کی سادہ مزاجی، تواضع اور بے تکلفی تھی۔ ان کو کھانا پکانے اور مل جل کر کھانے کا طالبعلمی ہی کے زمانہ سے شوق تھا۔ ۱۹۴۷ء کے انقلاب سے دہلی کی شاہی جامع مسجد کے سامنے "نازہوٹل" والی عمارت میں "ادارہ شرقیہ" کے نام سے

ایک مرکز قائم تھا جس میں منشی فاضل وغیرہ کی پرائیویٹ تیاری کرائی جاتی تھی۔ مولانا محمد ادریس صاحب میرٹھی (حال صدر مدرس جامعہ عربیہ بنوری ٹاؤن، کراچی) اس کے کرتا دھرتا تھے۔ ہر جمعرات کو وہاں مخصوص احباب جمع ہوتے۔ مرغ ذبح کیا جاتا مولانا حفظ الرحمان اس کا گوشت بناتے۔ مفتی صاحب مصالحہ پیستے اور پکاتے۔ دوسرے رفقا بھی ہاتھ بٹاتے، کوئی آگ دہکاتا، کوئی برتن دھوتا۔ غرض حدیث میں جو واقعہ آتا ہے کہ کسی غزوہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام بکری پکانے بیٹھے تو کسی نے اس کی ذبح کی ذمہ داری لی۔ کسی نے کھال اتاری اور گوشت بنایا، کسی نے اسے پکایا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میں لکڑیاں جمع کر کے لاؤں گا اس کا پورا منظر نگاہوں کے سامنے آجاتا۔ مجھے بارہا اس مجلس احباب میں شرکت اور کام و دہان کی لذت کے ساتھ دل و دماغ کی فرحت حاصل کرنے کا موقع ملا ہے۔

یہ مجلس جمعہ کے دن ہی جمتی اور اس میں چائے کا دور چلنا۔ جب مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ تعالیٰ سفر یورپ و روس سے واپس آکر جامعہ ملیہ دہلی میں بیت الحکم بنا کر فروکش ہوئے تو وہ بھی جمعہ والی مجلس میں شریک ہوتے بلکہ حجۃ اللہ البالغہ کی اپنے مخصوص علمی و سیاسی انداز میں تعلیم بھی دیتے۔

حضرت مولانا کی سیر یورپ و روس وغیرہ نے، اور عالم اسلام میں مسلمانوں کی پس ماندگی اور ان کے اختلافات نے مولانا کے خیالات میں بڑا مد و جزر پیدا کر دیا تھا۔ ان کے مزاج میں بڑی یبوست اور نزاکت آگئی تھی۔ ذرا ذرا سی خلاف مرضی بات پر بگھر جاتے اور مخاطب کو مجلس سے اٹھا دیتے۔ مولانا بشیر احمد کٹھوری بڑے دلچسپ اور بذلہ سنج آدمی تھے بڑی متین اور سنجیدہ صورت بنا کر مولانا سے ایسے سوالات کرتے جس سے وہ چیں بہ جبیں ہو جاتے اور مجلس مذاکرہ معرکہ کارزار بن جاتی۔ مگر مولانا سندھی کا مزاجی تلاطم جلد ہی پرسکون بھی ہو جاتا اور پھر سنجیدگی سے اپنی گفتگو شروع کر دیتے۔

ابتدا میں ایک روز میں نے مولانا سے سوال کیا کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے شام میں دولتمندوں کے خلاف جو تحریک شروع کی۔ کیا اسے سوشلزم کی اساس نہیں قرار دیا جا سکتا۔ مولانا بے حد ناراض ہوئے اور حسب عادت مجھے مجلس سے اُٹھ جانے کا حکم ہوا۔ میں اٹھنے لگا مگر مولٰنا حفظ الرحمٰن نے مجھے اشارہ سے روک دیا۔ میں رُک گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد اس ناراضگی کا تدارک شروع ہوا۔ مجھ سے پوچھا گیا کہ میں کہاں رہتا ہوں میں نے عرض کیا۔ میرٹھ۔ تو فرمایا۔ میرٹھ آؤں گا تو تمہارے یہاں ہی ٹھہروں گا۔

مفتی صاحب کی سادگی اور بے تکلفی کا ذکر کر رہا تھا۔ اس قسم کے کئی واقعات میرے ذہن میں ہیں مگر بخوف طوالت نظر انداز کرتا ہوں۔

مفتی صاحب کی وضع داری :۔

مفتی صاحبؒ کی وضع داری بھی قابلِ ذکر ہے۔ جس سے ایک مرتبہ تعلقات ہو جاتے ان میں ذرا فرق نہ آتا۔

مولٰنا حفظ الرحمٰن مرحوم کے انتقال کے بعد جمعیۃ علماء ہند پر مولٰنا اسعد مدنی کا اقتدار قائم ہو گیا۔ مفتی صاحب عملی طور پر جمعیۃ سے بے تعلق ہو گئے تھے۔ میں جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ کا رکن تھا۔ پھر دار العلوم دیوبند کے حالیہ نزاعات میں میں اور مفتی صاحب مجلس شوریٰ میں مختلف صفوں میں تھے۔ مفتی صاحب پر اس کا اثر ہونا طبعی بات تھی۔ مگر ان کی وضعداری میں ذرا فرق نہ آیا۔ یہ ممکن نہ تھا کہ میں ندوۃ المصنفین کے دفتر میں جاتا اور مفتی صاحب چائے پلائے بغیر اٹھنے دیتے بلکہ خود بہ نفسِ نفیس جاتے اور گھر سے جو قریب ہی تھا یا دفتر کے سامنے ہوٹل سے خود ٹرے میں چائے لے کر آتے اور باصرار پلاتے۔

مرض الموت کے آخری زمانہ میں جب پلنگ سے اٹھنے کی طاقت نہ تھی، میں بغرض عیادت گھر پہنچا۔ اندر بلا لیا گیا۔ دیکھا تو ناک پھول رہی تھی۔ چہرہ متورم

تھا۔ بات کرنی دشوار تھی۔

مگر باصرار بٹھایا۔ اہل خانہ کی خیریت معلوم کی اور وہیں چائے منگا کر پلائی۔

حضرت مفتی صاحب کے بہت سے اوصاف و کمالات حافظہ کے پردہ پر ابھر رہے ہیں۔ مگر حالات کی ناسازگاری، طبیعت کی ناسازی اور وقت کی تنگی کی وجہ سے میں سلسلۂ بیان کو مجبوراً ختم کرتا ہوں۔ بہرحال

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

۲۴ر جون ۱۹۸۷ء

حضرت کی یاد آئی تو آتی چلی گئی

پروفیسر رضی الدین احمد ایم۔اے پی ایچ ڈی لٹ
ڈین علوم شرقیہ، سابق صدر شعبہ اُردو فارسی۔ ایس وی یونی ورسٹی تروپتی آندھرا پردیش (جنوبی ہند)

میری پیدائش ایک ایسے خاندان میں ہوئی جہاں علمائے دیوبند سے عقیدت اور ان کا احترام جزوِ ایمان بن گیا تھا چنانچہ جب میں نے ہوش کی آنکھیں کھولیں تو اپنے ارگرد صحیح بخاری اور مسلم کی موٹی موٹی جلدوں کے ساتھ الامداد القاسم اور الرشید کے اُردو پرچوں کا ڈھیر بھی پایا۔ یہیں سے میں نے اردو کے مطالعے کی بسم اللہ کی۔ اس وقت اتنی سمجھ کہاں تھی کہ ان پرچوں میں علوم اسلامیہ کے جو بیش قیمت موتی بکھرے ہوئے تھے ان کو پرکھ سکتا۔ ان کے مضامین کو سمجھ سکتا۔ لیکن ان کی ورق گردانی کا یہ فیض بھی کیا کم تھا کہ ان چند لکھنے والوں کے نام میرے حافظے نے بچپن ہی میں محفوظ کرلئے۔

حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رح، حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رح حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی رح حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رح بہت بعد کو اس کا علم ہوا کہ آخری دونوں بزرگ حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن کے عم محترم تھے۔ یہ وہ اکابر تھے جن سے میری عقیدت علم اور عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتی رہی۔ یہاں اس دلچسپ واقعہ کا ذکر بے موقع نہ ہوگا کہ میرے پردادا ابو حامد علی مرحوم متوفی ۱۹۰۴ء کی انگریزی عہد کے آغاز میں کسی انگریز سے دوستی ہوگئی تھی۔ اس دوستی کے طفیل انہیں انگریزی زبان کی شدبد ہوگئی۔ یہ زمانہ ایسا سخت اور حکومت کی تبدیلی کا سانحہ ایسا شدید تھا کہ مسلمانوں کو نہ صرف انگریزوں سے دشمنی تھی بلکہ انگریزی زبان سے

بھی ایسی سخت نفرت تھی کہ اس کا سیکھنا بھی کرسٹان کہلائے جانے کے لئے کافی سمجھا جاتا تھا۔ کچھ دنوں تک میرے دادا مرحوم نے اپنی غلطی کو مصلحت کی چادر میں چھپائے رکھا لیکن بعد کو جب انہیں محکمہ نہر میں ایک سرکاری ملازمت مل گئی تو ایک نہ شد دو شد کے مصداق ان کے دونوں عیب کھل گئے۔ انگریزی پڑھنا اور انگریزی سرکار کی ملازمت کرنا دو ایسے عیب تھے کہ ایک نے دوسرے کا پردہ فاش کر دیا۔ نہ صرف عام مسلمانوں نے ان سے آنکھیں پھیر لیں بلکہ خاندان کے افراد اور ان کے اقربا بھی ان سے ملنے میں کترانے لگے۔ اس دن سے ہمارے خاندان کا نام ہی بابوجی کا خاندان کہلانے لگا۔ کچھ مدت کے بعد شاید پردادا کو بھی اپنے گناہ کا احساس ہوا، اس احساس کی شدت نے انھیں اس گناہ کے کفارے کی طرف مائل کیا۔ یہ تو ممکن نہ تھا کہ جو زبان سیکھ لی ہے اسے بھلادیں اور یہ بھی آسان نہ تھا کہ اپنی سرکاری ملازمت ترک کر دیں۔ آخر ایک عالم دین نے ان کی مشکل کو حل کرنے کی ایک ایسی تدبیر سجھائی جو یہ کر گزرے۔ ان کے چار لڑکے تھے عالم دین نے کہا کہ آپ اپنے ایک لڑکے کو دیوبند بھیج کر عالم دین بنادیں تو آپ کے گناہ کا کفارہ ادا ہو جائے گا۔ انہوں نے اپنے سب سے چھوٹے لڑکے محمد نصیرالدین کو اس غرض سے میرٹھ سے دیوبند بھیج کر دینی تعلیم دلائی۔ انہوں نے دیوبند میں درس نظامیہ کی تکمیل کی اور حضرت محدث گنگوہی مولوی رشید احمد سے حدیث کی سند لی۔ پھر بعد کو دہلی جاکر حکیم عبدالمجید خاں سے طب کی تعلیم حاصل کی اور بجائے علم دین کے طب کو اپنا پیشہ بنایا۔

دیوبند کی تعلیم اور حضرت گنگوہی کے تعلق کی وجہ سے ہمارے گھرانے سے نہ صرف علمائے دیوبند کا تعارف تھا بلکہ اکابر علمائے دیوبند سے ایسا تعلق پیدا ہو گیا تھا کہ حضرت گنگوہیؒ اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ ہمارے ہاں تشریف لاتے قیام فرماتے اور خاندان کے افراد کو اپنی خدمت کا موقع فراہم کرتے۔ میرے دادا مرحوم

مولوی حکیم نصیرالدین نے کوے کی حلت کے بارے میں اپنے استاد حضرت گنگوہی کا ایک فتویٰ بھی شائع کیا تھا جس کی تائید اور تردید میں بہت سے کتابچے شائع ہوئے۔ افسوس کہ ان کا انتقال عین جوانی میں ہوا اور وہ سوائے ایک رسالہ فصل الخطاب کے اور کوئی تصنیف اپنی یادگار نہ چھوڑ سکے۔ میرے دادا کے انتقال پر میرٹھ میں شاید انہی کی یادگار میں مطبع قاسمی قائم ہوا۔ اور ایک عربی مدرسہ خادم العلوم۔

مولوی جلال الدین، قاری محمد اسحاق، مولوی ریاض الدین دادا کے ساتھیوں میں تھے۔ یہی حضرات مدرسہ کے معلم بھی تھے۔ قاری محمد اسحاق مفتی عزیز الرحمٰن کے خلیفہ تھے۔ میرے والد حکیم محمد ظہیر الدینؒ سے بڑی شفقت اور بہت اپنائیت کا تعلق رکھتے تھے۔ اسی وجہ سے مفتی عتیق الرحمٰن صاحب قاری اسحاقؒ کی طرح میرے والد مرحوم کا بھی احترام کرتے تھے۔ میرے عم محترم حکیم محمد بشیر الدین نے دینی تعلیم اسی مدرسہ خادم العلوم میں پائی تھی پھر دہلی کے طبیہ کالج سے طب کی تعلیم حاصل کی۔ یہ حکیم اجمل خاں کے عزیز شاگرد تھے۔

مولوی بدر عالم میرٹھی چچا کے نہایت بے تکلف دوستوں میں تھے۔ مولوی بدر عالم میرٹھی حضرت محدث کشمیری مولانا انور شاہ کے عزیز شاگرد تھے۔ جب حضرت کشمیری نے دارالعلوم کو چھوڑ کر جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کا رخ کیا تو اس شمع انوری کے پروانوں میں مولانا شبیر احمد عثمانی، مفتی عزیز الرحمٰن، مولانا حفظ الرحمٰن، مولوی بدر عالم اور مفتی عتیق الرحمٰن بھی شامل اور شریک تھے۔ عم مرحوم سے مولوی بدر عالم کی بہت بے تکلفی اور گہری دوستی تھی۔ دونوں کی دوستی میں مذہبی عقائد کے اشتراک کے علاوہ ایک قدر مشترک شکار کا شوق بھی تھا۔ چچا جان مرحوم کبھی کبھی کئی کئی دن اپنے مطب سے غائب رہتے تھے۔ یہ بات میرے والد مرحوم کو سخت ناپسند تھی اور وہ اس پر اپنی

خفگی کا برملا اظہار بھی کرتے تھے۔ لیکن جب چچا جان مرحوم صفائی میں یہ فرماتے کہ میں مولوی بدر عالم کے ساتھ شکار کو گیا تھا تو والد مرحوم کی خفگی شفقت سے بدل جاتی تھی۔ شاید اس دوستی کا ایک تحفہ یہ بھی تھا کہ عم محترم نے اپنے بڑے صاحبزادے کا نام بھی مولوی بدر عالم کے نام سے مستعار لیا تھا۔

۱۹۳۵ء میں انڈیا ایکٹ آجانے پر ہندوستان کی سیاسی زندگی میں ایک نئی ہلچل شروع ہو چکی تھی۔ انڈیا ایکٹ کی حمایت اور مخالفت میں پوسٹر شائع ہوتے تھے اور وہ اس وقت میرے قد سے بھی بڑے ہوتے تھے۔ میں اس وقت اُردو روانی سے پڑھ لیتا تھا محلہ کے ناخواندہ لوگ مجھ سے یہ پوسٹر پڑھوا کر سنتے تھے۔ کبھی پوسٹر دیوار پر اتنے اونچے لگائے جاتے تھے کہ پوسٹر پڑھنے کے لئے مجھے کسی کے کاندھے پر چڑھ کر انھیں پڑھنا ممکن تھا لوگوں کے کاندھے پر چڑھ کر پوسٹر پڑھتے وقت مجھے بچپن ہی سے اپنی بڑائی کا قبل از وقت احساس ہونے لگا تھا۔ میں نہ صرف روانی سے پوسٹر پڑھ کر لوگوں کو سناتا تھا بلکہ بیچ بیچ میں اپنی طرف سے یہ حاشیہ بھی چڑھاتا جاتا تھا کہ یہ بات صحیح ہے یہ بات غلط ہے۔ لوگ ہنس ہنس کر مجھے داد دیتے تھے اور میں خوش ہو ہو کر یہ داد وصول کرتا۔ اسی زمانے سے مجھے قومی تحریک سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ یہ میری زندگی کا پہلا کھیل تھا، جسے میں نے اپنے بچپن میں اس طرح کھیلا جس طرح بچے گلی ڈنڈا یا کبڈی کھیلتے ہیں۔ آخر اسی شوق نے میری مخمل کی کامدار ٹوپی کو کھدر کی گاندھی ٹوپی سے بدل دیا۔ ۱۹۳۶ء میں پہلی بار میں نے پنڈت جواہر لال نہرو کو میرٹھ میں دیکھا جن کا جلوس نکالا جا رہا تھا۔ جواہر لال کھدر کی وہی ٹوپی پہنے ہوئے تھے جسے عام طور پر کانگریس کے حامی استعمال کرتے تھے۔ اس وقت کانگریس اور مسلم لیگ میں اتحاد تھا۔ ۳۷ء کے انتخاب میں جب دوبارہ جواہر لال نہرو کو میں نے میرٹھ میں دیکھا تو وہ جلسہ گاہ میں اس طرح تشریف لائے تھے کہ ان کے ایک پہلو میں کانگریس کے امیدوار پنڈت

پیارے لال شرما تھے اور دوسرے بازو میں مسلم لیگ کے امیدوار نواب محمد اسمٰعیل خاں ۔ اس وقت انتخاب جداگانہ تھے ۔میں نے بھی نواب صاحب کی تائید میں چھوٹے چھوٹے جلسوں میں تقریریں کرنی شروع کردی تھیں ۔اس زمانے میں علمائے دیوبند میں کچھ حضرات قومی تحریک کی حمایت کر رہے تھے اور کچھ علمائے کرام کا یہ عقیدہ تھا کہ ہندوستان میں تاقیام قیامت انگریزوں کی حکومت قائم رہے گی ۔اس لئے قومی تحریک سے الگ رہنا ہی بہتر ہے ۔

۲۷ ءمیں میں نے کلام پاک حفظ کر لیا تھا ۔اس وقت میری عمر دس برس کی تھی جب کوئی عالم یا رئیس والد کے مطب میں آتے اور میں اندر زنانے مکان میں ہوتا تو والد مجھے اندر سے بلواتے ، والد مرحوم اپنے مخاطب سے فرماتے کہ یہ بندہ زادہ ہے ۔ اس نے قرآن شریف حفظ کر لیا ہے ۔ پھر مجھے حکم ہوتا کہ ایک رکوع سناؤ ۔میں ان کی تعمیل میں ایک رکوع پڑھ کر سناتا اور پھر آخر میں داد وتحسین پاتا ۔کبھی کبھی ملکہ وکٹوریہ کا چاندی کا روپیہ بھی انعام میں مل جاتا ۔میرٹھ میں اسی سال پہلی مرتبہ میری مفتی عتیق الرحمن صاحب سے ملاقات ہوئی ۔

مفتی صاحب اس زمانے میں ندوۃ المصنفین کی تاسیس کا منصوبہ بنا چکے تھے ۔اپنے خاص احباب سے اعانت اور تائید کے لئے گشت کر رہے تھے ۔مولوی بدر عالم اور مولوی حفظ الرحمٰن اس منصوبے میں ان کے رفیق و شریک تھے ۔مفتی صاحب مولوی بدر عالم اور بعض ذی علم حضرات کے ساتھ والد کے مطب میں تشریف لائے ۔علماء کے اس مبارک اجتماع کو دیکھ کر والد مرحوم نے حسب معمول مجھے مکان سے بلوایا ۔ علماء کے اس مبارک مجمع کے سامنے مجھے یہ کہکر پیش کیا کہ یہ بندہ زادہ ہے ، اس نے قرآن شریف حفظ کر لیا ہے ۔ پھر مجھ سے ایک رکوع پڑھنے کی فرمائش کی گئی اور میں نے بحسن وخوبی اس فرمائش کی تکمیل بھی کر دی ۔اب تک شروع سے یہ ہوتا آرہا تھا کہ اس موقع پر مجھے داد دی جاتی میری تعریف کی جاتی اور میں بھی اس سے

خوش ہوتا لیکن اس دن ایک ایسی غیر متوقع بات ہوئی کہ بجائے تعریف و تحسین کے مجھے ہدف ملامت بننا پڑا۔ ہوا یہ کہ جب میں مفتی صاحب اور مولوی بدر عالم کو قرآن شریف کا ایک رکوع سنا چکا تو قرأت ختم ہوجانے کے بعد مولوی بدر عالم نے میری ٹوپی کی طرف اشارہ کرکے طنزاً والد مرحوم سے کہا۔ حکیم صاحب یہ آپ کے صاحبزادے کے سر پر کیا ہے؟ والد مرحوم نے میری کھدر کی ٹوپی کو دیکھ کر بڑی سادگی اور سادہ لوحی سے جواب دیا حضرت ٹوپی ہے۔ یہ جواب سن کر مولوی صاحب پہلا وار طنز اُخالی گیا۔ مگر وہ بھی خاموش ہونے والے نہیں تھے۔ پھر والد صاحب سے فرمایا حکیم صاحب آپ کے اور ہمارے بزرگوں نے کبھی یہ ٹوپی اوڑھی ہے۔ والد صاحب یہ سُن کر کچھ خاموش سے کچھ محجوب سے ہوئے تو مفتی عتیق الرحمٰن صاحب نے مولوی بدر عالم سے مخاطب ہوکر فرمایا۔ مولوی بدر عالم یہ گاندھی جی کی ٹوپی نہیں ہے۔ گاندھی جی نے حکیم اجمل خاں کو اس ٹوپی میں دیکھا تھا۔ اس کو کانگریس کے قومی لباس میں شامل کرلیا۔ دراصل یہ حامد کیپ ہے۔

یہ تھا مفتی صاحب سے میرا پہلا تعارف اور ان سے میری اوّلین ملاقات۔ مفتی صاحب کی اس تائید اور ترجمانی سے والد مرحوم کی مشکل بھی آسان ہوئی اور میری بھی ہمت بندھی۔ پہلا تاثر عموماً بہت گہرا اور گرانمایہ ہوتا ہے۔ اس کی گرمی اور گداز اب بھی میرے احساس میں شامل اور شریک ہے۔ مجھے یہ اندازہ ہوگیا کہ مفتی صاحب عام علماء سے الگ اپنا ایک مزاج رکھتے ہیں جس میں چھوٹوں سے شفقت، ہم عمروں اور ہم خیالوں سے اپنائیت، بزرگوں سے عقیدت اور اپنے مخالفوں سے خاطر و مدارات، ان کی طبیعت کے اہم اساسی عناصر تھے۔ معتبر اور محترم اساسی عناصر۔

۱۹۳۷ء کے پہلے صوبائی انتخابات میں کانگریس کے ساتھ مسلم لیگ کے بھی بہت سے امیدوار کامیاب ہوئے۔ اس سال جب پہلی بار صوبائی سطح پر کانگریس کی وزارتیں بنیں تو یوپی میں کسی مسلم لیگ کے امیدوار کو وزارت میں نہیں لیا گیا۔ یہیں سے

کانگریس اور مسلم لیگ میں شدید اختلافات کا آغاز ہوا اور کانگریس کی وزارتیں بننے کے بعد اس اختلافات نے بڑی شدت اختیار کر لی اور بہت سے شبہات نے خطرناک راہ پالی۔ میری دلچسپیاں شروع ہی سے کانگریس کے ساتھ تھیں اور یہ بھی حسن اتفاق تھا کہ اکثر علمائے دیوبند بھی اس سیاسی مسلک کے پیرو تھے۔ ۱۹۳۸ء میں ندوۃ المصنفین کے منصوبے نے عملی شکل اختیار کر لی۔ مفتی صاحب اپنی تنظیمی صلاحیتوں اور تعمیری رجحانات کی وجہ سے اس ادارہ کے منتظم اعلیٰ قرار پائے۔ ان کے رفیقوں اور ہمدموں میں مولانا حفظ الرحمٰنؒ مولوی بدر عالمؒ مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ جیسے اکابر اور اعلیٰ ذہن رکھنے والے بزرگ شامل تھے۔ ادارہ کا ترجمان برہان نکلنے لگا جس کے مدیر اعلیٰ مشہور عالم دین مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ تھے۔

ادارہ کا ترجمان کیا بلحاظ صورت اور کیا بلحاظ سیرت میرے خیال میں الامداد، القاسم اور الرشید ہی کی ترقی یافتہ شکل تھا۔ ۳۷ء سے ۴۰ء تک کانگریس اور مسلم لیگ کا اختلاف اتنا شدید ہو گیا تھا کہ ملک کی آزادی کی راہ میں مسلم لیگ ایک بہت بڑی رکاوٹ بن کر ابھر آئی۔ یہ برطانوی حکمت عملی کا ایک ایسا حربہ اور حملہ تھا جس نے آخر ملک کی تقسیم کا نعرہ اور نظریہ بن کر ملک کی سیاست کی بساط ہی پلٹ دی۔ مجھے اس زمانہ سے حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی، حضرت مولانا حفظ الرحمٰن، مولانا احمد سعید، سید شاہ عطاء اللہ بخاری اور استاذی حضرت عبیداللہ سندھی سے بڑی عقیدت اور بڑی قربت ہو گئی تھی۔ میں قرآن شریف حفظ کرنے کے بعد عربی مدرسہ میں عربی اور فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھ رہا تھا۔ یہ حضرات عربی مدارس کے جلسوں میں تشریف لاتے تھے اور ان کے مواعظ اور تقاریر نے مجھے اس درجے متاثر اور مسحور کر دیا تھا کہ میں نے بھی چھوٹے چھوٹے جلسوں میں تقریر کرنے کی مشق شروع کر دی تھی جو چند سال میں مہارت بن گئی۔ اب مجھے بھی بڑے بڑے جلسوں میں تقریر کرنے کا خبط سا ہو گیا۔ خطبی اور خطیب ملت میں بہت جلد مقبول اور مقرب ہو جاتے ہیں میرے ساتھ یہی سانحہ ہوا جسے میں نے سعادت سمجھا۔

مسلم لیگ نے اپنے لاہور کے اجلاس میں جو مارچ ۴۰ء میں ہوا تھا ملک کی تقسیم کا مطالبہ کیا تھا۔ اس سال اپریل میں مطالبہ پاکستان کی مخالفت میں نوبہالان احرار نے اپنی ایک کانفرنس کی جس کی صدارت کا شرف اور اعزاز مجھے مل گیا۔ نوبہالانِ احرار کانفرنس کی تاریخی اہمیت یہ تھی کہ مارچ ۴۰ء میں لاہور میں قرارداد پاکستان پاس ہونے کے بعد لاہور میں یہ پہلی کانفرنس تھی جس میں صرف نوجوان تھے۔ اس میں ملک کی تقسیم کی مخالفت کی گئی تھی۔ میرا خطبہ صدارت چھپ کر اخبارات میں شائع ہوا تصویریں شائع ہوئیں اور میں قبل از وقت ایک کل ہند لیڈر بن گیا۔ قومی تحریک سے ملحقہ اور اس کا مسلمہ لیڈر، عربی مدرسوں کے اکثر علماء اور طلباء تقسیم ملک کے خلاف تھے لیکن عربی مدارس کے مہتمم صاحبان جو عموماً ثروت مند تھے تقسیم ملک کے حامی تھے، غریب طلباء کو سیاست میں حصہ لینے کی اجازت نہ تھی۔ مگر ان کے مہتمم صاحبان سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ مجھے عربی مدرسہ سے اس لئے نکال دیا گیا تھا کہ میں نے کھل کر سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ والد مرحوم مجھ سے سخت ناراض تھے۔ اب میری تعلیم کا مسئلہ میرے لئے ایک سخت مرحلہ تھا۔ میں اچھا خاصا کل ہند لیڈر تھا لیکن میری تعلیم ناقص تھی علماء کرام سے بڑا قرب حاصل تھا بعض حضرات کا مشورہ تھا کہ میں دیوبند جا کر تعلیم کی تکمیل کروں۔ بعض حضرات جن میں حضرت سندھی بھی تھے چاہتے تھے کہ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ میں داخل ہو کر تعلیم حاصل کروں۔ لاہور کانفرنس میں حضرت سندھی میری تقریر سن چکے تھے اور مجھ سے بہت زیادہ متاثر اور مسرور تھے۔ آخر خدا خدا کر کے ۴۰ء میں میرا داخلہ جامعہ ملیہ دہلی کے ابتدائی مدرسہ میں ہو گیا۔ یہ بھی حسن اتفاق تھا کہ اس سال حضرت استاذی عبیداللہ سندھی بھی جامعہ میں تشریف لے آئے۔ یوں مجھے حضرت سے کچھ پڑھنے اور کچھ پانے کا موقع ملا۔ بہت بڑا موقع اور بہت مبارک موقع حضرت سندھی ہفتہ میں چھ دن جامعہ میں درس دیتے تھے اور ایک دن یعنی جمعہ کو جامعہ نگر

سے دہلی جاکر جامع مسجد کے قریب ادارہ شرقیہ میں تفسیر بیان کرتے تھے۔ ادارہ شرقیہ میں حضرت سندھی کے درسوں میں مفتی عتیق الرحمٰن، مولانا حفظ الرحمٰن، مولانا سعید احمد اکبر آبادی جیسے علماء کرام تشریف لاتے تھے۔ اس کم مدت میں بڑی حد تک مفتی صاحب سے متعدد ملاقاتیں اور بہت سی مدارائیں ہو چکی تھیں۔ مفتی صاحب کا ادارہ ندوۃ المصنفین قرولباغ میں تھا۔ ایک آدھ بار وہاں بھی مجھے حاضری کا شرف حاصل ہو چکا تھا۔ اب میں بڑی حد تک مفتی صاحب کے عقائد اور سیاسی افکار سے واقف ہو چکا تھا اور اب مختلف موضوعات پر ان سے گفتگو کرنے کے مواقع بھی مل چکے تھے۔ حضرت مفتی صاحب، مولانا حفظ الرحمٰن اور مولانا سعید احمد اکبر آبادی صاحب نہ صرف ایک دوسرے کے ہمدرد و ہمدم تھے ملک کے سیاسی عقائد و مذہبی مسلک میں بھی ایک دوسرے کے ہم مسلک و ہم مشرب تھے۔ استاذی حضرت عبید اللہ سندھی کے انتقال کے بعد ان کے افکار پر جب ایک مسلک کے علماء نے بے وقت اور بے جا تنقیدیں کیں تو حضرت سندھی کی تائید میں مولانا اکبر آبادی نے قلمی جہاد کیا۔ جس میں وہ تنہا نہ تھے۔ بلکہ ادارہ کے سب ہی اکابر اس مسلک کے قائل تھے۔ حضرت سندھی، حضرت شیخ الہند کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ لیکن دیوبند کے اکابر نے دارالعلوم کے دروازے حضرت سندھی کے لئے بند کر دیئے تھے۔ حد یہ تھی کہ حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی تک نے اخبارات میں یہ اعلان کر دیا تھا کہ برطانوی حکومت کی اذیتیں برداشت کرتے کرتے حضرت سندھی کا ذہنی توازن متزلزل ہو گیا۔ حضرت شیخ الہند کا یہ جملہ میں نے اپنے خاندان کے بزرگوں سے سنا تھا کہ ان کے صدہا شاگردوں میں سے مولانا شبیر احمد ان کی زبان ہیں مولانا سندھی ان کا ذہن ہیں اور مولانا حسین احمد ان کا دل ہیں۔ ذہن ضمیر اور زبان کے اس اختلاف نے ملت کے لئے ایک صدمۂ جانگداز اور سانحۂ عظیم کی شکل اختیار کر لی تھی۔ میں نے ان تینوں حضرات کو دیکھا اور سنا ہے ان میں مولانا شبیر احمد عثمانی واقعی سب سے اچھے مقرر اور بہت دلچسپ بزرگ تھے حضرت

مدنی اور مولانا سندھی کی تقاریر عوام کے لیے شگفتگی اور دلچسپی کے عناصر سے خالی تھیں لیکن علماء کے لئے سرتاسر مغز ہوتی تھیں لیکن مولانا عثمانی خطابت کے میدان کے شہسوار تھے حضرت مفتی صاحب تحریر و تقریر دونوں میں ان اکابر سے کسی حد تک الگ واقع ہوئے تھے ۔ ان میں غیر معمولی طور پر تنظیمی صلاحیت تھی ۔ ان کے معاصر علماء کرام میں جس طرح کی خشک مزاجی اور خشونت طبع تھی ۔ مفتی صاحب اس کے برخلاف شگفتہ مزاج اور مردم شناس عالم تھے ۔ ان کی معاملہ فہمی اور موقع شناسی عام علماء سے بہت بلند تھی ۔ اس کے صدہا واقعات میرے ذہن میں محفوظ ہیں

فخرالدین علی احمد کے دورِ صدارت میں راشٹرپتی بھون میں دعوت افطار کے موقع پر اکثر مشاہیر معاصر علماء کرام اور اہم عہدیدار مدعو ہوئے تھے ۔ ایک بار اس دعوت کے موقع پر وہاں ان کے گھر کی خواتین اور بعض دوسری خواتین دعوت افطار کے اہتمام میں مصروف تھیں ۔ حضرت مفتی صاحب اور دوسرے علماء کرام بھی موجود تھے ۔ غالباً فخرالدین علی احمد صاحب نے مفتی صاحب سے تقریر کے لئے کہا ۔ لیکن مفتی صاحب نے اپنے ایک معاصر سے کچھ کہنے کی فرمائش کی اور اس موقع پر حضرت واعظ نے رسم کے برعکس بجائے رمضان یا افطار پر کچھ کہنے کے پردہ کے موضوع پر کچھ ایسے شدید خیالات کا اظہار کیا جس سے سبھی سننے والوں نے بڑی تلخی محسوس کی خصوصاً خواتین نے جو اس موقع پر انتظامات کے فرائض انجام دے رہی تھیں ۔ مفتی صاحب صورت حال کو بھانپ گئے اور موقع کی نزاکت کے خیال سے بغیر کسی فرمائش کے افطار اور رمضان کے بارے میں بڑے شگفتہ انداز سے کچھ کلمات ارشاد فرمائے اور آخر میں یہ فرما کر اپنی گفتگو ختم کی کہ رمضان اور اس کے روزوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس بارے میں علماء اور فقہا میں کوئی اختلاف نہیں ہے ۔ روزہ فرض ہے غریب ہو کہ امیر ، مرد ہو کہ عورت ، مگر بعض فقہی مسائل میں اختلاف ہے جیسے پردہ کی نوعیت ۔ بعض منہ ڈھانپنے کو ضروری خیال کرتے ہیں بعض نہیں ۔ اس لئے

ایسے مسائل میں غیر ضروری شدت مناسب نہیں ہے۔ اس میں احتیاط لازمی ہے۔ مفتی صاحب کے ان چند جملوں نے پہلے واعظ صاحب کی ساری تلخی اور تہدید کی جگہ ماحول کو خوشگوار بنا دیا۔ گویا فضا کا تکدر دھل سا گیا۔ سامعین نے ایک طرح سے بڑے سکون کا سانس لیا۔ مفتی صاحب سے عرصے سے تعلق ہونے کی وجہ سے ایک طرح کی اپنائیت ہو گئی تھی اور حضرت مجھ پر اتنی عنایت کرنے لگے تھے کہ بعض مواقع پر مجھے اپنے ساتھ سفر میں بھی شریک کر لیتے تھے۔ یوں مجھے غم اور خوشی کے آداب سے واقف کراتے تھے۔ ایک بار میں ایک لمبے سفر سے دہلی پہنچا اور قیام ان ہی کے دفتر میں تھا۔ اِدھر اُدھر کی بات چیت کے بعد ہی مجھ سے فرمانے لگے آپ کیا پنڈت سندر لال جی سے بھی واقف ہیں؟ میں نے کہا کیوں نہیں۔ میں نے ان کی متعدد تقریریں سنی ہیں۔ میں موصوف کا بے حد احترام کرتا ہوں وہ بڑے ترقی پسند رہنما اور بہت صاف گو انسان ہیں۔ وہ صحیح معنوں میں قومی یکجہتی کا ایک زندہ اور مثالی نمونہ ہیں۔ مفتی صاحب میری گفتگو سنتے رہے۔ آخر آہ بھر کر کہا آج ان کا انتقال ہو گیا ہے۔ مجھے ان کی میت میں جانا ہے۔ آپ بھی میرے ساتھ چلئے۔ چنانچہ میں پنڈت سندر لال کے آخری دیدار کے لئے ان کے ساتھ گیا۔ راستے بھر مفتی صاحب نے ان کے بارے میں بعض ایسی اہم باتیں بتائیں جو بعض خاص حضرات ہی جانتے تھے۔ مثلاً گاندھی جی ملک کی تقسیم کے بعد اپنی رہائش پاکستان میں رکھنا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے عین قتل و غارتگری کے عہد میں پنڈت سندر لال کو پنجاب بھیجا تاکہ وہ وہاں کی بربریت اور درندگی میں شرافت کا نمونہ پیش کریں اور اس طرح وہاں گاندھی جی کی آمد کی راہ ہموار کریں۔ جب دہلی میں ایک ہندو دہشت پسند نے گاندھی جی کو قتل کر دیا۔ تو بیچارے گاندھی کا پاکستان جانے کا خواب پورا نہ ہوا۔

مفتی صاحب بہت کم گو اور کم خور تھے اور ساتھ ہی بہت کم نویس بھی۔ ان کی اکثر تقریروں میں میں نے یہ جملہ سنا کہ موضوع بہت اہم اور تفصیل طلب ہے۔ اس وقت

چند اشاروں ہی سے کام لوں گا کسی اور وقت تفصیل سے اظہار خیال کروں گا۔ میں نے کبھی کسی موضوع پر انہیں تفصیل سے گفتگو کرتے نہیں سنا اور اس کی حسرت دل ہی کی دل میں رہ گئی ۔ جامعہ میں میں نے اپنے بعض استادوں سے مولوی کی تعریف سنی تھی کہ اس کا معدہ اور منہ ہر وقت مصروف رہتا ہے ۔ مولوی کے معدے اور منہ کو آرام حرام ہے۔ مفتی صاحب اس معیار پر بھی پورے نہیں اترے ۔ ان کی کم گوئی اور کم خوری اپنی مثال آپ تھی ۔

علماء دیوبند سے ابتدا میں میری عقیدت بڑی حد تک اندھی عقیدت تھی۔ حضرت سندھی کی صحبت اور شاگردی میں یہ عقیدت عقلیت سے بدلنے لگی ۔ آخر کچھ دن بعد یہ عقیدت ہوا ہو گئی ۔ ابتدا میں میری عقیدت محض میرا خاندانی ورثہ تھا ۔ یہ عقیدت نقلی تھی، حضرت سندھی کی صحبت سے جو عقیدت پیدا ہوئی وہ عقلی اور اصلی تھی ۔ یہ واقعی میری اپنی عقیدت تھی ۔ وہ میری اپنی عقل کا عطیہ تھی کسی کی نقل نہیں تھی ۔ میں زندگی بھر حضرت سندھی کے تربیت کے اس احسان کو فراموش نہیں کر سکتا ۔ جامعہ کی عام فضا بھی محض عقیدت مندی کی فضا نہیں تھی حضرت سندھی نے فضا کو عقلیت اور فکر و تامل سے خوب سے خوب تر کیا ۔

مجھے بچپن ہی سے جن حضرات سے بے حد عقیدت تھی ۔ ان میں حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد صاحب کی ذات گرامی تھی ۔ مفتی صاحب بھی اندھی عقیدت کے قائل نہیں تھے بلکہ اسے ناپسند کرتے تھے ۔ لیکن ان کی ناپسندیدگی بھی ایک ہلکے رنگ کی طرح ہوتی تھی جس میں تیزی نام کو نہ تھی ۔ اندھی عقیدت اور انتہا پسندی سے مفتی صاحب کا دامن کبھی داغدار نہ ہوا ۔

حضرت شیخ الاسلام، مولانا حسین احمد مدنی بعض معاملات میں انتہا پسند تھے مجھے جس زمانے میں حضرت مدنی سے بے انتہا عقیدت تھی اور حضرت کے پیر دبانے میں مجھے اپنے درجات کے بلند ہونے پر ایمان محکم تھا ـــــ اس زمانے میں حضرت شاہ

سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے مجھے حضرت مولانا محمد الیاسؒ سے ملایا۔ شاہ جی کو ایک طرف حضرت شیخ الاسلام سے عقیدت تھی دوسری طرف حضرت مولانا الیاس سے بھی ارادت تھی۔ مجھے بھی شاہ جی نے حضرت مولانا الیاس سے ملایا جو تبلیغی جماعت کے مؤسس تھے، مگر سیاست سے یکسر بے تعلق۔ میں سیاسی افکار میں حضرت مدنی سے بہت متاثر تھا۔ دل میں یہ بات ایمان کی طرح بیٹھ گئی تھی کہ ساری برائیوں کی جڑ انگریزی حکومت ہے، جس دن یہ ختم ہو جائے گی ساری برائیاں ہوا ہو جائیں گی۔ انگریزوں کے بعد ہندوستان جنت نشان بن جائے گا۔ پیالے سے وہی چھلکتا ہے جس سے یہ بھرا ہوا ہے۔ دل کی یہی بات کسی طرح حضرت جی کی صحبت میں بھی زبان پر آگئی حضرت جی کے تیور بدل گئے۔ مجھ سے پوچھا ہندوستان کی آبادی کتنی ہے۔ میں نے کہا، چالیس کروڑ۔ پھر فرمایا ہندوستان میں انگریز کتنے ہیں؟ میں نے کہا، زیادہ سے زیادہ چالیس ہزار حضرت جی نے فرمایا کہ چالیس کروڑ آدمی کیا چالیس ہزار کو جذب نہیں کر سکتے۔ میں یہ سن کر خاموش ہو رہا لیکن یہ خیال مجھے پریشان کرتا رہا کہ انگریزوں سے لڑنا ہی ہمارا ڈرنا تو نہیں ہے۔ حضرت جی کا خیال تھا کہ اگر مسلمان عملاً سچے مسلمان ہوں تو انگریزوں کو نکالنے کی بجائے انہیں جذب کر سکتے ہیں۔ کسی قوم کی دشمنی اسلام کی دعوت نہیں ہے۔ اسلام دوسروں سے الگ ہونے کی جگہ اُن سے ملنے اور دوستی کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ میرٹھ کے کسی جلسے میں حضرت شیخ تشریف لائے۔ میں حضرت کے ساتھ سائے کی طرح لگا رہا حضرت نے ازراہ شفقت مجھے کھانے میں شریک کر لیا۔ پھر حضرت کی لمبی تقریر سنی جو بہت اکتا دینے والی تھی۔ پھر حضرت آرام کرنے لگے۔ اب مجھے موقع ملا کہ میں حضرت سے دل کی بات کہوں جو دل میں پھانس بن کر چبھ رہی تھی۔ میں حضرت کے پیر دبا رہا تھا حضرت آرام فرما رہے تھے کہ دبی زبان سے حضرت جی کا یہ جملہ نکل گیا کہ "اسلام انگریزوں کو نکالنے کی تعلیم نہیں دیتا۔ میں ابھی اپنی پوری بات بھی کہہ نہ پایا تھا کہ حضرت مدنی غصہ سے بپھر گئے اور کروٹیں بدلنے لگے۔

اور اپنے پیر سکوڑ لئے۔ پھر غصہ سے اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ فرمانے لگے اس وقت انگریزوں سے لڑنا ہی سب سے بڑی نیکی ہے۔ انسان تو انسان اگر کتے اور سور بھی انگریزوں پر دوڑیں تو ان کا ساتھ میں دوں گا۔ حضرت مدنی کے اس طیش سے میں سہم گیا۔ اپنی گستاخی پر ندامت بھی تھی اور اتنی ندامت کہ معافی چاہنے کی ہمت بھی نہ تھی۔ پھر حضرت لیٹ گئے تو غصہ بھی لوٹ گیا۔ اب میں پھر ڈرتے ڈرتے پیر دبانے لگا، بات آئی گئی ہوئی۔

ملک کی آزادی کے بعد جب آزادی کا جشن منانے میں میں مدہوش اور مست تھا کہ اچانک دلّی کے مسلمانوں پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ اس سخت مصیبت میں گاندھی جی کے دل میں خدا نے نیکی ڈال دی، بہت بڑی نیکی۔ انھوں نے مرن برت رکھا اور مسلمانوں کی حمایت میں جان کی بازی لگادی۔ لیکن گاندھی جی کی نیکی کے جواب میں دہلی میں دہشت پسند ہندوؤں نے ان کو قتل کرکے اپنے دل کا ارمان پورا کرلیا۔ گاندھی کے قتل نے مجھے بیحد متاثر اور بہت متأسف کیا۔ گاندھی جی کے آخری دنوں میں میں ان کے ساتھ تھا۔ گاندھی کے ہمت دلانے پر مولانا آزاد، رفیع احمد قدوائی اور ان کا پورا خاندان اور مولانا حفظ الرحمٰن دلّی کے خوف زدہ تباہ حال مسلمانوں کی مدد کے لئے جم گئے تھے ڈٹ گئے تھے۔ جب دہلی میں مسلمانوں کا قتل عام ہو رہا تھا تو قرولباغ میں مفتی صاحب کا ادارہ مکتبہ برہان اور جامعہ کا مکتبہ اور کتب خانہ آگ کی لپیٹوں میں تھا۔ اس تباہی کے بعد مکتبہ برہان قرول باغ سے جامع مسجد کے اردو بازار کی ایک گلی میں آگیا۔ اس گلی میں مفتی صاحب کا قیام بھی تھا۔ جامعہ کے اساتذہ اور طلبا ابھی دہلی میں مسلمانوں کے زخموں پر مدد کا مرہم رکھ رہے تھے۔ جنگ آزادی میں حصہ لینے والے علماء کا ایک طبقہ بھی اس صورت حال پر انگشت بدنداں تھا اور سخت مایوسی کا شکار تھا کہ کیا سوچا تھا اور ہو گیا کیا۔

حضرت مدنی بھی ایک سخت کشمکش سے گزر رہے تھے۔ وہ اسی زمانے میں دہلی میں آئے اور کشمیری دروازے کی ایک مسجد میں قیام تھا۔ وہاں عقیدت مندوں کی ایک

بھیڑ تھی۔ آزادی کے بعد میری حضرت مدنی سے ابھی کوئی ملاقات نہیں ہوئی تھی میں مفتی صاحب کے ہاں بیٹھا ہوا تھا مفتی صاحب نے بڑی سنجیدگی سے مجھ سے کہا حضرت مدنی آئے ہوئے ہیں کشمیری دروازے کی ایک مسجد میں قیام ہے آپ جاکر مل لیجئے۔ میں اس سے پہلے حضرت مفتی کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید کے دلی جذبات سے واقف تھا۔ آزادی کے بعد اس قیامت کے ہنگامے میں مجھے مولانا احمد سعید کا وہ لطیفہ یاد تھا کہ جب میں نے ان سے پوچھا تھا کہ حضرت یہ کیا ہوا؟ مولانا احمد سعید بڑے شگفتہ مزاج اور زندہ دل بزرگ تھے۔ برجستہ کہا

'میاں صاحب ہوا کیا ؎ پکائی کھیر تھی قسمت سے ہوگیا دلیہ'

میرا خیال تھا کہ حضرت مدنی سے مل کر بھی یہی بات چیت ہوگی اور آزادی کے بعد ان کے تاثرات معلوم کرسکوں گا۔ حضرت مفتی صاحب کے اکسانے سے میں بھی حضرت مدنی کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔ نوعمری ہی سے حضرت کا عقیدت مند اور ارادت مند تھا۔ سفر حضر میں بھی حضرت کا ساتھ رہ چکا تھا۔ دیوبند میں میں جب بھی گیا تو مدنی حضرت کے درِ دولت پر ان کے خوان نعمت پر کھانے میں شریک ہونے کا شرف بھی مجھے حاصل ہوا۔ مگر آج کی ملاقات کا رنگ ہی کچھ نرالا تھا۔ میں جوں ہی مسجد میں داخل ہوا تو حضرت کو میرے آنے کی اطلاع دی گئی۔ حضرت کی خدمت میں مجھے حجرے میں بلایا گیا۔ مجھے دیکھتے ہی حضرت پر ایک ایسی سخت کیفیت طاری ہوگئی کہ میں دنگ رہ گیا۔ فرمایا کہ تمہیں تو رسول کی شکل ہی سے بے تعلقی ہے۔ جس کو رسول سے اجنبیت ہو مجھے اس سے کیا واسطہ مجھے تم سے کلام و طعام بھی گوارا نہیں۔ میں حضرت کے اس غصے سے سخت پریشان اور نہایت پشیمان تھا۔ میرا وہی حال تھا کہ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن حضرت کے ساتھ ان کے عقیدت مندوں کا ایک مجمع تھا۔ سب کے چہروں پر ماشاءاللہ اللہ کا نور تھا۔ لیکن دلوں پر خوف و ہراس کا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے۔ یہ

وہ زمانہ تھا جب مولانا سعید اکبر آبادی جیسے جیّد عالم نے بھی شنوکرنا شروع کر دیا تھا حضرت مدنی کی اس ناراضگی اور خفگی نے مجھے بھونچکا کر دیا تھا۔ اس مجمع میں حضرت مولانا محمد میاں مرادابادی بھی تھے وہ مجھ سے بخوبی واقف تھے۔ حضرت مدنی کے اس رویّے سے وہ بھی کسی قدر متاثر تھے۔ جب میں حضرت مدنی کے حجرے سے بے حد پشیمانی اور نہایت پریشانی کے عالم میں باہر نکلا تو مولانا محمد میاں مرحوم بھی میرے ساتھ ہی حجرے سے باہر آگئے۔ مجھے دلاسا دیا۔ فرمایا حضرت سے ملے بغیر ہرگز نہ جائیے۔ میں نے تعجب سے کہا، اب ملنے کا کیا سوال ؟ کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں حضرت سے جوتے کھاؤں۔ مولانا محمد میاں مسکرائے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا کہ حضرت کا غصّہ آپ سے بربنائے محبّت ہے۔ ابھی میں حضرت سے کہتا ہوں کہ آپ اصلاح کا وعدہ کرتے ہیں کہ آئندہ آپ سنت کی پیروی کریں گے تب آپ ان کی دعائیں لے کر جائیے۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ مولانا محمد میاں مرحوم نے واپس جاکر حضرت سے میری خاص طور پر سفارش کی۔ حضرت مدنی خاموش ہو گئے۔ میں نے بڑے ادب سے مصافحہ کیا۔ پھر میری خیریت معلوم کی۔ لیکن سیاست کے سانحے اور دلّی کی نئی صورت حال پر حضرت نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ میں جب اس افتاد کے بعد مفتی صاحب کے ہاں اپنے وعدے کے مطابق حاضر ہوا تو مجھے دیکھتے ہی مسکرائے جیسے ساری صورت حال سے بخوبی واقف ہوں۔ پھر فرمایا کہیے کیسی گزری ؟ میں نے کہا حضرت ؎

چرا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی

فرمایا نہیں۔ اس میں پشیمانی کا کیا سوال۔ میں نے اپنی ساری افتاد سُنا ڈالی۔ فرمایا۔ یہ بھی ایک رنگ ہے۔ اچھا ہوا۔ آپ نے دیکھ لیا۔ پھر کچھ دیر دل جمعی اور تسلّی کی باتیں کرتے رہے لیکن حضرت مدنی کے بارے میں اس سے زیادہ ایک لفظ بھی نہیں کہا

ملک کی آزادی اور تقسیم کے سانحے کے بعد جہادِ آزادی کے سربراہ علماء میں سے اکثر

ذہنی پریشانی اور نفسیاتی پشیمانی میں مبتلا تھے۔ ان کا یہ یقین کہ ملک کی ساری خرابیاں اور ملت کے سارے مسائل کا واحد حل ملک کی آزادی ہے، اب چکنا چور ہو چکا تھا۔ اپنی فکری کج روی کا برملا اعتراف بڑا مشکل مرحلہ ہوتا ہے یہی مشکل ان حضرات کے سامنے پہاڑ بن کر آکھڑی ہوئی تھی لیکن دلوں کا چور کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی صورت میں ظاہر بھی ہو جاتا تھا، چند اکابر ملت البتہ ایسے ضرور تھے جو اس وقت اپنے اس مسلک پر سختی سے کاربند تھے کہ جب آگ لگ رہی ہو تو یہ سوال اُٹھانا کہ آگ کس نے لگائی ہے بے وقت کی راگنی ہے پہلے لگی ہوئی آگ بجھائی جائے پھر اس پر بحث اور گفتگو ہو کہ آگ کس نے لگائی اور کیوں لگائی تھی۔ ان حضرات نے جس ہمت مردانہ اور فکر عارفانہ کا مظاہرہ کیا وہ علمائے ہند کی تاریخ میں قابل فخر باب ہے۔ دلی میں مولانا حفظ الرحمٰن مفتی عتیق الرحمٰن اور مولانا احمد سعید انہی علمائے کرام میں سے تھے۔ مفتی صاحب نے اس زمانے میں اپنا یہ معمول بنا لیا تھا کہ وہ روزانہ نہایت پابندی کے ساتھ دن چھپے جمعیۃ علماء کے دفتر گلی قاسم جان پہنچ جاتے اور پھر رات کو کافی دیر سے اپنے مکان واپس تشریف لاتے۔ وہ اس نفسا نفسی کے زمانے میں مولانا حفظ الرحمٰن کے خصوصی مشیر اور ہمہ وقتی معاون تھے۔ اس تعاون مسلک اور اتحاد مزاج نے دونوں کو ایک دوسرے کا سچا رفیق اور مخلص رازدار بنا دیا تھا، کوئی بات کتنی ہی معمولی اور چھوٹی سے چھوٹی ہی کیوں نہ ہو مفتی صاحب مولانا حفظ الرحمٰن کے مشورے کے بغیر کچھ نہ کہتے تھے اور اسی طرح مولانا حفظ الرحمٰن ہر معاملے اور ہر مسئلے میں مفتی صاحب کے ایما کے بغیر کچھ نہ کرتے تھے۔ مولانا حفظ الرحمٰن اور مفتی صاحب کی پہنچ اس زمانے میں براہِ راست مولانا آزاد اور پنڈت جواہر لال نہرو تک تھی۔ اس پہنچ کے نتیجے اور پرواز کے انجام میں دلی کے بہت سے مسلمانوں کی کروڑہا روپیوں کی جائدادیں انھیں کسٹوڈین سے واپس مل گئیں اس کار خیر اور کامیابی نے ان حضرات کے حوصلے بلند اور حلقے کو وسیع کر دیا۔ مفتی صاحب اس بڑے محیط کا ایک ایسا چھوٹا سا مرکز تھے جس پر

بہت کم کسی کی نظر پڑتی تھی اور جچتی تھی۔ میں اس زمانے میں جامعہ کالج کا طالب علم تھا۔ مفتی صاحب کے بڑے صاحبزادے حافظ مجیب الرحمٰن عثمانی بھی جامعہ کالج کے طالب علم تھے وہ مجھ سے جونیر تھے لیکن جامعہ کی اقامتی زندگی میں جونیر اور سینیر میں چنداں فرق نہ تھا۔ اس لئے وہ میرے دوست اور بے تکلف ساتھی تھے۔ مفتی صاحب سے پہلے ہی سے ہمارے خاندانی مراسم تھے اور میں خصوصیت سے مفتی صاحب سے خوردی اور بزرگی کے تعلقات رکھتا تھا۔ اب مفتی صاحب کے صاحبزادے کی دوستی کے بہانے مفتی صاحب کی خدمت میں حاضری کے اور بھی نت نئے مواقع پیدا ہو گئے۔ مفتی صاحب اور مولانا حفظ الرحمٰن سے اکثر میں اپنے ذاتی معاملات اور جامعہ کے حالات پر گھنٹوں بحث اور گفتگو کیا کرتا تھا۔ جب مفتی صاحب کے صاحبزادے حافظ مجیب الرحمٰن عثمانی جامعہ کے اساتذہ میں شامل ہو گئے تو ان حضرات کی جامعہ سے دلچسپی اور واقفیت میں بہت کچھ اضافہ ہو گیا۔ ذاکر صاحب کے علی گڑھ چلے جانے کے بعد جامعہ سے ان کی بے تعلقی بہت ہی غیر متوقع تھی۔ میرا خیال تھا کہ اگر ذاکر صاحب آزادی کے بعد جامعہ کے اس تعمیری اور تعلیمی کام میں لگے رہتے جو وہ اس سے پہلے انجام دے رہے تھے تو یہ نہ صرف جامعہ کے لئے بہت اچھا ہوتا بلکہ اس سے ذاکر صاحب کی بلندی بھی مزید بلندیوں کا ذریعہ اور زینہ بن جاتی۔ مگر افراد کی طرح اداروں کی بگڑی قسمت کو کون بنا سکتا ہے۔ جب جامعہ کے اندرونی معاملات اور انتظامی صورت حال زیادہ بگڑنے لگی تو حضرت مفتی صاحب اور مولانا حفظ الرحمٰن اکابر جامعہ سے حرف شکایت زبان پر لائے بغیر نہ رہ سکے۔ بزرگان جامعہ نے اس پر چنداں توجہ نہ کی۔ اس سے یہ حضرات کافی دل برداشتہ اور جامعہ کی طرف سے مایوس ہو گئے۔ حضرت مفتی صاحب اپنے عقائد اور افکار میں دیوبند کے اکابر ہی کی طرح غیر متزلزل تھے۔ مگر معاملات اور انتظامی مسائل میں بہت دور رس نرم اور صلح پسند تھے۔ علماء دیوبند میں مفتی صاحب کا یہ امتیاز

ان کا خاص اپنا مزاج تھا جس کے متعدد مظاہرے میں نے بھی دیکھے اور ان سے بہت متاثر اور بہت مسرور ہوا۔ تمام علماء کے برخلاف مفتی صاحب اپنے مخالفین سے بھی اپنائیت تواضع اور ملنساری کا سلوک روا رکھتے تھے اور اس معاملے میں ہر طرح کی جانبداری سے بلند تھے جب دارالعلوم کا جشن منانے کا بڑے پیمانے پر اہتمام ہو رہا تھا تو مفتی صاحب ان سربراہوں میں سے تھے جو انتظامی معاملات میں سب سے زیادہ دخیل تھے۔ علماء دیوبند کو جماعت اسلامی کے مسلک سے سخت اختلاف تھا اور حضرت مفتی صاحب بھی جماعت اسلامی کے مسلک سے بہت واضح اختلاف رکھتے تھے لیکن جب مسز اندرا گاندھی نے ایمرجنسی کا نفاذ کیا تو جماعت اسلامی کے بہت ارکان بھی ملک کی دوسری فرقہ پرست جماعتوں کے رہنماؤں کے ساتھ تھوڑی سی مدت جیل میں رہے، اس قربت اور مدت جماعت اسلامی کے بعض اکابر پر یہ راز منکشف ہوا کہ علمائے دیوبند نے سیکولرزم کی حمایت کر کے ایک بڑا اہم اجتہاد کیا ہے اسی وقت سے جمہوریت اور سیکولرزم کے بارے میں جماعت اسلامی کے رویے میں کچھ معمولی تبدیلی آئی مفتی صاحب فرمایا کرتے تھے کہ ملک کی آزادی کے بعد سے مدتوں تک جو بات ہم جماعت اسلامی کو نہ سمجھا سکے وہ جیل میں چند دنوں میں ہندو فرقہ پرستوں نے ان کو سمجھا دی۔ مجلس مشاورت میں مفتی صاحب کے اسی رویہ نے جماعت اسلامی کے بہت سے ارکان کو اپنا ہم نوا بنا لیا اور جماعت اسلامی کے بہت سے اکابر مسائل اور معاملات میں مفتی صاحب سے صلاح لینے اور مشورہ کرنے میں کوئی جھجک اور تکلف محسوس نہ کرتے تھے اور پوری طرح مشاورت کے قائل ہو گئے۔ دارالعلوم دیوبند کے جشن منانے کے موقع پر وہاں ایک بازار لگانے کی تجویز پاس ہوئی تھی۔ جہاں لوگ عام ضرورت کی چیزیں خرید سکیں۔ اس بازار میں جماعت اسلامی کے حضرات بھی اپنی کتابوں کی دکان لگانا چاہتے تھے۔ دیوبند کے کٹر علما جماعت اسلامی کی کتابوں کی دکان کے خلاف تھے۔ اور یہ حضرات اپنے ہی اکابر کی کتابیں اس نمائش میں رکھنا، دکھانا اور بیچنا چاہتے تھے۔

حضرت مفتی صاحب نے ان حضرات کو یہ بات سمجھائی کہ اگر کچھ لوگ جماعت اسلامی کی کتابیں پڑھنا چاہتے ہیں تو اچھا یہی ہے کہ وہ اس کے لئے جماعتِ اسلامی کی دکان سے یہ کتابیں خریدیں اور ہم اپنی دکان پر ان کی کتابوں کی ذمہ داری نہ لیں ہم اپنے اکابر کی کتابیں اپنی دکان پر رکھیں تو نہ زیادہ اچھی بات ہے ۔ حضرت مفتی صاحب نے اپنے ذاتی اثر و رسوخ اور معاملہ فہمی سے مدرسہ کے مہتمم قاری محمد طیب صاحب کو بھی اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہاں جماعت اسلامی کی ایک دکان کھل جانے سے آپ کے مسلک اور مرتبے پر کوئی آنچ نہ آئے گی جس طرح چائے اور کھانے کی بہت سی دکانیں ہوتی ہیں ۔ اسی طرح اگر کتابوں کی بھی متعدد دکانیں ہوں تو اس پر کون سی اعتراض کی بات ہے چنانچہ یہ تدبیر کارگر ہوئی اور وہاں جماعت اسلامی کی کتابوں کی فراہمی کا ایک مرکز مہیا ہو گیا ۔

مفتی صاحب دارالعلوم کے لائق فرزندوں میں تھے ۔ وہ ان کے خاندان کے اکابر کو اس ادارے سے جو ربط اور تعلق تھا وہ دیوبند کی تاریخ کا ایک باب ہے ۔ لیکن کئی ایسے سخت مرحلے بھی آئے جب حضرت مفتی صاحب اور ان کے خاندان کے بزرگوں کو نہ صرف اس ادارے سے اختلاف کرنا پڑا بلکہ ہجرت کی سنت پر بھی عمل پیرا ہونا پڑا ۔ جب حضرت مفتی صاحب کے استاد حضرت کشمیری نے دیوبند سے ڈابھیل کی راہ لی تو اس وقت بھی مفتی صاحب شمع انوری کے پروانوں میں تھے ۔

ملک کی تقسیم کے بعد جب دیوبند پر ایک آزمائشی وقت پڑا ۔ دارالعلوم کے مہتمم قاری محمد طیب صاحب دیوبند سے بہت دور اور دیر تک ایک نئی تعلیمی بستی بسانے کی فکر میں کچھ دنوں کے لئے چلے گئے ۔ قاری صاحب کی عدم موجودگی میں دیوبند کے اہتمام کا مسئلہ اکابر علماء کے لئے ایک سخت مرحلہ بن گیا ۔ بعض حضرات نے قاری صاحب کی عارضی جدائی کو مستقل قرار دے کر نئے مہتمم کے انتخاب کی ضرورت محسوس کی اور دیوبند کے شیخ الحدیث حضرت مولانا حسین احمد مدنی کو بھی اس کے لئے آمادہ کر لیا ۔ اس سلسلہ میں

دہلی سے مولانا حفظ الرحمٰن اور مولانا بشیر احمد کٹھوری، حضرت مفتی کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید صاحب ایک کار لے کر دہلی سے میرٹھ پہنچے تاکہ دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے ایک رکن حکیم محمد اسحاق کٹھوری کو اپنے ساتھ دیوبند لے چلیں اور وہاں حضرت شیخ کو اس کے لئے آمادہ کریں کہ وہ مفتی عتیق الرحمٰن کو مدرسہ کا مہتمم بنانے کی تجویز پاس کریں۔ ان میں سے بعض حضرات نے جب یہ تجویز حکیم محمد اسحاق کے سامنے رکھی تو وہ سب کچھ سن کر خاموش رہے اور ٹس سے مس نہ ہوئے لیکن حکیم صاحب کے چھوٹے صاحبزادے حکیم محمد ادریس صاحب نے جو اس وقت اس گفتگو کے موقع پر وہاں موجود تھے۔ مولانا احمد سعید کے کان میں کہا کہ آپ ابا سے کہیں کہ مہتمم محمد اسد اللہ خاں بدایونی کو بنوادیں تاکہ جو کام مفتی صاحب چار دن میں کریں وہ مولوی اسد اللہ خاں دو دن میں پورا کردیں (مولوی اسد اللہ خاں حکیم صاحب کے بچوں کے اتالیق تھے۔ کانگریس کی تحریک میں بہت بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ ایک مخلص کارکن تھے لیکن انتظامی معاملات میں انھیں کوئی تجربہ اور کوئی دخل نہ تھا) مولوی احمد سعید صاحب نے یہ سُن کر قہقہہ لگایا اور دیر تک بے اختیار ہنستے رہے، دوسرے حضرات نے اس ہنسی پر استفسار کیا تو مولوی احمد سعید صاحب نے یہ راز کی بات سب سے کہدی کہ حکیم صاحب کے صاحبزادے میاں محمد ادریس کی تجویز مولوی اسد اللہ کو مہتمم بنانے کی ہے۔ اس پر دوسرے حضرات نے بھی خوب خوب لطف لیا اور مفتی صاحب کے اہتمام کی بات آئی گئی ہوئی جب یہ حضرات کار میں سوار ہو کر دیوبند روانہ ہونے کو تھے تو مولوی احمد سعید صاحب نے بطور مذاق حکیم اسحاق صاحب سے کہا کہ حکیم صاحب آپ پسند کریں تو مولوی اسد اللہ کو بھی ساتھ لے چلیں۔ اس پر حکیم صاحب بھی ہنس پڑے اور کار دیوبند کے لئے روانہ ہوگئی ـــــ دیوبند پہنچ کر حکیم اسحاق صاحب نے خلاف توقع حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی سے بڑے تند و تلخ لہجے میں کہا کہ قاری محمد طیب صاحب آپ ہی کی وجہ سے یہاں سے گئے ہیں۔ آپ ہی چاہتے ہیں کہ وہ یہاں نہ آئیں

سارے معاملات کی ذمہ داری آپ پر ہے۔ اور آپ چاہیں تو سب کچھ ٹھیک ہو سکتا ہے آپ قاری صاحب کو مدعو کریں تو وہ واپس آجائیں گے اور میں اس کی ذمہ داری لیتا ہوں۔ چنانچہ وہاں یہ بات طے پائی کہ قاری صاحب کو واپس بلوانے کے لئے حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کی اعانت خصوصی حاصل کی جائے اور قاری صاحب کو واپس بلوا لیا جائے چنانچہ مولانا آزاد کی ذاتی دلچسپی سے یہ کوشش بارآور ہوئی اور حضرت قاری صاحب واپس اہتمام پر آ گئے ؎

چمن میں پھر سے نسیم بہار آ پہنچی

تیسرا اور آخری سانحہ جس نے مفتی صاحب کو بہت بددل اور مایوس کر دیا وہ دارالعلوم کے جشن کے بعد قاری صاحب کی جانشینی کے مسئلہ کا آخری سین تھا جس نے اس ڈرامے کو ایک سخت اور عظیم المیے پر ختم کر دیا۔ ان دنوں جس طرح کے اختلافات نے سر اٹھایا اور پھر عالم اسلامی کی اس سب سے بڑی دینی اخلاقی اور روحانی اقدار کی حامل دانش گاہ نے جو برے دن دیکھے وہ اس دانش گاہ کیلئے سب سے بڑی روسیاہی اور رسوائی کا عظیم المیہ ہے۔ مجھے اس زمانے میں مفتی صاحب کی اس خوبی کا بخوبی مشاہدہ ہوا کہ وہ طوفان سے پہلے طوفان کے آثار سے طوفان کا کتنا صحیح اندازہ لگا لیتے ہیں۔ بُرائی کے واقع ہونے سے پہلے اس کی شدت کو اس کی علامتوں سے کس قدر صحیح ناپ لیتے ہیں۔ مفتی صاحب کی فہم و فراست میرے لئے ایک عجوبہ سے کم نہیں تھی۔ میرے لئے محترم اور مفتی صاحب کے ایک معتمد خاص عالم کو حکومت ہند نے ایک بڑے علمی اعزاز سے نوازا۔ میں اس تقریب میں اپنے محترم استاد ڈاکٹر عابد حسین مرحوم کے ساتھ شریک تھا۔ مفتی صاحب بھی اس خصوصی محفل میں تشریف رکھتے تھے۔ میں نے بڑی گرم جوشی اور نہایت تپاک سے مفتی صاحب کو مبارکباد دی اور مجھے یقین تھا کہ وہ میری اس مخلصانہ تہنیت سے بہت مسرور اور ممنون ہوں گے لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب مفتی صاحب نے کسی گرم جوشی یا خوشنودی کے اظہار کے بجائے ایک آہ سرد بھر کر آسمان پر نگاہ ڈالتے ہوئے مجھ سے

کہا خدا دارالعلوم کو ہر بلا سے بچائے۔ اس موقع پر مفتی صاحب کا یہ تاثر میرے لئے ایک عقدۂ لاینحل تھا کہ ایک عالم دین جو دارالعلوم کے فرزند تھے اور حضرت مفتی صاحب سے گہرے مراسم بھی رکھتے تھے حکومت نے ایک علمی اعزاز سے نوازا تھا۔ یہ بات تو خود دارالعلوم کے لئے باعثِ فخر اور مفتی صاحب کے لئے باعثِ مسرت ہونی چاہیے تھی مگر مفتی صاحب کا یہ رویہ انھیں ایک روحانی خانوادے سے متعلق کرنے کے علاوہ اور کچھ نہ تھا جو میں سمجھ سکتا۔ کچھ دن کے بعد حکومت نے اسی ادارے کے ایک اور فرزند کو ایک ایسے ہی علمی اعزاز سے نوازا اور مفتی صاحب کسی جلسے میں شرکت کے لئے بعض دوسرے علماء کے ساتھ بنگلور تشریف لائے اور مجھے اپنی ملاقات کا شرف عطا کیا۔ ایک خصوصی محفل میں میں نے پھر بڑی گرم جوشی سے اور انتہائی خلوص سے اپنا نذرانۂ تہنیت مفتی صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ میں متوقع تھا کہ وہ مسرور ہوں گے اور مطمئن۔ اب پھر مفتی صاحب نے کچھ تامّل سے ٹھنڈی سانس بھری اور مجھ سے فرمانے لگے کہ لوگ علامات قیامت سے قیامت کا اندازہ نہیں لگاتے۔ قیامت کے آنے کے منتظر رہتے ہیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک بڑا طوفان برپا ہونے والا ہے۔ خدا خیر کرے اور دیوبند کو نظرِ بد سے بچائے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مفتی صاحب اور بعض دوسرے علماء مسز اندرا گاندھی کے رویّہ سے سخت برہم اور بیزار تھے۔ جشن دارالعلوم کے موقع پر میں وہاں اپنی یونی ورسٹی کی جانب سے بطور نمائندہ تھا اور یہ محسوس کر رہا تھا کہ بظاہر یہ چھوٹا سا ادارہ عالم اسلامی میں کتنی اہمیت اور کس قدر وقعت کا حامل ہے وہاں میں نے وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی اور دوسرے ملکی قائدین کی تشریف آوری پر قدرے تعجب کا اظہار کیا تھا۔ مسز اندرا گاندھی نے اس جشن کے موقع پر دیوبند جاکر اس عظیم اجتماع کی کیفیت کا بچشم خود معائنہ کیا تھا لیکن اپنے تاثرات کو اپنے دل میں اس طرح چھپالیا تھا کہ کسی ذہن پر اس کا کوئی عکس نہ پڑ

سکے۔ اگر میرا قیاس غلط نہیں ہے۔ یہی وہ نقطۂ آغاز تھا جس نے بعد کو دیوبند میں ایک بڑے طوفان کی شکل اختیار کرلی۔ دلّی سے جو ہندوستان کا دل اور اس کی راجدھانی ہے کچھ دُور دیوبند کا یہ قصبہ اتنی اہمیت رکھتا ہے کہ اس کے ایک بوریہ نشین کے بلاوے پر عالم اسلام کی اتنی شخصیتوں کا اتنا بڑا اجتماع بھی ممکن ہے۔ ایک عربی مدرسہ کا بوریہ نشین اور عالم اسلام کی ایسی برگزیدہ اور ممتاز شخصیتوں کا میزبان؟ یہ تھا مفتی صاحب کا وہ خطرہ، وہ اشارہ وہ بھیانک خواب جس کی طرف وہ مجھے بار بار متوجہ کر رہے تھے اور میں ناآشنائے راز اس جشن کی کامیابی اس کی عظمت اور اہمیت پر خوشی کے مارے پھولا نہ سماتا تھا۔ میں جس قدر مطمئن اور مسرور تھا اور مفتی صاحب اتنے ہی ملول اور متاسف۔ میں وہاں سے لوٹا تو دیوبند اس کی عظمت اس کی روحانی اہمیت قاری صاحب کے حسن انتظام کے مناظر اور مظاہر ان کی مقبولیت اور عظمت کے نقوش میرے دل و دماغ پر بہاروں کی طرح رونق اور رنگینی کا سرمایہ اور سامان فراہم کر رہے تھے۔ لیکن مفتی صاحب کی دُور رس نگاہیں اس جشن کی تعمیر میں چھپی ہوئی اس تخریب پر جمی ہوئی تھیں جو کسی کے تصور میں نہ تھیں۔ میں نے اس جشن کے موقع پر مفتی صاحب کو جس قدر متاسف اور متحیر دیکھا اتنا کبھی نہ دیکھا۔ آخر کچھ دن کے بعد ایک دھماکہ ہوا ایک ایسا سیاسی زلزلہ آیا جس نے دیوبند کی روحانی اور اخلاقی قدروں کو آناً فاناً ملیا میٹ کردیا۔ یہ وہی زلزلہ تھا جس کا خطرہ اور خیال رمز و ایما میں مفتی صاحب نے کئی بار ظاہر کیا تھا۔ اس زمانے میں مجھے دہلی اور دیوبند، حیدرآباد اور بمبئی کے بہت سے عمائدین کی بہت سی انہونی باتیں اور ہوش رُبا روایتیں بہت سے معتبر اور مستند حضرات سے مجھے اس ادارے کی بلندی اور پستی کی وہ وہ باتیں اور گھاتیں دیکھنی اور سننی پڑیں جن کی علمائے دین سے نسبت بھی ان کی توہین ہے۔ اس بارے میں خود مفتی صاحب سے بھی مجھے کئی بار تبادلۂ خیال کی نوبت آئی اور میں نے محسوس کیا

کہ شاید ان کے تدبر سے اب یہ گتھی سلجھ جائے اور یہ معاملہ بگڑنے سے بچ جائے۔ ایک روایت جو درایت پر مبنی تھی یہ بھی تھی کہ حضرت مفتی صاحب نے حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب کو اہتمام سے دست بردار ہونے کے لئے آمادہ کرلیا ہے اور مولانا سعید احمد اکبرآبادی کو اہتمام کی ذمہ داری سونپے جانے کی بات پکی کرلی ہے۔ مگر مسلمانوں کے دارالعلوم کی قسمت میں جو روسیاہی مقدر ہوچکی تھی اسے نہ مفتی صاحب کی کوئی تدبیر روک سکی نہ علمائے کرام کا وقعت و وقار کا پہاڑ ریت کا ٹیلہ بننے سے بچ سکا۔ دین کے تقویٰ اور طہارت کے نمائندوں نے اپنے ہی بزرگوں کی رسوائی اور اپنے ہی اسلاف کی روسیاہی کا جو ثبوت اور سرمایہ فراہم کیا اس پر کون یہ کہنے سے باز رہ سکتا ہے ؎

تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

اس ادارہ ملّی کے نزاع نے حضرت مفتی صاحب کو حد درجہ ملول اور مغموم کردیا تھا مگر حضرت قاری طیب کے انتقال پر ملال نے انہیں یک سر امید کی روشنی سے محروم کرکے ناامیدی کے اندھیرے میں مبتلا اور مفلوج کردیا تھا۔ آخری بار ملاقات ہوئی تو اندازہ ہوگیا کہ گو مفتی صاحب بقید حیات ہیں مگر اب اس قید اور حیات دونوں کا دم واپسی ہے۔ یہ چراغ جو کبھی روشنی اور رونق رکھتا تھا اب صرف دھواں ہی دھواں رہ گیا۔ چند منٹ مفتی صاحب کی خدمت میں خاموش بیٹھ کر مجھے احساس ہوا کہ اب ان سے گفتگو کرنا یا کسی سوال کا جواب پانا اب ان کی روحانی اور ذہنی اذیت میں اضافہ کرنا ہے۔ میں خاموشی سے بغیر مصافحہ لئے اٹھا۔ ابھی مڑا بھی نہیں تھا کہ نہ معلوم کیسے اور کہاں سے مفتی صاحب کی گم شدہ قوت گویائی عود کر آئی، بے نور آنکھوں میں آخری بار روشنی کی ایک رمق بن کر چمکی جسم میں ایک جنبش خفی سی ہوئی، رک رک کر اتنا فرمایا کہ آتے رہیے۔ پھر اپنے آپ کو نہ

سنبھال سکے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ میں نے تسلی کے دو چار لفظ کہے۔ مزاج پرسی کرنے والوں نے ہمت دلائی متعلقین نے دلاسا دیا اور خدمت کرنے والوں نے انہیں آہستہ آہستہ لٹانے کی سعی کی۔ رُک رُک کر یہ کہنے کی کوشش کرتے رہے کہ میرے بعد بھی آتے رہیئے۔ میں لوٹ آیا اور پھر ہونے والی بات ہو کر رہی۔

آں قدح بشکست و آں ساقی نہ ماند

حضرت مفتی صاحبؒ سے میرے علمی تعلقات

از مولانا قاضی اطہر مبارکپوری

****

مشہور اسلامی رائٹر مولانا قاضی اطہر مبارکپوری کا پیش نظر مضمون اگرچہ حضرت مفتی صاحبؒ سے قاضی صاحب کے تعارف اور علمی قرابت و تعلق کے عنوان پر لکھا گیا ہے لیکن اس کا بیشتر حصہ اُن مکاتیب پر مشتمل ہے جو قاضی صاحب کی مختلف تالیفات سے متعلق وقتاً فوقتاً حضرت مفتی صاحبؒ نے خود تحریر فرمائے تھے اور حقیقتاً یہی خطوط و مکاتیب اس پورے مقالہ کی بہار جانفزا ہیں۔ یہ خطوط بجائے خود حضرت مفتی صاحبؒ کے نہایت حسین و دلپذیر اُسلوب نگارش کے آئینہ دار ہیں اور ان کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر زندگی کی فرصتوں نے مفتی صاحبؒ کو خالص علمی اور ادبی کاموں تک محدود رہنے کا موقعہ دیا ہوتا تو بلاشبہ ان کے ہاتھوں ادب و انشاء کا ایک تاج محل تعمیر ہو سکتا تھا اور علوم و معارف کے خزانوں میں ایک بیش بہا اضافہ ــــ مرتب

****

حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی دید و ملاقات کا

شرف مجھے زمانہ طالب علمی ہی سے حاصل تھا، اُن دنوں مدرسہ احیاء العلوم مبارکپور اپنے باحوصلہ اور متحرک ناظم استاذی مولانا حضرت شکر اللہ صاحبؒ کی وجہ سے علماء و فضلاء اور اربابِ سیاست کا مرکز بن رہا تھا۔ آئے دن علمی، مذہبی اور سیاسی جلسے جلوس ہوا کرتے تھے، جن میں حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب، حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب حضرت مولانا محمد اسمٰعیل صاحب اور دیگر علماء و مشاہیر آیا کرتے تھے، ان میں حضرت مفتی صاحب بھی ہوا کرتے تھے، اسی زمانہ میں ندوۃ المصنفین نیا نیا قائم ہوا تھا، اس کا مجلہ برہان اور وہاں کی مطبوعات پابندی سے مدرسہ میں آتی تھیں اور ہم ان سے استفادہ کیا کرتے تھے، جس کی وجہ سے حضرت مفتی صاحب اور وہاں کے مصنفین سے خصوصی عقیدت کا تعلق تھا۔

اسی دوران میں ایک مرتبہ ندوۃ المصنفین کے دفتر واقع قرول باغ میں حضرت مفتی صاحبؒ سے نیاز حاصل ہوا۔ میں جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مراد آباد میں تکمیل کے لیے ایک سال رہا، اور وہیں سے دہلی گیا تھا، چوں کہ زمانہ طالب علمی میں میرے اشعار اور مضامین رسالہ قائد، مراد آباد میں شائع ہوتے تھے جو ہمارے بزرگوں کی نظر میں وقیع اور معلوماتی ہوتے تھے، اس لیے حضرت مفتی صاحبؒ نے ازراہ بندہ نوازی مجھ سے فرمایا کہ برہان کے لیے مضامین لکھا کریں، میں کور کسر درست کر دوں گا۔

فراغت کے بعد مدرسہ احیاء العلوم میں تین چار سال تک مدرسی کی، پھر امرتسر گیا اور وہاں سے لاہور پہنچا، جہاں تقریباً تین سال رہا، اسی دوران میں ملک تقسیم ہوا اور لاہور جانا نصیب نہ ہو سکا کسی معقول جگہ کی تلاش تھی، کئی دروازوں پر دستک دی مگر کامیابی نہیں ہوئی، آخر میں مفتی صاحبؒ کو لکھا

کہ مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی مدرسہ عالیہ کلکتہ کے پرنسپل بنائے گئے، آپ ان کے پاس میرے لیے سفارش لکھ دیں تاکہ مجھے کوئی جگہ مل جائے۔ **مفتی** صاحبؒ نے جواب دیا کہ آپ میرے حوالے سے مولانا اکبر آبادی کو لکھیں اگر کوئی جگہ ہوئی تو آپ کو ضرور لے لیں گے، میں نے اس مشورہ پر عمل کیا اور مولانا اکبر آبادی صاحب کا جواب آیا کہ آپ کی درخواست آنے سے دو چار دن پہلے ایک صاحب کا تقرر ہو گیا ہے، اس لیے معذوری ہے۔ حضرت **مفتی** صاحب کے مشورہ پر میں کلکتہ تو نہیں جا سکا مگر بعد میں ان ہی کے مشورہ پر بمبئی گیا۔ تفصیل آگے آرہی ہے۔

مدرسہ عالیہ کلکتہ کی طرف سے ناامیدی کے بعد میں نے اس سلسلہ میں بعض اداروں اور جماعتوں کا چکر کاٹا مگر ہر طرف ناکامی رہی، ان ہی دنوں حضرت **مفتی** صاحب کے ہمدرس اور دوست مولانا محفوظ الرحمٰن نامیؒ (پارلیمنٹری سکریٹری حکومت یو، پی) کی نگرانی میں بہرائچ سے ہفتہ وار اخبار جاری ہوا جس کی ادارت مجھے مل گئی، مگر یہ اخبار ایک سال بھی نہیں چل سکا، جوں توں سال پورا کر کے جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں مدرسی کر لی۔ جہاں حضرت **مفتی** صاحبؒ اور ان کے اساتذہ شاندار تدریسی خدمت انجام دے چکے تھے، بلکہ ان ہی حضرات نے وہاں کے مدرسہ تعلیم الدین کو جامعہ اسلامیہ بنایا تھا، مگر یہاں بھی ایک سال سے زیادہ رہنا نصیب نہیں ہوا، آخر بمبئی جا کر پناہ ملی۔

صورت یہ ہوئی کہ جمعیۃ علماء صوبہ بمبئی کے روح رواں جناب حکیم اعظمی (مولانا حکیم فصیح اللہ خان صاحب اعظمی مرحوم) "زمزم" "لاہور اور" انصار" بہرائچ میں میرے اشعار و مضامین دیکھتے تھے اور ہموطن ہونے کی نسبت سے غائبانہ محبت رکھتے تھے، کبھی کبھی مراسلات بھی اشاعت کے لیے میرے پاس بھیج دیا

کرتے تھے، جب میں ہر طرف سے مایوس ہوگیا تو ان کو لکھا کہ میں بمبئی آنا چاہتا ہوں، آپ اس سلسلہ میں میرا تعاون فرمائیں۔ میرا یہ خط جمعیۃ علماء بمبئی کے دفتر میں جس وقت پہنچا حسن اتفاق سے وہاں حضرت مفتی صاحبؒ اور استاذی حضرت مولانا سید محمد میاں صاحبؒ بھی موجود تھے جو ایک وفد کے ساتھ حج کو جارہے تھے، ان دونوں بزرگوں نے حکیم اعظمی صاحب سے فرمایا کہ یہ شخص بڑے کام کا ہے، حالات سے مجبور ہے، آپ بلالیں، بمبئی جیسے شہر میں کوئی نہ کوئی مناسب جگہ مل ہی جائے گی، چنانچہ ان حضرات کے مشورہ کے مطابق حکیم اعظمی صاحبؒ نے مجھے بمبئی بلالیا، یہ واقعہ ۱۹۵۱ء کا ہے۔

اس کے بعد مسلسل ایسے حالات پیدا ہوتے رہے کہ مفتی صاحبؒ اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ بار بار بمبئی آتے رہے اور زیادہ زیادہ دنوں تک قیام کرتے رہے۔ روزنامہ "جمہوریت" کا اجراء ہوا جو جمعیۃ علماء کی پالیسی کا ترجمان تھا اور ان ہی بزرگوں کے مشورہ سے مجھے اس کے ادارۂ تحریر میں شامل کیا گیا اسی زمانہ میں جمعیۃ علماء ہند کی طرف سے انگریزی اخبار جاری کرنے کا منصوبہ تیار ہوا اور بمبئی سے زیادہ سے زیادہ تعاون کی صورت نکالی گئی نیز ہندوستان کے مسلمانوں کی طرح بمبئی کے مسلمانوں کے حالات الجھے ہوئے تھے اور طرح طرح کے معاملات و مسائل درپیش تھے، پورٹ حج کمیٹی بمبئی اور حج و حجاج کے معاملات تھے نیز ہنگامی اور وقتی مسائل پیدا ہوتے رہتے تھے اور حضرت مفتی صاحبؒ مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ کے مشیر خاص اور دست راست کی حیثیت سے بمبئی آیا کرتے تھے، دونوں حضرات ایک دوسرے کے رفیق محترم تھے، ان حضرات کا قیام مستقل طور سے بمبئی کے ایک بزرگ حاجی عبداللہ عرب سمکری مرحوم کے دولت کدہ واقع خان منزل، محلہ کھانڈیا میں ہوتا تھا حاجی صاحب

نہایت بزرگ ، نیک نفس اور علماء کے عاشق و خادم تھے نسلاً ہندوستانی تھے مگر پیدائش مکہ مکرمہ میں ہوئی تھی اور زندگی کا بیشتر حصہ اسی دیارِ پاک میں گزرا تھا ان کا لب و لہجہ عربیت لیے ہوئے تھا، میرا بھی ان سے خاص تعلق تھا۔ میری پہلی کتاب "حیات جمیلہ" انھوں نے دو ہزار کی تعداد میں چھاپ کر لوجہ اللہ مفت تقسیم کی تھی۔ حاجی عبداللہ عرب صاحب کے مکان پر ان دونوں حضرات سے ملنے لیے شہر اور باہر کے لوگ آیا کرتے جن میں اکثر اپنے اپنے معاملات پیش کرتے تھے اور کچھ لوگ بلاغرض ان حضرات کی مجلسی گفتگو میں شریک ہوا کرتے تھے ، یہ مجلسیں صبح دس بجے تک اور رات میں بارہ بجے تک رہا کرتی تھیں ، جن میں مختلف موضوعات پر علمی ، دینی ، سیاسی ، ملکی ، قومی ، جماعتی باتیں ہوتی تھیں ، ان خصوصی مجلسوں میں چند مخصوص اہل علم اور ارباب فہم و فراست شریک ہوتے تھے اور مختلف موضوعات پر کھل کر باتیں ہوتی تھیں جن کا عنوان خالص دینی و علمی ہوتا تھا ، میں عام طور سے کوئی موضوع چھیڑتا اور یہ حضرات اس کے بارے میں معلومات کے دریا بہاتے تھے اور پوری مجلس استفادہ کرتی تھی ، بمبئی کی یہ مجلسیں دینی و علمی اعتبار سے یادگار ہیں ، ان کے خصوصی شرکاء میں سے مولانا مفتی عبدالعزیز صاحب بہاری ، مولانا حکیم اعظمی ، جناب طاہر انصاری جناب محمد بیگ چغتائی ، حاجی عبداللہ صاحب سکری ، حاجی یحییٰ محمد زبیر صاحب مالیگانوی مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ اور **مفتی** صاحبؒ کی طرح اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے جوار رحمت میں رکھے اور مغفرت فرمائے۔ محترم مولانا مرزا سیف اللہ صاحب ، محترم مصطفےٰ فقیہ صاحب اور بعض دیگر حضرات بقید حیات رہ گئے ہیں جو ان یادگار مجلسوں کے امین ہیں ، اللہ تعالیٰ ان کو تادیر زندہ اور سلامت رکھے۔

اسی زمانہ میں جمعیۃ علماء ہند کے زیر اہتمام اور بمبئی کے مشہور و مخیر میمن خاندان محمد احمد برادرس کے زیر انتظام آل انڈیا دینی تعلیمی کانفرنس کا تاریخ ساز اجلاس صابو صدیق مسافر خانہ بمبئی میں ہوا جس میں پورے ہندوستان سے علماء و فضلاء اور اہل مدارس شریک ہوئے، اس دینی تعلیمی کانفرنس کے روح رواں **مفتی** صاحبؒ اور مولانا حفظ الرحمن صاحبؒ تھے اور اس کی کامیابی میں محترم الحاج احمد غریب صاحب اور ان کے تینوں بھائیوں کے مالی تعاون اور انتھک کوشش کو پورا پورا دخل تھا۔ اس سلسلہ میں رسالہ "البلاغ" بمبئی کا عظیم الشان تعلیمی نمبر نکالا گیا جو ہندوستان کے مدارس اسلامیہ کے لیے تاریخی دستاویز ہے۔ مہینوں پہلے سے **مفتی** صاحب اور مولانا حفظ الرحمن صاحب بمبئی تشریف لایا کرتے تھے اور ان کا قیام حاجی عبداللہ عرب بمکری کے یہاں ہوتا تھا، وہیں محفل جمتی تھی اور ہم لوگ اس میں بڑے ذوق و شوق اور باقاعدگی سے شریک ہوتے تھے۔

اس زمانہ میں میرے مضامین و مقالات بمبئی کے روزنامہ جمہوریت، روزنامہ انقلاب اور ماہنامہ البلاغ میں شائع ہوتے تھے اور حضرت **مفتی** صاحبؒ کی نظر سے گزرتے تھے، نیز **مفتی** صاحب اس صورت حال سے واقف تھے جو روزنامہ جمہوریت سے ترک تعلق کے سلسلہ میں پیدا ہوئی تھی اور مجھے بمبئی سے اکھاڑنے کی کوشش کی گئی تھی جس میں میرے بہی خواہ میری مظلومیت پر ترس کھا رہے تھے اور بدخواہ بغلیں بجا رہے تھے **مفتی** صاحب اس معاملہ میں وقتی طور سے میرے خیر خواہ تھے، اگرچہ اس سے ان کو کوئی تعلق نہیں تھا آخر میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا تاسیسی اجلاس بڑی شان و شوکت سے بمبئی میں ہوا جس میں دیگر حضرات کی طرح **مفتی** صاحب نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا

اور حضرت قاری محمد طیب صاحب کے وصال کے بعد اس کے صدر بھی بنائے گئے۔ مسلم پرسنل لا بورڈ کے سلسلہ میں بھی مفتی صاحب اکثر بمبئی تشریف لایا کرتے تھے، پھر حج کمیٹی کے نائب صدر ہونے کی حیثیت سے بمبئی آنا جانا رہا کرتا تھا، ان تقریبات میں مفتی صاحبؒ کو بہت قریب سے دیکھنے اور ان کے اوصاف و کمالات سے واقف ہونے کے مواقع ملے، چوں کہ مفتی صاحبؒ ایک مشہور و مستند علمی و تحقیقی اور تصنیفی ادارہ کے ناظم تھے اس لیے مجھے ان سے ملنے جلنے اور قربت حاصل کرنے میں علمی لذت محسوس ہوتی تھی مفتی صاحب بھی مجھے خصوصی التفات سے نوازتے تھے اور بڑی قدر و محبت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، میں اپنے چھوٹوں اور بڑوں سے ملنے جلنے میں بے تکلف ہوں مگر مفتی صاحب کے رکھ رکھاؤ، وضعداری اور خلوص و محبت کی وجہ سے میں ان سے بے تکلف نہ ہوسکا، بلکہ ان کے لطف و کرم کے سامنے شرمندہ ہی رہا کرتا تھا اور وہ میری شرمندگی کا احترام کرتے تھے، فرماتے تھے، آپ کے ہمارے تعلقات رسمی نہیں عزیزانہ ہیں۔

میرے علمی و تحقیقی اور تصنیفی کاموں کے زبانی قدر دان اور منہ پر تعریف کرنے والے اکابر و اصاغر میں بہت سے لوگ ہیں مگر حقیقی قدر دان صرف چند مخصوص بزرگ اور اہل علم تھے یعنی استاذی مولانا سید محمد میاں صاحبؒ مولانا ابوالوفا افغانی صاحبؒ صدر لجنۃ احیاء المعارف النعمانیہ حیدر آباد، مولانا شاہ معین احمد ندوی صاحبؒ دار المصنفین اعظم گڈھ، مولانا عبدالماجد صاحبؒ دریابادی اور مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحبؒ عثمانی ندوۃ المصنفین دہلی رحمہم اللہ، ان بزرگوں میں مفتی صاحبؒ نے ندوۃ المصنفین سے میری آٹھ کتابیں اپنے شاندار مقدمات کے ساتھ شائع کرکے عملاً میری

قدر دانی اور ہمت افزائی فرمائی، اس وقت میری کتابوں پر ان کے مقدمات سے کچھ عبارتیں نقل کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے جس سے ان کے میرے علمی تعلقات کی نوعیت معلوم ہوتی ہے، اس سے پہلے یہ ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ میری علمی نشو ونما بے آب وگیاہ صحرا کے اُس پودے کے مانند ہوئی ہے جو تیز دھوپ اور تُند جھونکوں میں رہ کر سرسبز وشاداب ہوا میں مدرسہ سے جیتا جاگتا دل ودماغ لے کر نکلا مگر کسی ادارہ یا شخصیت سے مجھے آگے کی راہ نہ مل سکی، اس کے باوجود اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم، اساتذہ کی دعا اور اپنی جد وجہد سے میں نے آگے بڑھ کر اپنی راہ نکالی اور جب چل پڑا تو دو شخصیتوں نے آگے بڑھایا۔ میری پہلی کتاب "رجال السند والہند" کو الحاج احمد غریب صاحب مرحوم (محمد احمد والاخوان المیمنین بمبئی) نے زرِ کثیر صرف کر کے مصری ٹائپ میں چھپوائی اور اس کتاب کی وجہ سے پورے ملک کے علمی حلقوں میں میرا تعارف ہوا۔ اس کے بعد حضرت **مفتی** صاحبؒ نے **ندوۃ المصنفین** سے میری کتابیں اپنے شاندار مقدمات کے ساتھ شائع کر کے میری علمی خدمات کو عام کیا۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر یہ دو شخصیتیں مجھے نصیب نہ ہوتیں تو میں اپنی کتابوں کی اشاعت کے سلسلہ میں ہاتھ پیر مارتا ہی رہتا۔

رجال السند والہند، القصد الثمین، اور الہند فی عہد العباسیین کے علاوہ میں نے اپنی کتابوں پر کسی سے مقدمہ، تعارف اور پیش لفظ نہیں لکھوایا مندرجہ بالا تینوں کتابوں پر بعض عرب علماء وفضلاء اور شعراء کے مقدمات میں انھوں نے بڑے حوصلہ اور انشراح سے میری محنت کی داد دی ہے ہمارے علماء میں یہ حوصلہ بہت کم ہے وہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے چند الفاظ وکلمات سے کتاب اور مصنف کی حیثیت اُن کے مقام ومرتبہ سے بہت زیادہ بڑھ جائے گی۔

اس لیے تنگ نظری اور بخل کی حد تک احتیاط کرتے ہیں، پہلی بات تو یہ تھی۔ دوسری بات یہ کہ ہم محنت کر کے کتاب لکھیں اور رات دن ایک کر کے اس کے نوک پلک درست کریں پھر دوسروں سے اس کا سرنامہ لکھوانے جائیں، یہ بات مجھے کچھ زیادہ پسند نہیں ہے، کتاب میں جان ہوگی تو وہ خود اپنا مقام بنا لے گی، ورنہ دوسرے کے مقدمہ کی مہمیز بے کار ہے، اس لیے **مفتی صاحبؒ** نے **ندوۃ المصنفین** کے ناظم اور ناشر ہونے کی حیثیت سے میری کتابوں پر جو کچھ لکھ دیا وہی میرے لیے کافی ہے اور ماشاء اللہ ایسا لکھا کہ شاید دوسرا کوئی عالم کتاب کی قدر و قیمت اور مصنف کی خدمت و محنت کا اعتراف اس قدر شاندار انداز میں نہیں کر سکتا تھا۔

اس سلسلہ میں ایک بات اور صاف کر دینی ہے، میں نے کبھی علم کو ذریعہ معاش نہیں بنایا، ملازمت کے زمانہ میں جو ملا لے لیا۔ حالاں کہ یہ زمانہ میری سخت آزمائش کا تھا۔ اسی طرح اپنی کتابوں کی قیمت وصول نہیں کی۔ جواز اور عدم جواز کی بحث سے یکسو ہو کر میرا یہ نظریہ رہا ہے اور اسی پر میں نے عمل کیا، ابتدائی دور میں لاہور میں ایک مختصر سی کتاب پر پچاس روپیہ حق تصنیف لیا تو آج تک یہ پتہ نہ چل سکا کہ چھپی یا نہیں، پھر یہ غلطی نہیں کی۔ حتیٰ کہ مصر اور پاکستان میں اس کی پیش کش پر صاف انکار کر دیا، یہی معاملہ **مفتی صاحبؒ** کے ساتھ بھی رہا، ان کی پہلی ہی پیش کش پر میں نے کوئی رقم لینے کے بدلے کچھ کتابیں لے لیں اور پھر یہی سلسلہ چلتا رہا، کتاب لکھ کر بیچنا اہل علم کی شان نہیں ہے، میں تو سمجھتا ہوں کہ اسی کی برکت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اتنا زیادہ دے دیا ہے کہ کتابوں کی رائلٹی سے اس کا عشر عشیر بھی نہیں مل سکتا تھا، یہ بھی ملحوظ رہے کہ میں جماعتی عصبیت، گروہی تحزب اور شخصیت پرستی سے دور رہا ہوں، اگر میں اپنی

کتابوں پر پیسے لینے کے چکر میں رہتا تو شاید ایک آدھ کتاب چھپ جاتی، باقی مسودے بہت سے اہل علم کی کاوشوں کی طرح کیڑے مکوڑوں کی نذر ہوجاتے اس لیے میں نے اپنی ہر کتاب آزاد رکھی ہے جس کا جی چاہے چھاپے۔

اب میری کتابوں پر مفتی صاحبؒ کے مقدمہ یا پیش لفظ کے کچھ اقتباسات ملاحظہ ہوں، اس سے اندازہ ہوگا کہ مفتی صاحبؒ میری کتابوں کے قدردان اس لیے نہیں تھے کہ میں ان کو مفت دیا کرتا تھا بلکہ اس لیے تھے کہ ان میں علم و تحقیق اور کد و کاوش تھی اور ان کا مصنف اس کا مستحق تھا، ساتھ ہی اس سے مفتی صاحب کے اسلوب تحریر، ادبی ذوق اور صاف ستھرے انداز بیان کا پتہ بھی چلے گا۔

(۱) سب سے پہلی کتاب "عرب و ہند عہد رسالت میں" ۱۳۸۴ھ، ۱۹۶۴ء میں ندوۃ المصنفین سے شائع ہوئی، مفتی صاحبؒ بمبئی تشریف لاتے تھے، میں نے مسودہ دیا اور کہا کہ اگر یہ کتاب ندوۃ المصنفین کے معیار و مزاج کے مطابق ہو تو شائع کردیں۔ مفتی صاحبؒ نے مسودہ ہاتھ میں لیتے ہوئے فرمایا کہ ضرور شائع ہوگی، آپ کی کتاب اور ندوۃ المصنفین کے معیار کے مطابق نہ ہو؟ پھر اسی سال شائع کردیا اور اس کے مقدمہ میں لکھا۔

> "عرب و ہند عہد رسالت میں" ندوۃ المصنفین سے شائع کرکے مجھے خاص مسرت ہورہی ہے۔ مجلہ "معارف" میں اس کے بعض ابواب کے مطالعہ کا اتفاق ہوا تھا اور اسی وقت سے خیال تھا کہ ایسی معلوماتی اور نفیس کتاب کی اشاعت اسی ادارے سے ہونی چاہیے شکر ہے کہ اس کا وقت آگیا، لائق مؤلف نے ان مقالات پر نہ صرف وسیع نظر ثانی کی ہے بلکہ متعدد ابواب کا اضافہ بھی کیا ہے اور

اس طرح اپنے موضوع پر یہ کتاب نادر معلومات کا گنجینہ ہوگئی ہے...
فاضل مؤلف عربی زبان کے بہت اچھے ادیب ہیں اور ان کا یہ ذوق
طبعی اور فطری ہے اس لیے قدرتی طور پر بہت سی پیچیدہ اور اجنبی
عبارتوں کا ترجمہ نہایت صاف اور بے تکلف کیا ہے۔

(۲) میری کتاب "اسلامی ہند کی عظمت رفتہ" کے مقدمہ میں لکھا کہ امید رکھنی چاہیے کہ موصوف کی تازہ ترین عربی تالیف العقد الثمین فی فتوح الهند ومن ورد فیها من الصحابۃ والتابعین کا اردو ترجمہ بھی اسی ادارے سے شائع ہوگا، اس طرح تاریخ کے ان گنجہائے گراں مایہ سے ہر طبقے کے لوگ استفادہ کرسکیں گے۔ اور اس کا افادہ عام ہوجائے گا، بڑھاپے میں قدرتی طور پر رخش عمر کی تیز گامی کا احساس بڑھ جاتا ہے، اس لیے خاص طور پر میری خواہش ہے کہ یہ علمی کام پہلی فرصت میں مکمل ہوجائے۔ الحمد للہ کہ مفتی صاحبؒ کی یہ آرزو پوری ہوگئی اور اس سلسلہ کی آخری کتاب پر بستر مرگ پر مقدمہ لکھوا کر دنیا سے گئے۔ جب "خلافت راشدہ اور ہندوستان" کے عنوان سے اس سلسلہ کی پہلی کتاب چھپنے کی باری آئی تو نہایت انشراح سے مفتی صاحبؒ نے مقدمہ میں لکھا۔

خوشی کی بات ہے کہ ندوۃ المصنفین کے لائق اور مخلص
رفیق مولانا قاضی اطہر مبارک پوری کی اہم تاریخی کتاب العقد الثمین
کا اردو ترجمہ جدید ترتیب و تہذیب سے آراستہ ہوکر ایک مستقل تالیف
کی صورت میں شائع ہو رہا ہے، موصوف نے بہت سی قیمتی معلومات
اور غیر معمولی اضافوں کے بعد کتاب کو تین جداگانہ حصوں میں تقسیم
کردیا ہے، پہلا حصہ یہی "خلافت راشدہ اور ہندوستان" ہے۔

باقی دو حصے "خلافت امویہ اور ہندوستان" اور "خلافت عباسیہ اور ہندوستان" اس کے بعد شائع ہوں گے۔ ان تینوں حصوں اور پہلی تین کتابوں "عرب و ہند عہد رسالت میں"، "ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں" اور "اسلامی ہند کی عظمت رفتہ" کی اشاعت کے بعد بے تکلف کہا جاسکتا ہے کہ عرب و ہند کے قدیم تعلقات کے موضوع پر یہ ذخیرہ ایک لاجواب تاریخی ذخیرہ بن گیا ہے اور اب اس کو گراں قدر اور بیش بہا علمی دستاویز کی حیثیت سے میدان تاریخ کی وسعتوں میں پیش کیا جاسکتا ہے۔.........

ایک بات بہرحال صاف ہے کہ فاضل مولف کی مسلسل محنت اور تلاش و جستجو سے عرب و ہند کے روابط کے بے شمار گوشے اپنی گوناگوں خصوصیات کے ساتھ سامنے آگئے ہیں۔ کتاب کے جستہ جستہ ٹکڑوں کے مطالعہ کے بعد مجھے یہ ظاہر کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں ہے کہ یہ سلسلۂ تصنیف وقت کی ایک بڑی ضرورت کو پورا کرے گا اور اعلیٰ علمی حلقوں میں اس کی اہمیت ہمیشہ کے لیے قائم ہوجائے گی۔

(۲) "خلافت امویہ اور ہندوستان" ۱۳۹۵ھ، ۱۹۷۵ء میں شائع ہوئی میں نے اس کا مسودہ ۱۳۹۲ھ میں دیدیا تھا مگر ہنگامی مشکلات کی وجہ سے اس کی اشاعت میں تاخیر ہوگئی، اس کے مقدمہ میں مفتی صاحب نے لکھا۔

عرب و ہند کے تعلقات پر اردو میں سب سے پہلے علامہ سید سلیمان ندوی ؒ کی کتاب شائع ہوئی تھی اور علمی حلقوں میں اس کو بہت سراہا گیا تھا۔ اس کی اشاعت کے پچاس سال بعد مولانا قاضی اطہر مبارک پوری نے اس میدان میں قدم رکھا اور واقعہ یہ ہے کہ تحقیق کا حق ادا کردیا

مولانا نے کئی سال کی مسلسل محنت اور تلاش وتحقیق کے بعد متعدد
کتابیں تیار کیں جو پچھلے چند برسوں میں ندوۃ المصنفین سے
شائع کی گئیں، "عرب و ہند عہد رسالت میں" اور "ہندوستان
میں عربوں کی حکومتیں" کی تالیف کے بعد موصوف نے اس
سلسلہ کو اور آگے بڑھایا، نہ صرف آگے بڑھایا بلکہ اس کو محققانہ
رنگ دے کر عرب و ہند تعلقات کے مختلف ادوار کی نشاندہی
کی، اس عرق ریز کوشش اور سلیقۂ ترتیب و تہذیب کا فطرتی نتیجہ
یہ ہوا کہ خلافت راشدہ سے عباسی دور تک کے ہندوستان اور
عرب کے تہذیبی، سماجی اور تاریخی روابط پوری طرح نکھر کر سامنے
آگئے اور تاریخ کے چہرے پر جو غبار جم گیا تھا وہ صاف ہوگیا ....
فاضل مولف نے ان بیانات اور مباحث کی ترتیب میں اموی دور
حکومت اور ہندوستان کے تعلقات کے مختلف گوشوں کو جس
دیدہ وری سے ایک لڑی میں پرونے کی کوشش کی ہے، اس کا صحیح
اندازہ کتاب کے مطالعہ ہی سے ہوسکتا ہے۔

(۴) خلافت عباسیہ اور ہندوستان ۱۴۰۲ھ، ۱۹۸۲ء میں شائع ہوئی، اس کا مقدمہ حضرت مفتی صاحبؒ نے بستر مرگ پر لکھوایا تھا جو غلطی سے کتاب کے آخر میں چھپ گیا ہے، اس سلسلہ کی یہ ان کی آخری تحریر ہے اور اسی کتاب پر اسلامی ہند کی عربی تاریخ نویسی کا سلسلہ بھی ختم ہوگیا۔

۱۹۶۵ء میں ندوۃ المصنفین سے "عرب و ہند عہد رسالت میں"
شائع ہوئی، اس کے بعد "خلافت راشدہ اور ہندوستان"، "خلافت
امویہ اور ہندوستان"، "ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں" اور

"اسلامی ہند کی عظمت رفتہ" کی اشاعت وقفہ وقفہ سے ہوتی رہی اور اب "خلافت عباسیہ اور ہندوستان" کی باری آئی ہے، اس طرح سترہ سال کی مدت میں ہندوستان کی خالص اسلامی عربی تاریخ پہلی بار نہایت محققانہ انداز میں سامنے آئی، ترتیب و تسلسل کا تقاضا تو یہ تھا کہ اس سلسلہ کی آخری کتاب "ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں" ہوتی جس کی اشاعت پہلے ہی ہو چکی ہے، بہرحال اس علمی و تحقیقی خدمت کے نتیجہ میں فاضل مؤلف مولانا قاضی اطہر مبارک پوری اور ادارہ ندوۃ المصنّفین دونوں ہی ایک قرضہ سے سبکدوش ہوئے واقعہ یہ ہے کہ موصوف نے اس ملک کی خالص اسلامی عربی تاریخ کے موضوع کو اپنی علمی و تحقیقی کاوشوں کا محور بنا کر جو کارنامہ انجام دیا ہے، وہ ہر اعتبار سے لائقِ تحسین ہے اور ان کی ان گراں قدر تصانیف کو اسلامی تاریخ کا بیش بہا اور نادر خزانہ کہا جا سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جناب مؤلف اس بے آب و گیاہ صحرا میں تنہا چلے اور جب منزل مقصود پر پہنچے تو اپنے ساتھ باغ و بہار کا ایک پورا قافلہ لے کر آئے .... "خلافت عباسیہ اور ہندوستان" بھی پچھلی کتابوں کی طرح تحقیق و تلاش کی تھکا دینے والی جد و جہد کا نتیجہ ہے اور کتاب ہر اعتبار سے معیاری ہے .... فاضل مؤلف نے اس کتاب میں خاص طور سے ہندوستان کے علم و علماء کے بارے میں بڑی کاوش کی ہے اور بتایا ہے کہ اس دور میں یہاں کے کن کن شہروں میں علماء و محدثین کے تعلیمی حلقے قائم تھے اور بیرونی ممالک میں کون کون حضرات علمی سرگرمی دکھا رہے تھے۔ کتاب کا یہ

حصہ اس لیے خاص طور سے قابل توجہ ہے کہ عام خیال کے مطابق
اس دور میں یہاں علم و علماء کی سرگرمی نہیں تھی، یہاں کے جو چند
اہل علم باہر کی دنیا میں رہے وہ کسی خاص مقام و مرتبہ کے حامل
نہیں تھے، کتاب کے اس حصہ کے مطالعہ کے بعد یہ نظریہ غلط ہوجاتا
ہے اور اس کے برخلاف یہاں کے علماء و محدثین کی کثیر تعداد اندر باہر
سرگرم تدریس و تصنیف معلوم ہوتی ہے، پچھلے چند ماہ سے مجھے امراض و
اسقام کے ہجوم نے گھیر رکھا ہے، قدیم رسم کے مطابق یہ چند سطریں
بطور مقدمہ کے لکھوادی ہیں۔"

(۵) ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں ۱۳۸۷ھ، ۱۹۶۷ء میں شائع ہوئی، اس کو "خلافت عباسیہ اور ہندوستان" کے بعد لکھنا اور شائع ہونا چاہیے تھا، میں نے اس کتاب کو ہر اعتبار سے معیاری بنانے کی بھرپور کوشش کی تھی، اور بڑی لگن اور محنت سے مرتب کیا تھا، **مفتی** صاحبؒ نے بھی اس کی اہمیت محسوس کی اور نہایت فراخدلی سے اس کا مقدمہ تحریر کیا۔ اس کے جستہ جستہ ٹکڑے ملاحظہ ہوں۔

"ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں" اپنی خاص نوعیت کے لحاظ سے پہلی
مفصل اور تحقیقی تصنیف ہے جس میں سندھ اور اس کے قرب و
جوار کی ان مملکتوں کی جن کو عام مورخ صرف مقامی اور صوبائی درجہ
دیتے ہیں مرتب اور تفصیلی معلومات مہیا کی گئی ہیں ....
اصل یہ ہے کہ ہمارے بڑے بڑے مورخ غزنویوں، غوریوں، خلجیوں
اور مغلوں کی شاہانہ شان و شوکت اور ظاہری آب و تاب میں کچھ
اس طرح گم ہو گئے کہ ان کے حافظہ سے اس کر و فر اور شان و شوکت کا

اصل سرچشمہ ہی محو ہوگیا، غور کرنے کی بات یہ ہے کہ خطۂ پاک سندھ
میں اگر داعیانِ اسلام کے قدم نہ جمتے اور یہ ریاستیں قائم نہ ہوتیں
تو بعد کے یہ ترقی یافتہ اور تابناک دور کہاں سے آتے؟ وہ سندھ
ہی کی نسیم جاں فزا تھی جس کے جھونکوں سے یہ بوٹے گل پھیلی اور
پورے ملک کے مشامِ جاں کو معطر کرگئی، فاضل مؤلف کے شوق و
جستجو اور ذوق تحقیق کی داد دینی چاہیے کہ انھوں نے عربی کی سیکڑوں
تاریخی کتابوں کے سمندر میں غوطے لگاکر یہ گوہر آبدار فراہم کیے اور
مہبط اول سندھ کی عظمت و سطوت کی ایک اعلیٰ درجہ کی تاریخ مرتب
کردی......... مجھے یہ ظاہر کرنے میں مسرت محسوس ہورہی
ہے کہ جناب مؤلف نے اپنی طاقت وصلاحیت کے مطابق کتاب
کو زیادہ سے زیادہ دل نشین اور مرتب و مہذب بنانے میں کوئی دقیقہ
اٹھا نہیں رکھا ہے، کسی بہتر سے بہتر کام کو بھی حرفِ آخر کا درجہ نہیں
دیا جاسکتا، اس لیے ممکن ہی نہیں عین اغلب ہے کہ جب کبھی نقش ثانی کی
باری آئے گی تو وہ نقش اول سے زیادہ بہتر اور زیادہ جامع ہوگا لیکن
اس وقت بھی جو کچھ ہے وہ فاضل مؤلف اور ندوۃ المصنفین
دونوں کی شان کے مطابق ہے......... حقیقت تو یہ ہے
کہ گرامی قدر مؤلف نے یہ کتاب لکھ کر پچھلے تمام مؤرخوں کو بار قرض سے
سبکدوش کردیا ہے، امید ہے کہ ہمارے تاریخی لٹریچر میں اس کتاب
کا اضافہ گراں قدر ثابت ہوگا، اہل علم اور اصحاب ذوق اس کی قدر
کریں گے اور کتاب کو قبول عام حاصل ہوگا۔

(٦) "اسلامی ہند کی عظمت رفتہ" ١٣٨٨ھ، ١٩٦٩ء میں ندوۃ المصنفین

سے شائع ہوئی ، یہ آٹھ مقالات کا مجموعہ ہے جو اسلامی ہند کی بعض اہم قدیم شخصیات اور یہاں کی اسلامی تاریخ سے متعلق ہیں ، اس کے مقدمہ کی ابتدا میں مفتی صاحبؒ نے مولانا ابوالکلام آزادؒ کے خطبہ (سیشن رام گڑھ ۱۹۴۰ء) کا ایک طویل اقتباس دے کر لکھا ہے۔

میری رائے میں زیر نظر مقالات کا یہ مجموعہ اور فاضل مؤلف کی پچھلی دونوں کتابیں "عرب و ہند عہد رسالت میں" اور "ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں" مولانا آزاد کے اس اجمالی بیان کی دل پذیر تشریح و تفصیل کرتی ہیں ، جن کو پڑھ کر اس ملک میں مسلمانوں کے بابرکت دور کے تمام نقوش ابھر کر سامنے آجاتے ہیں اور ان کے شاندار کارناموں کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے ، بے رحم سیاست اور تعصب و تنگ نظری کی ان اندھیریوں میں اس رنگ کی محققانہ تالیفات کا مطالعہ نہ صرف مسلمانوں کے لیے بلکہ ملک کے تمام صاف دل و دماغ رکھنے والے باشندوں کے لیے سرمۂ بصیرت کا کام دے گا ، اور اس سے بہت سی غلط فہمیوں کے بادل صاف ہوجائیں گے ، مجھے خوشی ہے کہ قاضی صاحب محترم کی یہ تینوں اہم تاریخی دستاویزیں ندوۃ المصنفین سے شائع ہوئیں۔

(۷) مآثر و معارف ۱۳۹۱ھ ، ۱۹۷۱ء میں شائع ہوئی ، یہ پچیس خالص دینی اور علمی مقالات کا مجموعہ ہے مفتی صاحبؒ نے اس کے مقدمہ میں بعض مقالات پر خاص طور سے اظہار خیال فرمایا ہے ۔ لکھتے ہیں۔

عام رواج کے مطابق کسی مؤلف کے متفرق مضامین کی یکجا اشاعت کا اہتمام اس وقت کیا جاتا ہے جب وہ تصنیف و تالیف کے دشوار

گزار مرحلوں سے گزر کر بحیثیت مصنف شہرتِ عام کی حدود میں داخل ہوجاتا ہے، اس لحاظ سے دیگر خصوصیات کے علاوہ جناب مولف کی یہ خصوصیت بھی غیر معمولی بلکہ لائق رشک ہے کہ ان کے مقالات کا مجموعہ جن کی تحریر کی ابتدا شاید ۱۹۴۹ء سے ہوئی ہے ندوۃ المصنفین جیسے بلند پایہ علمی ادارے سے شائع ہو رہا ہے، غالباً یہ ان کے قلم کی برکت اور خلوص کا نتیجہ ہے........ مقالوں میں ہر مقالہ اپنی خاص نوعیت کے اعتبار سے قیمتی معلومات کا خزانہ ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ مواد فراہم ہوجائے.... یہ چند سطور قاضی صاحب کی تعمیل حکم اور وضع قدیم کو باقی رکھنے کے لیے لکھی گئی ہیں کہ یہ کتاب بھی میرے مختصر تعارف سے کیوں خالی رہے؟ ان مضامین کے جستہ جستہ حصوں کے مطالعے کے بعد قلب نے جو بات محسوس کی وہ یہ ہے کہ انشاء اللہ اس علمی اور دینی ذخیرے سے اہل علم بھرپور نفع اٹھائیں گے اور عام اصحاب ذوق بھی، اسی احساس کا اثر ہے کہ یہ مجموعہ اس مشکل وقت میں اس قدر جلد شائع ہو رہا ہے۔

...... "تدوین حدیث" کے موضوع پر بے شمار مضامین اور ضخیم ضخیم کتابیں شائع ہوئی ہیں اور ہوتی رہتی ہیں جن کے مقابلہ میں اس چھوٹے سے مقالے کی نسبت وہی ہے جو قطرے اور سمندر میں ہوتی ہے، لیکن مقالہ نگار نے دریا کو جس کاوش اور سلیقے سے کوزے میں بند کرنے کی سعی کی ہے، اس کا اندازہ وہی حضرات کر سکتے ہیں جنھوں نے اس مسئلے کی تلاش وجستجو میں بڑی بڑی کتابوں کی خاک چھانی ہے۔

(۸) دیارِ یورپ میں علم و علماء ۱۳۹۹ھ، ۱۹۷۹ء میں شائع ہوئی، اس کے

نعارف میں مفتی صاحبؒ نے جو کچھ لکھا اس کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

قاضی صاحب نے "عرب و ہند عہد رسالت میں" "ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں" "خلافت راشدہ اور ہندوستان" "خلافت امویہ اور ہندوستان" جیسی تاریخی کتابیں لکھ کر علمی حلقوں میں اپنا لوہا منوالیا ہے اور اب ان کا شمار ہمارے ملک کے مستند مورخوں میں ہو گیا ہے۔ زیر نظر تالیف بھی مختلف حیثیتوں سے ایک اہم تاریخی تالیف ہے، اس میں ملک کے پوربی علاقوں الٰہ آباد، صوبہ اودھ، جون پور وغیرہ کے اصحاب علم و فضل اور ان کے علمی اور اصلاحی کارناموں کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے .... فاضل مؤلف مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے سالہا سال کی محنت اور تلاش و تیقین کے بعد ایک نفیس تحقیقی کتاب مرتب کر دی، مضامین پر سرسری نظر دوڑانے سے اندازہ ہوا کہ کتاب صرف خشک تاریخی واقعات کی کھتونی نہیں ہے بلکہ اس میں ان علاقوں کی سات سو سال کی علمی تاریخ کو فلسفہ تاریخ کی کسوٹی پر گھسنے کی کوشش کی گئی ہے، ہر دور کی حکومت اور اس دور کے اہل علم اور مشائخ کے روابط و تعلقات پر بھی سیر حاصل بحث کی گئی ہے، مضامین کی وسعت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ کتاب کی ترتیب میں کم و بیش پچاس کتابوں سے مدد لی گئی ہے اور کئی سو عنوانات قائم کر کے تحقیق کا حق ادا کیا گیا ہے۔

میری متعدد کتابوں پر حضرت مفتی صاحبؒ کے مقدمات اور ان اقتباسات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مرحوم نے کتنی وسیع النظرفی، عالی حوصلگی، اور علمی قدردانی کے ساتھ خورد نوازی کا مظاہرہ فرمایا ہے۔

میکدے سے اُٹھ گیا وہ ساقیٔ مینا بدوش

مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ

اسلاف کی روایات کے امین

(از مولانا محمد حنیف ملی۔ شیخ الحدیث معہد ملت مالیگاؤں)۔

حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے وصال سے دلّی کے اُن علماء کی بساط خالی ہوگئی، جو حرکت و عمل، دعوت و عزیمت، درد و کرب، ایثار و قربانی اور فکر و خیال کی اپنی طویل اور حسین تاریخ رکھتے تھے وہ میرِ ملّت اُٹھ گیا، جس نے ملّتِ اسلامیہ کو زندگی کا سبق دیا تھا، وہ پیرِ میکدہ اُٹھ گیا جس کی ذات سے توحید کے متوالے توحید کے جام ایک جہان کو تقسیم کرتے تھے۔ ہاں وہ مجاہد اُٹھ گیا جس نے ۴۷ء کے ہنگاموں سے ہند و پاک جنگ تک نہ صرف پامردی سے غیر مسلم جارحیت کا مقابلہ کیا بلکہ مسلمانوں کو حوصلہ نہ ہارنے کا سبق دیا، مفتی صاحب اسلاف کے دور کی آخری کڑی تھے، وہ اپنے والد بزرگوار کی فقہی بصیرت، تنقیح مسائل، گرہ کُشائی دُور بینی کے سچے وارث تھے، عثمانی خاندان کے وہ گوہر شب چراغ تھے، جن کی ضَو فشانی سے دُنیا ایک زمانہ تک کسبِ نور کرتی رہی، اُنھوں نے اپنے رفقاء کے

تعاون سے ایسے لکھنے والوں کی ایک ٹیم تیار کی جس کی تصنیفات دنیا ایک زمانہ تک یاد رکھے گی، وہ دارالعلوم کے اُن فرزندوں میں شمار ہوتے تھے جن کا نصب العین دارالعلوم کی ترقی کے سوا کچھ نہ تھا، ملتِ اسلامیہ انھیں ہندوستان کے معمار، تاریخ ساز، اور عہد آفریں علماء میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے گی۔ مفتی صاحب نہ صرف ایک عالمِ دین بلکہ برِصغیر میں نقد و افتاء، تصنیف و تالیف، درس گاہ و خانقاہ کے لئے پوری ایک سرگرم اور فعال نسل کے بانی تھے، انھوں نے اگرچہ تحریر و قلم کے میدان میں اپنے معاصرین میں زیادہ نہیں لکھا تاہم معرکے گرمائے، مجلسیں آباد کیں، اپنے فکر و شعور سے اُلجھے ہوئے مسائل کی گتھیاں سُلجھائیں، ہند اور بیرونِ ہند میں پوری دنیا کو ملت کی قدروں سے آگاہ کیا، اور قرطاس و قلم کا ذوق رکھنے والوں کے لئے تحقیق و ریسرچ اور مضامین کے نت نئے زاویے عطا کئے، اور گائیڈ ریسرچ کی حیثیت سے چھوٹے بڑے سب کو راہ بتائی، جس پر چل کر اُن ذخیر مصنّفین کو ان کی تصنیفات کے ذریعہ پورے ملک نے پہچانا، اور یہ وہ خدمت ہے جس پر لوگوں کی کم نظر جاتی ہے۔

ندوۃ المصنّفین اُسی زندۂ جاوید تحریک کا نام ہے، جسے مفتی صاحب نے اپنا لہو دے کر گُل رنگ بنا دیا ہے، اور آج جو ہندوستان کے ممتاز، معیاری اور ہمہ گیر اداروں میں شمار ہوتا ہے،

دلی نے اپنی زندگی میں لکھو کھا علماء دیکھے ہوں گے، لیکن ایسا جامع کمالات کے لئے وہ ہمیشہ ترسے گی، جس کی زبان تسنیم و کوثر کی طرح پاک و نفع بخش اور قلم نہایت سادہ، زود اثر اور سحر انگیز اور جس کے فکر و شعور کے سامنے ہمالیہ کی بلندیاں بھی خم ہوں جس کی اصابت رائے اور زود فہمی نے نازک موڑ پر بھی مسائل چشم زدن میں سلجھائے، حقیقت یہ ہے کہ مفتی صاحب علماء کے اس ہراول میں نقیب کی حیثیت رکھتے تھے،

وہ جنگِ آزادی کے صفِ اول کے مجاہد تھے، انھوں نے شعلے بھی برسائے اور شبنم ریزی بھی کی، خاروں کو گلے بھی لگایا، اور ملک وملت کے لئے اپنوں کی دوری بھی گوارا کی، ان کی زندگی میں ایک دلیر، بیباک، معاملہ فہم سرنکف اور دور اندیش مجاہد وطن کی تصویر دیکھی جا سکتی ہے، آزادی کے لئے حضرت شیخ الہند کے ایمار پر جب حضرت مدنی نے جہاد کا اعلان کیا تو دلی کے علماء میں مفتی صاحب نے سب سے پہلے یہ فتویٰ دیا کہ انگریزوں سے جنگ ناگزیر ہے، اور اب ایک مسلمان خاموش نہیں بیٹھ سکتا حضرت سحبان الہند کے بعد دہلی کے بلبل خوشنوا تھے، جن کے نام پر پورا شہر سمٹ کر گوش برآواز ہو جاتا تھا، وہ اعلیٰ دماغ روشن ضمیر اور حساس تھے، ان کی نگاہیں اداشناس اور انتہائی متحرک تھی، زبان انتہائی شیریں، جملے معنی خیز، ترکیبیں ہموار اور انداز بیان بڑا شستہ تھا، ان کی تقریریں، تکرار اور مہمل مضامین سے پاک تھیں۔ ڈیڑھ ڈیڑھ، دو دو گھنٹے کی لمبی لمبی تقریروں میں اُن کی شخصیت بادِ صبار اور موجِ کوثر پیش کرتی تھی۔ مخالفتوں اور شور سے بھرے ہوئے مجمعوں کو اپنی اداشناس نگاہوں، دل رُبا زبان اور معنی خیز غمزوں سے رام کرلینا مفتی صاحب کی زندگی کا انتہائی نمایاں وصف تھا، اُن کے معاصرین میں مولانا محمد طیب صاحب کے سوا کوئی نہ تھا، افسوس کہ یہ ملت اپنے اِن دونوں بزرگوں سے آج محروم ہے۔

مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی دارالعلوم کے اُن اولین سپوتوں میں ہیں جن پر یادِ علمی زندگی بھر یاد کرے گی۔ فراغت کے بعد اپنے بزرگوں کے اصرار پر انھوں نے برسوں باکمال اُستاد کی طرح دارالعلوم میں درس دیا۔ بعد میں حضرت شاہ صاحب کے ساتھ ڈابھیل آگئے، جہاں تدریس کے ساتھ افتاء کی ذمہ داری بھی قبول کرلی، کچھ دنوں کے بعد جب جنگِ آزادی شباب پر ہوئی تو مفتی صاحب بھی اس سرگرم تحریک میں اپنے بزرگوں کے ساتھ شامل ہو گئے، حکومت کے مظالم اور قید وبند کی تکالیف سے بے نیاز

مفتی صاحب نے ہر اس تحریک کو گرمایا جس میں اکابر کا لہو اور پسینہ شامل تھا، اور اُس وقت تک چین سے نہیں بیٹھے جب تک انگریز نے ملک نہ چھوڑ دیا۔ یہاں یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ آج جو لوگ بھی حکومت کی کرسیوں پر فائز ہیں، مفتی صاحب کی قربانیاں اُن سے کسی طرح کم نہیں ہیں، مگر چونکہ اس مرد درویش نے کبھی عہدوں کو پسند نہیں کیا اس لئے آزادی ملتے ہی تعمیری کاموں اور قومی کاموں میں مصروف ہو گئے تا آنکہ زندگی بھی اسی کے لئے قربان کر دی۔ بلاشبہ علم، ادب اور قوم و ملت کے میدانوں میں مرحوم نے اتنا زبردست کام کیا ہے جو جماعتوں اور اداروں کی زندگی میں کبھی کبھی ہوتا ہے، مرحوم حج کمیٹی کے مقبول ترین چیرمین بھی رہ چکے ہیں۔ ان کے دور کے کارنامے، حجاج کے لئے سہولت آج کے کام کرنے والوں کے لئے ایک نمونہ ہیں، وہ دار العلوم کی مجلس شوریٰ کے تاحیات باوقار رکن رہے۔ شوریٰ میں ان کے مشورہ کو بڑا وزن حاصل رہا۔ انھوں نے اس اہم ترین مجلس کی بارہا صدارت بھی فرمائی، اور آگے بڑھ کر عملی طور پر بہت سی ذمہ داریاں بھی قبول فرمائیں، وہ اپنے گہرے دوست مجاہدِ ملت مولانا حفظ الرحمٰنؒ صاحب کے فکر و عمل کی طاقت اور اُن کے کارناموں میں دست و بازو اور احساسات کے نقش جمیل تھے دار العلوم کی عظمت اور ترقی انھیں جان و دل سے زیادہ عزیز تھی، اخیر میں جو وقتِ نازک دار العلوم پر آیا مرحوم اخیر تک اس کے لئے کوشاں رہے، بلکہ یہی فکر ان کے لئے پیام اجل ثابت ہوئی۔

مفتی صاحب کا دل قوم و ملت کے درد سے بھرا ہوا تھا، ملک کے گوشے گوشے میں جب فسادات کی لہر چلی اور مسلمانوں کا قتل عام شروع ہوا تو ہندوستان کے مسلم علماء نے ساری مسلم تنظیموں کو یکجا کر کے وفاق بنایا اور مسلمانوں کے دلوں سے خوف و ہراس دور کرنے اور خود اعتمادی پیدا کرنے کے لئے مسلم مجلس مشاورت بنائی، پھر ملک بھر کا دورہ کیا، مولانا بھی اس کے بنیادی بانیوں میں تھے، ابتداء میں نائب صدر پھر عمر بھر اس کے صدر رہے، اس دورہ کی تقریروں کو تو ملک کا سمجھدار طبقہ کبھی نہیں بھولے گا۔ اسی زمانہ میں مشاورت

کا وفد، استاد محترم مولانا نعمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کوششوں سے مالیگاؤں بھی آیا جس کا شایانِ شان استقبال ہندو و مسلم سبھوں نے کیا، مفتی صاحب بھی وفد میں شریک تھے، رات میں مشاورت چوک میں جلسۂ عام ہوا، اس وقت جن مقررین نے دلوں کو مسحور کیا۔ مفتی صاحب بھی ان میں سرفہرست ہیں۔ اُن کی وہ باتیں آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہیں اُنھوں نے فرمایا تھا:

"ہم مسلمان ہیں، خوف و ہراس ہماری فطرت نہیں ہے، ہم خدا کی ذات پر اعتماد رکھتے ہیں، اور یہ یقین بھی رکھتے ہیں کہ فرقہ پرستوں کی طرف سے جو حالات پیدا کر دیئے گئے ہیں کہ وہ خدا کا اٹل فیصلہ اور مسلمانوں کے لئے امتحان ہیں، جس کا بڑا سبب خود ہماری غفلت ہے، لیکن اس کا ایک مؤثر سبب، ملک کی تقسیم ہے، جس کے متوقع اندیشوں کی نشاندہی ہم نے کی تھی۔ ہم نے اُس وقت بھی ملک کی تقسیم کی مخالفت یہ کہہ کر کی تھی کہ ہندوستان ایک مشترکہ ہبہ ہے، جسے (ہبہ مشاع) کہتے ہیں، اور مشترکہ ہبہ کی تقسیم بے سود ہوتی ہے، جیسے کوئی مشترک چارپائی کو حقداروں میں تقسیم کر لے، تو کسی کے حصہ میں بان، کسی کے حصے میں ڈنڈے اور کسی کے حصہ میں پایہ آئے گا، جو کسی کے لئے بھی مجموعی چارپائی کے مقابلے پر مفید نہیں ہے، مگر افسوس کہ برادرانِ وطن کے ساتھ ہمارے رہنماؤں کو بھی یہ بات سمجھ میں نہ آسکی، بہرحال آج ہم اس مسموم فضا کو بدلنے اور فرقہ پرستی کا مقابلہ کرنے کے لئے اس کا پیغام لے کر اُٹھے ہیں، ہم اگر ایک طرف انتشار پسند طاقتوں کو وارننگ دے رہے ہیں تو دوسری طرف مسلمانوں کو یاد دلاتے ہیں کہ یہ ملک ان کا بھی ہے، اس کی سالمیت کے ذمہ دار یہ بھی ہیں، اس لئے خوف و ہراس، دل سے

نکال کر ملک کو ترقی دینے اور فرقہ پرستوں سے نظر ملانے کی صفت اپنے اندر پیدا کریں، مشاورت آپ کو یہی پیغام سُنانے آئی ہے ہم نعمانی صاحب کے مشکور ہیں کہ ان کے ذریعہ اپنا دردِ دل آپ کو سُنا رہے ہیں۔"

مفتی صاحب کی اس تقریر سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں صاف گوئی اور بےباکی کے ساتھ کس قدر بے تکلفی تھی، وہ جس بات کو ضروری سمجھتے دوستوں اور بےگانوں میں اس کا ذکر ضروری سمجھتے تھے، اُن کی تقریریں مداہنت اور خوشامدانہ طرزِ گفتگو سے خالی ہوتی تھی، اسی وصف کی بناء پر حکومت نے علماء میں ان پر اعتماد کیا، اور نازک ترین موقعوں پر حکومت کے اجلاس یا ریڈیو سے انھوں نے قوم و ملت کی نمائندگی بڑی خودداری کے ساتھ کی، لیکن نہ اپنی انفرادیت، اور اسلامیت کا سودا کیا اور نہ اس پر کوئی آنچ آنے دی، مولانا کی سینکڑوں ریڈیائی تقریریں خودداری اور مقبولیت کی ناطق عدل ہیں، جسے انتقال سے سال بھر پہلے ندوۃ المصنفین نے "منارِ صدا" کے نام سے شائع کیا ہے، اور اس میں کیا شک ہے کہ یہ نشری تقریریں منارِ صدا کے ساتھ صدائے منار بھی ہیں، یہ تقریریں وقت کی پکار، غمِ دوراں کا علاج، سرمایۂ تسکین، تاریک راہوں میں شعاعِ امید، مایوسیوں میں حوصلہ بخش، دیدہ و دل کے لئے فسانۂ عبرت، ہندستان کے بزرگوں کی دل افروز داستان، مسلمانوں کی قربانیوں کا سچا تذکرہ، جمہوریت کی سچی تعبیر ..... زخموں کے لئے مرہم، پیاسی رُوحوں کے لئے آبِ زلال، یہ چمن انسانیت کے لئے سامانِ سرور، اور پورے ملک اور حکومت کے لئے انمٹ لازوال نقوش ہیں، جسے مفتی صاحب نے دردِ دل اور نورِ ضمیر کی آمیزش سے ملک کے سارے باسیوں کے سامنے پیش کیا ہے، قرطاس و قلم کے ساتھ زبان و خطابت کی دُنیا میں مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا وہ دلپذیر اور جامع عطیہ ہے جس پر اسلامیانِ ہند کا سر فخر و سرور سے ہمیشہ اُونچا رہے گا۔

مفتی صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی قدآور اور مقبول ترین شخصیت کی عظمت کا دل پر
اُس وقت بہت گہرا اثر ہوا جب دو پڑوسی ملک ایک دوسرے سے برسرپیکار تھے'
اِن دنوں میں معہد ملت کے چند طلبہ کو لے کر انٹرویو کے لئے دلی گیا ہوا تھا، ہند پاک
مختلف محاذ پر جنگ میں مصروف تھے، مسلمانوں کے لئے زندگی اجیرن بنی ہوئی تھی ،
بے چارے مسلمان تقسیم کا طعنہ سن رہے تھے ، دلی افواہوں کی آماجگاہ اور میدان بنا ہوا
تھا، دلی کی سڑکوں پر مسلمانوں کا نکلنا مشکل تھا، خطرہ کا سائرن ، اور بلیک آؤٹ
کی تان بے چارے و نادار ہندوستانی مسلمانوں پر ٹوٹ رہی تھی ، پاکستانی جاسوس
کے نام سے مسلمانوں کو نہ صرف جیلوں میں بھرا جا رہا تھا بلکہ بُری طرح مارتے بھی تھے'
مسلم رہنماؤں میں مفتی صاحب ہی تنہا تھے، جو بیک وقت کئی محاذوں پر حکومت کو
مطمئن کرنے اور مسلمانوں کو پُر امن رہنے کی تلقین کر رہے تھے ، انتہائی مشکوک اور
خون آشام ماحول میں حکومت کے شدید اصرار پر مفتی صاحب ریڈیو سے مسلمانوں کو پُر امن
رہنے کی تلقین کر رہے تھے ۔ انھیں فکر تھی تو اس بات کی کہ اس سنگین حالت میں کس طرح
مسلمانوں کے خلاف بدگمانی پھیلانے والوں کو بے نقاب کیا جائے ، ان آنکھوں نے
دیکھا کہ ایک نحیف و نزار معمر جسم میں عنفوانِ شباب کی تیزی اور ایسی گرمی بھر دی گئی ہے
کہ وہ ہندو مسلم اتحاد اور ملک کی سالمیت کے لئے سیماب کی طرح بے قرار ہے ، ان
کی سرگرمی کو دیکھ کر بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۹۴۷ء میں جب دلی جل رہا تھا، مسلم محلے
نشانہ پر تھے، اور گاندھی جی نے برت رکھا تھا تو اس تازہ دم جوان عالم دین کا کیا حال
رہا ہوگا، اور اپنی مظلوم ملت کے لئے جانے کتنی بے قراری رہی ہوگی ، سچ ہے آج وہ
مردِ مجاہد اٹھ گیا، جو آڑے وقت میں مسلمانوں کو پامردی، صبر و سکون کی تلقین کرتا
تھا، اور ہر وقت مسلمانوں کی اشک شوئی بھی کرتا تھا۔ ہند پاک جنگ کے وقت ہم
لوگ مفتی صاحب سے ملنے کے لئے آئے تو وہ حد سے زیادہ پریشان اور آزردہ خاطر تھے

مجھے دیکھتے ہی فرمایا کہ دلّی کے حالات بڑی تیزی سے بگڑ رہے ہیں، آپ حضرات کو بہت دور جانا ہے، جتنی جلد ہو، یہاں سے روانہ ہو جائیں، ورنہ ریلوے لائنوں کے بند ہو جانے کا بھی اندیشہ ہے۔ مفتی صاحب نے بڑی محبت سے اپنی دعاؤں کے ساتھ ہمیں رخصت فرمایا۔

مفتی صاحب مرحوم کم گو مگر فعال، سنجیدہ مگر سرگرم، اور نبض شناس تھے ان کی پیشانی کی شکنیں ہمہ وقت معنی خیز نتائج کی متلاشی ہوتی تھیں، وہ عمر بھر دارالعلوم کی شوریٰ کے معزز رکن رہے، اور ہر نازک موقعہ پر دارالعلوم کی عظمت و وقار کے لئے سینہ سپر رہے، ان کی اصابتِ رائے کا یہ عالم تھا کہ ارکانِ شوریٰ نہ صرف یہ کہ ان کے مشوروں کی قدر کرتے تھے، بلکہ اُسے اختیار بھی کرتے تھے، پچھلے دنوں جب دارالعلوم کا آفتاب گہن میں آیا اور اقتدار کے الاؤ نے اسلاف کی قدروں کو بھی نشانہ بنایا تو وہ مفتی صاحب ہی تھے کہ اخیر تک دارالعلوم کو اس سنگین صورتِ حال سے بچاتے ہیں لگے رہے، لیکن جب پانی سر سے اونچا ہو گیا اور اب دارالعلوم کے در و دیوار خون فشاں ہونے لگے تو مفتی صاحب نے ممبر شوریٰ رہنے کے باوجود علیحدگی اختیار فرمالی، اور دریافت کرنے پر بھی اظہارِ خیال سے گریز کرتے رہے۔

پچھلے دنوں امارتِ شرعیہ بہار و اڑیسہ کی عمارتوں کے سنگِ بنیاد کے موقع پر مفتی صاحب بھی تشریف لائے تھے، رات کے جلسۂ عام میں لوگوں نے تقریر کے لئے اصرار کیا تو بڑی مشکل سے کرسی پر آئے، اور گلوگیر ہو کر فرمایا آج جبکہ دارالعلوم نرغۂ داروگیر میں پھنسا ہوا ہے، آخر ہم آپ کے سامنے کیا عرض کریں۔ جب ہم جیسے جبہ و دستار رکھنے والے علما خود وقار و انانیت کے لئے دارالعلوم کی عظمت کو تج کر رکھے ہوئے ہیں، ان حالات میں ہم کس منھ سے آپ حضرات کو نصیحت کریں، مرحوم تھوڑی دیر خاموش رہے پھر امارت شرعیہ کی خدمات، مولانا سجاد رحمۃ اللہ علیہ کی قربانیوں، حضرت امیر شریعت

اور قاضی شریعت کی سرگرمیوں کا بڑے دلنشیں انداز میں تذکرہ فرمایا، اور پھر تقریر ختم کردی، حقیقت یہ ہے کہ جن بزرگوں نے دارالعلوم کو خونِ جگر دے کر پروان چڑھایا تھا۔ ان میں مفتی صاحب سرفہرست ہیں۔ شاید اسی فکر کا اثر تھا کہ اخیر میں فالج جیسے جان لیوا مرض میں مبتلا ہوکر ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگئے۔ خدا اُن کے درجات بلند فرمائے۔ (آمین)

مفتی صاحب مرحوم کے مولانا نعمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بڑے قریبی اور دیرینہ مراسم تھے، وہ بارہا مولانا کی دولت کدہ پر معہد ملت کے جلسۂ تقسیم اسناد اور تقریب ختم بخاری میں بھی تشریف لا چکے ہیں، یہ ان کی خورد نوازی ہے کہ ہم نیازمندوں پر شفقت کی نظر رکھتے تھے، مولانا نعمانی صاحب کی علمی اور دینی سرگرمیوں کو بڑی قدر کی نظر سے دیکھتے تھے، تعلیمی امور میں مفتی صاحب نے معہد ملت کو مہاراشٹر کا ندوہ بتاتے ہوئے اس کی ترقی کے لئے دعائیں بھی دی ہیں۔ مولانا نعمانی صاحب نے بھی مفتی صاحب کی شخصیت سے فائدہ اٹھانے میں کوئی کسر نہیں رکھی، ہندپاک جنگ کے وقت جب نعمانی صاحب گرفتار ہوئے تو ان سطروں کے راقم نے مفتی صاحب کو بذریعہ تار گرفتاری کی اطلاع دی۔

مرحوم نے یہ اطلاع پاتے ہی کہ مولانا گرفتار ہوگئے ۔ فوراً شاستری حکومت کو یاد دلایا کہ نعمانی صاحب جیسا نیشلسٹ مسلمان کی گرفتاری جمہوریت کی پیشانی پر بدنما داغ ہے۔ مفتی صاحب کی کوششیں رنگ لائیں، اور مولانا نعمانی صاحب سب سے پہلے رہا ہوگئے۔ رہائی کے وقت مرحوم نے مجھے جو خط لکھا تھا اس سے دونوں بزرگوں کے گہرے روابط کا پتہ چلتا ہے، ملاحظہ فرمائیں :-

مخلص و مکرم مولانا محمد حنیف صاحب، السلام علیکم،

"گرامی نامہ ملا، نہایت مسرت ہوئی، ہم لوگ مولانا کی گرفتاری سے

کافی پریشان تھے، ممکن کوشش بھی کر رہے تھے، جیسے ہی آپ کا خط پہنچا سعی میں لگ گئے تھے، ہمایوں کبیر صاحب نے بھی اس سے دلچسپی لی تھی، نندہ جی کو بھی لکھا گیا تھا، بہت اچھا ہوا آپ نے بروقت اطلاع کردی ورنہ شاید کل پرسوں میں نندہ جی سے ملاقات کا پروگرام تھا، یہاں میر مشتاق احمد صاحب نے بھی چند ناموں کی سفارش کی تھی، ان میں ایک نام مولانا کا تھا، بے شک حارث صاحب، فقیہ صاحب اور عابد صاحب نے بھی پوری کوشش کی ہوگی، عابد بھائی خاص طور پر معتمد ہیں۔ مولانا سے سلام کہیے، اور مبارکباد دیجئے، ساتھیوں کا کیا رہا، توقع ہے کہ وہ بھی رہا ہوگئے ہوں گے، حکام کو بہرحال ایسا غیر محتاط قدم نہیں اٹھانا چاہیے، اس سے عام مسلمانوں پر سخت ناگوار اثر پڑتا ہے، آپ کے پہلے خط کے جواب میں ضرورت سے زیادہ تاخیر ہوگئی، معذرت خواہ ہوں، یقین ہے کہ آپ سب احباب بخیر وعافیت ہوں گے، کہ ان تینوں طلبہ کو بھی سلام پہنچے۔"

عتیق الرحمٰن عثمانی

دسمبر ۶۵ء

سنجیدگی کے ساتھ بے باکی اور صاف گوئی مفتی صاحب کا امتیاز تھا، جب پرسنل لا میں مداخلت کے ارادے سے حکومت کے ذمہ داروں نے بیان دینا شروع کیا تو مفتی صاحب نے مالیگاؤں میں معہد ملت کے جلسہ تقسیم اسناد میں خطاب کرتے ہوئے حکومت اور حکام کو بڑی سخت وارننگ دی تھی جس سے اس مردِ مجاہد کی غیرت، دلسوزی اور حق گوئی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

انھوں نے فرمایا: "حکومت پرسنل لا میں مداخلت کے ارادے سے باز آجائے

ورنہ مسلمان اپنی شریعت کی حفاظت کے لئے بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہیں کریگا۔ دستورِ ہند کا احترام نہ صرف عوام بلکہ حکومت کے لئے بھی ضروری ہے، جس میں ملک کے تمام باسیوں کو مذہبی آزادی کی ضمانت دی گئی ہے۔ حکومت پرسنل لا میں مداخلت کے لئے نام نہاد اور ننگ نام مسلمانوں کا بار بار نام نہ لے، وہ مسلمانوں کا رہنما نہیں ہے مسلمانوں کے رہنما دارالعلوم دیوبند اور علماء کرام ہیں، حکومت مسلمانوں سے ایسے گھناؤنے مذاق کرکے ان کی دل آزاری کر رہی ہے، وہ یہ سُن لے کہ مسلم پرسنل لا خدا کا بنایا ہوا قانون ہے، جس میں کسی تبدیلی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔"

افسوس کہ آج انتہائی بے باکی، جرأت اور صفائی سے مسلمانوں کے کیس کو پیش کرنے والے مخلص وکیلوں کی ضرورت ہے، مفتی صاحب ہمارے گھروں کے آخری سپوت تھے اُن کے وصال سے وہ زرّیں کڑی بھی ختم ہوگئی، جو مسلم مسائل کے لئے مسلمانوں کو جوڑنے کا کام کرتی تھی۔

بلاشبہ اِس دورِ قحط الرّجال میں مرحوم مسلمانوں کے لئے گوہر شب چراغ، خدا کی نشانی، اور شکستہ دلوں کے لئے ڈھارس تھے، ان کے وصال سے بزم اور رزم دونوں سونی رہے گی، بلاشبہ ایسی نادرۂ روزگار ہستیاں ہمیشہ پیدا نہیں ہوتیں جو اپنا راحت و آرام تج کر ملّت کے مسائل کو حل کرنے میں دیوانہ اور مصروف ہوں، سچ ہے ؎

؎ اب نہ آئے گا نظر ایسا کمالِ علم و فن • گو بہت آئیں گے دُنیا میں رجالِ علم و فن

مفتی صاحب انتہائی منکسر مزاج ذہین دُور اندیش، اور تعمیری فکر رکھنے والے انسان تھے، ان کی تعمیری اور علمی سرگرمیوں کے بے شمار نقوش ملک میں دیکھے جا سکتے ہیں، قومی اور ملی مسائل سے دلچسپی کے ساتھ ساتھ ان کا سب سے بڑا کارنامہ ندوۃ المصنفین کا قیام ہے، جس نے ملک کو سنجیدہ اور اچھے لکھنے والے دیئے، جہاں سے ان کی

سرپرستی میں سینکڑوں معیاری متوازن اور قابلِ قدر اور اہم کتابیں بڑے اہتمام سے شائع ہوتی رہی ہیں، اور ماہنامہ برھان تو اُن کے علمی تدبر اور حسنِ تدبر کا شاہکار ہے، جو مسلسل ۴۰ سال سے اُن کے قریب ترین رفیق حضرت مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی کی ادارت میں نکل رہا ہے، اور جو برِ صغیر میں اپنے سلجھے تحقیقی علمی مقالات ومضامین کی وجہ سے صفِ اوّل کے رسائل میں شمار ہوتا ہے ندوۃ المصنفین ۴۷ء کے ہنگامے میں لُٹ گیا تھا، لیکن مفتی صاحب نے ہمت نہیں ہاری، اور بڑی پامردی سے انتہائی سنگین حالات میں اسے باقی رکھا، جس کی شہرہ آفاق تصنیفات کو دیکھ کر ایک مردِ آہن، مستقل مزاج اور سرگرم ترین رندِ مشرب کی قربانیاں یاد آتی ہیں۔

خدا بخشے مفتی صاحب کو کہ انھوں نے اس ادارہ کو قائم کر کے فضلاءِ دیوبند کے نہ صرف بار کو ہلکا فرمایا بلکہ ایک بڑی غلط فہمی جو دلوں میں پیدا ہو رہی تھی اُسے دُور کر کے بتادیا کہ زبان وقلم پر کسی کا اجارہ نہیں ہے، بلکہ یہ بزم مے ہے جو آگے بڑھے گا جام اس کا ہوگا، اس میں وراثتِ صاحبزادگی، کوئی معنی نہیں رکھتی۔ ندوۃ المصنفین کا قیام مفتی صاحب کی وہ زرّیں خدمت ہے جس پر انشاء اللہ اُن کی خدا کے یہاں مغفرت ہو جائے گی۔

میں خوش نصیب ہوں کہ مفتی صاحب سے معہد ملت کے علاوہ مختلف علمی و تعلیمی تقریبات میں نیاز حاصل ہوتا رہا، ملاقات پر زیادہ دن گذر جانے پر مراسلات سے یکمی پوری کر لیتا تھا وہ ہم لوگوں کے محترم بزرگ تھے، اس سال کے اخیر میں معہد ملت کے بعض بچوں کو جب ندوہ داخل کرنے کے لئے لکھنؤ گیا تو واپسی میں عیادت کی غرض سے مفتی صاحب کے دیرِ دولت پر بھی حاضر ہوا۔ اُس وقت مولانا فالج میں مبتلا تھے لیکن ہوش وحواس سب قائم تھے۔ مفتی صاحب کے داماد مولانا اظہر صدیقی نے جب

میرے آنے کی اطلاع دی تو مرحوم نے مجھے اور میرے دوست منظور پہلوان کو پیار بھرے لہجہ میں اندر بلالیا۔ہم لوگ پردہ ہونے کی وجہ سے تامّل کر رہے تھے تاہم میں اندر گیا، مفتی صاحب مکان کی ایک جانب پلنگ پر آرام کر رہے تھے، میں نے انھیں سلام کیا، انھوں نے بیماری کے باوجود مجھے پہچان لیا۔سرہانے بیٹھ کر میں نے ان کی مزاج پرسی کی، مفتی صاحب نے خود ہی نعمانی صاحب مرحوم کے حادثۂ وفات کا ذکر کیا اور زار و قطار رونے لگے، اور فرمایا کہ :۔

> "نعمانی صاحب ہمارے بزرگوں میں بڑے باکمال سادہ اور بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ان کی محبت تھی کہ ہم لوگوں نے برسوں وطن سے ہزاروں میل دُور رہ کر جمعیت کے کاز کو آگے بڑھایا، معہد ملت اور آپ حضرات ان کا بڑا کارنامہ ہے۔"

اور آخر میں جو نصیحت فرمائی وہ دل پر ہمیشہ نقش رہے گی۔

فرمایا :۔

> "معہد ملت مولانا نعمانی رح کی قربانیوں کا پیکر جمیل ہے، جسے مرحوم نے خونِ جگر دے کر پروان چڑھایا ہے، اس کی حفاظت اور آبیاری مولانا قاضی عبد الاحد صاحب ازہری اور آپ کی بنیادی ذمہ داری ہے۔"

میری خوش بختی تھی کہ انتقال سے چند ماہ پہلے مفتی صاحب سے نیاز حاصل ہوا پھر میں آخر میں سلام اور دعا کی درخواست کے بعد رخصت ہوگیا۔

کسے معلوم تھا کہ اپنے وقت کا باکمال اور عبقری انسان چند مہینوں کے بعد پوری ملت کو سوگوار چھوڑ جائے گا۔خدا مرحوم کی بال بال مغفرت فرمائے، جنت میں اُن کے درجات بلند فرمائے، اور علماء کو ان کے مشن پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔مسلم یونیورسٹی کی انتظامیہ ہو یا مجلس شوریٰ، مجلسِ مشاورت ہو یا پرسنل لا بورڈ، ندوۃ العلماء ہو یا ندوۃ المصنفین

سب جگہ مفتی صاحب کے وصال کا شدید احساس رہے گا۔ سچ یہ ہے کہ حفظ الرحمٰن کے مشن، مولانا مدنی رح کے کاز، شیخ الہند کے اصولوں اور مسلکِ دیوبند کا نقیب بن کر اب ہماری صفوں میں سچی ترجمانی کرنے والے کوئی نظر نہیں آتا، آخر یہ کس کی جدائی ہے کہ سارا ماحول سُنسنی اور فضا خاموش ہے۔ شاعر نے خوب کہا ہے ؎

ہلی جاتی ہے دنیا رنگ محفل میں تغیر ہے ٭ یہ دامن جھاڑ کر کون اٹھ گیا ہے آج محفل سے

آج بھی مفتی صاحب رحمتہ اللہ علیہ چشم تصور میں سمائے ہوئے ہیں۔ روشن پیشانی ہموار بینی، کتابی چہرہ، اکہری بھوئیں، گوری رنگت، موزوں اندام، سفید ریش متجسس نگاہیں، ماتھے کی شکنیں معنی خیز، سر پر بارعب مخملی ٹوپی، شیروانی میں ملبوس خوش پوش، بدن پر ململ کا سادہ اور ڈھیلا ڈھالا کرتا مشرقی تہذیب اور دلی کی ٹکسالی زبان کے خوگر، وسیع دماغ، ان کی مجلس اسلاف کا نمونہ، پوری ملت کے غم خوار، سب کا حال جاننے کے لئے بے قرار، گفتگو کے دوران میں اکابر کی سادگی، بلا شبہ ان کے وصال سے دل کی وہ بساط لپیٹ دی گئی جس کے دم سے قلم وزبان کی آبرو ملت کے لئے سیماب اثری قائم تھی۔

افسوس مسلکِ دیوبند اور فکر ولی اللّٰہی کا مؤثر نقیب اٹھ گیا۔ شاید ہی مستقبل قریب میں ایسا فرزند ملت پیدا کرسکے جو ان تت نئے محاذوں پر پوری ملت کی انتہائی بے نیازی اور جرأت و صاف گوئی کے ساتھ وکالت کر سکے۔ جہاں اندیشے اور لالچ پختہ فکر رکھنے والوں کو مات کر دیتی ہے۔

مُفکّرِ ملّت

مفتی عتیق الرّحمٰن عثمانیؒ

ایک مخلص رہنما اور علم دوست کی حیثیت سے

از محمد ظفیر الدّین مفتاحی
مفتی دارالعلوم دیوبند

دارالعلوم دیوبند نے ہر دور میں بڑے قیمتی لعل و گوہر انسان پیدا کیے، جن کی علمی، دینی اور سیاسی خدمات سے ایک دُنیا پُرشور رہی، جہاں گئے اپنے اخلاص اور جوشِ عمل سے چھا گئے، اور جب وہ ہمارے درمیان نہیں رہے تو ایسا معلوم ہوا کہ ایک دمکتا نور تھا جو غائب ہو گیا، اور علم و عمل کا ایک آفتاب تھا جو غروب ہو گیا۔

فرزندانِ دارالعلوم دیوبند کے انہی روشن چاند و سورج میں مفکر ملّت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کی بھی شخصیت تھی، آپ ایک باشعور علمی خاندان کے چشم و چراغ تھے، اور دیوبند کے مشہور ترین علماء میں آپ کا شمار ہوتا تھا، دیوبند میں ہی پیدا ہوئے، یہیں نشو و نما ہوئی، اور شروع سے آخر تک مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند میں ہی تعلیم حاصل کی، پہلے حفظ قرآن کی دولت سے مالا مال ہوئے، پھر فارسی درجات کی تکمیل کی، اور سند حاصل کی اور آخر میں عربی کا پورا نصاب ختم کر کے فاضل دارالعلوم ہوئے۔ حدیث آپ نے اس وقت کے سب سے مشہور عالمِ دین محدث العصر حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ سے پڑھی، جو اپنے زمانہ میں یکتائے روزگار شمار ہوتے تھے، اور چلتے پھرتے کتب خانہ کہے جاتے تھے۔

مفتی صاحب کا پورا خاندان علم وعمل سے سرشار تھا، آپ کے دادا مولانا فضل الرحمٰن عثمانی ان چند افراد میں تھے، جنھوں نے دارالعلوم قائم کیا تھا اور جو دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے اولین اراکین میں شامل تھے، آپ کے والد ماجد اپنے وقت کے مفتی اعظم اور عارف باللہ تھے، اور وہی دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے مفتی ہوئے، یعنی حضرت مولانا مفتی عزیزالرحمٰن عثمانی رح، شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی رح اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی رح آپ کے حقیقی چچا تھے، مفتی صاحب انہی اہلِ علم اور صاحب فضل وکمال کی گودوں میں پل کر جوان ہوئے تھے، اور کتاب وسنت کی دولت حاصل کی تھی۔

کوئی شبہ نہیں مفتی صاحب ذہانت وذکاوت اور بیدار دماغی میں ممتاز تھے اور بڑا بلند مقام رکھتے تھے، پدر بزرگوار کی کیمیا اثر نگاہ نے قلب ودماغ کو مجلّیٰ کر دیا تھا، اور اخلاص اور خدا ترسی سے معمور کر دیا تھا، جس دور میں آپ نے دارالعلوم میں تعلیم حاصل کی تھی، وہ دارالعلوم کا دورِ شباب تھا، اس کے در و دیوار سے اللہ اللہ کی صدا آتی تھی اور بانیٔ دارالعلوم حجۃ الاسلام حضرت نانوتوی اور آپ کے تلمیذ رشید شیخ الہند مولانا محمود حسن کے انوار سے اس کا ذرّہ ذرّہ پُر نور تھا،

فراغت کے بعد حضرت مفتی صاحب رح مادر علمی میں بحیثیت عربی استاذ مسند درس وتدریس پر فائز ہوئے، اور تمرین افتاء میں اپنے والد بزرگوار سے تربیت پائی، نتیجہ یہ ہوا کہ نظر وسیع اور گہری ہوتی چلی گئی، پھر اپنے استاذ محترم حضرت کشمیری رح کے ساتھ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل تشریف لے گئے اور وہاں عرصہ تک درس وتدریس اور کار افتاء انجام دیتے رہے، آپ نے یہ دونوں خدمت انجام دیتے رہے، آپ نے یہ دونوں خدمت پوری محنت اور دلی لگن سے انجام دی، اور اہل علم میں شہرت پائی۔

ہندوستان میں سیاسی انقلاب آیا۔ انگریزی حکومت کے خلاف جدوجہد شروع

ہوئی تو کہا جاتا ہے کہ اس زمانہ میں آپ نے انگریزی حکومت کے خلاف کوئی فتویٰ دیا، جس کی وجہ سے ارباب جامعہ نے آپ پر کوئی پابندی عاید کی، تاکہ ان کا مدرسہ حکومت کی زد میں نہ آسکے، مگر مفتی صاحب کو یہ پابندی بھی علمی خودداری اور کار افتاء کی عظمت کے خلاف نظر آئی، اور وہاں سے ملازمت کا تعلق ختم کرلیا۔

اس کے بعد کچھ دنوں کے لیے کلکتہ جاکر درس قرآن دینے لگے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ڈابھیل مدرسہ سے علیحدہ ہونے کے بعد آپ نے عزم کرلیا تھا کہ ملازمت کا طوق گردن سے ہمیشہ کے لیے نکالنا پھینکنا ہے، کہ اس میں علمی خودداری کا خون ہوتا ہے اور ذہن و فکر کی جولانی پہ پہرہ بٹھادیا جاتا ہے، جس سے ایک صاحب علم کی نشو و نما گھٹ کر رہ جاتی ہے اور وہ احساس کمتری کا غیر شعوری طور پر شکار ہوجاتا ہے۔

چنانچہ مفتی صاحبؒ نے اپنے چند احباب کے ساتھ مل کر غالباً ۱۹۳۷ء میں ایک تصنیفی ادارہ کی بنام خدا داغ بیل ڈالی، جس کا نام ندوۃ المصنفین دہلی تجویز ہوا، پھر اس تصنیفی ادارہ سے ایک معیاری علمی و دینی ماہنامہ برہان دہلی کے نام سے جاری فرمایا، جس کی ادارت کا فریضہ مولانا سعید احمد اکبرآبادی فاضل دیوبند ایم۔اے کے سپرد ہوا کوئی شبہ نہیں یہ علمی رسالہ بڑی آن بان سے نکلا، اور آج تک اسی پابندی کے ساتھ نکل رہا ہے۔

اسی کے ساتھ تصنیف و تالیف کا کام بھی شروع کردیا گیا، چونکہ یہ حلقہ علماء دیوبند کا پہلا باضابطہ تصنیفی ادارہ تھا، اس لیے اس وقت کے تقریباً تمام نامور و مشہور علمائے دیوبند معاون بن گئے، مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمن سیوہارویؒ، مولانا سعید احمد اکبرآبادی، مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی مولانا حامد الانصاری غازی، حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلومؒ یہ سارے کے سارے حضرت کشمیریؒ کے فیض یافتہ اور تلامذہ تھے، ان کی تصانیف نے ندوۃ المصنفین دہلی کو حیات دوام بخش دی، اور

ایسا کیوں نہ ہوتا کہ یہ تمام علماء اپنے علم و عمل میں آفتاب و ماہتاب کی حیثیت کے مالک تھے۔
چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ندوۃ المصنفین سے پہلے سال جو کتابیں شائع ہوئیں،
ان میں حکیم الاسلام کی تعلیمات اسلام اور مسیحی اقوام، مجاہد ملت کی اسلام کا اقتصادی نظام
اور مولانا اکبر آبادی کی اسلام میں غلامی کی حقیقت جیسی معیاری کتابیں نظر آتی ہیں۔
مفتی صاحب نے اپنے ذمہ تصنیف و تالیف کے بجائے انتظام کی ذمہ داری رکھی
جو سب سے صبر آزما خدمت تھی، اور جس میں خون جگر پینا پڑتا ہے، سرمایہ کی فراہمی، کتابوں
کی کتابت و طباعت اور ان کی نکاسی، مصنفین سے وقت پر کام کی تکمیل کرانا۔
ندوۃ المصنفین دہلی سے جس وقت یہ کتاب پہلے سال ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئی
ہیں، اس وقت خاکسار ایک ابتدائی عربی متعلم کی حیثیت رکھتا، مگر چونکہ مطالعہ کا ذوق
تھا اور نئی کتابیں بہت شوق سے پڑھتا تھا، ۱۹۴۰ء میں یہ کتابیں حاصل کرکے پڑھیں،
تو ایسا معلوم ہوا کہ دل و دماغ روشن ہوگیا، اس علمی خدمت کا ملک کے گوشہ گوشہ میں
خیر مقدم کیا گیا، اور ہر اہلِ علم نے اس خدمت دینی، علمی پر مفتی صاحب کو مبارک باد
پیش کی۔
۱۹۴۴ء میں جب خاکسار نے درسیات سے فراغت حاصل کی، تو تصنیف و تالیف
کا ذوق ابھر آیا، اس وقت خاکسار مدرسہ مفتاح العلوم مؤ ضلع اعظم گڈھ میں تھا اور
دورۂ حدیث محدث جلیل حضرت الاستاذ مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی دامت فیوضہم اور
مولانا عبداللطیف نعمانی رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھ رہا تھا، اور اب تک تحریر سے زیادہ
تقریر کا شوق تھا، اولاً حضرت الاستاذ مولانا اعظمی مدظلہٗ سے درخواست کی کہ مجھے
دار المصنفین اعظم گڈھ میں کچھ دنوں کے لیے رکھوا دیں، جس کی سعی حضرت والا نے فرمائی
اور اسی زمانہ میں مفتی صاحب کو بھی میں نے خط لکھا، کہ دیکھیں وہاں سے کیا جواب آتا ہے
حالانکہ اس وقت تک نہ دہلی کے دیکھنے کی نوبت آئی تھی اور نہ مفتی صاحب کی صورت

دیکھی تھی، نہ مفتی سے کوئی استاذی شاگری کا رشتہ تھا، بس دیوانگی تھی، مگر مفتی صاحب نے جواب لکھا، اس وقت وہی خط پیش کرنا ہے، جس سے ندوۃ المصنفین پر روشنی پڑتی ہے، پورا خط ملاحظہ فرمائیں۔

برادر مکرم دام مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ کرم نامہ دو تین ہفتے ہوئے موصول ہوا تھا جواب میں تاخیر ہوگئی، آپ کے ذوق علمی اور شوق تحریر کا حال معلوم ہو کر دلی مسرت ہوئی، اللہ تعالیٰ آپ کی صلاحیتوں سے ملّت کو استفادہ کا موقع مرحمت فرمائے۔

ایسے ہی ناسازگار حالات ہوتے ہیں، جن سے مسلسل ٹکرانے کے بعد بڑے بڑے ولولے سرد ہو جاتے ہیں، اور ابھرنے والی امنگوں پر پانی پھر جاتا ہے، دلی آرزو ہے اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے مقاصد میں کامیاب فرمائے، اور ان کی تکمیل کی کوئی راہ کھل جائے۔

جہاں تک ندوۃ المصنفین کا تعلق ہے، یہاں سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ ہم چند کارکن ہیں اور ہر ایک اپنے کام میں اس طرح غرق رہتا ہے کہ اس کو سر اٹھانے کی فرصت نہیں ملتی، پھر کرایہ کا مکان تنگ اور ناکافی جگہ، خود رفقائے ادارہ کے لیے دفتر میں قیام کی گنجائش نہیں، سب جدا جدا رہتے ہیں، طعام کا بھی کوئی مشترک بندوبست نہیں، جنگ کی ہولناکیوں سے چھٹکارا ہو، تو بہت سی تجویزیں زیر غور ہیں، جو انشاء اللہ تعالیٰ بہت جلد عملی صورت میں سامنے آسکتی ہیں، بہت سے فضلائے دیوبند جو تالیف و تصنیف کے کام سے مناسبت رکھتے ہیں، ندوۃ المصنفین میں قیام کے خواہش مند ہیں، لیکن سر دست کوئی انتظام نہیں، خیال ضرور ہے، آپ از راہ کرم دو تین مہینے کے بعد پھر یاد دہانی کا ایک خط تحریر فرمائیں۔

ایک لائن مولوی فاضل کی بھی ہے، یہاں فتحپوری میں داخل ہو کر تیاری کی جائے وہیں قیام رہے، اسی کے ساتھ کچھ یہ مشغلہ بھی ہو، لیکن فتح پوری سے جو وظیفہ ملتا ہے وہ

وہ برائے نام ہی ہوتا ہے، بہرحال یہ چیز غور طلب ہے۔ والسلام،
عتیق الرحمن عثمانی ندوۃ المصنفین۔ قرول باغ۔
۷ار ستمبر ۱۹۴۴ء۔ ۱۳ار رمضان ۱۳۶۳ھ

اس خط سے جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ مفتی صاحب معمولی سے معمولی ذوق والے کے خط کا جواب دیا کرتے تھے، اور اس کی اشک شوئی کی سعی فرماتے تھے، وہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دل علمی جذبات سے لبریز تھا اور خود ان حالات سے دل برداشتہ تھے، جو نوجوانوں کو ابھرنے نہیں دیتے تھے، اور اس کا بھی درد رکھتے تھے کہ نوجوانوں کو کن مشکلات کا سامنا ہے۔

اس خط سے ندوۃ المصنفین کے اس نقشہ کا بھی اندازہ ہوتا ہے، جو اس سلسلہ میں مفتی صاحب کے ذہن میں تھا، یہ الگ بات ہے کہ اخیر وقت تک مفتی صاحب نوجوانوں کی تربیت کا شعبہ نہیں کھول سکے، مگر کتابیں برابر پابندی سے شائع کرتے رہے، شعبان ۱۳۶۳ھ میں خاکسار نے دورۂ حدیث ختم کر کے سالانہ امتحان دیا تھا، اللہ تعالیٰ نے میرے لیے یہ نظم کیا کہ استاذ محترم حضرت مولانا اعظمی مدظلہ نے مئو بلا کر مفتاح العلوم میں ابتدائی عربی مدرس اور مفتی بنا دیا، اور یہی میری ترقی کا علمی زینہ تھا، اس وقت دہلی سے مایوس ہو کر اپنے کام میں مصروف ہو گیا، باقی ندوۃ المصنفین سے تعلق باقی رہا، نئی کتابیں منگوا تا رہا اور پڑھتا رہا، پھر وہ زمانہ آیا کہ میں مضمون لکھنے لگا، اور صدق جدید لکھنؤ میں میرے بعض مضامین شائع بھی ہوئے، اسی زمانہ میں ایک لمبا مضمون لکھ کر برہان میں شائع ہونے کے لیے دہلی بھیجا، اور حضرت مفتی صاحب کے ہی نام بھیجا، آپ نے اس خط کا بھی جواب ازراہ کرم عنایت فرمایا لکھا:۔

مخلص مکرم　　　　السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

عنایت نامہ مع مضمون ملا۔ برہان کی ترتیب کا تعلق اب تمام تر مولانا سعید احمد

ایم - اے اکبرآبادی سے ہے، آپ کا مضمون ان کو دے دیا جائے گا اور میں سفارش بھی کر دوں گا، مجھے ادارے کے اوپر کے کاموں سے سر اٹھانے کی فرصت نہیں ہے تاہم مناسب مشورے کے لیے ہر وقت حاضر ہوں، یہ معلوم ہو کر مسرت ہوئی کہ مضمون نویسی سے آپ کو خاص لگاؤ ہے، وقت کی ضرورتوں اور ملت کے تقاضوں کے لحاظ سے ہمارے فضلاء میں یہ بہت بڑی کمی ہے۔ ندوۃ المصنفین اسی کمی کو پورا کرنے کے لیے قائم کیا گیا ہے، جگہ کا بندوبست ہو جائے تو میرا ارادہ جلد ایک ایسے شعبہ قائم کرنیکا ہے۔ جس میں فارغ شدہ علماء کو انگریزی زبان پڑھائی جائے، اور تقریر و تحریر کی مشق کرائی جائے، اور اخذ و استنباط کے جدید طریقے سکھائے جائیں، آپ جیسے بہت سے احباب اپنے حلقے میں موجود ہیں، جن میں کام کرنے کی امنگ بھی ہے اور صلاحیت بھی، مگر ان کے لئے کوئی ایسی جگہ نہیں، جہاں وہ اس لائن پر کام کرسکیں، فقط والسلام۔

۳ راپریل ۱۹۴۶ء ۔ عتیق الرحمٰن عثمانی۔ ندوۃ المصنفین۔ قرول باغ دہلی۔

اس زمانہ میں خاکسار بحیثیت صدر مدرس مدرسہ معدن العلوم نگرام ضلع لکھنؤ میں قیام پذیر تھا، میرے زمانۂ طالب العلمی کے مضامین پڑھ کر مدرسہ کے مہتمم مولانا محمد انیس صاحب نگرامی نے حکم دیا، کہ مسجدوں کے احکام و نظام پر میں ایک کتاب لکھوں، یہ بھی فرمایا کہ تم میں صلاحیت ہے، اس سے کام لینے سے وہ ترقی پذیر ہوگی، میں نے ان کی فرمائش پر کام شروع کر دیا، پہلے پورا قرآن اسی نقطۂ نظر سے بغور پڑھا۔ پھر پوری مشکوٰۃ مطالعہ کی، اور جو آیتیں یا حدیثیں مسجد سے متعلق نظر آئیں سب کو نقل کرتا گیا۔ پھر اپنے تمام اساتذہ کو خطوط لکھے، کہ رہنمائی فرمائی جائے، اس موقع سے بھی میں نے مفتی صاحب کو اپنے اس ارادہ سے مطلع کیا، اس کے جواب میں مفتی صاحبؒ کا گرامی نامہ موصول ہوا۔

"احکام مسجد پر ایک رسالہ مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی کا بھی ہے اسے دیکھ لیجئے گا کتاب کی ترتیب دل پذیر اور جدت آمیز ہونی چاہیے، تاکہ جدید تعلیم کے احباب بھی اس کا

مطالعہ کرسکیں، مساجد کی اجتماعی اہمیت پر بحث ضروری ہے، اور یہ کہ اس زمانے میں امام مسجد کس حیثیت کا ہونا چاہیے، شریعت میں اس منصب کی کیا اہمیت ہے، عہد مشہود لہا بالخیر میں مساجد سے کیا کام لیا جاتا تھا، مساجد کا قدرتی اجتماع کس قدر نتیجہ خیز ہوسکتا ہے، یہ اور اس طرح کے بہت سارے عنوانات ہیں، جن پر مختصر اور جدید انداز میں کلام کی ضرورت ہے۔" (مکتوب ۲۹ر اپریل ۱۹۴۶ء)

غور کیا جائے حضرت مفتی صاحب اپنے ایک خُرد کے خط میں تصنیف و تالیف سے متعلق کس قدر کارآمد اور ضروری چیزیں لکھ کر متوجہ کر رہے ہیں، کہ مصنف و مؤلف کو کن چیزوں پر دھیان دینے کی ضرورت ہے، خاکسار نے صرف اپنے کام کا تذکرہ کیا تھا۔ اور آپ بطور خود معاون کتابوں کی نشاندہی بھی فرما رہے ہیں اور تقاضائے زمانہ اور ضروری مباحث کی طرف اشارہ بھی فرما رہے ہیں، کوئی شبہ نہیں کہ اسلام کا نظام مساجد نامی کتاب میں ان تمام چیزوں کی رعایت بھی موجود ہے اور ان گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مفتی صاحب کی نظر علوم پر گہری و وسیع تھی، اور ان پہلوؤں کو ابھارنا ضروری سمجھتے، جن کی طرف عام مولویوں کی نظر نہیں جاتی ہے، اس کے بعد اگر کوئی کہتا ہے کہ وہ گو مصنف نہیں تھے مگر مصنف گر ضرور تھے، تو اس میں کیا مبالغہ ہے، اسی طرح اپنے چھوٹوں کی حوصلہ افزائی اور علمی رہبری کا خاص ذوق رکھتے تھے اور نوجوان عالمان دین کے سوتے ہوئے علمی جذبات کو ابھارنے کا ملکہ تامہ رکھتے تھے۔

نظام مساجد کا مسودہ جب خاکسار نے مکمل کر لیا، تو کوئی ایسا بے تکلف عالم نہیں ملا، جو میری پہلی علمی کاوش پر صحیح معنی میں نظر ثانی کرتا، میرے اپنے اساتذہ ضرور تھے اور وہ علمی دنیا اور تصنیف و تالیف کے میدان کے شہسوار بھی تھے، مگر ایک شاگرد کی اس زمانہ میں کہاں ہمت ہوسکتی تھی کہ وہ اپنی پہلی کتاب کو ان کے سامنے پیش کرتا اس کے لیے بھی حضرت مفتی صاحبؒ سے مشورہ طلب کیا، اس لیے کہ وہ میرے علمی کاموں سے برابر

دلچسپی لے رہے تھے، مفتی صاحب نے یہاں بھی رہنمائی فرمائی، خط کے جواب میں تحریر فرمایا:۔

"گرامی نامہ ملا۔ نظام مساجد کی تکمیل سے مسرت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ مقبول ونافع فرمائے، ترتیب مضامین اور زبان کے لحاظ سے قاضی زین العابدین صاحب محلہ اندرکوٹ میرٹھ شہر کی نظر ثانی مفید رہے گی، میرے حوالے سے ان کو لکھیے اور حق المحنت بھی طے کر لیجیے"، میٹریل (مواد) کے پیش نظر مولانا محمد ادریس صاحب ادارہ شرقیہ جامع مسجد دہلی کی نظر ثانی بہتر رہے گی، ان سے خط وکتابت کیجیے"، یہ دونوں بھی کسی نہ کسی درجہ میں ندوۃ المصنفین سے بھی وابستہ ہیں، رفقائے خاص میں کسی کو فرصت نہیں، معمولی مشورہ کے لئے ہم سب حاضر ہیں"۔ (مکتوب ۷ر جولائی ۱۹۶۳ء)

یہ وہ زمانہ تھا کہ ان میں سے کسی سے نہ ملاقات تھی، اور نہ دید شنید، البتہ قاضی صاحب کی خلافت راشدہ ضرور پڑھ چکا تھا، بڑی مایوسی ہوئی، کہ اس قدر دور دراز سے رشتہ کس طرح جوڑا جائے۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں تین مہینے بحیثیت طالب العلم گذار کر میں نگرام آیا تھا، مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ سے میری جان پہچان تھی کہ وہ بھی اس زمانہ میں ندوہ کے استاذ تھے، اس مایوسی میں ایک لمبا خط مولانا ندوی کے نام لکھا، اور اس میں علماء کی سست رفتاری، کام چوری اور بخل علمی کی خوب خوب شکایتیں لکھیں اور نظام مساجد پر نظر ثانی کے سلسلہ میں جن مرحلوں سے گذر رہا تھا اس کی تفصیل بھی لکھی، اللہ تعالیٰ مولانا کے درجات بلند فرمائے، واپسی ڈاک سے جواب لکھا اور حوصلہ افزا کلمات سے نوازا، یہ بھی لکھا کہ آپ نے علماء کی جو شکایتیں اپنے خط میں لکھی ہیں، بالکل یہی شکایتیں مجھے بھی ان سے تھیں، جب میں تمہاری عمر میں تھا، لہٰذا تم اپنا کام کرو، کام کرنے سے کام کی راہیں خود بخود کھلتی چلی جاتی ہیں، اخیر میں لکھا جب تم ادھر آنا تو وہ مسودہ ساتھ لیتے آنا، انشاء اللہ میں اسے دیکھوں گا، چنانچہ میں لے کر حاضر ہوا، مولانا نے دو ہفتے اپنے پاس مسودہ رکھا

اس کا ایک ایک حرف پڑھا، باضابطہ تصحیح فرمائی، البتہ اخیر والے حصہ میں سرسری طور پر پڑھ کر حاشیہ پر اپنی رائے لکھتے گئے کہ اسے اس طرح کر لینا۔

دو ہفتے کے بعد جب پھر حاضری ہوئی تو مسودہ پر مولانا کی تصحیح دیکھی، اس وقت مجھے کتنی مسرت ہوئی، بیان نہیں کر سکتا کہ ایک عالم دین تو ایسا مخلص ملا۔ وہ دن ہے آج تک ان کو اپنا استاذ جانتا ہوں، اور یقیناً تصنیف و تالیف کے میدان میں وہ میرے شفیق استاذ ہیں، اور پھر بٹھا کر تصنیف و تالیف سے متعلق بہت ساری باتیں بیان فرمائیں کہ کن چیزوں کی رعایت ضروری ہے۔

درمیان میں یہ ضمنی بات آگئی، عرض کر رہا تھا کہ حضرت مفتی صاحب میں اپنے خردوں اور چھوٹوں کو بڑھانے کا بہت خیال تھا، اگست ۱۹۴۷ء کے بعد مسلمانوں کی دلّی پھر ایک بار لٹی، جلی، اس زمانہ میں خط لکھ کر مفتی صاحب کے حالات معلوم کرنے کی سعی کی، مفتی صاحب کا جواب موصول ہوا۔ وہ پورا خط بھی ملاحظہ کیا جائے۔

مخلص مکرم مولوی ظفیر الدین صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

کرم نامہ ملا۔ یاد آوری کا دلی شکریہ، الحمد للہ ہم سب زندہ سلامت ہیں، اور قرول باغ میں جو کچھ گذر چکا ہے، اس کو دیکھتے ہوئے، زندہ بچ نکلنا ہی حق تعالیٰ کا بہت بڑا فضل ہے، مطبوعات کا تمام قابل ذکر ذخیرہ خاکستر ہو چکا ہے، کچھ حصہ جو دفتر میں رہتا تھا ضرور بچا ہے، بعض کتابیں جو پریس میں تھیں، اگر وہ تیار ہو گئیں، تو وہ بھی بچ گئیں، کوشش یہی ہے کہ "برہان" جنوری سے جاری ہو جائے، لیکن دہلی کی فضا میں آثار سکون کے بعد پھر تلاطم سا معلوم ہوتا ہے، ادھر اجڑے اور لٹے ہوئے کام کے سرے ملانا بھی کچھ ایسا سہل نہیں ہے، اس لیے ہو سکتا ہے، جنوری کے بجائے فروری سے اشاعت شروع ہو" (مکتوب ۱۱ر دسمبر ۱۹۴۷ء)

ان حالات میں نظام مساجد کی طباعت کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا، خاکسار خود بھی

نگرام ضلع لکھنؤ سے منتقل ہو کر انہی حالات کی وجہ سے سانحہ ضلع مونگیر دارالعلوم معینیہ میں آگیا، اور کیسے لکھنؤ سے بچ بچا کر وطن آیا، ایک لمبی داستان ہے۔ سانحہ ایک دیہاتی قصبہ تھا۔ دو سال بعد جب مولانا گیلانی سے جان پہچان ہوئی، اور یہ مسودہ مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے دیکھا تو فرمایا کہ اس کے چھپوانے کی سعی کرو۔ مفتی صاحب کے سوا کوئی دوسرا نظر نہیں آیا، میں نے سانحہ ضلع مونگیر سے اپنے خط میں اس نظام مساجد کی طباعت کا تذکرہ کیا، دہلی سے جواب آیا۔

"کتاب کی تکمیل سے مسرت ہوئی، اللہ تعالیٰ آپ کی محنت ٹھکانے لگائے۔ اور کتاب جلد طبع ہو جائے، ندوۃ المصنفین کے کاموں کا شیرازہ ابھی تک بکھرا ہوا ہے، اس کی اپنی بہت سی مطبوعات ناپید ہیں، جن پر ادارے کی بقا کا مدار ہے یہی وجہ ہے اب تک ۱۹۴۸ء و ۱۹۴۹ء کی کتابیں بھی شائع نہیں ہو سکیں، بحالت موجودہ آپ کی گراں قدر تالیف کی اشاعت کی یہاں سے کوئی صورت نہیں ہے، البتہ وقت کی ضرورت کے لحاظ سے آپ اس کا کوئی باب "برہان" میں شائع کرنے کے لیے دے سکتے ہیں" (مکتوب: ۳؍مئی ۱۹۴۹ء)

اس زمانہ میں مفتی صاحبؒ کا یہ جواب بھی بہت غنیمت معلوم ہوا، ملک کی تقسیم کے بعد جو حالات رونما ہو چکے تھے بالخصوص دہلی جس طرح برباد ہو چکی تھی، ندوۃ المصنفین اور اس کے رفقاء کار کا بچ جانا اور پھر کاموں کے شروع کرنے کا عزم بڑی بات تھی۔

یہاں اس کا تذکرہ مناسب ہوگا کہ جب خاکسار نے حضرت مولانا گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کو یہ جواب سنایا تو فرمانے لگے کہ دو آدمیوں کی عزیمت سے میں بہت متاثر ہوا، ان میں ایک مفتی صاحبؒ کے متعلق فرمایا کہ ۱۹۴۷ء میں ندوۃ المصنفین کا سرمایہ جب لٹ گیا اور کلکتہ میں مدرسہ عالیہ کا از سرِ نو افتتاح ہوا، تو اس کے لیے مولانا آزاد نے دہلی سے علماء کرام کی ایک ٹیم بھیجی، مولانا فرماتے تھے میں نے مفتی صاحب کو لکھا کہ اچھا یہ ہے کہ

آپ بھی بحیثیت استاذ مدرسہ عالیہ کلکتہ تشریف لے جائیں، اس کے جواب میں انھوں نے لکھا، میں بڑی آسانی سے جا تو سکتا ہوں، مگر مجھے ملازمت کرنا نہیں ہے، مجھ سے جیسے بھی بن پڑے گا اپنے اس ادارے کو چلانے کی جد و جہد کروں گا، مولانا گیلانی فرماتے تھے جن حالات سے وہ گذر رہے تھے، ان میں یہ حوصلہ لائق مدح و ستائش ہے، واقعی یہ ان شاء اللہ کام کر جائیں گے، اور ادارہ ندوۃ المصنفین کامیاب رہے گا۔

مفتی صاحب کی طلب پر خاکسار نے نظام مساجد کا ایک باب نقل کرکے بھیج دیا، تاکہ اس بہانہ سے کتاب کا قبل از وقت تعارف ہو جائے گا، اور اہل علم کی نظر میں اس کتاب کی اہمیت سما جائے گی، یہاں بکس میں بند رہنے کا آخر فائدہ کیا ہوگا، مضمون ملتے ہی جواب آیا۔

"مضمون ان شاء اللہ اگست کے برہان میں شریک اشاعت ہوگا، ابھی مسودے پر نظر نہیں ڈال سکا، بشرط فرصت دیکھوں گا، خدا کرے آپ کی محنت مثمر ہو، اور مسلمانوں کو اس سے نفع پہونچے، مسودے کی اگلی قسط بھی بھیج دیجیے، پورا مضمون سامنے ہوتا ہے تو اشاعت کے لیے توازن قائم کرنے میں سہولت ہوتی ہے، اس نازک اور مشکل وقت میں جو کام بن آئے، غنیمت ہے، بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ سر و سامان کے انتظار میں اصل کام ہی رہ جاتا ہے، بہت اچھا ہوا کہ ایک مفید اور علمی اور اصلاحی خدمت سامنے آگئی۔" (مکتوب ۴ رمضان المبارک ۱۳۶۸ھ ۲ جولائی ۱۹۴۹ء)

الحمد للہ اس کے بعد نظام مساجد کی متعدد قسطیں برہان میں آئیں، اور قارئین نے اس سلسلہ کو پسند کیا اور خود مفتی صاحب نے بھی اس سے دلچسپی لی، اور بلاشبہ ان قسطوں کے شائع ہونے سے میرا حوصلہ بھی بڑھا اور مجھ میں توانائی بھی آئی۔

مفتی صاحب نے بڑی دور اندیشی کی بات لکھی تھی، اس کا تجربہ بہت بعد میں اس وقت ہوا جب کہ کئی کتابوں کے مسودات جو میں تیار کرکے رکھے ہوئے تھا کہ اس پر کچھ اور

کام ہو جائے تو طباعت کا انتظام کیا جائے گا، مگر ناگہانی طور پر ایک وقت ایسا آیا کہ یہ سارے مسودات لٹ گئے اور دوسرے لے جانے والے مال غنیمت سمجھ کر میرے غائبانہ میں لے بھاگے، اور اس طرح میری سالہاسال کی محنت ضائع گئی، بلکہ زندگی بھر کا سرمایہ جاتا رہا۔

انہی مسودات میں تاریخ مساجد کا قیمتی مسودہ بھی تھا جس پر کم و بیش بیس سال میرے صرف ہوئے تھے، پوری دنیا کی تاریخی مسجدوں کا تذکرہ جمع اور یکجا کرنے کی سعی کی گئی تھی، کئی سو مسجدوں کا حال آ گیا تھا، جس میں مصر، شام، بیت المقدس، حرمین محترمین، افریقہ، اندلس، ہندوستان، پاکستان اور دوسرے ممالک کی تاریخی مسجدوں کا تذکرہ کتابوں کے حوالہ کے ساتھ میں نے یکجا کیا تھا۔

یہ کام خاکسار نے حضرت مولانا گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے حکم سے کیا تھا، کام شروع کرنے کے زمانہ میں مفتی صاحب نے لکھا کہ نظام مساجد کے بعد تاریخ مساجد پر کام شروع کر رکھا ہے۔ حضرت مفتی صاحب نے اس کے جواب میں لکھا:

"موصوف (مولانا گیلانی) نے خدمت (تاریخ مساجد) بھی اچھی تجویز کی ہے، اس کام کے لئے آپ کو تاریخ مکہ وفاء الوفاء سمھودی، تاریخ مدینہ منورہ، اردو میں اخبار الاندلس، اور آثار الصنادید بڑی کتابوں میں خطیب بغدادی کی تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہیے، ان کتابوں میں مختلف ممالک کی مساجد کے بکھرے ہوئے حالات ملیں گے بہر حال کام شروع کیجئے قدرت مدد کرے گی۔" (مکتوب یکم اگست ۴۹ء)

دیکھ رہے ہیں مفتی صاحب کی نظر کہاں کہاں پہونچی ہوئی ہے، اور آپ کا مطالعہ کتنا وسیع ہے، اور حوصلہ افزائی کا انداز کتنا پیارا اور دلکش ہے، یہ واقعہ ہے کہ مفتی صاحب کا ذوق مصنف بنانے کا بڑا ہی عمدہ اور بہتر تھا، ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں۔

"ماشاء اللہ آپ کا قلم شدہ شدہ پختہ سے پختہ تر ہوتا جا رہا ہے، اللہ تعالیٰ آپ کے وجود کو ملت کے لیے نافع بنائے" (مکتوب ۸ مئی ۱۹۵۰ء)

ایک نوجوان مدرس جو درس و تدریس کے فرائض ادا کرنے کے ساتھ مقالہ نویسی یا تصنیف و تالیف کا معمولی کام کر رہا ہو، اور وہ ایک قصباتی مدرسہ کا معلم ہو، اس کے لیے ندوۃ المصنفین دہلی کے بانی و ناظم کے قلم سے یہ جملے کتنے ولولہ انگیز ہو سکتے ہیں، اندازہ لگانا مشکل نہیں، یہی وجہ ہے حضرت مفتی صاحب سے بڑی عقیدت بھی رہی، اور محبت بھی، ماننا چاہیے میرے علمی محسنوں میں حضرت مفتی صاحب بھی شامل تھے۔

میری طرح اس وقت ملک میں دوسرے بھی کتنے نوجوان ہوں گے جن کی مفتی صاحب نے حوصلہ افزائی کی ہوگی، اور اس کی صلاحیت کو اجاگر کیا ہوگا، اور میرے علم میں ہے کہ ندوۃ المصنفین جس نے کتنے ہی گمنام کو شہرت علمی بخشی ہے اور ان کی کتابیں شائع کر کے مصنف بنا دیا ہے، اور ان کا اہل علم میں ایک معیار قائم کر دیا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ مفتی صاحب علماء کی جماعت میں اپنی آپ مثال تھے، تعمیری ذہن و فکر کے مالک تھے، تخریب سے کوسوں دور تھے، اور سراپا اخلاص تھے، علماء میں ایسے افراد نایاب نہیں تو کمیاب یقیناً ہیں، ورنہ دنیا جانتی ہے کہ ہمارا طبقہ تنگ نظری، اور تنگ دلی میں بدنام ہے، اور یہ بدنامی بلا وجہ نہیں ہے۔

لیکن اسی جماعت کے ایک فرد مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی بھی تھے، جو سنگ ریزوں کو گہر بنانے کا فن جانتے تھے، اور خذف کو گوہر شاہوار کر دیا کرتے تھے، یہ درست ہے کہ وہ مالی مدد نہیں کرتے تھے کہ ان کے پاس سرمایہ نہیں تھا، مگر علمی رہنمائی، علم نوازی، اور ذی استعداد علماء کی قدردانی کا خاص ذوق رکھتے تھے، اور اس میدان میں بے مثال تھے، آپ مردم شناس بھی تھے اور مردم ساز بھی، بلکہ شخصیت سازی میں بہت سے لوگوں سے بہت آگے تھے۔

پرانے علماء بیان کرتے ہیں کہ یہ خوبی مفتی صاحب کے چچا سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی میں بدرجہ اتم تھی، اپنے دور اہتمام میں کسی ہونہار فاضل دیوبند کو ضائع نہیں ہونے دیا۔

ایک خط میں مفتی صاحب نے خاکسار کو لکھا۔

"تاریخ مساجد کا کام بھی کر ڈالیے، جو کام آپ کے اختیار کا ہے، وہ تو ہو جائے"

مجھے حیرت ہے ملک انقلاب سے دوچار تھا، دہلی تاراج ہو رہی تھی، اور مفتی صاحب اپنے کام سے اس وقت بھی غافل نہیں ہوئے، ایک طرف مجاہد ملت کے ساتھ مسلمانوں کے تحفظ و بقا اور ان کو بسانے کی فکر میں منہمک تھے اور دوسری طرف ندوۃ المصنفین اور اپنے متعلقین سے بھی بے فکر نہیں تھے، اپنے ایک خط میں خاکسار کو یہ بھی لکھا۔

"خدا کرے نظام مساجد کی اشاعت کا جلد کوئی سامان ہو جائے، مجھے اس کا بہت خیال ہے، مسودّہ جلد بھیجنے کی فکر کیجئے، جہاں جہاں مناسب اختصار ہو، ہو جانا چاہیے، نظر ثانی کے وقت تعبیر و بیان میں بھی معتد بہ فرق ہو جایا کرتا ہے، یہ چیز بھی سامنے رہنی چاہیے، کسی جگہ بیان کا کوئی حصہ مکرر نظر آئے تو اس کو حذف کر دینا بہتر ہے مقصد یہ ہے کہ کتاب کا انداز بیان بھر پور ہو، اور جامع و مختصر بھی"

(مکتوب ۴ر اکتوبر ۱۹۵۰ء)

ان حوصلہ افزار کلمات کے بعد کون ایسا مصنف ہوگا، جو کوتاہی سے کام لے گا، اور اس وقت اور بھی جب وہ مصنف نوجوان ہو، اور اپنی محنت کو منظر عام پر لانے کا متمنی ہو، چنانچہ خاکسار نے ان ہدایات کی روشنی میں بعجلت تمام نظر ثانی کر کے مسودہ مفتی صاحب کی خدمت میں روانہ کر دیا، اور انھوں نے اس کی کتابت شروع کرادی اور چند ماہ کے بعد خوشخبری سنائی۔

"نظام مساجد کے پروف آرہے ہیں، کاغذ کی کمیابی نے پریشان کر رکھا ہے۔

تھوڑے کاغذ کا بندوبست ہوگیا ہے، توقع ہے اس مہینہ کے آخر تک کتاب تیار ہو جائے گی، والامر بیداللہ تعالیٰ"

اسی خط میں یہ بھی لکھا۔

"جناب مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی دام مجدہم السامی کے علم و فضل اور تقدس و تقویٰ سے ہم سب ہمیشہ متاثر ہیں، مولانا کے تعلق سے آپ سے اور بھی خصوصیت ہوگئی" (مکتوب ۷ مارچ ۱۹۵۱ء)

یہ واقعہ ہے کہ استاذ کی نسبت ہر جگہ کام آتی ہے حضرت مولانا اعظمی دامت برکاتہم کا ہی فیض ہے کہ خاکسار مدرس بنا، مفتی بنا، مصنف بنا اور مقالہ نگار و مضمون نویس بنا، اخلاق و اعمال پاکیزہ رہے، اور عقاید میں پختگی رہی، الحمد للہ حضرت الاستاذ مدظلہٗ کا سایۂ عاطفت اب تک خاکسار پر سایہ فگن ہے اور جب کبھی کوئی مصیبت آئی، مجھ سے زیادہ حضرت مولانا کو فکر ہوئی، اللہ تعالیٰ بہت دیر تک آپ کا سایہ قائم رکھے۔

اس کے چند ہفتوں کے بعد خوشخبری دی گئی کہ کتاب نظام مساجد چھپ کر تیار ہوگئی۔ مفتی صاحب نے لکھا:

"یہ معلوم کر کے آپ کو خوشی ہوگی کہ نظامِ مساجد چھپ گئی، آج موڑائی شروع ہوئی ہے، زیادہ سے زیادہ دس روز میں جلد بندی ہو جائے گی، لکھیے آپ کو کتنے نسخوں کی ضرورت ہے، روانہ کر دئیے جائیں گے" (مکتوب یکم اپریل ۱۹۵۱ء)

مجھے یہ دکھانا تھا کہ مفتی صاحب کا علمی ذوق کتنا عمدہ تھا، اور اپنے ملنے والوں سے نہیں، بلکہ اجنبی اور غیروں سے علمی خدمت کے نام پر کیسا بزرگانہ برتاؤ رکھتے تھے، اور اس کی دلدہی میں کتنے سرگرم تھے، اور ندوۃ المصنفین کے کاموں میں کیسی مستعدی پائی جاتی تھی، میرا اندازہ ہے، مفتی صاحب کے چند خطوط سے ان چیزوں کے سمجھنے میں بڑی آسانی ہوئی ہوگی۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ خاکسار مفتی صاحب کے لئے قطعاً اجنبی تھا، دید شنید تک نہیں تھی، مگر ہر قدم پر ان کی رہنمائی سامنے آتی رہی، انھوں نے نظام مساجد بہت عمدہ چھاپی اور اس کے نسخے خاکسار کے نام روانہ فرمائے۔

اس کتاب کے بعد نظام عفت وعصمت کے کئی ابواب مسلسل برہان میں چھپے اور وہ مستقل کتاب بھی بعد میں ندوۃ المصنفین سے ہی آب وتاب سے شائع ہوئی، اور یقیناً یہ سب مفتی صاحب کی علم دوستی تھی اور ساتھ ہی ذرہ نوازی بھی۔

مفتی صاحبؒ کی نظر فقہ پر وسیع بھی تھی اور گہری بھی، وہ عرف زمانہ کو بھی نظرانداز کرکے نہیں سوچتے تھے، ان کا ذہن بند نہیں تھا، کھلا ہوا تھا، مجلس تحقیقات شرعیہ لکھنؤ میں بارہا خاکسار نے مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے دیکھا اور سنا ہے، دار العلوم معینیہ سانحہ کے زمانۂ قیام میں خاکسار نے "جلکر" (پانی میں مچھلی فروخت کرنے کے) متعلق دریافت کیا۔ تو جواب میں تحریر فرمایا۔

"استفسار کا مختصر جواب یہ ہے کہ "جلکر" کی وہ صورت جسے فقہاء بیع السمک فی الماء سے تعبیر کرتے ہیں۔ ظاہر ہے اس کے جواز کی کوئی صورت نہیں ہے، البتہ یہ ظاہر ہے کہ بیع فاسد، مفید ملک ہے اور چونکہ یہاں معاملہ مدرسہ کا ہے، کسی کی ذات کا نہیں، اس لیے بیع فاسد سے حاصل شدہ رقم ضروریات مدرسہ پر خرچ کی جا سکتی ہے، یہ رقم اگر کسی شخص کی ملک میں ہوتی تو اس کا صدقہ دینا ضروری ہوتا، یہاں خود مدرسہ تصدق کا بہت اچھا مصرف موجود ہے، نفس عقد کے جواز کے لیئے اصل معاملے میں ترمیم کی ضرورت ہے، مثلاً تالاب کو اجارے پر دے دینا، اب اجارہ پر لینے والا خواہ اس سے مچھلیاں حاصل کرے، یا سنگھاڑے کی بیل ڈالے، یا کوئی اور کام کرے، نفس عقد میں تھوڑی ترمیم اور ردوبدل کے بعد جواز کی صورت نکل سکتی ہے، لیکن اس کے لیے بالمشافہ گفتگو کی ضرورت ہے، فتویٰ کی حیثیت میں ان کو سامنے نہیں رکھا جا سکتا" (مکتوب ۴ اکتوبر ۱۹۵۰ء)

اسی طرح ایک خط میں خاکسار نے "قنوت نازلہ" کے باب میں مفتی صاحب کی رائے دریافت کی، تو مفتی صاحب نے اپنے جوابی خط میں دیگر چیزوں کے ساتھ قنوت نازلہ پر بھی اپنی رائے لکھ بھیجی، تحریر فرمایا:

"قنوت نازلہ کے متعلق تفصیلی گفتگو تو زبانی ہی ہو سکتی ہے، خلاصہ بہر حال آپ کے ہی دماغ میں ہے۔

احناف کے سب سے بڑے ترجمان امام طحاویؒ اس کے قائل ہیں کہ قنوت نازلہ تمام جہری نمازوں میں نہیں، صرف فجر کی نماز میں پڑھی جائے گی اور وہ اس کو امام ابی حنیفہؒ کا مسلک قرار دیتے ہیں، الفاظ قنوت نازلہ مختلف حدیثوں میں ملتے ہیں، آپ جن الفاظ کو موجودہ حوادث اور اسلام کی عام تعلیمات کے زیادہ قریب خیال کرتے ہیں، منتخب کر لیجیے، جہاں تک میرا تعلق ہے ذہن ادھر ہی جاتا ہے کہ قنوت نازلہ صرف اس وقت پڑھنی چاہیے کہ مسلمانوں کا کوئی طائفہ دشمن کے مقابلہ میں مصروف قتال ہو، اور دشمنوں کے نرغہ میں گھر گیا ہو، ہاتھ باندھنا میرا بھی معمول نہیں ہے، قنوت نازلہ میں ہاتھ باندھنا، مجھے تو خلافِ سنّت معلوم ہوتا ہے، سمع اللہ لمن حمدہ، ربنا لک الحمد کے ساتھ اگر کچھ مزید دعائیں بھی کسی وجہ سے پڑھی جائیں، تو ان میں ہاتھ باندھنے کا کیا مطلب ہے، اس مسئلہ میں بعض بزرگوں کو بھی غلط فہمی ہوئی ہے، اور انھوں نے اسے امام ابی حنیفہؒ اور قاضی ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے مشہور و معروف اختلاف کے سلسلہ میں منسلک کر دیا ہے۔ حالانکہ قنوت کی دعاؤں سے اس کا کوئی تعلق نہیں، ہاتھ چھوڑ کر پھر قنوت کے لیے ہاتھ باندھنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ حضرت والد ماجدؒ (مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی مدظلہٗ) کا بھی یہی مسلک تھا۔" (مکتوب ۸ مئی سنہ ۱۹۵۰ء)

حضرت مفتی صاحبؒ حالات زمانہ کو سامنے رکھ کر جب مسائل پر بولتے تھے، تو سننے والوں کے ذہن کی گرہیں کھلتی چلی جاتی تھیں، اور اندازہ ہوتا تھا کہ مفتی صاحبؒ

کا ذہن آفاقی ہے، محدود نہیں ہے، گو وہ دائرہ اور حدود کے اندر رہ کر ہی بات کرتے تھے، مگر تقاضائے وقت پر نگاہ رکھتے تھے۔

مفتی صاحب کے ذاتی کتب خانہ میں منتخب کتابوں کا بڑا عمدہ ذخیرہ ہے میں نے ان کا کتب خانہ دیکھا ہے، ان کے کتب خانہ کی کتابوں کی جلدیں بڑی عمدہ اور نفیس ہیں، الماریوں پر شیشے لگے ہوئے ہیں، ہر چیز قرینہ اور سلیقے کے ساتھ اپنی اپنی جگہ رکھی ہوئی ہے، جب کبھی رات میں وہاں قیام کرنا پڑا، تو اسی کتب خانہ میں آرام کرتا تھا، ان کے علمی و دینی مزاج کا ہی نتیجہ تھا کہ مفتی صاحب اہل علم کی بڑی قدر و منزلت فرماتے تھے، علمی منصب و مقام کا ان کے یہاں بڑا لحاظ و پاس تھا، ہمارے استاذ محدث جلیل مولانا اعظمی کی بڑی تعظیم و تکریم فرماتے تھے، میری کتاب "اسلام کا نظام عفت و عصمت" کا مسودہ جب مفتی صاحب کی خدمت میں پہونچا، تو بطور خود آپ نے استاذ محترم دامت برکاتہم سے تعارف لکھوایا، نظام مساجد کے متعلق لکھا کہ:

"مولانا مناظر احسن گیلانی مدظلہم سے مقدمہ ضرور لکھائیے، اس سے برکت بھی ہوگی اور کتاب کی اصلاحی اور افادی حیثیت بھی اجاگر ہو جائے گی۔"

نظام مساجد کے فقہی جزئیات والے حصہ پر نظر ثانی کی جب مفتی صاحب سے درخواست کی گئی، تو تحریر فرمایا:

"فقہی جزئیات پر دیوبند کے مفتی مہدی حسن صاحب بلکہ زیادہ بہتر ہو کہ مولانا محمد اعزاز علی صاحب، سہارنپور کے مفتی سعید احمد صاحب یا شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب نظر ڈال لیں تو اچھا ہے، میں بھی وقتاً فوقتاً نظر ڈال لوں گا، حضرت مفتی محمد کفایت اللہ صاحب سے بھی عرض کر دوں گا۔" (مکتوب ۷ رمضان ۱۳۷۰ھ)

اس طرح کے خطوط سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مفتی صاحب کے یہاں علمی کاموں میں احتیاط کا پہلو کس قدر غالب تھا، اور ذی علم سارے علماء ان کی نظر میں

کس طرح مستحضر رہا کرتے تھے، اور ان پر پورا کیسا مضبوط اعتماد رکھتے تھے۔
ایک خط میں خاکسار کو بطور خاص تاکید فرمائی۔
"تاریخ ملت کے حصوں پر آپ کا مضمون پڑھ کر مولانا عبدالماجد صاحب دریاآبادی نے بھی وہ حصص طلب فرمائے ہیں، حلقۂ برہان میں بحمداللہ اب آپ کافی نیک نام ہیں، مضامین کم لکھیے، مگر جو کچھ لکھیے معیار کے مطابق لکھئے، معیار کی بقا بڑی بات ہے۔" (مکتوب ۱۱ر ستمبر ۱۹۵۱ء)

جب میں نے اپنے ایک خط میں تذکرہ کیا کہ نظام مساجد کے بعد اب میں نے "اسلام کا نظام عفت و عصمت" اپنے لیے عنوان منتخب کیا ہے، تو مفتی صاحب نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا۔

"آپ نے بہت دل پسند عنوان تلاش کیا ہے، یہ عنوان بہت خوب ہے، جی جاکر لکھیے، قدیم کتابوں کے علاوہ جدید کتابوں سے بھی مدد لینی چاہیے، تفسیروں میں سید رضا مصری کی المنار، وحی محمدی، نداء للجنس اللطیف مفید ہوگی، محمد رسول اللہ، المثل الکامل، الاسلام دین عام خالد، نظام العالم والامم، الحاضر العالم الاسلامی اور اس طرح کی دوسری کتابیں مفید ہوں گی، الذریعہ الی مکارم الشریعہ، ادب الدنیا والدین غالباً آپ کے پیش نظر ہوں گی۔" (مکتوب ۳ر نومبر ۱۹۵۱ء)

یہ قلم برداشتہ خطوط کے جواب میں مفتی صاحب کی تحریر کیا غمازی کرتی ہے۔؟ یہی ناکہ مفتی صاحب کا مطالعہ وسیع تھا، جدید و قدیم تصنیفات پر نظر تھی، اور یہ کہ آپ علمی انداز کی کتاب پسند فرماتے تھے، عوامی نقطۂ نظر نہ تھا، عالمانہ محققانہ نظر رکھتے تھے، اور وقت کے تقاضہ سے چشم پوشی پسند نہیں کرتے تھے، نظام عفت کی پہلی قسط جب برہان میں چھپی تو اسے پڑھ کر مفتی صاحب نے لکھا:۔

"جہاں تک اندازہ ہوتا ہے یہ کتاب وقت کی ضرورتوں کے عین مطابق

رہے گی اسے جلد سے جلد مکمل کر لیجیے۔" (مکتوب ۹ر مارچ ۱۹۵۲ء)

ایک دوسرے خط میں تحریر فرمایا:

"میری خواہش ہے کہ آپ جیسا عالم دین ضروریات وقت کو زیادہ سے زیادہ بہتر طریقے پر پہچاننے کی کوشش کرے گا۔"

ایک اور خط میں توجہ دلائی اور لکھا:۔

"نظام عفت کی ترتیب کے لیے جن مشوروں کی ضرورت ہے، ان کا تحریریں آنا دشوار ہے، مجموعی اعتبار سے ترتیب اطمینان کے لائق ہے، بنیادی طور پر یہ چیز پیش نظر رہنی چاہیے کہ کتاب کسی مدرسہ میں بیٹھ کر نہیں لکھی جارہی ہے، اور اس کے مخاطب مسلمانوں کی کوئی خاص جماعت نہیں ہے، اور نہ اس میں کسی خاص فقہی نقطۂ نظر کی ترجمانی کی گئی ہے، بلکہ اسلام کے نظام عفت و عصمت مذاہب اربعہ کی وسعتوں کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے، غیر مسلموں پر اثر ڈالنے والی جزئیات کو زیادہ سے زیادہ اجاگر کرنے کی ضرورت ہے...... سچ تو یہ ہے کہ آپ جیسے معتدل، سنجیدہ اور وسیع النظر عالم دین کو جو وقت کی ضرورتوں اور زمانۂ حال کے تقاضوں کو پہچانتے، کچھ زیادہ مشوروں کی ضرورت نہیں ہے، اللہ تعالیٰ آپ کا والی و ناصر ہو۔"

(مکتوب ۲۹ر دسمبر ۱۹۵۲ء)

اندازہ لگائیں تصنیف و تالیف میں یہ مشورے کتنے دقیع، دوررس، اور مفید ہیں، نظر میں کیسا توسع ہے، اور ایک نوجوان کی کس قدر حوصلہ افزائی ہے،

واقعہ یہ ہے کہ مفتی صاحب خود تصنیف و تالیف کے میدان میں نہیں آئے۔ مگر کتنے باذوق عالموں کو انھوں نے اپنے مشوروں اور حوصلہ بڑھانے والے کلمات سے مصنف بنادیا، اس طرح خطوط جب بھی نظر سے گزرتے ہیں، اس دور قحط الرّجال میں حیرت ہوتی ہے اور خط لکھنے والے کے لیے بے ساختہ دل سے دعائیں نکلتی ہیں۔

یہ کتاب چھپنے کے بعد مفتی صاحب کو بہت پسند آئی، انھوں نے آج سے دس بارہ سال پہلے چاہا تھا کہ اس کا انگریزی ترجمہ ہو جائے، انہوں نے اس کا ایک نسخہ اپنے ایک انگریزی داں عزیز کے سپرد فرمایا تھا کہ اس کا وہ انگریزی ترجمہ کردیں، ان صاحب نے مجھ سے کہا بھی تھا کہ بعض اصطلاحات آپ سے سمجھنے ہیں۔ مگر یہ کام ان سے نہیں بن آیا۔

مفتی صاحب کی زندگی میں ہی کویت کے ایک کتب خانے والے نے اس کتاب کا بڑا عمدہ سلیس اور شگفتہ انگریزی ترجمہ کرا کے پوری کتاب عمدہ ٹائپ میں چھپوا کر شائع کردی ہے، اس کا ایک نسخہ نہ معلوم میرے کس عزیز نے مجھے بہت تاخیر سے مجھے بھجوادیا تھا، مگر افسوس یہ ہے کہ میں مفتی صاحب کو دیکھ نہ سکا، اس کی وجہ یہ ہوئی کہ ان دنوں مفتی صاحب سخت بیمار تھے۔

میری تین کتابیں مفتی صاحب نے ندوۃ المصنفین سے شائع فرمادیں اور اب تک کبھی میری ملاقات نہیں ہوسکی تھی، مفتی صاحب سے ہی خط سے معلوم ہوا کہ ۱۱ر۱۲ر۱۳ر فروری ۱۹۵۵ء کو کلکتہ میں جمعیۃ علماء ہند کا آل انڈیا اجلاس ہے، اس زمانہ میں مفتی صاحب جمعیۃ کے سرگرم کارکن کی حیثیت رکھتے تھے، اور مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کے دست و بازو بنے ہوئے تھے۔

اتفاق سے ہم چند ساتھیوں نے بھی کلکتہ اجلاس میں شرکت کا ارادہ کرلیا، اور موجودہ امیر شریعت حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی مدظلہٗ سجادہ نشین خانقاہ رحمانی مونگیر کی قیادت میں مونگیر سے کلکتہ کے لیے روانہ ہوئے، وہاں عزیز محترم مولانا محمد یحییٰ ندوی سلمہٗ اللہ تعالیٰ نے پتہ لگا کر بتایا کہ مفتی صاحب تشریف لائے ہوئے ہیں، یہ بھی کہا کہ مفتی صاحب سے وہ مل بھی چکے ہیں، تم سے کبھی کی ملاقات نہیں ہے، میرے ساتھ چلیں تا کہ میں تعارف کرادوں، تذکرہ آپ کے آنے کا کردیا ہے، چنانچہ ان کے

ساتھ جاکر پہلی دفعہ مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کلکتہ میں ملا، اور ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پہچانا۔ اور اسی اجلاس کے موقع سے مولانا اکبرآبادی مدظلہ سے بھی پہلی دفعہ ملاقات کی، اور دیر تک ان کے پاس بیٹھا، اس دن مولانا اکبرآبادی نے جس شفقت و محبت سے گفتگو کی اس کا بڑا اثر ہوا، اور یہ غالباً اس وقت پہلے عالم دین تھے، جن کی باتوں سے محسوس ہوا کہ میرے اندر بھی تھوڑی بہت علمی مناسبت اور صلاحیت ہے۔

اس ملاقات کے بعد حضرت مفتی صاحب سے تعلقات اور استوار ہو گئے، یہ ۱۹۵۵ء کی بات ہے، اس کے سال بھر کے اندر کچھ ایسی صورت حال ہوئی کہ مجھے دارالعلوم معینیہ سانحہ ضلع مونگیر سے دارالعلوم دیوبند طلب کر لیا گیا، اور میں وہاں سے دیوبند آگیا۔

یہ صورت اچانک پیدا ہوئی، حضرت مولانا منت اللہ رحمانی مدظلہ نے خانقاہ رحمانی میں کتب خانہ کی ایک نئی عمارت بنوائی تھی، اس کے افتتاح کے لیے دیوبند سے شیخ الاسلام حضرت مدنی رح اور حکیم الاسلام حضرت قاری صاحب رح کو مدعو کیا، اور اسی کے ساتھ صوبہ کے تقریباً تمام قابل ذکر علماء کو بھی دعوت دی، اس افتتاحی اجلاس میں خاکسار نے کتب خانہ کی تاریخ اور اس کی افادیت پر ایک مقالہ پڑھا تھا، جو ان دونوں بزرگوں کو پسند آیا، چنانچہ ۳ صفر ۱۳۷۶ھ سے خاکسار دارالعلوم دیوبند کا ایک معمولی ملازم ہو گیا۔

دیوبند آجانے کے بعد مفتی صاحب سے قدرتاً بہت قریب ہو گیا، مفتی صاحب رح مجلس شوریٰ دارالعلوم کے رکن خصوصی بھی تھے اور ان کا آبائی وطن بھی دیوبند ہی تھا، اب سال میں متعدد مرتبہ ضرور ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں،

مفتی صاحب اپنی وضع کے بہت پابند اور تعلقات نباہنے کا خاص ملکہ اور سلیقہ

رکھتے تھے، دہلی کبھی سال میں ایک آدھ مرتبہ جانا ہوتا، تو بحکم مفتی صاحب ندوۃ المصنفین میں ہی قیام ہوا کرتا تھا، مجھے اچھی طرح یاد ہے ابھی خاکسار نیا نیا ہی تھا کہ مولانا یحییٰ ندوی آئے اور دہلی دیکھنے کا شوق ظاہر کیا، ہم دونوں نے قیام مفتی صاحب کے یہاں کیا، حضرت مفتی صاحب کی مہمان نوازی اور بزرگانہ برتاؤ سے ہم دونوں متمتع بھی ہوئے اور بہت متاثر بھی، ایسی دل دہی بڑوں کی طرف سے عام طور پر ہوا کرتی ہے، اس کے بعد بھی جب کبھی دہلی جانا ہوا مفتی صاحب نے ہمیشہ اپنے ایک عزیز کی طرح ٹھہرایا، اور آنے جانے والوں سے بڑے وقیع و بلند جملوں کے ساتھ تعارف کرایا، مفتی صاحب رح مکارم اخلاق کے عملاً مجسم تھے اور صاف دل اور پاک باطن ایسے کہ رشک ہوتا تھا۔

ان کی نشست گاہ ہر وقت آنے جانے والوں سے بھری ہوتی تھی، سیاسی، غیر سیاسی، زعماء قوم و ملک علماء کرام، مدارس کے اساتذہ، تاجر، مختلف پارٹیوں کے سربراہ، مصیبت زدہ، مختصر یہ کہ ہر طرح کے لوگ آتے اور مفتی صاحب سبھوں کے ساتھ محبت سے ملتے، سبھوں کی باتیں سنتے اور مخلصانہ مشورے دیتے، سفارشیں بھی کیا کرتے تھے، مفتی صاحب کو نہ کسی سے حسد تھا، اور نہ بغض و عداوت، بلکہ سبھوں کے بہی خواہ تھے، وہاں سے کوئی رنجیدہ نہیں اٹھتا تھا، مزاج میں بڑی سادگی تھی، گو بہت باوضع تھے، مگر مہمانوں کے لیے خود گھر سے کھانا لاتے، ملازم کئی کئی سامنے موجود ہوتا، مگر ان میں سے کسی کو حکم نہیں دیتے، بارہا میں نے دیکھا چائے لا رہے ہیں، خود ہی کھانا لا رہے ہیں، اور پھر خود بیٹھ کر اپنے سامنے کھلا رہے ہیں اور باتیں کر رہے ہیں، جو جس ذوق کا ہوتا، اس سے اسی طرح کی گفتگو فرماتے، یعنی اہل علم سے علمی، اصلاحی اور دینی اور سیاسی لوگوں سے سیاسی۔

جب کبھی میں وہاں گیا، کبھی مفتی صاحب کو تنہا بیٹھے ہوئے نہیں دیکھا، بڑا کمال یہ تھا کہ اس ہجوم سے نہ دل برداشتہ ہوتے تھے اور نہ ناگواری ظاہر فرماتے تھے، تحمل و

برداشت کا بہت مادہ رکھتے تھے۔

مفتی صاحبؒ اگر خالص علمی مزاج نہ رکھتے ہوتے، تو وہ بھی ہندوستان کے ممتاز مرشدوں میں ہوتے، یا چوٹی کے لیڈروں میں، آپ کے والد محترم حضرت مفتی عزیز الرحمن عثمانی کے مسترشدین کا حلقہ بڑا وسیع تھا، وہ چاہتے بھی تھے کہ بڑے صاحبزادے اور ممتاز عالم دین ہونے کی حیثیت سے اپنے والد ماجد کی اس گدّی پر جلوہ افروز ہوں، اور بیعت و ارشاد کی خدمت انجام دیں، مگر مفتی صاحبؒ اس کے لئے اپنے آپ کو آمادہ نہ کر سکے۔ کبھی کبھی فرماتے تھے کہ فلاں خطہ میں جانا ہوا، تو دیکھا سیکڑوں بوتلیں ہیں جن پر مجھے دم کرنا ہے اور سیکڑوں اشخاص ہیں جو گریباں کھولے ہوئے بیٹھے تھے کہ ان کے سینوں پر پھونک مار دی جائے۔

دہلی میں بھی مختلف کمیٹیوں، اسکولوں، انجمنوں اور مدارس اسلامیہ میں بحیثیت عہدہ دار، اور مشیر شریک رہا کرتے تھے، بات کسی کی کاٹتے نہیں تھے، دہلی میں اللہ تعالیٰ نے حضرت مفتی کفایت اللہ کے بعد آپ کو بڑی مقبولیت عطا کر رکھی تھی، ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"کیا کہوں کاموں کے ہجوم میں گھرا رہتا ہوں اور یہ کام بھی مختلف النوع ہوتے ہیں، جمعیۃ علماء کا کام، الجمعیۃ اخبار کی دیکھ بھال، فتحپوری ہائی اسکول کی صدارت، سنّی مجلس اوقاف کے کام، مدرسہ حسین بخش کی نگرانی، بعض دوسرے عربی مدرسوں اور انگریزی اسکولوں کے کام، آنے جانے والوں کے وقتی اور ہنگامی کام، برہان اور ندوۃ المصنفین کی مکمل ذمّہ داری، حالات کی ناسازگاریوں اور تلخیوں کا مسلسل مقابلہ خانگی پریشانیاں، اہلیہ کی علالت کا امتداد، صحت کی کمزوری، اور صلاحیت کار کا فقدان، یہ سب چیزیں کچھ اس طرح جمع ہوگئی ہیں کہ جب کبھی خیال کرتا ہوں فلاں خط کا تفصیلی جواب لکھوں گا۔ بس وہ جواب رہ ہی جاتا ہے۔" (مکتوب ۱۳ر جنوری ۱۹۵۵ء)

مفتی صاحب کا تعلق ایک طرف وزیر اعظم ہند سے بھی تھا اور دوسری طرف معمولی معمولی ہم جیسے مولویوں سے بھی، وہ سیاسی کام بھی انجام دیتے تھے اور علمی و دینی خدمت بھی، ندوۃ المصنفین قائم کر کے انھوں نے جو خدمات انجام دی ہیں وہ آب زر سے لکھنے کے لائق ہے، سیکڑوں معیاری، دینی، تاریخی، تحقیقی کتابیں چھاپ کر شائع کر دینا معمولی کارنامہ نہیں۔

دارالعلوم دیوبند، دارالعلوم ندوۃ العلماء، مجلس مشاورت، مسلم پرسنل لاء بورڈ، سبھی کے مخلص مشیر اور کارکن تھے، عرصہ تک جمعیۃ علماء ہند کے فعّال کارکن رہے، کچھ سال اس کے صدر عالی بھی رہے۔ بلاشبہ مفتی صاحب ہمہ جہتی ذہن و فکر کے مالک تھے۔

اسی کے ساتھ مفتی صاحب باجماعت نماز اور اپنے معمولات کے بہت پابند تھے، خود حافظ قرآن تھے چنانچہ تہجّد میں قرآن پڑھنے کا معمول تھا، بڑے لڑکے کو حافظ قرآن بھی بنایا تھا، ابتداء تراویح میں اس کا قرآن بھی سنا کرتے تھے۔ اپنے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں۔

"شروع رمضان کے روزے کافی ثواب آور رہے، اب موسم بڑی حد تک خوشگوار ہو گیا ہے، بڑے بچّہ کا قرآن مجید تراویح میں سنتا ہوں، اپنا نوافل میں پڑھتا ہوں"

(مکتوب ۸ رمضان المبارک ۱۳۷۱ھ مطابق ۲ جون ۱۹۵۲ء)

مفتی صاحب کے یہاں شُو اور نام و نمود کا جذبہ قطعاً نہیں تھا، پُرانے طرز کے عالم باعمل تھے اپنے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہی عبادات کا معاملہ رکھتے تھے اور بس۔ ریاء و سُمعہ کو پسند نہیں کرتے تھے، اور یہ واقعہ ہے کہ عبادت اسی طرح ہونی چاہیے:۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پر روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے، چمن میں دیدہ ور پیدا

مفتی عتیق الرحمن صاحبؒ کی سرگزشتِ حیات کا ایک سنہری باب

مولانا انیس الحسن ہاشمی

مُفتی اور منصبِ افتاء

فتویٰ اسلامی شریعت کی ایک اہم اصطلاح ہے جو کسی معاملہ پر شریعت کی فیصلہ کن رہنمائی اور واجب العمل حکم نامہ کا مفہوم رکھتی ہے۔ ایک مسلمان کے لیے فتویٰ کی قدر و قیمت ــــــ دنیاوی معاملات میں کسی ٹریبونل کے ایوارڈ یا ہائی کورٹ کے ججمنٹ سے بھی کہیں زیادہ ہوتی ہے اس لحاظ سے "فتویٰ" صادر کرنے والی شخصیت یعنی "مفتی" کا مقام و منصب بھی بہت اعلیٰ و ارفع قرار پاتا ہے۔

شب و روز میں پیش آنے والے اُمور و معاملات پر مسئلہ مسائل بتانا ایک بات ہے، لیکن "فتویٰ" صادر کرنے کے لیے کسی عالمِ دین کو فقہ اسلامی پر بڑی وسیع نظر، دینی احکام، فروع و مبادیات سے کماحقہ واقفیت، منشاءِ شریعت کا پورا شعور اور ساتھ ہی وقت کے تقاضوں

اور انسانی و معاشرتی مصلحتوں کے متوازن احساس کا حامل ہونا چاہیے
واقعہ یہ ہے کہ کسی بھی مسلم سماج میں حدود اللہ اور شعائر اسلامی کا تحفظ جن
دو ستونوں پر مرکوز و منحصر ہوتا ہے وہ 'خدمتِ افتاء' اور 'خدمت قضا'
ہی ہیں۔ اس مختصر تمہید سے 'مفتی' کے مقام و منزلت کا کچھ سرسری اندازہ
ہو سکتا ہے۔

....

فتویٰ نویسی کے لیے دوسری ممتاز علمی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ
تحریر و بیان کی لیاقت بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ فتوے کی زبان بہت
محتاط، بچی تلی، معیاری اور قانونی ہونی چاہیے اور اس میں مستفتی کے
دینی جذبہ اور اس کے مبلغ فہم کی بھی پوری رعایت ہونی چاہیے۔ محض تحکمانہ
انداز یا اُسلوب تحریر کا بھونڈا پن (جو بے سواد، خود ساختہ مفتیوں کی
تحریروں میں اکثر پایا جاتا ہے) فتوے کی قدر و قیمت کو خاک میں ملا دیتا ہے
ایسا فتویٰ دینی رہنمائی کی بجائے دسیوں الجھنیں پیدا کر دیتا ہے اور فتوے
بازی کا ایک چکر چلنے لگتا ہے۔

یہ بڑی محرومی کی بات ہے کہ آج ہمارے معاشرہ میں (جو دینی
معاملات میں کسی اجتماعی نظم اور اتھارٹی سے محروم ہے) ایسے خرخشے آئے
دن سامنے آتے رہتے ہیں، وجہ یہ ہے کہ معیار و صلاحیت کا سوال ہی
درمیان سے اُٹھ چکا ہے اور ہر کس و ناکس بے دھڑک اپنے لیے کوئی دینی
منصب اور ٹائیٹل خود اختیار کر لیتا ہے۔ جو چاہتا ہے اپنے دروازہ پر
"دارالافتاء" کا سائن بورڈ لٹکا کر مفتی بن بیٹھتا ہے یا زیادہ سے زیادہ
کوئی ڈرامہ رچا کر ارشاد و امارت کی اڑانیں بھرتا ہوا آفاقِ زر و مال پر

کمندیں پھینکنے لگتا ہے، کوئی ان سے نہیں پوچھ سکتا کہ تمہیں قلم پکڑنا بھی آتا ہے یا تم نے پرائمری کلاسوں تک بھی تختی و سلیٹ کا کوئی شغل کیا ہے حقیقتاً یہ لوگ اپنی شکم پروری اور کسب معاش کے لیے زندگی کی راہوں میں محنت وجفاکشی سے فرار اختیار کرکے مذہبی مناصب، پیری مریدی اور مزارات و مدارس کی پناہ ڈھونڈ کر عیش کی بانسری بجاتے اور بزبان حال پکارتے ہیں ؎

اب تو آرام سے گزرتی ہے عاقبت کی خبر خدا جانے

پھر نادان اور سیدھے سادھے عوام کے لیے یہ معمہ آخر تک معمہ ہی رہتا ہے

الٰہی..... یہ تیرے سادہ لوح بندے کدھر جائیں
کہ سلطانی بھی عیاری ہے، درویشی بھی عیاری

....

بہرحال ہم ہندوستان کے مسلمان اس حقیقت کو اپنے لیے سرمایہ صد فخر و سعادت سمجھتے ہیں کہ گزشتہ صدی میں ہمارے درمیان دو ایسی عظیم اور مثالی ہستیاں ہوئی ہیں جنہوں نے پوری صلاحیت اور وصف کمال کے ساتھ خدمت افتاء انجام دی اور اس منصب وقیع کا اعلیٰ معیار قائم کیا، اور اس حد تک اور اس شان کے ساتھ اس دینی ذمہ داری کو نباہ کر پورے عالم اسلام نے ان کے تفقہ فی الدین، ان کی علمی گہرائی، فکر و بصیرت اور ان کی عالمانہ عظمتوں کو سر آنکھوں پر رکھا اور برملا تسلیم کیا۔

ان دو بزرگوں میں پہلی شخصیت دارالعلوم دیوبند کے مفتی اول حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانی رحمہ اللہ کی تھی اور دوسری عظیم شخصیت حضرت العلامہ مفتی محمد کفایت اللہ رحمہ اللہ کی۔ حق یہ ہے کہ ان اسلاف کے اٹھ جانے کے بعد

ملت اسلامیہ میں دُور دُور تک اس درجہ کمال کو کوئی دوسری شخصیت نہیں پہنچ سکی۔ یہ ضرور ہے کہ پچھلی صدی کے مقابلہ میں آج علم اور علمی مراکز کی ارزانی اور فراوانی کہیں زیادہ ہے۔ اور کاروباری اور اشتہاری علماء کی، مفتیوں کی، مرشدوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ لیکن حقیقی استعداد و صلاحیت اور جوہری قابلیت کا دور شاید ان اسلاف کے ساتھ ختم ہی ہوگیا۔ فیاللاسف!

....

مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی حضرت مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی کے خلف اکبر بھی تھے اور شاگرد رشید بھی۔ خوش قسمتی سے اُن کو دارالعلوم دیوبند کا خیرالقرون، دیکھنے کی سعادت حاصل ہوئی تھی، شیخ الہند مولانا محمود حسن اور علامہ انور شاہ کشمیری (جن کو خاتم المحدثین کہا گیا ہے) جیسے ارباب علم وفضل کا سایۂ شفقت اور دعائیں میسر آئی تھیں۔ علامہ شبیر احمد عثمانی رح اور دارالعلوم کے سابق مہتمم مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی تو مفتی صاحب کے حقیقی چچا ہی تھے، رفقاء درس بھی ایسے میسر آئے تھے کہ ع

اب انھیں ڈھونڈ چراغ رُخِ زیبا لے کر

یعنی مولانا محمد یوسف بنوری، مفتی محمد شفیع دیوبندی، مولانا سید محمد بدر عالم مہاجر مدنی مؤلف ترجمان السنہ، مجاہد ملت مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی مولانا قاری محمد طیب وغیرہ وغیرہ۔

اِس گرد و پیش اور سراپا خیر و برکت ماحول میں مفتی صاحب نے علوم درسیہ کی تکمیل کی اور ساتھ ہی اپنے والد بزرگوار کے سایۂ سعادت میں فتوی نویسی کی مشق جاری رکھی، اس طرح جب اُن کی علمی استعداد درجۂ

وثوق و اعتماد کو پہنچ گئی تو دارالعلوم ہی میں اُن کو صفِ اول کا مدرس اور ساتھ ہی مفتی دارالعلوم کا منصب تفویض کر دیا گیا۔ پھر کئی سال یہ سلسلہ جاری رہنے کے بعد جب اکابر دارالعلوم کا کاروان علم و فضل ڈابھیل (گجرات) منتقل ہوا تو اپنے استاذ محترم علامہ کشمیری اور عم محترم مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے ساتھ مفتی صاحب بھی ڈابھیل چلے گئے اور وہاں کی نو بہار دینی درسگاہ میں درس و تدریس کے ساتھ ساتھ افتاء کی خدمت انجام دینے لگے۔ ڈابھیل میں آپ نے کئی سال یہ خدمت انجام دی۔

تحریک آزادی کا ایک یادگار فتویٰ!

اسی زمانہ میں (غالباً ۳۲ء) مفتی صاحبؒ کے قلم سے وہ تاریخی اور انقلابی فتویٰ صادر ہوا جس نے تحریک آزادیٔ وطن کو اسلامی فکر و بصیرت کے ایک نئے عزم و ولولہ سے روشناس کیا اور اس تحریک کے جاں نثاروں میں جوش عمل کی ایک نئی روح پھونک دی۔

ان دنوں گاندھی جی ڈانڈی مارچ کے سلسلہ میں گجرات کے دیہات و قصبات کا دورہ کر رہے تھے اور دوسری طرف نمک ستیہ گرہ میں گرفتار ہونے والوں، ٹیکس نہ دینے والوں اور انگریز حکمرانوں کے احکام سے ٹکرانے والوں پر بدیشی سامراج کے غیظ و غضب کی تان ٹوٹ رہی تھی۔ اُن کی املاک و اراضی قرق کر کے نیلام کی جا رہی تھیں۔ مفتی صاحب ان دنوں دھراشٹہ پہنچ کر گاندھی جی سے ملے اور وہاں سے ڈابھیل واپس آتے ہوئے انھوں نے ایک مستفتی کے جواب میں برملا یہ فتویٰ دیا کہ بدیشی حکمرانوں کی طرف سے اس وقت آزادی پسندوں کی جائیدادیں، زمینیں اور املاک جس طرح ضبط کی جا رہی ہیں

وہ ایک کھلا ہوا ظلم ہے اور بوقت نیلام ان املاک کو خریدنا تعاون علی الظلم والعدوان ہے جو اسلام کی مقدس رہنمائی کے لیے کسی طرح بھی قابل برداشت نہیں۔ لہٰذا اِن املاک کو خریدنا مسلمانوں کے لیے ہرگز جائز نہیں۔

اس فتوے کے شائع ہوتے ہی دور دور تک گویا آگ ہی لگ گئی۔ حکام وقت نے اس کا سخت نوٹس لیا۔ جامعہ ڈابھیل کے کارپرداز گارڈی سیٹھ اور دوسروں سے باز پرس ہوئی کہ تمھارے مدرسہ کے مفتی نے یہ کیا تہلکہ مچادیا ہے۔ سیٹھوں کی کاروباری مصلحتیں حکام سے وابستہ تھیں انھوں نے **مفتی** صاحبؒ سے خدمتِ افتاء واپس لینا چاہی لیکن **مفتی** صاحبؒ کی خود دار اور حساس فطرت نے اس پورے پس منظر کو دیکھتے ہوئے جامعہ ڈابھیل سے قطع تعلق کو بہتر سمجھا۔

یہاں سے **مفتی** صاحبؒ کے قیام کلکتہ کا دور شروع ہوتا ہے جو کم و بیش پانچ سال تک ممتد ہوا، اور وہاں سے **مفتی** صاحب اپنی زندگی کا دوسرا تعمیری مشن یعنی **ندوۃ المصنفین** ایک نوخیز ادارہ کے ابتدائی شکل میں ہمراہ لے کر دہلی آگئے۔ یہ ۳۸ء کی بات تھی۔ **ندوۃ المصنفین** اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ دہلی کے ایک صاف ستھرے علاقہ میں قائم ہوا اور **مفتی** صاحب کی غیر معمولی انتظامی صلاحیتوں اور ذوق و پسند کی نفاستوں نے اُس کو دن دونی رات چوگنی ترقی سے ہمکنار کیا۔ مگر یہاں بھی فتاوٰی کے لیے **مفتی** صاحب کی طرف رجوعات جاری رہی اور اپنی دوسری مصروفیات کے ساتھ ساتھ **مفتی** صاحب فتوے بھی لکھتے رہے۔ سنہ ۱۹۴۷ء بلکہ سنہ ۱۹۵۰ء تک کے عرصہ میں ہزاروں فتوے انھوں نے تحریر فرمائے۔ اُن کے دفتری ریکارڈ میں ایک ضخیم رجسٹر دستیاب ہوا ہے جس میں **مفتی** صاحب

کے تحریر کردہ سیکڑوں فتاویٰ کی نقل ہے ۔ بہت سے فتووں پر حضرت مفتی محمد کفایت اللہ صاحبؒ ، حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ ، مولانا قاری یوسف صاحب اور دوسرے معاصرین کی تصدیق وتصویب بھی ثبت ہے ان میں بیشتر فتاوی نکاح وطلاق کے معاملات یا اُس دور کے نئے ابھرے ہوئے مسائل ۔ رویت ہلال ، ریڈیو ، ٹیلیفون وغیرہ کی خبروں کی شرعی قیمت ، اذان و نماز میں لاؤڈ اسپیکر کے استعمال وغیرہ سے متعلق ہیں ان مسائل میں مفتی صاحبؒ کا نقطۂ نظر وہی تھا جو علماء حق کا مختار مسلک ہے۔

۴۸ء اور ۵۰ء کے بعد جب ملک کے سیاسی اور ہنگامی حالات نے بحرانی صورت اختیار کرلی اور مفتی صاحبؒ کا بیشتر وقت ہنگامی کاموں میں گھر کر رہ گیا تو مفتی صاحبؒ نے عملاً فتوے لکھنے موقوف کردیے چوں کہ فتویٰ نویسی کے لیے جو یکسوئی اور ذہنی سکون وفرصت درکار ہے ، شب وروز کے ہنگاموں میں اُس کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ گئی تھی ، پھر بھی جب کوئی مستفتی کسی معاملہ میں مفتی صاحب سے رجوع کرتا تو وہ اپنی مجبوری اور معذرت پیش کرتے ہوئے دوسرے علماء کرام کی طرف معاملہ کو محوّل فرمادیتے ۔ تاہم کسی معاملہ کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے وہ اپنے ان حالات میں بھی کبھی کبھی فتوے تحریر فرماتے رہے ۔

ہم ذیل میں جو فتویٰ نقل کر رہے ہیں وہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے اس دور کا ایک نازک اور اہم مسئلہ ہے جس پر مفتی صاحبؒ نے بڑی احتیاط کے ساتھ مستفتی کو اپنے جواب سے مستفید فرمایا ہے ۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۲۴ر اپریل ۱۹۷۹ء

کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ :

موضع منجلے گاؤں ضلع بیڑ (مہاراشٹر) میں زراعتی مقاصد یعنی ذرائع آبپاشی فراہم کرنے کے لیے ایک ذخیرۂ آب (ڈیم۔ DAM) بنانے کا سرکاری منصوبہ ہے جس سے لاکھوں ایکڑ بنجر زمین سیراب ہوکر غذائی پیداوار کے قابل بن جائے گی، اس کے لیے استعمال ہونے والا علاقہ زمین کے درمیان ایک چھوٹی سی غیر آباد مسجد ہے جس میں بمشکل آٹھ یا دس آدمی بوقت واحد نماز ادا کرسکتے ہیں مگر اس میں اذان وصلوٰۃ بالکل بند ہے اور ایک درگاہ موسومہ بہ مانک شاہ بابا بھی اسی علاقہ میں ہے۔ ان دونوں مذہبی عمارات کو محفوظ کرتے ہوئے آبپاشی کا یہ منصوبہ پورا کرنا ممکن نہیں ہے، اسی لیے ان دونوں عمارتوں یعنی مسجد و درگاہ کو یہاں سے منتقل کرکے دوسری جگہ تعمیر کرنے کا انتظام کیا جاسکتا ہے۔ درگاہ کی حد تک مقامی باشندے جن میں ہندو اور مسلمان شامل ہیں رضامند ہیں کہ اس کو یہاں سے لے جاکر دوسری جگہ بنوا دیا جائے۔ البتہ مسجد کے لیے شرعی وفقہی احکامات کی رو سے علماء دین کا فتویٰ ضروری ہے۔ حکومت دوسری جگہ مسجد تعمیر کرکے دینے یا اس کے معاوضہ کے لیے ڈیڑھ لاکھ کی رقم ٹرسٹ (TRUST) کو دینے پر تیار ہے۔

کیا اس طرح مسجد و درگاہ کو رفاہِ عام کی غرض سے ان کی موجودہ جگہ پر منہدم کرکے دوسری جگہ تعمیر کیا جاسکتا ہے؟ شریعت اسلامی کا اس میں کیا حکم ہے؟

براہ کرم جواب سے فوری اطلاع دیں۔ فقط

احقر ڈاکٹر اسحاق جمخانہ والا بمعرفت جناب شیخ عبدالستار

بلیپے ہاؤز، دوسری رابوڑی، ضلع تھانہ، مہاراشٹر

الجواب

اس طرح کے معاملات انتہائی نازک اور دور رس نتائج کے حامل ہوتے ہیں، فقہ حنفی کے مفتی بہ قول کے مطابق جو مسجد ایک مرتبہ مسجد ہو جاتی ہے، ہمیشہ مسجد ہی رہتی ہے، حالات کا کوئی انقلاب اور زمانے کی کوئی گردش اس کی مسجدیت کو فنا نہیں کر سکتی اور حقیقت یہ ہے کہ فقہ حنفی کا یہ شرعی حکم زبردست حکمت و مصلحت پر مبنی ہے کہ اسی حکم سے مسجدوں کا مؤثر تحفظ ہو سکتا ہے۔ بنابریں اس فیصلے کے مطابق صورت مسئولہ میں اس مسجد کو منہدم کرنے کا حکم نہیں دیا جا سکتا، کیوں کہ اس سے بے شمار فتنوں کا دروازہ کھل جاتا ہے اور مسجدوں کی حفاظت کی ضمانت باقی نہیں رہتی۔

اس تمہید اور ضروری تشریح کے بعد اس خاص معاملے میں فتوے کی حیثیت سے بالکل الگ یہ اہم سوال ہے کہ آخر کار اس کا حل کیا ہو، فقہی تصریحات میں کچھ ایسے اشارے ملتے ہیں جن کی بنا پر یہ ضرور سوچنا پڑتا ہے کہ اگر یہ چھوٹی سی مسجد عرصہ سے غیر آباد چلی آرہی ہے اور اس میں مدت مدید سے نماز نہیں ہوئی اور مستقبل میں بھی اس کی آبادی کی کوئی صورت نہیں ہے اور اہم تر مفاد عامہ کے پیش نظر حکومت جبر و قہر سے نہیں بلکہ مسلمانوں کی رضامندی سے مسجد کی اس جگہ کے بدلے میں دوسری جدید مسجد تعمیر کرنے کے لئے آمادہ ہے اور عام مسلمان دوسری مسجد کی ضرورت اور افادیت کو محسوس کرتے ہوئے حکومت کی اس پیش کش کو قبول کرنے کے لیے تیار ہیں تو ان غیر معمولی مخصوص حالات میں اتنے بڑے مفاد کو دیکھتے ہوئے اس کی گنجائش ہونی چاہئے کہ اس غیر آباد اور ویران مسجد کا ضروری سامان دوسری جدید مسجد کی تعمیر میں لگا دیا جائے۔ ولو بنی مسجداً فضاق علی اهله والطريق واسع ولاضرر علی اهل الطريق اخذ

من الطریق ووسع المسجد کما یجوز العکس لان الامرین فی مصلحۃ العامۃ احکام المعاملات نصف اول۔ ص ۲۹۱

ولو خرب المسجد وما حولہ وتفرق الناس عنہ لایعود الی ملک الواقف عند ابی یوسف فیباع نقضہ باذن القاضی ویصرف ثمنہ الی بعض المساجد (شامی مع درالمختار جلد ۳ ص ۵۱۳)

ولاہل المحلۃ تحویل باب المسجد (خانیہ) وفی جامع الفتاوی لہم تحویل المسجد الی مکان آخر ان ترکوہ بحیث لایصلی فیہ ولہم بیع مسجد عتیق لم یعرف بانیہ وصرف ثمنہ فی مسجد آخر الخ (شامی جلد ۳ ص ۵۱۲)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

عتیق الرحمٰن عثمانی

ندوۃ المصنفین، اردو بازار، دہلی

۳۰ر جمادی الثانی ۱۳۹۹ھ

مطابق ۲۷ر مئی ۱۹۷۹ء

یہ تھا مفتی صاحب کا انداز فکر و تصفیہ۔ شرعی مصالح اور اوامر و احکام کو پوری جرأت و استقامت کے ساتھ ملحوظ رکھتے ہوئے وہ الجھنوں اور مشکلات کا عملی حل خود منشاء شریعت کی حدود میں رہتے ہوئے ضرور تلاش کرنا چاہتے تھے۔ وہ انتہائی پختگی کے ساتھ اس کے قائل تھے کہ حدود اللہ اور شریعت اسلامیہ کے محکمات اوامر و نواہی جن کا بیشتر تعلق بنیادی عقائد اور فرائض و محرّمات سے ہے سربمہر ازلی و ابدی حقیقت ہیں۔ کسی بھی دور اور کسی بھی حال میں اُن کو فکری تاویلات اور موشگافیوں کے لیے اُپن (OPEN) نہیں

کیا جا سکتا۔ البتہ فروعات اور عملی طور طریقوں سے متعلق تفصیلات میں وقت کے تقاضوں اور زندگی کی واقعی مصلحتوں کے لیے بہت کچھ گنجائشیں ہیں اور ان میں جمود، تنگ نظری اور ذہنی خشکی سے کام لینا، دین مبین کی بخشی ہوئی آسائشوں سے روگردانی اور خام خیالی کے مرادف ہے۔

دینی معاملات پر بات چیت کرتے ہوئے مفتی صاحبؒ بسا اوقات لسانِ نبوت سے صادر شدہ یہ کلمات طیبات دُہرایا کرتے تھے کہ

الدین یسر فیسروا ولا تعسروا

مجھے یاد ہے کہ ایک موقعہ پر ہندوستان کے سابق چیف جسٹس مسٹر ہدایت اللہ سے مفتی صاحبؒ کی گفتگو مسلمانوں کو درپیش مسائل و مشکلات پر ہو رہی تھی اور محورِ بحث یہ تھا کہ جس دین برحق کی نفع بخشیوں اور بے لاگ ہدایت و رہنمائی سے ابدالآباد تک، انسانی دنیا کو شرق و غرب میں، بحر و بر میں، گرم و سرد میں، جنگ و امن میں، صحت و مرض میں، فقر و فراخی میں، سازگار اور ناساز ماحول میں، تہی دستی اور پسماندگی میں اور عروج تمدن کی آسائشوں میں یکساں فیض حاصل کرنا ہے، ایسے بابرکت اور عظیم مخزنِ رشد و ہدایت میں انسانی فطرت اور ظروفِ زمان و مکان کا کتنا لحاظ، کتنی لچک اور لوچ ہونا ضروری ہے کہ انسانی زندگی پر عملی گنجائشوں کا دروازہ کسی حال اور کسی دور میں بھی بند نہ ہو سکے اور اس دین برحق کی رہنمائی میں انسان ہر ہموار اور سنگلاخ راستہ سے کامیاب و بامراد گزر سکے۔ فہل من مدکر!

حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی

اور ان کا قابلِ تقلید کردار

(از حکیم سید حسین دہلوی)

حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کی ذات گرامی محتاجِ تعارف نہیں حضرت مفتی صاحب مذہبیات اردو ادب اور سیاست ملکی میں بڑی بصیرت کے حامل تھے۔ آپ ہندوستان کے مفتخر علماء دین میں سے تھے، مفتی صاحب مرحوم مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی کے فرزند ارجمند تھے، آپ کے تایا مفتی حبیب الرحمٰن عثمانی مدت مدید تک مہتمم دارالعلوم دیوبند رہے، آپ کے حقیقی چچا مولانا شبیر احمد عثمانی اپنے علم وفضل اور سیاسی سوجھ بوجھ میں اپنی مثال آپ تھے حضرت مولانا محمد احمد خلف حضرت مولانا نانوتوی کے انتقال کے بعد مفتی حبیب الرحمٰن عثمانی نے بمشورہ مجلس شوریٰ مولانا قاری محمد طیب صاحب جو حضرت نانوتوی کے پوتے اور مولانا محمد احمد صاحب مرحوم کے صاحبزادے تھے نائب مہتمم دارالعلوم نامزد فرمایا جس پر بعض علماء کو اختلاف ہوا، ان علماء کا کہنا تھا، کہ دارالعلوم وقف ہے۔ اس لئے اس منصب کے لئے متبحر عالم مدبر اور تجربہ کار شخصیت کو نامزد کرنا چاہیے، چونکہ قاری طیب صاحب اس زمانہ میں نوجوان اور ناتجربہ کار شخص تھے، بعض علماء نے حضرت انور شاہ صاحب کشمیری جو صدر مدرس اور شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند تھے اُن کو ورغلا کر جامع مسجد میں اس تقرر کے خلاف آواز بلند کرائی، جب اس واقعہ کا علم مفتی حبیب الرحمٰن عثمانی کو ہوا تو انھوں نے ایک پروانہ جاری فرمایا جس میں تحریر تھا، کہ جن کو اس تقرر سے

اختلاف ہے وہ اپنے کو دارالعلوم سے خارج سمجھے اور دارالعلوم چھوڑ کر چلا جائے۔ یہ پروانہ جس وقت حضرت مولانا انور شاہ صاحب کی خدمت میں پیش کیا گیا اُس وقت وہ طلباء کو درس حدیث دے رہے تھے، آپ نے پروانہ پڑھنے کے ساتھ ہی حدیث شریف کی کتاب بند کر دی اور طلباء کو کہا کہ چونکہ مجھے اس تقرر سے اختلاف ہے، اس لئے میں دارالعلوم سے رخصت ہو رہا ہوں حضرت انور شاہ کے اس عزم و اعلان کے بعد بعض طلبا جن میں حضرت مفتی عتیق الرحمان عثمانی اور مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن کے نام نامی خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں اور اساتذہ میں حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی حضرت شاہ صاحب کے ہمرکاب ہو گئے۔ اور یہ سب حضرات دیوبند سے ڈابھیل ضلع احمد آباد گجرات چلے گئے اور وہاں جاکر حضرت انور شاہ نے دارالعلوم ڈابھیل قائم کر دیا، جو آج ایک عظیم دینی و علمی دارالعلوم کی حیثیت کا حامل ہے اور ہندوستان کے اوّل درجہ کی درسگاہوں میں اس کا شمار کیا جاتا ہے۔

حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی مدتِ مدید تک دارالعلوم ڈابھیل میں فاضل مفتی کی خدمات انجام دیتے رہے۔ حضرت مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی میں بڑی خوبی یہ تھی کہ بریلوی دیوبندی اختلافی مسائل میں وسعتِ نظری سے کام لیتے تھے، وہ مسائل پر تنگ نظری اور جانبدارانہ مسلک کو فراستِ دینی کے خلاف تصور فرماتے تھے، وہ مسئلہ کے سیاق و سباق پر گہرے مطالعہ کی روشنی میں تبصرہ کرکے فتویٰ صادر فرماتے تھے، وہ اپنی نجی گفتگو میں اکثر فرمایا کرتے تھے، کہ بین الاحناف اختلاف انگریزوں کے پٹھوؤں کی کارستانی کا نتیجہ ہے۔ اس لئے جواب فتویٰ قطعاً غیر جانبدارانہ ہونا چاہیے جو علما رجانبداری سے جواب لکھتے ہیں وہ معصیت میں مبتلا ہوتے ہیں، اللہ ہم کو صراطِ مستقیم اور صحیح سوجھ بوجھ کی توفیق عطا فرمائے سیاسی ماحول میں بھی آپ مسائل کے دونوں پہلوؤں پر واضح تبصرہ فرمانے کے بعد اظہارِ رائے فرمایا کرتے تھے، زیادہ تر آپ مسائل سیاسی کو سمو کر حل کرنے کے حامی تھے جب کسی ڈیلیگیشن میں وزیر اعظم ہند صدر جمہوریہ یا کسی دیگر اربابِ حل و عقد سے گفتگو فرماتے

تو بہت ہی نرم وسادہ الفاظ میں مسائل پر روشنی ڈال کر اپنا مدعا بیان فرماتے جو قابلِ قبول ہوتا۔

حضرت مفتی صاحب جب موضوع تصوف پر گفتگو فرماتے تو فرماتے کہ ہم بھی نقشبندی ہیں اور میرے بزرگ حضرت نانوتوی اور اُن کے بزرگ طریقت حضرت مولانا امداد اللہ مہاجر مکی چشتی تھے، ان بزرگانِ دین نے جو دینی خدمات انجام دی ہیں ہم سب مل کر بھی اس کے عشرِ عشیر کے برابر دینی و تبلیغی خدمات انجام دینے میں قاصر ہیں۔ اللہ تعالےٰ اُن کی قبور کو نور سے بھرے اور ہمیں ان کے چلن پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

حضرت مفتی صاحب اختلافی مسائل کو بڑھاوا دینے کے قائل نہیں تھے، وہ ان مسائل پر نہ زورِ قلم سے کام لیتے تھے اور نہ زورِ بیان سے وہ مرنجان مرنج شخصیت کے حامل تھے۔ اگر وہ کبھی میلاد النبیؐ کی مجلس میں شریک ہوتے اور قیام کرنے کے لئے حاضرین کھڑے ہوتے تو حضرت مفتی صاحب بھی خاموش کھڑے رہتے، کبھی دیکھنے میں نہیں آیا کہ آپ ایسی مجلس سے اٹھ کر چلے آئے ہوں، یا قیام سے قبل وہاں سے ٹل گئے ہوں، وہ فرماتے تھے ؎

تو برائے وصل کردن آمدی

نہ برائے فصل کردن آمدی

وہ مصلحت آمیز گفتگو کرنے میں اپنی مثال آپ تھے، وہ اختلافی مسائل میں اپنا نقطۂ نظر مدلل اور موزوں اندازِ بیان میں واضح فرمادیتے تھے سخت سے سخت اختلاف والے کو بھی مناسب الفاظ میں ظاہر فرمادیتے تھے، مجاہدِ ملت اکثر مسائل میں آپ سے مشورہ لیتے اور آپ کے تدبر اور سوجھ بوجھ کے قائل تھے۔

مجاہدِ ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن کے انتقال کے بعد جب جمعیۃ العلماء ہند کا نیا انتخاب ہونے والا تھا، اور جمعیۃ کے دستور کے مطابق صوبہ جمعیۃ علماء سے صدارت

کی نامزدگی کے لئے نام مانگے گئے، تو صوبوں نے حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی اور حضرت مولانا سید فخر الدین شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند کے ناموں کی سفارش کی پھر صوبائی جمعیتوں کو موصوفین کے نام بھیجے گئے، کہ وہ کسی ایک نام کا انتخاب کر کے بھیجیں، صوبائی آراء کچھ اس انداز میں آئیں کہ مرکزی جمعیۃ علماء ہند نے مناسب سمجھا کہ اجلاس عام جمعیۃ علماء ہند میں یہ نام پیش کر کے کھلے اجلاس میں صدر کا انتخاب عمل میں لایا جائے چنانچہ اجلاس عام میرٹھ میں یہ تجویز زیر غور آئی، حضرت مولانا سید اسعد صاحب مدنی کا گروہ مولانا فخر الدین شیخ الحدیث دارالعلوم کا حامی تھا، اور مولانا شاہد فاخری کا گروہ مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کا، اجلاس عام میں بڑی ردوقدح کے بعد طے پایا کہ مولانا فخر الدین صاحب صدر اور مفتی عتیق الرحمٰن صاحب ورکنگ صدر رہوں گے۔ اس اعلان کے بعد مسئلہ اصولی طور پر حل ہو گیا تھا لیکن مفتی عتیق الرحمان عثمانی کے حامی اس فیصلے کو تسلیم کرنے سے گریزاں تھے جس میں مفتی ضیاء الحق، مولانا سید انیس الحسن، مولانا حامد اللہ انصاری غازی مولود مسعود صاحب کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ان حضرات کی خواہش تھی کہ اسی پنڈال میں متبادل جمعیۃ العلماء ہند کا انعقاد عمل میں لایا جائے اور مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی کو صدر چن لیا جائے۔ جب اس گروپ کا ذمہ داروں نے شیخ عبدالحق پراچہ مرحوم اور مجھ حکیم سید جلیل دہلوی سے مشورہ کیا تو ہم دونوں نے ان کی اس رائے سے اتفاق نہیں کیا۔ وہ جانتے تھے اگر ان دونوں نے اتفاق نہ کیا بیل منڈھے نہیں چڑھے گی۔ ہم پر بہت زور ڈالا گیا ہم نے یہ کہہ کر اپنا پیچھا چھڑایا، کہ ہم ذرا اکابر علماء سے مشورہ کرلیں پھر جو بات طے ہوگی اس پر عمل کریں گے۔ سب سے پہلے ہم دونوں نے حضرت مولانا شاہد فاخری سے مشورہ کیا، مولانا آپے سے باہر ہو گئے۔ فرمانے لگے اگر تم کو جماعت کا فیصلہ منظور نہیں ہے تو جماعت سے استعفےٰ دے دو۔ جماعتی فیصلے سے انحراف جماعتی اصولوں کے منافی ہے، مولانا شاہد فاخری صاحب کے اس جواب کے

بعد ہم نے امیر شریعت بہار حضرت مولانا منت اللہ صاحب رحمانی سے مشورہ کیا،
حضرت مولانا نے بھی مولانا شاہد فاخری کے مشورہ کی تائید کی، پھر ہم دونوں مفتی عتیق الرحمن
عثمانی کی خدمت میں پہنچے، ان کو واقعات بیان کر کے اُن کی رائے معلوم کی حضرت مفتی
صاحب نے فرمایا کہ ایک زمانہ میں کانپور والوں نے متوازی جمعیۃ تشکیل کی تھی، اس کا حشر میری
آنکھوں کے سامنے ہے میں اپنے ماتھے پر ایسا کلنک کا ٹیکہ نہیں لگوانا چاہتا کہ میری وجہ سے
جماعت میں پھوٹ پڑی اور جماعت کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ ان آرار کے حاصل کرنے کے بعد
ہم نے کھُل کر اختلاف کیا، جس کی وجہ سے متوازی جمعیۃ علمار کا جواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔
کچھ عرصہ تک حضرت مفتی صاحب بطور ورکنگ صدر پابندی کے ساتھ شیخ
عبدالحق پراچہ کے ساتھ مرکزی دفتر آتے رہے اور جماعتی خدمات انجام دیتے رہے۔
مولانا انیس الحسن وغیرہ کی کوشش سے جمعیۃ علمار مدھیہ پردیش کے ارکان نے متوازی
جمعیۃ علمار ہند کے قیام کے لئے بھوپال میں اجتماع کیا، جس کے کرتا دھرتا مولانا صدرالدین
صاحب انصاری بھوپالی وغیرہ تھے، میں اور شیخ عبدالحق پراچہ اس اجلاس میں بن بلائے
پہنچے، مولانا صدرالدین انصاری نے بڑے اعزاز کے ساتھ ہم کو مدعو کیا لیکن ہم مجلس میں
اس لئے شریک نہیں ہوئے کہ ہم کو حاضر ممبران مولانا اسعد مدنی صاحب کے حامی سمجھتے تھے
آخر کار وہاں بھی ہماری اسکیم کامیاب ہوئی، وہاں بھی جلسۂ عام میں مفتی عتیق الرحمن صاحب
عثمانی نے انھیں خیالات کا اظہار کیا جو وہ ہم سے میرٹھ میں کر چکے تھے۔
اس واقعہ کے تقریباً ایک سال بعد گیا بہار میں جمعیۃ علمار ہند کا کھلا اجلاس
ہوا، مولانا اسعد مدنی نے بمشورہ ورکنگ کمیٹی چند علمار کو نامزد کیا کہ وہ مفتی صاحب کو
گیا کے اجلاسِ عام کی شرکت کے لئے آمادہ کریں، ان علمار میں بھی بعض حضرات مفتی
صاحب کی شرکت کے حامی نہیں تھے۔ مفتی ضیار الحق وغیرہ نے مفتی صاحب کو شرکت
قبول نہ کرنے پر زور دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ مفتی صاحب نے شرکت سے صاف انکار کر دیا۔

مولانا سید اسعد مدنی صاحب باوجود اس اختلاف کے مفتی صاحب کے پاس مشورہ کرنے آتے جاتے رہے، مفتی صاحب میں لاکھ روپے کی بات یہ تھی کہ وہ مشورہ بے لاگ اور مفید دے دیا کرتے تھے، اور اپنے مزاج کے مطابق دونوں پہلوؤں پر مفصل روشنی ڈال دیا کرتے تھے۔

مفتی صاحب کا یہ کردار ناقابلِ فراموش ہے مفتی صاحب کی دانشمندی، معاملہ فہمی و فراست کے سب ہی قائل تھے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالےٰ اُن کو مراتب علیا سے سرفراز فرمائے اور ہم کو بھی صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق بخشے۔ آمین۔

پیغام

(از نرنجن سنگھ لانبہ)

جناب مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی۔ چند ایک شردھا کے پھول تحریر خدمت ہیں۔ سچائی، دیانتداری، غریب پرور، ہر ایک مظلوم کی مدد دل و جان سے کرنی۔ خواہ کوئی مذہب ہو، یہ اثر میرے دل پر ہے۔ اور تا زندگی رہے گا۔ عرصہ دراز تعلق رہا، مگر ظالم موت نے ہم سے ایک عظیم انسان کی جان لے لی۔

میری دلی دعا ہے۔ کہ پروردگار ان کی روح کو شانتی دیں اور اپنے دربار میں (خدا) کے دربار میں جگہ دیں اور بہشت میں اعلیٰ مقام ملے۔

مفتی صاحب کی وفات کے بعد بھی میرا تعلق اُن کے صاحبزادہ عمید الرحمٰن عثمانی اور انکے پاک ادارے سے بالکل اُسی طرح جڑا ہوا ہے۔ اور صاحبزادہ عمید الرحمٰن عثمانی مجھ سے بہت لگاؤ رکھتے ہیں۔

فقط خیر اندیش: نرنجن سنگھ لانبہ

وہ بہار جو پھر کبھی لوٹ نہ سکی
کی کچھ پُرانی یادیں

قاری محمد ادریس صاحب امام جامع مسجد نیو دہلی

مفتی صاحبؒ نے اپنے کمال علم و فضل کے ساتھ جس آن بان کی زندگی گذاری اور فکر و قلم کے جو اعلیٰ مشاغل اپنائے اُن میں راہ سلوک و تصوف کی وہ اعلیٰ نسبت جو حضرت موصوف کو حاصل تھی، کچھ زیادہ نمایاں نہ ہو سکی، مگر واقعہ یہ ہے کہ اُن کو سلسلۂ نقشبندیہ چشتیہ سے وابستگی موروثی نعمت و سعادت کے طور پر حاصل تھی اور عمر بھر وہ اپنے وظائف و اوراد کے پابند رہے اور ہمیشہ ذکرِ خفی کو پسند فرماتے رہے۔

اُن کے والدِ ماجد مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانیؒ اپنے وقت کے بڑے اہل اللہ میں شمار کئے گئے ہیں۔ انہیں شاہ عبد الغنی صاحبؒ و مولانا رفیع الدین صاحبؒ کے توسل سے حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے مستند سلسلہ سے بیعت و ارشاد کی اجازت حاصل ہوئی تھی اور اپنے وقت میں ہزاروں بندگانِ الٰہی نے اُن کے ہاتھ پر بیعت و ارادت کا فیض پایا تھا۔

میرے دادا جان مولانا قاری محمد اسحاق صاحب میرٹھیؒ حضرت موصوف کے باقاعدہ مجاز اور جانشین بیعت و ارشاد تھے۔ وہ مستقل طور پر دہلی میں نہر سعادت خاں کے کنارہ پل بنگش کے قریب ایک بالا خانہ میں رہائش رکھتے تھے۔ چچا جان قاری محمد یعقوب صاحب مرحوم دادا جان کے ساتھ ہی رہتے تھے، اور والد مرحوم (مولانا قاری محمد یوسف صاحب) کی بھی قریبی محلہ میں

رہائش تھی۔

مرحوم ومغفور مولانا سید محمد بدر عالم صاحب میرٹھی، کو اپنی علمی عظمتوں کے ساتھ رُوحانی سلسلہ سے بھی بڑا لگاؤ تھا اور اُنھوں نے دادا جان مرحوم کے ہاتھ پر بیعت کر کے سلوک و روحانیت کے منازل طے کئے تھے۔

حضرت علامہ کشمیریؒ کی وفات کے بعد جب اُن کے علوم و مراتب کے وارثین ڈابھیل سے منتشر ہونے لگے، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ دیوبند واپس آگئے۔ مفتی عتیق الرحمٰن صاحبؒ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کلکتہ چلے گئے تو مولانا بدر عالم صاحب نے دہلی آکر اپنے مُرشد (دادا جان) سے کسب صحبت و سعادت کو زیادہ بہتر سمجھا اور دہلی آگئے۔ اِن دنوں وہ جامع صحیح البخاری پر حضرت شاہ صاحبؒ کے تراجم و تشریحات کو جمع کر کے فیض الباری کی تدوین میں مشغول تھے۔

اُن کا یہی مبارک منصوبہ بعد میں ترقی اور وسعت پا کر اُردو زبان میں انوارِ وحیٔ احادیث مقدسہ کا ایک بے مثال اور بیش بہا مخزن بن کر "ترجمان السنۃ" کے نام سے ضخیم جلدوں میں ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع ہو کر مقبولِ خاص و عام ہوا۔ یہی مولانا مرحوم کی عمر بھر کی محنت کا ثمرہ قدسیہ تھا اور اُمت کے لئے عشقِ رسول کے عطر میں ڈوبا ہوا سدا بہار تحفہ۔

دادا جان مرحوم ومغفور کی رہائش گاہ پر ان دنوں علماء و مشائخ کی آمد ورفت بہت تھی۔ دیوبند اور میرٹھ کے اربابِ علم وفضل آئے دن دادا جان کے پاس حاضری دیتے تھے اور اُن کی بزرگانہ شفقت و محبت سے فیض پاتے تھے۔

وقت گذرتا گیا اور کچھ ہی عرصہ بعد مفتی عتیق الرحمٰن صاحب اور مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب بھی ندوۃ المصنفین کا منصوبہ لے کر دہلی آگئے۔ اور اپنے رفیق محترم مولانا بدر عالم صاحب

کو بھی ندوۃ المصنفین میں ساتھ لے کر ندوۃ کے کام کی بسم اللہ کی۔

یہ زمانہ ہندوستان کی سیاست میں انتہائی تلاطم و جوش و جذبات کا تھا۔ ہندوستان کی آزادی اور تقسیم کے نعرے فضاؤں میں گونج رہے تھے۔ مجاہدِ ملت کا زیادہ وقت سیاسی دلچسپیوں اور سرگرمیوں میں گذرتا تھا پھر بھی ندوۃ المصنفین کی ذمہ داریوں کو وہ بہر صورت نباہنے کی کوشش کرتے تھے۔ پھر برسوں یہ سلسلہ رہا کہ دن بھر یہ حضرات ندوۃ المصنفین کا کام کرکے شام کے وقت تفننِ طبع اور ہواخوری کے لئے قرول باغ سے پیدل چل کر داداجان کے ہاں آجاتے سو ہاں چائے کی محفل جمتی اور پھر اہم علمی موضوعات اور وقتی مسائل پر بے تکلف گفتگوؤں کا سلسلہ عشاء کے بعد تک قائم رہتا۔

اِن روزینہ مجلسوں میں مفتی صاحب کی شگفتہ بیانی اور مولانا سید بدر عالم صاحب کی نکتہ سنجیاں باغ و بہار کا سماں باندھ دیتی تھیں۔ مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی بھی اکثر شریک رہتے تھے۔ اُردو کے مقبول و مشہور شاعر بہزاد لکھنوی بھی اُن دنوں دہلی آگئے تھے اور اکثر ان بزرگوں کی مجلس علمیہ میں شریک ہوا کرتے تھے۔ پھر فرمائشی طور پر وہ اپنی کوئی غزل یا نعت جب اپنے مخصوص والہانہ بلکہ مجذوبانہ انداز میں پڑھتے تھے تو پوری محفل پر ایک وجد طاری ہو جاتا تھا۔

برادرم مولانا سید انیس الحسن صاحب جو اُن دنوں اپنے علوم دینیہ و درسیہ کی تکمیل کے درجے میں تھے اور قریب ہی رہائش رکھتے تھے، بصد ذوق و شوق ان محفلوں میں شریک ہوا کرتے، انھیں خاص طور پر مفتی صاحبؒ کی اور مولانا سید بدر عالمؒ کی علمی گفتگوؤں اور تفسیر و حدیث کے موضوعات پر اُن کی جواہر ریزی سے بڑا اُنس تھا۔ کبھی کبھی مولانا فقیہہ الدین صاحب بھی اُن کے ساتھ ہوتے تھے۔ داداجانؒ ہم سب کم عمروں سے نہ صرف شفقت و کرم کا معاملہ کرتے بلکہ بڑی پابندی اور اہتمام کے ساتھ ہر دفعہ کچھ نہ کچھ مٹھائیاں ضرور کھلاتے (جو اُن کی الماری میں ہمیشہ ہی رہتی تھیں) جن کی حلاوت و لذت

آج تک کام و دہن کو یاد ہے، ۱۳۶۶ھ میں دا دا جان کے وصال کے ساتھ ان بابرکت وباسعادت مجلسوں کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ اور پھر تھوڑے ہی دن بعد وطن کی آزادی اور تقسیم نے وہ قیامتیں برپا کیں کہ یہ تمام شیرازہ ہی بکھر گیا۔ مولانا بدر عالمؒ ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ ترجمان السنّہ کی تدوین دیارِ حبیب ہی میں فرمائی اور پھر آخری سانس تک زندگی مدینۃ الرسول کی مقدس و معطّر فضاؤں میں ہی گذار دی' ادھر ندوۃ المصنفین تباہ و برباد ہوا مفتی صاحب مقامی پناہ گزیں بن کر جامع مسجد کے قریب ایک مکان میں منتقل ہو گئے۔

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کو ہنگامی مسائل اور مظلوموں کے بے اندازہ مصائب ومشکلات نے ایسا گھیرا کہ انھیں پھر قلم سنبھالنے کی مہلت ہی نہ مل سکی۔ مولانا حامد اللہ انصاری غازی بمبئی اور مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی مدرسہ عالیہ کے پرنسپل بن کر کلکتہ چلے گئے۔ گردشِ دوراں کو پھر ایسی منوّر و مقدس محفلیں دیکھنی نصیب ہی نہ ہوئیں۔

حضرت مفتی صاحب مرحوم

ایک مختصر خراجِ عقیدت

(از پروفیسر طاہر محمود، شعبۂ قانون، دہلی یونیورسٹی)

کم لوگ اس بات سے واقف ہوں گے کہ میں اُن خوش قسمت گنہ گار و دنیادار لوگوں میں ہوں جنہیں دینی علم و عمل کے اُس کوہِ عظیم مرحوم و مغفور حضرت مفتی عتیق الرحمن صاحب سے قُرب حاصل تھا، باوجود اس کے کہ میں عمر میں اُن کے سامنے طفلِ مکتب، اور علم میں اُن کے قدموں کی دُھول بھی نہیں تھا۔ جو پدرانہ شفقت، بزرگانہ مہر و محبت اور قدم قدم پر انمول ہدایات و نصیحت مجھے برسوں تک مرحوم سے ملتی رہی اُن کا میرے کردار و خیالات کی تعمیر میں ایک قابلِ ذکر حصّہ ہے۔

میں بہ سلسلۂ ملازمت اب سے بیس سال قبل ۱۹۶۷ء میں علی گڑھ سے دہلی منتقل ہوا تھا۔ اسی سال کے اواخر میں مجھے فتحپوری مسلم اسکول کی مجلسِ عاملہ کی رکنیت پیش ہوئی۔ مفتی صاحب مرحوم ان دنوں اس ادارہ کے ناظمِ اعلیٰ تھے۔ یہ حضرت کی خدمت میں میری رسائی کا نقطۂ آغاز تھا۔ اس کے بعد سے حضرت کی ناحیات میں اپنے علمی، تعلیمی، تحقیقی، یہاں تک کہ کبھی کبھی ذاتی مسائل کا حل تلاش کرتے، ان کی خدمتِ بابرکت میں برابر حاضر ہوتا رہا اور آپ نے ہمیشہ انتہائی شفقت کے ساتھ میری دستگیری فرمائی۔

ستمبر ۱۹۶۹ء میں جب بہ سلسلۂ تعلیم میں لندن کے لئے روانہ ہو رہا تھا تو مفتی صاحب

بہ کمال شفقت خود پہلی بار میرے غریب خانہ پر تشریف لائے تھے۔ انھوں نے اس وقت جو معنی خیز دعائیں میرے لئے فرمائیں۔ انھوں نے کفر و الحاد کی اس دنیا میں میرے لئے نصیحت کا ایک چراغ مستقل روشن رکھا۔ ۱۹۷۱ء میں لندن سے واپسی پر میں جلد ہی حضرت والا کی خدمت میں پھر حاضر ہوا۔ ہندوستان میں مسلم پرسنل لا کے سلسلہ میں حکومت کے دائرہ اختیار کی تاریخ اور اس کی دستوری حیثیت پر اپنے تحقیقی کام میں مجھے مفتی صاحب سے تبادلۂ خیال کے کثیر مواقع ملے، آئندہ سال ۱۹۷۲ء میں دارالعلوم دیوبند میں قاری طیب صاحب مرحوم و مغفور کے ایما پر ایک کل ہند کانفرنس مسلم پرسنل لاء پر منعقد ہوئی جس میں شرکت کا شرف مجھے بھی عطا ہوا۔ دیوبند کے اجلاس میں میری طویل تقریر کا متن بعد میں مفتی صاحب کی خدمت میں خود موصوف کے حکم پر پیش کیا گیا۔ ان کے فرمودات کی روشنی میں اس پر نظر ثانی کی گئی جس کے بعد وہ تقریر پروفیسر مجیب مرحوم کے تعارفی کلمات کے ساتھ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کی طرف سے "مسلم پرسنل لا کے تحفظ کا مسئلہ" کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع ہوئی۔

نومبر ۱۹۷۳ء میں ایک دن جب میں حضرت کو اپنی شادی کی تاریخ طے ہونے کی اطلاع دینے اور دعائیں لینے کے لئے حاضر خدمت ہوا تو آپ نے اظہار مسرت کے ساتھ بے ساختہ فرمایا کہ "جناب آپ کا نکاح تو میں ہی پڑھوں گا"۔ خاندان کی روایت کے مطابق میرے متعدد بھائیوں میں سے اکثر کا نکاح قبلہ والد صاحب مرحوم و مغفور نے بذات خود پڑھا تھا۔ میں نہ اس روایت سے محروم ہونا چاہتا تھا اور نہ اس سعادت عظمیٰ سے جس کی پیش کش مفتی صاحب نے فرمائی تھی بہرحال اپنے شش و پنج کا حضرت سے اظہار کئے بغیر چلا آیا۔ شادی کی شام کو حضرت تشریف لائے اور تقریب کی انتہائی سادگی اور صحیح اسلامی طریقے کی سخت پابندی

جو میرے والد مرحوم کی شرعی احکام پر شدتِ عمل کی مرہونِ منت تھی، دیکھ کر بے حد خوش ہوئے۔ گنتی کے چند لوگ جو بطور "بارات" کے میرے ساتھ لڑکی والوں کے گھر گئے اُن میں مفتی صاحب بھی شامل تھے۔ ابا جان مرحوم کی اجازت بلکہ اصرار پر حضرت نے ایجاب و قبول کرایا اور خطبۂ نکاح پڑھا۔ آج بھی یہ امر ہم دونوں زن و شو اور بچوں کے لئے باعثِ صد افتخار ہے۔

دو سال بعد دسمبر ۱۹۷۵ء میں ابا جان قبلہ نے فریضۂ حج کی ادائیگی کے بعد مکہ معظمہ میں رحلت فرمائی۔ سانحہ کی خبر سنتے ہی مفتی صاحب مولانا سعید احمد اکبر آبادی مرحوم کی معیت میں اپنے دولت کدہ سے میلوں دُور واقع میرے غریب خانہ پر تشریف لائے۔ جس انوکھے انداز پر ان بزرگوں نے تعزیت فرمائی، خصوصاً حضرت مفتی صاحب کے کلمات اور توضیحات، وہ آج بھی میرے ذہن کی گہرائیوں میں اس مرہم کی طرح محفوظ ہیں جو والد صاحب مرحوم و مغفور سے جدائی کے غم کو، جو اکثر تازہ ہو کر دل و دماغ کو متاثر کرتا ہے، دُور کرنے میں میری جذباتی اور نفسیاتی اعانت کرتے ہیں۔

فقہی مسائل پر حضرت مفتی صاحب کا موقف جس کا اظہار بارہا فرمایا گیا، یہ تھا کہ ہندوستان کے مسلم معاشرہ میں بہت سی خرابیاں آگئی ہیں جن کا سدِّباب ہونا چاہیئے لیکن مسلمانوں کے شخصی قانون کی انفرادیت اور امتیاز کے اس ملک میں تحفظ کی ہر ممکن کوشش کی جانی چاہیئے۔ مرحوم قانون کے معاملہ میں نہ جمود پرست تھے اور نہ مقلد۔ نصوص قطعی کے دائرہ سے باہر ان کے نزدیک غور و خوض اور نظرِ ثانی کی پوری گنجائش تھی۔

اللہ تعالیٰ رب العزت حضرت کی روحِ سعید کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائیں۔ ان کے فرمودات و نصائح کے اثرات میری طرح جانے کتنے اور لوگ آج بھی اپنے خیالات و کردار میں فرما دیکھتے ہوں گے۔

صاحبِ ذکر و فکر

ڈاکٹر تنویر احمد علوی

جن لوگوں نے کبھی مفتی صاحب کو نہیں دیکھا وہ بہت کچھ سُن کر اور پڑھ کر بھی شاید اس کا صحیح اندازہ نہ لگا سکیں کہ مرحوم اپنے کریمانہ اخلاق اور مشفقانہ لطف و کرم کے اعتبار سے کیا تھے اور یہ کہ جو ایک بار ان سے مل لیتا تھا وہ اُن کی عالمانہ گفتگو مصلحانہ طریق فکر اور بزرگانہ طرزِ سلوک کا کس قدر گرویدہ ہو جاتا تھا۔ اکثر وہ اس طور پر احسان فرماتے کہ اس شخص کو خبر بھی نہ ہوتی جس پر احسان کیا جا رہا ہے آج کے ماحول میں یہ سوچنا کتنا مشکل ہے۔

بڑے لوگ عام طور سے "شجرِ ممنوعہ" کی سی حیثیت رکھتے ہیں اور "دور باش" کے ضابطوں ہی میں، بڑی حد تک، اُن کی عظمت کا راز پوشیدہ ہوتا ہے مگر مفتی صاحب کے ساتھ ایسا نہ تھا۔ ایک بڑے باپ کے بڑے بیٹے تھے اور اپنی علمی حیثیت، خاندانی امتیازات، ثقافتی سرگرمیوں، دینی بصیرت اور سیاسی فکر و عمل کے اعتبار سے ملتِ اسلامی کے بہت ممتاز افراد میں سے تھے اور اسی نسبت سے ان کی مصروفیات کا دائرہ بھی کافی وسیع اور رنگا رنگ تھا۔ لیکن اپنی ذہنی اور عملی مشغولیتوں کے باوصف وہ ہمیشہ خوش فکر اور متوازن نظر آتے تھے۔ تعصب و تفاخر سے ماورا اور ہمیشہ نیک نیتی کے ساتھ حسنِ سلوک پر آمادہ۔

مختلف افراد، اپنے ذاتی، معاشرتی، اجتماعی اور سیاسی مسائل لیکر ان کے پاس آتے مفتی صاحب اُن کی سنتے اُن سے تبادلۂ خیال کرتے اور اپنی مخلصانہ

توجہ اور تعلقِ خاطر کے ساتھ اُن کو جو مشورہ دیتے یا اُن کی مدد کے لئے جو قدم اُٹھاتے وہ دوسروں کے لئے بھی روشنی اور رہنمائی کا باعث ہوتا۔

سلسلۂ دیوبند سے وابستہ بعض دوسرے اکابر کی طرح مُفتی صاحب نے بھی سیاست میں قدم رکھا اور قومی رہناؤں کی صفِ اوّل تک آگئے لیکن اس راہ میں گام فرسائی کی پہلی شرط ان کے یہاں کبھی یہ نہ رہی کہ وہ مجنوں بنے رہیں۔ اس کے برعکس انھوں نے اپنی آزادیٔ فکر ورائے کو ہمیشہ قائم رکھا اور دل کے خطرے سے باخبر رہے۔ دوسروں کی رائے کا احترام کیا۔ لیکن مصلحت وقت اور قومی تقاضوں کو سمجھتے ہوئے بھی اپنے ضمیر کے خلاف ان سے سمجھوتہ کرنے پر کبھی آمادہ نہ ہوئے۔

مولانا آزاد، گاندھی جی، سردار پٹیل، پنڈت جواہرلال نہرو اور اندراجی جیسے زعما اور اہلِ سیاست سے ان کے براہِ راست تعلقات تھے۔ مفتی صاحب ان کے لئے اپنے دل میں احترام کا جذبہ بھی رکھتے تھے۔ ان کے قومی نقطۂ نظر اور سیاسی حکمت عملی کو سمجھنے سمجھانے کی بھی مُخلصانہ کوشش کرتے تھے لیکن جہاں ضروری ہوتا اپنے دل و دماغ کی گواہی کے ساتھ وہ ان سے برمحل اور برملا اختلاف کرتے، اور اس کا اظہار اُن کی اپنی زبان اور زبانِ قلم سے بے تکلف ہوتا۔ ان کے یہاں تذبذب فی الرائے کو دخل نہ تھا۔ اسی لئے وہ اپنی بات منطقی ربط اور مثبت انداز سے پیش کر سکتے تھے۔

ہمارے یہاں داستان طراز واعظوں اور شعلہ فشاں (Fire. brand) مقرروں کو زیادہ پسند کیا جاتا رہا ہے۔ سیاسی کرتب اور نظریاتی قلابازیاں بھی قومی زندگی اور اس کے سیاسی تماشائیوں کی توجّہ کو اپنی طرف کھینچنے کے لئے بہت زود اثر خیال کی جاتی رہیں۔ علاوہ بریں سیاسی کردار کی تعمیر کے لیے دولت کے خود غرضانہ حصول اور صرف بے جا کی مثالیں بھی آزاد ہندوستان کی جماعتی گروہ بندیوں اور

اقتدار خواہی کے لئے سیاسی صف آرائیوں میں کچھ ایسی کم یاب اور نایاب نہیں ہیں۔ لیکن مفتی صاحب اپنی قومی اور سیاسی زندگی میں طاعت گذاریوں اور ملّی نقطۂ نظر کی پاسداریوں میں منہ انگیس کی لاگ سے ہمیشہ دُور رہے اور اپنی سیاسی وملّی خدمات کے جذبہ کو کبھی انھوں نے اِس میزانِ قدر اور وزن و وقار کے اِن عصری پیمانوں سے تولنے کی بابت نہیں سوچا۔

آدمی اپنے حلقۂ احباب سے پہچانا اور اپنے اداراتی رشتوں سے جانا جاتا ہے۔ مفتی صاحب کا تعلق دیوبند کے مدرسۂ فکر سے تھا جس کی روایت میں ہی حضرت شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی کی حرّیت فکر، اس خاندان کا تبحّر علمی اور جذبۂ جہاد کارفرما عنصر کی حیثیت میں شامل رہا ہے۔ اس اعتبار سے دارالعلوم اپنی ابتدا ہی سے ایک "مکتبِ ذکر" نہیں "دبستانِ فکر" بھی ہے۔ اس نے اپنے دائرۂ فکر وعمل میں حضرت مولانا قاسم، حضرت مولانا یعقوب (صاحبزادۂ مولانا مملوک العلی) حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن، حضرت مولانا حسین احمد مدنی، حضرت مولانا حفظ الرحمٰن اور خود مفتی صاحب جیسے اکابر کو سمیٹ لیا ہے جن کی زندگی میں جہاد و اجتہاد کا ایک عجیب امتزاج ملتا ہے۔

ان کا سلسلۂ تعلیم و تدریس حضرت شیخ الہند اسیر مالٹا، حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیری، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی اور مفتی عزیز الرحمٰن جیسے علمائے عصر کے حلقۂ تربیت اور سایۂ عاطفت سے وابستہ رہا ہے اور یہ وہ لوگ تھے جن کے لئے کہا جاسکتا تھا "آنانکہ خاک را بہ نظر کیمیا کنند" اور پھر جن لوگوں سے اُن کے بیحد شگفتہ تعلقات رہے اور اخلاص و احترام کا دینی رشتہ ہمیشہ استوار رہا، ان میں مولانا اشرف علی صاحب تھانوی، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب اور حضرت مولانا احمد سعید صاحب جیسی شخصیتوں کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ دھنک کے سے رنگوں کا

یہ نیم دائرہ خود اپنی جگہ بہت وسیع ہے اور اس کا عکس ان کے دوستوں کے حلقے میں بھی دیکھا جا سکتا ہے جن میں ایسے بہت سے صاحبانِ امتیاز کا نام آتا ہے جو اپنے ناموں اور کاموں دونوں کے اعتبار سے بڑے ہیں۔

یہ بڑے رشتے کسی بھی شخص کے لئے بڑائی کا سبب بن سکتے ہیں۔ مگر مفتی صاحب کا معاملہ کچھ "باہمہ اور بے ہمہ" کا سا تھا۔ اُن کی ایک الگ شخصیت تھی (وہ اپنی ذات سے انجمن تھے) انھوں نے اپنے اداراتی کردار میں بزرگوں کی پیروی اور تقلید بھی کی، کہ مذہبی طریق فکر میں اس کو خاص طور پر وجہ تحسین و لائق تعریف قرار دیا جاتا ہے مگر بزرگوں کی شخصیت و شعور کو اپنے لئے نشان راہ بنانے کے باوصف وہ روش اختیار نہ کی کہ ان کے اپنے نقوشِ قدم کو الگ نہ پہچانا جا سکے۔ ان کی شناخت کا ذریعہ ان کی اپنی وہ شخصیت تھی جس میں جدید و قدیم کا ایک عجیب اتصال و اجتماع دیکھنے کو ملتا تھا۔

دیکھئے تو وہ ایک سیدھے سادے مُہذّب و معقول انسان نظر آتے تھے اور سوچئے تو اُن کی شخصیت ایک بڑی پُرجہت شخصیت تھی جس میں سادگی و پرکاری کا ایک عجیب امتزاج دیکھا جا سکتا تھا۔

از شمار نظر زیک تن کم ور حسابِ خرد ہزاراں بیش

تورّع اور تقدّس کے ظاہری رسوم و آداب کا سہارا انھوں نے کبھی نہ لیا، خود کو دوسروں سے دور رکھنے اور مصافحہ کی حد تک بھی تکلّف اختیار کرنے کی ادا شاید اُن کو کبھی پسند نہ آئی جو آج بھی بہت سے صاحب "سُبحہ و سجادہ" افراد کے مفتخرانہ رویّے میں شامل نظر آتی ہے وہ دوسروں سے ایسے کُھلے دل سے ملتے تھے جیسے وہ اُن کے اپنے ہوں۔

مختلف لوگوں سے ملتے اور بات کرتے تو کبھی اپنے وسیع مطالعہ زندگی بھر کے مشاہدے

ذاتی تجربے، علمی تفکّر اور تدبّر کی بات درمیان میں نہ لاتے وہ دوسروں کی بات اس طرح سنتے جیسا کہ وہ ان سے کچھ سیکھنا اور سمجھنا چاہتے ہوں مگر بیشتر ان کا مقصد سمجھانا ہوتا تھا جس کے لیے دوسرے کی بات پہلے سمجھ لینا ضروری ہوتا ہے۔ اپنی بات کچھ ایسے سنجیدہ طریقہ اور ہمدردانہ خلوص کے ساتھ سمجھاتے تھے جس میں "شرکت" کا احساس شامل رہتا تھا۔

میں نے کبھی اُن کو دوسروں کی بات کاٹتے اور بلاوجہ اپنی کسی بات پر زور دیتے ہوئے نہیں دیکھا، انھوں نے بزرگوں، دوستوں، مخالفوں اور نیازمندوں کے درمیان رہ کر بہت کچھ سیکھا۔ اور آدمی اسی وقت سکھا بھی سکتا ہے جب وہ مسلسل سیکھنے کے لئے آمادہ رہے۔ یہ "آمادگی" مفتی صاحب کے انسانی رویہ، سوال وجواب کے طریقہ اور گفتگو کے سلیقہ سے ہمیشہ ظاہر ہوتی تھی۔ اس نوع کی سلامت روی کے نمونے بہت کم ملتے ہیں۔

دیوبند سے ذہنی اور زمینی ہم رشتگی کے باوصف (کہ وہی اُن کی زاد بوم تھی) اور جمیعۃ علماء سے بہت نمایاں اور امتیازی حیثیت میں وابستگی کے باوجود جدید تعلیمی اور تربیتی اداروں سے ان کا بہت گہرا تعلق تھا جسے کسی طرح رسمی نہیں کہا جاسکتا۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جامعہ ملّیہ اسلامیہ، دہلی کالج، اور اینگلو عربک کالج سے ان کے روابط اس کی طرف اشارہ کرنے کے لئے کافی ہیں۔ یہاں جن لوگوں سے ان کا واسطہ پڑتا تھا وہ ذاکر صاحب، مجیب صاحب اور بیگ صاحب جیسے افراد تھے۔ جنہوں نے جدید تعلیم کی اُفقی منزلیں طے کی تھیں اور جن کے سامنے ثقافت وتہذیب اور تعلیم وتربیت کے نئے مسائل تھے۔ مفتی صاحب ان مسائل سے عہدہ برآ ہوئے اور نئے حالات میں ان کا حل تلاش کرنے میں ایک موثر رکن اور روشن دماغ مدبّر کی طرح اُن کے شریک رہے۔ ذہن میں تیزی اور تفہیم نکات میں "پیناپن" (sharp-ness) اسی وقت آتی ہے جب آدمی اپنے ذہن کے دریچوں کو کھلا رکھے اور نئی سچائیوں کے ساتھ آنکھیں چار کرنے اور مختلف ومتضاد

عناصر کے ساتھ ہم سنگ و ہم آہنگ ہونے کی اس طرح کوشش کرے کہ توازن و تناسب کی "قدر" ہاتھ سے نہ جانے پائے۔

مفتی صاحب کی زندگی اور ان کے ذہن کا ایک ہلکا سا پرتو ان کے برآمدہ ملاقات اور برہان کے دفتر میں بھی دیکھا جاسکتا تھا۔ کوئی شئے زیادہ قیمت کی نہیں صوفہ سیٹ کرسیاں، الماریاں، بجلی کا لیمپ، مگر ہر شئے قرینے سے رکھی ہوئی اور اس حالت میں بھی یہ قرینہ باقی ہے کہ ہر وقت آنے والوں کا تانتا لگا رہتا ہے۔ گاہ گاہ اخبارات و رسائل ضرور ادھر اُدھر میز پر بکھرے ہوئے نظر آتے تھے، بوریا نشینی کی روایت کو انہوں نے بدل دیا تھا مگر "درویش صفت وہ ضرور تھے۔

علمائے دیوبند ہی میں نہیں صوفیائے کبار میں بھی بہت بزرگوں کے یہاں یہ رویہ ملتا ہے کہ وہ زبان حال یا پھر زبان قال سے زیادہ کام لیتے تھے اور زبانِ دل کے مقابلہ میں خامہ و زبان کو "نشۂ غیر" تصور کرتے تھے اور زبان غیر سے شرحِ آرزو کرنا انھیں اچھا نہ لگتا تھا۔ یہ خیال خود مغربی اہل فکر کے یہاں بھی موجود رہا ہے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ صرف درمیانی درجہ کے لوگ ہی لکھتے ہیں۔ اعلیٰ درجہ کا ذہن رکھنے والے گو سوچتے ہیں اور مشاہدہ کا ذات و تجزیہ حیات میں مستغرق رہتے ہیں۔ ہاں ایسے کچھ لوگوں کے ملفوظات ضرور جمع کئے گئے ہیں اور یہ ملفوظات حکیمانہ ادبیات کا ایک بیش بہا حصہ ہیں۔

مفتی صاحب کے ساتھ بھی یہ عجیب بات ہے کہ انھوں نے بہت کم لکھا اور جو لکھا ہے اس کی حیثیت بھی سخن مختصر کی سی ہے۔ انھیں لکھنا آتا تھا اور خوب سے خوب تر کی تلاش میں وہ کسی معنی میں عاری نہ تھے۔ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے آغاز کار سعی تصنیف و تالیف ہی سے کیا تھا۔ ۱۹۳۸ء میں جب ندوۃ المصنفین کا قیام عمل میں آیا تو دوسرے رفقا کے ساتھ انھوں نے بھی لکھنے پڑھنے کا کام شروع کر دیا تھا۔

علامہ ابن تیمیہ کی "الکلم الطیب" کی تشریحی نگارشوں کے ساتھ اور علامہ ابن جوزی

کی "صید الخواطر" انھیں دنوں کی یادگار ہے۔
ایک طرف اُن کی عالمانہ بے نیازی تھی جو انھیں اپنے بعض بیش رَوں سے ورثہ میں ملی تھی، دوسری طرف دہلی کے طویل زمانۂ قیام میں اُن کی سیاسی، ثقافتی اور انتظامی مصروفیتیں جن کے حق میں فیصلہ خود انھوں نے کیا تھا بالخصوص وہ حالات جو سنہ ۴۷ء کے تاریخی واقعہ کے بعد مُلکی اور قومی زندگی میں پیش آئے اور جنہوں نے مسلمانوں کے ملّی وجود سے متعلق بہت سے خطرات اور خدشات پیدا کر دیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انکی وجہ سے وہ دوسرے اہم مسائل و معاملات کے لئے تو وقت نکال سکے اور خود کو ان کے حل کی تلاش کی خاطر وقف کر دینے پر تو آمادہ ہو گئے لیکن جو کچھ بھی کیا اور کہا اس کے لئے قلم و قرطاس کا سہارا لینے پر خود کو مجبور نہ کر سکے۔ بہرحال ان کے شروع کے فیصلہ کا انجام یہ ہوا کہ وہ آخر وقت تک اپنا رویہ نہ بدل پائے۔ یوں بھی انھوں نے اپنے بزرگ استاد مولوی شبیر احمد عثمانی اور اپنے زمانہ کے ایک دوسرے عالم مفتی شفیع کی طرح پاکستان نہ جانے کا فیصلہ کیا تو اس کا صاف یہ مطلب بھی تھا کہ وہ یہاں کے ناسازگار حالات میں اپنے اور اپنے ہم قوموں کے لئے ایک روشن مستقبل کی تلاش کریں گے۔ یہ تلاش آسان نہ تھی مگر مفتی صاحب نے اسی مشکل کو پسند کیا اور اس موجِ خوں کے شناور بن گئے جو پورے مُلک میں مسلمانوں کے سر سے گزر رہی تھی۔
اگر اپنے اسی دَور کے تجربات، حالات اور مشاہدات پر وہ لکھتے تو پچھلی نصف صدی کی نظری و عملی سیاست اور ملّی مسائل سے متعلق ایک مبسوط و مستند تاریخ تیار ہو جاتی جس کی آئندہ کے لیے ایک دستاویز کی سی حیثیت ہوتی اور یہ بھی پتہ چل جاتا کہ کس کس کی نہر ہے سر محضر لگی ہوئی۔ مگر مفتی صاحب ان مسائل سے جوجھتے رہے جو ملّت کے سامنے تھے اور ان وسائل کی جستجو کرتے رہے جو مسلمانوں کے روشن مستقبل کی ضمانت دے سکیں لیکن اس کے لئے اخبارات و رسائل کے صفحات یا قلم و کتاب کے

"میڈیا" سے صرف نظر کرتے ہوئے گذر گئے۔

"اب رہ رہ کر خیال آتا ہے کہ قیام ڈابھیل اور بیضاوی شریف وجلالین شریف ۲۱ - ۱۹۲۷ء کے درس کے زمانہ میں یا پھر ۳۷-۱۹۳۳ قیام کلکتہ کے دنوں میں پانچ سال کے قریب تک درس قرآن کریم کا جو سلسلہ قائم رہا تھا اور جس کی یاد اب بھی دل کو گرمادیتی ہے۔ اس وقت اس درس کی ریکارڈنگ ہوجاتی تو تھوڑی محنت کے بعد یہی درس تفسیر کی شکل میں مرتب ہوجاتا۔"
گذرے ہوئے دن واپس نہیں آتے اور اب افسوس کے علاوہ کوئی چارۂ کار بھی نہیں ہے۔ (۵)

ایک اور موقع پر لکھتے ہیں:

"حکیم محمد زماں صاحب نے بڑے خلوص اور محبت سے بار ہا اصرار کیا کہ اب سب کام چھوڑ کر دو ہی جلدوں میں قرآن کریم کی مختصر سی تفسیر لکھ دو نا یہ بڑا کام ہوجائے گا، مگر میری زندگی کا نقشہ ہی بدل چکا تھا۔ دوسری بے تحاشا اجتماعی اور سیاسی مشغولیتوں کے ساتھ کلام پاک کو ہاتھ لگانے کی ہمت باقی نہ رہی تھی۔" (۵)

ان کے پاس تو خود ان کا قائم کردہ ادارہ ندوۃ المصنفین تھا اور اس کا علمی ماہنامہ "برہان" ان دونوں کا بھی ان پر حق تھا۔ یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ان دونوں کی اپنی ایک تاریخ ہے، نصف صدی کے طویل عرصہ پر پھیلی ہوئی تاریخ۔ اس تاریخ کو مفتی صاحب کی ذات سے الگ کرکے دیکھنا ممکن نہیں کہ اصل وہی ان کے روح رواں تھے لیکن یہ دونوں بھی ان کے قلمی آثار سے تقریباً محروم ہیں جس کی تلافی مفتی صاحب کی

انتظامی صلاحیت، کاروباری سوجھ بوجھ اور علمی وادبی معیار بندی سے بھی شاید نہیں ہو سکتی۔

ویسے یہ امور بھی کچھ کم لائق تحسین اور قابل احترام نہیں کہ برہان کے اجرا اور ندوۃ المصنفین کے قیام پر نصف صدی بیت رہی ہے جو ہماری ملکی اور قومی زندگی میں بڑے جزر ومد کا زمانہ ہے۔ کتنے معیار ہیں جن کو ذہن میں رکھ کر اور جن کا قابل قدر نمونہ پیش کر کے ہمارے ادبی جرائد آگے بڑھے لیکن وقت نے آگے چل کر کچے دھاگوں اور مٹی کے گھروندوں کی طرح ان کو توڑ دیا۔

علمی معیاروں کو قائم رکھنا، کاغذ، کتابت، طباعت اور ترسیل میں یکساں معیاروں کو اتنے لمبے زمانے تک لیکر چلتے رہنا اور اپنے عمل سے اس پر اصرار کرتے جانا کوئی مذاق نہیں۔ ہماری قومی صحافت وادب دونوں کی تاریخ میں یہ باتیں وقوعات نادرہ میں سے ہیں۔ برہان کا ایک پرچہ اور مکتبۂ برہان کی ایک کتاب بھی ایسی نہیں ہے جسے ہم دوسرے درجہ میں رکھ کر دیکھ سکیں۔ قبول عام کی سند کتنی ہی بڑی چیز ہو لیکن اپنے معیار کی ضمانت وہ بہر حال نہیں ہوتی۔ ہماری علمی صحافت اور ادبی جرنلزم کی ایک کسوٹی بجا طور پر برہان کو قرار دیا جا سکتا ہے جس کا تمام کریڈٹ مفتی صاحب اور ان کے ساتھ کام کرنے والوں کو جاتا ہے۔

اگر "منارِ صدا" میں ترتیب پانے والے مضامین مرتب ہو کر مکتبۂ برہان سے شائع نہ ہو گئے ہوتے تو ہم مفتی صاحب کے ایسے رشحات فکر سے بالکل تہی دست رہ جاتے جنکو پاکر اور پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اگر مفتی صاحب اپنے لئے تحریری مصروفیات اور قلمی آثار کی تحریر و تحفظ کو اتنا ہی اہم اور ضروری سمجھتے جتنا انھوں نے انتظامی مسائل ومعاملات سے دلچسپی اور قومی سطح کے کاموں میں مشغولیت کو اپنے لئے ناگزیر تصور کیا تو خود ان کے قلم سے ان کے اپنے مکتبہ کی تالیفات میں گراں قدر اضافہ عمل میں آتا۔

منار کی صدا کی ترتیب کے لئے ڈاکٹر عنوان چشتی ہماری ستائش خاص کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ان پراگندہ اوراق صدا کو بڑی کوشش و کاوش سے جمع کیا اور ریڈیائی نشریات کے نقطۂ نظر سے ان پر فنی تنقید کی اور موضوع کا حق ادا کیا۔

ان مضامین میں تکرار خیال کے لحاظ سے بہت سے شہ پارے محل نظر ہیں اور وہ نہ ہوتے تو بہت اچھا تھا۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ یہ الگ الگ تقریروں میں اور مختلف رسوم اور تقریبات کے موقع پر ریڈیائی تعارف ناموں کے طور پر لکھی گئی ہیں ان میں بعض وہ باتیں اور مثالیں بار بار سامنے آئی ہیں جو مفتی صاحب کو بگمان غالب زیادہ پسند تھیں اور جنھیں ریڈیو کے سامعین تک پہنچانا چاہتے تھے اسی لئے اُن کی اس غائبانہ گفتگو میں "آیئے" کا لفظ اکثر آتا ہے۔

جب وہ ایک کے بعد دوسری مرتبہ اسی موضوع پر لکھتے تو جو باتیں ان کے ذہن پر ابر پاروں کی طرح تیرتی رہتی ہیں وہ بے اختیار اُن کے قلم روشنائی کے ساتھ صفحۂ قرطاس پر تراوش پا جاتیں۔

اتنا موقع انھیں مشکل ہی سے ملتا ہوگا کہ وہ اس خاص موضوع پر باز نگاری کی کوشش کو "دہرانے کے عمل" سے بچالیں اور تلاش تازہ سے کام لیں

بہرنوع تحریری زبان اور زبان تحریر کے اعتبار سے یہ نگارشات نہ صرف یہ کہ اہم ہیں بلکہ ان میں علمی نثر کی سنجیدگی اور نثری ادب پاروں کی شگفتگی کی بہت عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔

ڈاکٹر عنوان چشتی نے ان کے اسلوب تحریر پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمان عثمانی ملتِ اسلامیہ کے ممتاز دانشور اور مفکر ہیں۔ موصوف نے اس بحرانی دور میں قومی سطح پر ارباب فہم و فراست سے اپنی سیاسی و سماجی بصیرت کا لوہا منوایا ہے۔ مفتی صاحب کے فکر رسا اور دانشِ باطن نہ صرف یہ کہ ان کے قومی و سماجی کارناموں میں جھلکتی ہے بلکہ انکی

تقریروں اور تحریروں میں جلوہ گر رہے۔

مفتی صاحب کی شخصیت کی بنیادی خصوصیات ہیں۔ ذہن بیدار اور دل دردمند یہ دونوں خوبیاں اپنی تازگی اور توانائی کے ساتھ ان کی تحریروں میں جھلکتی ہے۔ (۵)

دردمندی ان کی مذہبی فطرت کی ایک نمایاں خوبی ہے۔ لیکن ان کے ذہن بیدار نے مذہبیت کے جذباتی رویے اور جرح وتعدیل کی غیر ضروری تفصیلات سے انھیں بچالیا۔

مذہبی تحریر چونکہ پرستانہ جذبہ اور معتقدانہ انداز کے ساتھ نقش پذیر ہوتی ہیں، اس لئے ان میں سپاٹ پن کی مثالیں زیادہ سامنے آتی ہیں یا پھر مذہبی انشائیات کے ایسے نمونے ملتے ہیں جن کو ادبی حسن اور جمالیات نثر کے کسی پیمانہ پر مشکل سے پرکھا جاسکتا ہے (استثنائی صورتیں یہاں بھی ضرور ہوں گی)

اس کی بڑی وجہ مذہبی طبقہ کا اردو ادب کے مطالعہ سے عدم دلچسپی کا رویہ بھی ہے ان کے یہاں اردو نگارشات ایک میڈیم ہیں مقصد نہیں اس لئے مذہبی تحریریں، ادبی حیثیت رکھنے والوں کے لئے ذہنی تسکین کا باعث نہیں ہوتیں مگر مفتی صاحب کی نگارشات اپنے علمی ادبی اور گاہ گاہ انشائی عناصر کے لحاظ سے بڑی پرکشش ہوتی ہیں، ان کا لطف زبان اور حسنِ بیان بھی ہے اور علمی اور منطقی طریق رسائی بھی جو نئے علمی انداز نظر کی دین ہے۔

وعظ سننا کار ثواب تو خیال کیا جاتا ہے مگر اس سے عملی زندگی میں اثر پذیری کی کوئی شعوری خواہش و کوشش سامعینِ وعظ کا مفسوم اس لئے نہیں بنتی کہ وہ اس کا رشتہ زندگی سے جوڑنے اور اُسے ایک جیتی جاگتی حقیقت بنانے میں کامیاب نہیں ہوتے۔

مفتی صاحب ایک عمدہ مقرر ہونے کے ساتھ ایک واعظ بھی تھے اور زندگی بھر گویا مواعظ

حسنہ" سے ان کا واسطہ رہا، انھوں نے خود بھی لکھا ہے۔

"عام تقریروں اور وعظوں کی بات دوسری ہے۔ یہ میدان میرے لئے اجنبی نہیں تھا، خاص طور پر کلکتہ کے پانچ سال کے قیام میں بے شمار وعظوں اور تقریروں سے واسطہ پڑا تھا۔"

اس کا اثر ایسا تو نہیں ہے کہ اُن کی زبان و قلم پر نہ ہو لیکن ان کی علمی ذہانت اور ترسیل وابلاغ کے نئے تقاضوں پر اُن کی نظرداری ان کے نثری اسلوب کو بدلنے میں ایک موثر ادا کرتی نظر آتی ہے۔

ڈاکٹر عنوان چشتی نے مفتی صاحب کی ریڈیائی تقریروں کے حوالے سے جو گفتگو کی ہے وہ تقریر و تحریر کے بنیادی فرق کی وضاحت کے لئے بے حد اہم ہے۔

ان خصوصیات سے قطع نظر جو تقریر اور تحریر میں عنصر مشترک کی حیثیت رکھتی ہیں مگر دونوں میں بعض نادر و نازک اور واضح امتیازات بھی ہیں۔ تقریر کا مقصد مخاطب کے دل میں تحریک اور تشویق پیدا کرنا ہے۔ یہیں سے دونوں کی راہیں جداگانہ یا کم از کم مختلف ہونے لگتی ہیں۔"

"تقریر میں کسی نقطۂ خیال یا واقعہ کی وضاحت کی جاتی ہے۔ خیال کے مختلف اجزاء یا واقعات کی مخصوص ترتیب سے ایک خاص فضا پیدا کی ہے۔ مثالوں سے اپنی بات کی وضاحت کی جاتی ہے، عام فہم اسلوب اور مجموعی طرز استدلال سے کام لیا جاتا ہے۔

تحریر میں قطعیت جامعیت اور وضاحت کی خصوصیات ہوتی ہیں، ارتکاز خیال کی خصوصیت ان تینوں کا احاطہ کرتی ہے اور خیال نیز الفاظ کو بکھیرنے سے بچاتی ہے۔ نثری تحریر کے اسلوب پر موضوع، مواد ماحول اور مخاطب اثر انداز ہوتے ہیں۔ ادبی اور علمی نثر میں جمالیاتی عناصر کی رنگ آمیزی بھی ہوتی ہے۔" (۹)

تحریر کی جمالیاتی قدروں اور نثری اسلوب کی فنی حدود کا احساس ہی مفتی

صاحب کی نثر کو مواعظ کی مجموعی فضا سے الگ کر دیتا ہے اس کے پس منظر میں جو شعور کی رو کارفرما ہے وہ اُن کا صحیح علمی مذاق ہے صرف فضائل کا جذبات انگیز بیان نہیں مسائل پر غور و فکر ہے اور وہ بھی تحقیق و تفحص کی روشنی میں۔

مفتی صاحب دبستان دیوبند اور ندوۃ العلماء لکھنؤ کے مابین ایک قدرِ مشترک کی حیثیت سے اُبھرتے ہیں۔ انھوں نے مذہبی مسلک میں چاہے اکابر دیوبند کی پیروی کی ہو لیکن اپنے علمی طریق رسائی اور طرزِ اظہار میں وہ "ندوہ" سے زیادہ قریب نظر آتے ہیں۔ ان کی تحریروں سے کچھ ایسا ہی مترشح ہے کہ انھوں نے علامہ شبلی اور سید سلیمان ندوی کو زیادہ پیش نظر رکھا ہے مکتبہ برہان سے شائع ہونے والی کتابیں، جن کے انتخاب اور جن کے علمی معیار پر فیصلہ میں اُن کی نگاہِ نکتہ رس کو بیش از بیش دخل ہوتا تھا۔ نیز جن پر ان کے پیش لفظ بھی ہیں اس کا ایک ثبوت قرار دی جا سکتی ہیں۔

حالی اور بطورِ خاص ڈاکٹر اقبال ان کے مطالعہ میں رہے۔ اکثر اپنی تقریروں میں وہ اقبال کا حوالہ بھی دیتے ہیں (یہ بات اُن کے صاحبزادے اور برہان کے مدیر نے اپنی معلومات کی روشنی میں مجھے بتلائی)

(مفتی صاحب کے سوانح و سیرت پر اگر ایک مبسوط و مربوط کتاب شائع ہو جائے تو اُن کی شخصیت، کردار اور علمی طریق رسائی کی فکری نہج اور جہتوں کا کچھ حال معلوم ہو سکتا ہے۔ اس میں ان کے اپنے خطوط بہت معاون ہو سکتے ہیں جنھیں مرتب کر کے شائع کر دینا ایک بڑا علمی کام ہوگا۔)

فخر اقران مفتی عتیق الرحمٰن

(حکیم عبدالقوی صاحب (ایڈیٹر صدق جدید دریاباد۔ لکھنؤ)

نامور عالمِ دین۔ دیوبند کے علمی خانوادہ کے گُلِ سرسبد مسلمانوں کے ملّی رہنما خطیب شیوہ بیان۔ اُردو کے نامور علمی و دینی تصنیفی ادارہ "ندوۃ المصنفین" کے بانی اور روحِ رواں۔ جمعیۃ علماء ہند سرکردہ نقیب۔ آل انڈیا مُسلم مجلس مشاورت کے صدر مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی ۱۲ رمئی ۱۹۸۴ء کو اس جہانِ فانی سے ایک طویل اور ایک کارگزار ملّی رہنما کو صاحبِ فراش بنادینے والی علالت میں مبتلا رہنے کے بعد، رحلت فرماگئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔

نصف صدی سے زائد مدت تک وہ ملّت اسلامیہ ہند اور ملک و وطن کی خدمت انتہائی خلوص و دیانت سے انجام دیتے رہے۔ جمعیۃ علماء ہند سے اُن کا تعلق بہت قدیم تھا اور وہ بجا طور پر جمعیۃ کے اکابرین شمار ہوتے تھے۔ علاوہ بریں مسلمانوں کے چھوٹے بڑے نہ معلوم کتنے ملّی و تعلیمی اداروں سے وہ منسلک تھے وطنِ مالوف دیوبند تھا لیکن عرصے سے وہ دہلی کو وطن ثانی بناچکے تھے۔ اور یہی شہر تادمِ آخر اُن کی سرگرمیوں کا مرکز و مستقر بنا رہا۔ اُن کی وفات سے دہلی کے خدا معلوم کتنے ادارے اپنے ایک مخلص سرپرست اور سچے صاحبِ تدبیر مشیر سے محروم ہوگئے۔ حالؔی کے مرثیہ غالب کا یہ مصرعہ کسی اور پر صادق آئے یا نہ آئے اُن پر حرف بحرف صادق آکر رہا!

= اُس کے مرنے سے مرگئی دہلی =

مرحوم کے والد محترم مولانا مفتی عزیزالرحمٰنؒ دارالعلوم دیوبند کے اکابر واساطین میں سے تھے۔ اُن کی اور دوسرے اکابر دیوبند کی نگرانی میں تعلیم و تربیت کے مراحل بدرجۂ امتیاز طے کئے۔ تکمیل کے بعد اسی درسگاہ میں تدریس کے فرائض بحُسن وخوبی انجام دیئے پھر جب دیوبند کے اکابر میں اختلاف کے باعث متعدد نامور اساتذہ وشیوخ جن میں محدث جلیل مولانا محمد انور شاہ کاشمیری علاّمہ شبیر احمد عثمانی اور مفتی عزیزالرحمٰن صاحب بھی شامل تھے علیحدگی اختیار کرنے پر مجبور ہوئے اور گجرات کے ایک مقام "ڈابھیل" میں نو قائم شدہ دارالعلوم سے وہ سب منسلک ہو گئے تو اُن ہی میں یہ نوجوان اُستاد مفتی عتیق الرحمٰن بھی شامل تھے وہاں مشاغل تدریس کے ساتھ ساتھ فتویٰ نویسی کا کام بھی اُن کے سپرد رہا ہے اور اس سلسلہ میں انہوں نے ایسی شہرت پائی کہ لفظ "مفتی" اُن کے نام کا جُز بن گیا۔ کچھ عرصہ بعد آپ کا تعلق پھر دارالعلوم دیوبند سے قائم ہوا اور اُس کے مجلس شوریٰ کے اہم رکن کی حیثیت سے آخر دم تک کام کرتے رہے۔ آخر زمانہ میں دارالعلوم دیوبند پہ عارض ہونے والے انتہائی افسوسناک اختلافات کو طے کرنے اور سُلجھانے کی سرگرم کوششیں کرتے رہے لیکن بدقسمتی سے یہ کوششیں کامیاب نہ ہوسکیں۔

دارالعلوم دیوبند کے ساتھ مُلک کے ایک اور مشہور دینی دارالعلوم "ندوۃ العلماء" لکھنؤ کی مجلس انتظامیہ کے بھی وہ تادم آخر رکن رکین رہے اور اُسکے جلسوں میں پابندی سے شرکت کرنے اور اُسکی کارگزاریوں میں سرگرم حصہ لینے والوں میں ممتاز رہے۔

احقر کو آخر کے چند سال اُس کے جلسوں میں شرکت کے دوران مفتی صاحبؒ کی ہم نشینی کے ساتھ ساتھ اہم مسائل میں اُن کے قابلِ قدر اور پُرمغز مشوروں کے سُننے کا اتفاق ہوا جس سے میرے دلمیں اُن کی قدر و منزلت بہت بڑھ گئی۔
اسی طرح مسلم مجلس مشاورت کے متعدد ہنگامہ خیز جلسوں میں بھی جنکی صدارت مفتی صاحبؒ

فرمارہے تھے شرکت کا اتفاق ہوا۔ ان جلسوں میں مختلف الخیال جوشیلے عناصر پر قابو رکھنے اور جلسوں کی کارروائی کو کامیابی کے ساتھ چلانے میں اُن کے فکر و تدبر کا نقش دل پر جما رہا۔ ملک کی تحریک آزادی میں جمعیۃ علمار ہند کے ایک قائد کی حیثیت سے انہوں نے سرگرم حصّہ لیا۔ جمعیۃ کے سرگرم ناظم عمومی مولانا مولوی حفظ الرحمٰن سیوہاروی کے وہ دست راست تھے۔ آزادی اور تقسیم وطن کے بعد خاص طور پر دارالحکومت (دہلی) اور پنجاب کے مسلمانوں کو جس دورِ ابتلار سے طویل عرصہ تک گذرنا پڑا اس میں مفتی صاحب نے وہ گرانقدر خدمات انجام دیں جنکو کسی حال میں بھلایا نہیں جا سکتا۔

آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت کے قیام کے بعد اُس کے اولین صدر ڈاکٹر سید محمود اور دوسرے سرکردہ مسلم زعمار کے ساتھ مفتی صاحبؒ نے ملک کے طول و عرض مثلاً ریاستہائے مدھیہ پردیش۔ گجرات۔ مہاراشٹر۔ کیرالا۔ آندھرا۔ کرناٹک۔ اُڑیسہ۔ تامل ناڈو وغیرہ کے دورے کئے۔ اُن علاقوں میں جہاں شدید نوعیت کے فرقہ وارانہ فسادات ہو چکے تھے، ان دوروں کا اور دلوں کو مسخر کرنے والی اثر انگیز تقریروں کا عوام و خواص پر بہت گہرا اور خوشگوار اثر ہوا۔ اور تحریکِ خلافت و ترکِ موالات کے اتحاد پرور زمانہ (۲۰-۱۹۲۱ء) کی یاد تازہ ہوگئی۔

دہلی کا مسلم وقف بورڈ ہو یا دوسرے تعلیمی و ملّی ادارے۔ اسکول۔ کالج درسگاہیں مفتی صاحبؒ کسی نہ کسی حیثیت میں سب ہی سے والبتہ تھے اُن کا بہت کچھ وقت صرف ہوتا تھا۔ اس طرح اس دور کی دہلی میں اُن کی شخصیت لاثانی سمجھی جاتی ہے۔

اپنی دوسری بے شمار سیاسی و ملّی سرگرمیوں کے دوش بدوش وہ اپنی خاموش سنجیدہ اور تعمیری صلاحیتوں کا گہرا نقش "ندوۃ المصنّفین" کی شکل میں چھوڑ گئے جس کے وہ بانی بھی تھے۔ ناظم بھی اور حقیقت میں روحِ رواں بھی۔ یہ ادارہ انہوں نے

اپنے مخلص ترین رفقاء اکابرِ ملت مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی ۔ مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی ۔ مولانا بدرِ عالم میرٹھی ثم المدنی رح کے ساتھ ملکر آزادیٔ ملک سے پہلے قائم کیا تھا اُس کا شاندار دفتر پہلے پہل قرولباغ میں قائم ہوا۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد ۱۹۴۷ء میں دہلی کے قیامت خیز ہنگاموں میں مسلمانوں پر جو قیامت ٹوٹی تھی اُس کی لپیٹ میں آکر ندوۃ المصنفین کا بیشتر ذخیرہ کتب اور دفتری سرمایہ و سامان بالکل برباد ہوگیا حالات انتہائی ہمت شکن تھے اور مکمل بے لبسی کا عالم کا ، پھر بھی مفتی صاحبؒ نے غیر معمولی صبر و استقامت سے جامع مسجد دہلی کے قریب جگہ حاصل کر کے اِس ادارہ کو اللہ کے بھروسہ پر ایک نئی زندگی سے روشناس کیا۔ بحمداللہ یہ عظیم علمی اور تعمیری ادارہ آجتک قائم ہے اور دین و ملت کی انتہائی رفیع اور گرانقدر خدمات انجام دے رہا ہے۔ مفتی صاحب کی بے مثال انتظامی قابلیت اس ادارہ کی مقبولیت اور اعتراف قدر و منزلت کا سبب تھی مختلف موضوعات ۔ تفسیر۔ حدیث۔ تاریخ اسلام۔ لغت سیاسیات تاریخ ہند۔ تصوّف سوانح وغیرہ پر اِس اِدارہ کی شائع کردہ سوا سو سے زیادہ معیاری کتابیں اندرون و بیرون ملک حسنِ قبول حاصل کر چکی ہیں۔ ان کتابوں میں متعدد وہ بھی ہیں جن کے اڈیشن بار بار شائع ہوئے کتابوں کے علاوہ اس ادارہ کا مؤقر اور صفِ اول کا علمی ماہنامہ بُرہان بھی اپنے ممتاز معیار کے ساتھ پابندی سے شائع ہوتا رہا جس کے شذرات و نظرات نامور اہلِ قلم مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی لکھا کرتے تھے اور اُن کی کسی سفری مجبوری یا طویل عدم موجودگی کے موقعہ پر خود مفتی صاحبؒ وہ اِدارتی نوٹ تحریر فرماتے تھے۔ کتابوں کی پوری نگرانی کے ساتھ ساتھ رسالہ کی ترتیب اور مضامین کا انتخاب بلکہ تصحیح تک مفتی صاحبؒ بہ نفسِ نفیس فرمایا کرتے تھے

ایک عالمِ دین کی حیثیت سے اُن کا پایہ بہت بُلند تھا۔ فقہی اُمور میں پوری دستگاہ رکھتے تھے۔ اُن کے تحریر کردہ فتاویٰ سے اُن کے کمالِ تفقہ کا اندازہ کیا جاسکتا ہے

کاش اُن کے تحریر کردہ فتاوی بھی کبھی زیورِ طبع سے آراستہ ہوسکیں تو اُن کی بہترین علمی یادگار ہوگی مفتی صاحب کی تقریر بڑی دلنشین اور سُلجھی ہوئی ہوتی تھی۔ خاکسار کو اپنی نواسی کے تقریبِ ختمِ قرآن میں اُن کا دلپذیر وعظ وارشاد سننے کا موقعہ ملا جس سے دل بیحد متاثر ہوا۔ وہ بڑے پختہ اور باحمیت عالمِ دین تھے۔ اسلام پر ہونے والے ہر حملہ کے دفاع میں پیش پیش رہتے تھے۔ مسلمانوں پر جس رنگ میں بھی آفات و مصائب کا نزول ہوتا، وہ سینہ سپر ہوجاتے تھے دہلی کے مسلمان تو شب و روز اپنے بگڑے ہوئے کاموں کے لئے اُن کا توسل حاصل کرتے ہی تھے بیرون دہلی سے آنے والے بھی ہرگونہ معاملات میں اُن کی مدد حاصل کرتے اور مفتی صاحب کمال خندہ پیشانی سے اپنے کاموں کو روک کر بھی اُن کی مدد اور خدمت میں سرگرداں رہتے۔ افسوس اب ایسی کوئی شخصیت باقی نہیں رہی۔ ذاتی اعتبار سے مفتی صاحبؒ بڑے متجمع صفات تھے۔ بڑے ذی ہوش۔ دوراندیش بااخلاق۔ منکسر مزاج، علمی نخوت اور عالمانہ طمطراق سے بالکل مُبَرا۔ ملنے جُلنے میں بڑے پُرتپاک۔ حددرجہ مہمان نواز۔ دہلی میں اُن کی قیام گاہ پر ہر قسم کے مُلاقاتیوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ گزشتہ تیس۳۰ سال سے احقر کو اُن کی خدمت میں نیاز حاصل تھا جب بھی دہلی جانا ہوتا اُن کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتا اور ہر بار اُن کے حُسنِ اخلاق اور علمی قدر و منزلت کا ایک نیا نقش دل پر لیکر آتا۔ آخری مُلاقات (دفتر بُرہان کے قریب) اُن کے ذاتی مکان میں اس حال میں ہوئی تھی کہ وہ مرض فالج کی تکلیفوں کا مردانہ وار مقابلہ کررہے تھے۔ میری اطلاع پہونچتے ہی فوراً طلب فرمایا اور دیر تک اُسی انداز سے گفتگو فرماتے رہے جو تندرستی میں اُن کی عادت تھی۔ یہ آخری ملاقات حافظہ کے خزانہ میں ہمیشہ محفوظ رہیگی۔

"ادارہ ندوۃ المصنّفین" کی ساخت و پرداخت میں موحّد مسلمانوں کا یہ نقشِ تثلیث بھی علمی دنیا کا ایک اعجوبہ ہی سمجھا جاسکتا ہے،

جو سب سے پہلے مولانا حفظ الرحمٰن صاحب۔ پھر مفتی عتیق الرحمٰن صاحب اور آخر میں مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی کی وفات سے خود بخود محو ہوگیا۔

سدا ہے نام اللہ کا

آہ مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ

از مولانا شبیر احمد جذبی کاندھلوی

سرزمین علم و دانش میں جلا تھا اک چراغ
روشنی میں جس کی ملتا تھا حقیقت کا سراغ

جسکی کرنوں سے اُجالا تھا جہاں میں ہر طرف
ماتم اس کا آج ہر سو ہو رہا ہے حیف صد حیف

محفل ماتم میں میں بھی اشکبار آیا ہوں آج
دل شکستہ غم کا مارا بیقرار آیا ہوں آج

محفل درد و الم میں سوگوار آیا ہوں میں
چند آنسو نذر کرنے کیلئے لایا ہوں میں

درد و غم میں ماتمی ہے انجمن کی انجمن
بجھ گئی افسوس صد افسوس شمع علم و فن

پیکر اخلاص و تصویر صداقت اُٹھ گیا
ساقیٔ میخانۂ مہر و محبت اٹھ گیا

اب کوئی امت کا رہبر ہے نہ ملت کا رفیق
چلدیئے ہم کو اکیلا چھوڑ کر مفتی عتیق

حضرت مفتی صاحبؒ کی یادیں

مولانا اخلاق حسین قاسمی دہلوی
مہتمم جامعہ رحیمیہ، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی
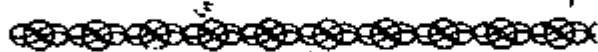
حضرت مفتی صاحبؒ کے فرزند سعید اپنے والد مرحوم و مغفور کا نمبر نکالنے کے لیے بے تاب تھے، ان کی بے تابی کا ثمرہ یہ نمبر قارئین کے سامنے ہے۔

ان کی بے تابی میں اپنے والد کے لیے بڑی محبت اور خلوص پوشیدہ تھا۔ ایک ایک متعلق سے انھوں نے کئی کئی سو بار، اگر مبالغہ نہ ہو، درخواست کی ہے تب کہیں جاکر یہ نمبر تیار ہوا ہے۔

اصل بات یہ تھی کہ مفتی صاحبؒ پر کون قلم اٹھاتا، انہی لوگوں کا حق تھا، جنھوں نے مرحوم کو شروع سے دیکھا اور مرحوم کی رفاقت کا شرف حاصل کیا۔

آج جو لوگ حیات ہیں ان میں زیادہ تر وہ ہیں جنھوں نے حضرت مرحوم کا صرف آخری دور دیکھا۔

مولانا اکبر آبادی مرحوم جو کچھ لکھ گئے وہ مفتی صاحبؒ کے فضل و کمال کا صحیح تعارف ہے، ہم لوگوں نے مفتی صاحبؒ کا وہ دور دیکھا جب مفتی صاحبؒ مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ کے ایک رفیق کار کے طور پر ۴۷ء کے

قیامت خیز ہنگاموں سے ملت اسلامیہ کی بچی کھچی پونجی کو بچانے کی جد وجہد میں مصروف تھے۔

اس دور کا کوئی ہنگامہ اور کوئی اجتماع ایسا نہ تھا جس میں **مفتی صاحبؒ** نے اپنے تدبر اور پدرانہ شفقت کے اثرات سے ہمارے دل و دماغ کو متاثر نہ کیا ہو۔

مفتی صاحبؒ کا تعلیمی اور تدریسی دور ایک علمی اور روحانی خانوادہ کے شاہ زادے کا دور تھا، وہی چلبلا پن، علمی تفاخر، تنقید و نکتہ چینی، ہنگامہ خیزی جو ایک شاہ زادے اور صاحبزادے کے اندر ہونی چاہیے وہ **مفتی** صاحبؒ کے اندر موجود تھی اور یہ ساری باتیں جب **مفتی** صاحبؒ سے اس آخری دور میں صادر ہوتی تھیں تو مرحوم کے دائیں بائیں بیٹھے ہوئے ان کے رفقاء مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ اور مولانا محمد میاں صاحب ہنس ہنس کر سنتے تھے اور کیف اندوز ہوتے تھے۔

جمعیۃ علماء ہند کے قدیم نظام میں جب انقلاب آیا اور مفتی کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید صاحب کی جگہ مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا ابوالمحاسن سجاد اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کو لایا گیا تو مفتی صاحبؒ بھی اس انقلاب کے رہنماؤں میں شامل تھے۔ یوپی کے مشہور کانگریسی لیڈر مولانا بشیر بھٹہ صاحب اس انقلاب میں سب سے آگے تھے تو اس دور کی باتیں سناتے ہوئے مولانا احمد سعید صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ مفتی **عتیق الرحمٰن** صاحب کہا کرتے تھے۔

ان چٹکیوں سے ہزاروں فتوے نکل چکے ہیں

مفتی صاحب کا اشارہ اس انقلاب کی شدت کو کم کرنے کی طرف تھا ایک گروہ کو مفتی اعظم کو صدارت سے ہٹانے پر صدمہ اور خفگی ہوگی لیکن جماعت

میں جمہوری سرگرمی پیدا کرنے کے لیے یہ انقلاب اپنی جگہ ضروری تھا۔

اور بلا شبہ ملک میں جو حالات پیدا ہوئے ان میں جمعیۃ علماء ہند کے جدید قائدین نے بہترین صلاحیت کا مظاہرہ کیا، ان میں مفتی عتیق الرحمٰن بھی شامل تھے لیکن یہ ان حضرات کا بڑا پن تھا کہ مفتی اعظم اور سحبان الہند کی عہدوں سے علحدگی کے بعد بھی اس نوجوان گروہ نے ان بزرگوں کے احترام وادب میں کوئی کمی نہیں کی۔

لیکن جب جمعیۃ علماء ہند تیسرے انقلاب سے گزری اور مولانا مدنی اور مولانا حفظ الرحمٰن کے بعد مولانا مدنی کے صاحبزادے صاحب کو ان کی جگہ لانے کی کوشش کی گئی تو حضرت مفتی صاحبؒ کے ساتھ وہ سلوک نہ کیا گیا جو انھوں نے اپنے پیش رو بزرگوں کے ساتھ کیا تھا۔

یہ تاریخ کی بڑی ستم گری تھی جو مفتی صاحب کے ساتھ پیش آئی۔ وہ دور مفتی صاحب کے لیے بڑا کرب انگیز تھا اور مرحوم دبے لفظوں میں اپنی اور اپنے ساتھیوں کی اس غلطی کو تسلیم کرتے تھے کہ جس طرح جمعیۃ علماء ہند کو متحرک کرنے کے لیے مفتی اعظم کی جگہ مولانا مدنی کو لایا گیا اسی طرح مولانا مدنی کی جگہ دوسرا صدر بنایا جاتا اور جمعیۃ علماء کا نظام بدلتا رہتا۔

جبکہ مولانا مدنی ہر بار صدارت سے علحدہ ہونے کی خواہش کرتے تھے۔ لیکن نہ ان کی جگہ پُر کرنے کے لیے جمعیۃ علماء کے پاس کوئی دوسری شخصیت تھی اور نہ ان ہنگامہ خیز حالات میں ان حضرات نے کوئی تبدیلی مناسب سمجھی، اس کا نتیجہ جماعت کے حق میں اچھا نہیں نکلا۔ کیوں کہ عرصہ دراز تک مولانا مدنی کی قیادت کے سبب جماعتی حلقہ پر مولانا کی عقیدت کا اثر قائم ہوگیا اور جمعیۃ علماء کو مولانا مدنی کے عقیدت مندوں کی جماعت سمجھا جانے لگا

اور اس کے نتیجہ میں ان کے صاحبزادے صاحب کا جمعیۃ علماء پر تسلط قائم ہونا ایک قدرتی بات تھی۔

مولانا حفظ الرحمٰن کی علالت کے دوران ہی اس تسلط کے آثار مولانا نے محسوس کرنے شروع کر دیے تھے لیکن جس موذی بیماری میں مولانا گرفتار تھے اس میں وہ بے بس تھے، مولانا کے بعد اس تسلط کی اذیت ناکی سے حضرت مفتی صاحبؒ کو پوری طرح گزرنا پڑا۔

اس دور میں مفتی صاحبؒ بڑے صبر آزما حالات سے گزرے، مولانا محمد میاں صاحب جیسے صاحبِ اخلاص بزرگ حالات کے دباؤ میں آکر مفتی صاحبؒ سے دور ہو گئے تھے۔

اس دور میں مفتی صاحبؒ کی شرافت ـــ جو اجتماعی اور جماعتی معاملات میں کمزوری بن جاتی ہے ـــ نمایاں رہی اور طرح طرح ذہنی اذیتوں اور بے بنیاد حملوں کو برداشت کر کے مفتی صاحبؒ نے اپنے رفقاء کو جماعت کی تقسیم سے دور رکھا ورنہ ان حالات میں ایک دوسری جمعیۃ علماء کا قیام ہو چکا ہوتا۔

مفتی صاحبؒ انسان تھے، کمزوری انسان کی فطرت کا حسن ہے ہماری اسی کمزوری پر خدا تعالیٰ کی مصلحت کا نظام قائم ہے مفتی صاحبؒ بڑی سے بڑی غلط بات پر بھی کسی کی دل آزاری کو پسند نہیں کرتے تھے۔

اپنی اس مشہور کمزوری کو وہ روحانی رنگ دے کر اس کی نہایت خوب صورت تاویل کرتے تھے اور فرماتے تھے میں تعدد حق کا قائل ہوں یعنی ایک ہی معاملہ میں مختلف اور متضاد پہلوؤں میں سے ہر پہلو کے حق اور صحیح ہونے کا امکان ہے۔ مفتی صاحبؒ کی یہاں مشہور تھی، ایک

لبی ہاں ــــــ جو ہر شخص کی تسلی کر دیتی تھی اور معاملات کی الجھنیں اپنی جگہ قائم رہتی تھیں۔

مفتی صاحب کی یہ فطری صفت ہی تھی جس کی وجہ سے مرحوم مختلف مزاج رکھنے والے کارکنوں سے کام لے لیا کرتے تھے۔

مفتی صاحبؒ نے مجلس مشاورت کو جس کمال حسن تدبر کے ساتھ چلایا وہ انہی کا حصہ تھا۔ مسلم لیگی، کانگریسی، جماعت اسلامی اور ارباب مدارس قدیم علماء سب ہی ایک جگہ جمع ہو کر ملت کے مسائل پر آنسو بہاتے تھے۔ اب مفتی صاحبؒ کی وفات کے بعد ان کی قدر ہو رہی ہے۔

مرحوم نے کبھی مشاورت کے پلیٹ فارم پر جذباتی فیصلے نہیں ہونے دیے اور اب وقتی اور جذباتی واہ واہ کرانے والے فیصلوں نے مشاورت کے وقار کو سخت صدمہ پہنچا رکھا ہے۔

مفتی صاحب کی طویل علالت ہی میں مولانا محمد مسلم صاحب کہا کرتے تھے کہ اب مجلس مشاورت کو ختم کر دینا چاہیے۔

جمعیۃ علماء ہند کا دفتر ایک پرانی گلی (دست گھرے) میں واقع تھا اور یہ تین بزرگ اس پرانے دفتر کی رونق تھے۔ اور اس دفتر میں فقیری کے اندر شاہی کا سماں نظر آتا تھا۔

مجاہد ملت کے بعد ایک خیر مقدمی تقریب میں مفتی صاحبؒ نے اس گلشن کے اجڑنے پر اپنے قلبی تاثرات کا اظہار ایک شعر پڑھ کر کیا ؎

مے بھی ہے، مینا بھی ہے، ساغر بھی ہے، ساقی نہیں
جی میں آتا ہے لگا دوں آگ مے خانہ کو بھی

کسے خبر تھی کہ مفتی صاحب کے بعد ان کے لگاتے ہوئے گلشن پر

بھی کھڑے ہوکر ان کے عاشق انہی الفاظ میں اظہارِ غم کیا کریں گے اور میاں عمید الرحمٰن عثمانی انھیں اپنے محبت بھرے الفاظ سے تسلی دینے کی کوشش کریں گے لیکن ہر غم گسار یہ پڑھتا ہوا چلا جائے گا ؎

شیشہ بھی ہے، ساقی بھی ہے، شمع بھی، پر بن تیرے
وہ خوبیِ مجلس کہاں، وہ رونقِ محفل کہاں

مفتی صاحب ماضی کی عظیم علمی اور قومی روایات کے امین تھے، اس لیے **ندوۃ المصنفین** کا دفتر بڑی سے بڑی سیاسی اور مذہبی شخصیت کا مرجع تھا اور جمعیۃ بلڈنگ گلی قاسم جان کے اجڑنے کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ مگر اب ان روایات، وضع داری اور خود داری پر مکمل ماتم کے سوا کچھ نہیں۔

مفتی صاحب میں بڑا پن تھا۔ صرف مرحوم بڑے ہی نہیں تھے، بہت سے لوگ بڑے ہوتے ہیں مگر ان میں بڑا پن نظر نہیں آتا، یہی وجہ تھی کہ **مفتی** صاحب شخصی تعلقات کو نبھانے کی بے مثال کوشش کرتے تھے، **مفتی** صاحب مزاح کے طور پر فرماتے تھے کہ دلی والے اب بھی مجھے پردیسی سمجھتے ہیں۔ حالاں کہ یہ حقیقت ہے کہ وہ دلی والوں کے ساتھ تعلقات نبھانے میں پوری شرافت وسیادت کا ثبوت دیتے تھے۔ مرنے جینے، شادی بیاہ اور سماجی تقریبات میں شرکت کا پورا پورا اہتمام کرتے تھے ملنے جلنے پر ایک ایک گھر والے کو پوچھتے تھے اور جہاں تک ممکن ہوتا لوگوں کی ضرورتیں پوری کرنے کی جد وجہد کرتے تھے۔

مفتی صاحب حضرت محدث کشمیری کے لائق ترین تلامذہ میں سے تھے۔ تدریسی دور میں **مفتی** صاحب کی جو شہرت ہوگی وہ تو ہم سے پہلے کے

دور کی بات ہے لیکن مختلف مسائل پر مفتی صاحب کے تبصرے ہم نے ضرور سنے ہیں، مختصر تقریریں بھی سنی ہیں، مرحوم اپنے رفقاء علمی سے کسی طرح کم نہیں معلوم ہوتے تھے۔ البتہ مفتی صاحبؒ کے جو رفقاء علمی اور تعلیمی لائن میں مصروف تھے، ان کو علمی شہرت مفتی صاحبؒ سے ہوئی اور ہونی بھی تھی۔

مفتی صاحبؒ کی تحریر نہایت علمی اور تحقیقی ہوتی تھی اور اگر ندوۃ المصنفین کے ادارہ کی تنظیمی خدمت ان پر حاوی نہ ہوتی تو مرحوم کی علمی اور تحقیقی کتابیں ایک بڑے کامیاب مصنف سے کسی طرح سے کم نہ ہوتیں۔

مرحوم کی کوششوں نے جماعت دیوبند کے علماء پر لگنے والے اس الزام کو دور کر دیا کہ علماء دیوبند اہل قلم نہیں ہیں اور شبلی اسکول ہی قلم و تحریر کا مالک ہے۔

مفتی صاحبؒ نے اتنا بڑا تصنیفی ادارہ بڑے وقار کے ساتھ چلایا اور چندہ مانگنے کی عام بدنامی سے ادارہ کو محفوظ رکھا، مرحوم مالی معاملات میں دیانت اور امانت کی صفات کا بہترین نمونہ تھے۔

مفتی صاحبؒ نے کافی لوگوں کو بنایا اور بڑھایا، ان حضرات میں مفتی صاحبؒ کے خاص شاگرد مولانا قاضی سجاد حسین صاحب ہیں، فارسی کتابوں کی طباعت اور فارسی نصاب کی کتابوں کا احیاء مفتی صاحبؒ ہی کے مشورہ اور رہنمائی سے قاضی صاحب کے ذریعہ ہوا اور بڑی مالی کامیابی کے ساتھ ہوا۔ دلی کے مدرسوں میں قاری محمد سلیمان صاحب میوانی کا مدرسہ مفتی صاحبؒ کی سرپرستی سے اس مقام پر پہنچ گیا کہ آج گجرات اور افریقہ

کی بڑی دولت اس مدرسہ پر بارش کی طرح برس رہی ہے اور قاری صاحب میوات کے رئیس اعظم ہیں۔
جمعیۃ علماء کے نوجوان طبقہ سے مفتی صاحب باپ جیسی شفقت و محبت فرماتے تھے، میرا معاملہ عجیب تھا، میں صدارتی اختلاف کے بعد جماعت ہی سے وابستہ رہا، جبکہ دہلی کے علماء میں مفتی ضیاء الحق صاحب حضرت مفتی صاحب کے ساتھ رہے، اس اختلافی دور میں بڑے بڑے تلخ مرحلے آئے مگر مفتی صاحب کی محبت میں کبھی فرق نہیں آیا، جب آمنا سامنا ہوا تو دو چار فقرے کس دیے اور پھر محبت سے حالات پوچھنے لگے کیسے ہو، خیریت ہے؟

مفتی ضیاء الحق صاحب سے مرحوم کا بہت خاص تعلق رہا۔ ضیاء الحق صاحب بہت زود حس اور جذباتی اعتبار سے بڑے کڑوے واقع ہوئے ہیں، ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتے، ہم جیسے فقیر مزاج ساتھیوں کو ہمیشہ اپنے سے بے حیثیت سمجھا۔ اور میں تو واقعی ان کے مقابلہ میں بے حیثیت انسان تھا اور اب بھی ہوں۔ مگر بعض دوسرے ساتھی ان کی اس انا سے بہت پریشان رہتے تھے، مفتی صاحب ایک طرف ضیاء الحق صاحب کی انا کا پورا پورا خیال رکھتے تھے اور دوسری طرف ہم جیسے فقیر صفت لوگوں کی دل داری کرتے تھے۔ اور یہ بڑاپن مفتی صاحبؒ کی خاص صفت تھی۔

جامعہ رحیمیہ سے مفتی صاحبؒ کا خاص تعلق تھا، علی محمد صاحب شیر میوات کا بہت خیال فرماتے تھے، ضیاء الحق صاحب کے بے تعلق ہونے کے بعد مفتی صاحبؒ کو جامعہ کا بڑا خیال رہا۔

احقر سے بار بار علالت کے دوران جامعہ کا ذکر فرماتے۔ علی محمد صاحب کی خواہش پر جب میں نے جامعہ کے مہتمم کا عہدہ سنبھالا تو مفتی صاحب کو ایک طرف خوشی ہوئی اور دوسری طرف میں نے مرحوم کے اندر قلق اور رنج محسوس کیا اور یہ رنج و افسوس ضیاء الحق صاحب کے جامعہ سے بے تعلق ہونے کا تھا اور ان کی جگہ ایک ایسے شخص کے تقرر کا تھا جس سے ضیاء الحق صاحب کو خاص قسم کی قلبی الجھن رہی اور معاصرانہ رقابت بھی۔

بہرحال جامعہ رحیمیہ کے قیام اور اس کی موجودہ ترقی میں مفتی صاحب کی قلبی توجہات کا بہت دخل رہا۔ خدا خوش رکھے مفتی ضیاء الحق صاحب کو وہ پاکستان چلے گئے" اور مفتی صاحب مرحوم نے ان کی جدائی کا بھی صدمہ اٹھایا۔ مفتی صاحب کی آخری علالت کے دوران ہی ضیاء الحق صاحب مفتی صاحب سے جدا ہو گئے تھے۔

دار العلوم کی کش مکش کے زمانہ میں مفتی صاحب زندگی کی بڑی کش مکش سے دوچار رہے، ایک طرف مولانا اسعد پارٹی کے قبضہ اور اس کے نتائج میں انھیں دار العلوم کی روایات کا زوال نظر آرہا تھا اور دوسری طرف انھیں ایک دیانت دار عالم کی طرح دار العلوم کے نظام میں پیدا ہونے والی کمزوریوں کا بھی احساس تھا۔ اور اس دوگونہ احساس نے ان کے اندر بڑی گھٹن پیدا کر دی تھی اور میرے سامنے مفتی صاحب اس گھٹن کا اظہار کرنے پر مجبور ہوتے تھے اور مرحوم اشاروں میں دونوں پہلوؤں پر روشنی ڈالا کرتے تھے۔

تنظیم فضلاء کا ناظم بنانے میں مفتی صاحب اور مولانا منت اللہ صاحب رحمانی دونوں بزرگوں کی رائے شامل تھی لیکن جب میں دار العلوم کے ہنگاموں

سے گھبرا کر دہلی آتا اور مفتی صاحب سے ملتا تو مفتی صاحب کے ملے جلے تاثرات سن کر میں سمجھ لیتا کہ دارالعلوم اس انقلاب سے بچ کر نہیں نکل سکتا۔

دارالعلوم کے جھگڑے میں اس رات کا منظر میں فراموش نہیں کرسکتا جس رات کو ہلڑ باز طلبہ مدنی منزل کی قیادت میں مہمان خانہ پر حملہ آور ہوئے اور شوریٰ کے اکابر وہاں موجود تھے، طلبہ خاص طور پر میرے خلاف نعرہ بازی کررہے تھے اور لوہے کے سریوں اور لاٹھیوں سے مسلح مجھے بھی اپنے حوالہ کرنے کا مطالبہ کررہے تھے اور میں ان بزرگوں کے ساتھ مہمان خانہ کے کمرہ میں تھا۔

اس وقت مفتی صاحب کی پریشانی مجھ سے دیکھی نہیں جارہی تھی ایک طرف وہ حوصلہ کا مظاہرہ کررہے تھے، دوسری طرف میرے بارے میں مولانا منت اللہ صاحب سے چپکے چپکے باتیں کررہے تھے کہ اسے حفاظت میں پہنچایا جائے، کیوں کہ مفتی صاحب جانتے تھے کہ اگر مجھے کچھ ہوگیا تو دلی میں اس کا کیا اثر ہوگا، اور مفتی صاحب دلی واپس آکر اس کا کیا جواب دیں گے؟

مفتی صاحبؒ دلی میں ہمارا مرکز تھے، ملک کی قومی قیادت کا معتمد سہارا تھے، مسلم عوام اور حکومت کے درمیان ایک سنجیدہ واسطہ تھے۔

جنتا انقلاب کے بعد میں اور مولانا انیس الحسن صاحب اور مولانا فقیہ الدین صاحب مفتی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ مرار جی بھائی کو وزیر اعظم منتخب ہونے پر مبارک باد کا ٹیلی گرام دے دیجیے، اب ان سے واسطہ پڑے گا۔ لیکن مفتی صاحبؒ نے

بڑی سنجیدگی سے انکار کر دیا۔

اس دور میں فرمایا کرتے تھے کہ میرا اندر ہی اندر دم گھٹ رہا ہے۔ ہم ایمرجنسی کے حالات سے متاثر تھے اور اس انقلاب سے خوش تھے مگر مفتی صاحب کی دور اندیشی حالات کو صحیح روشنی میں دیکھ رہی تھی چنانچہ تھوڑی مدت کے بعد معلوم ہوا کہ اپوزیشن پارٹیاں مسلم معاملات میں دکھاوے کے طور پر بھی ہمدردی کا اظہار کرنا غیر ضروری سمجھتی ہیں اور مفتی صاحب کی گھٹن بالکل صحیح ہے۔

مفتی صاحب مسلمانوں میں الگ سیاسی پلیٹ فارم کو پسند نہیں کرتے تھے، آزادی کے دور میں بھی مفتی صاحب نے اتحاد پسندوں کا ساتھ دیا اور قومی تحریکات میں شریک رہے اور مسلم مشاورت کی صدارت کے دور میں بھی مفتی صاحب اپنے سیاسی کردار پر قائم رہے اور مسلم لیگ کی سیاسی حکمت عملی کو مجلس میں داخل ہونے سے روکتے رہے۔

بعض لوگ یہ کہتے تھے کہ جماعت اسلامی نے مفتی صاحب کی آڑ میں ملک کے اندر جگہ بنائی لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ مفتی صاحب نے جماعت اسلامی کی مذہبی شدت پسندی کو کم کرنے میں بھی خاص رول ادا کیا۔

دیوبندی، بریلوی اختلاف ہو یا سنی شیعہ اور حنفی اہل حدیث اختلاف مفتی صاحب ان اختلافات میں شدت پیدا کرنے کے خلاف تھے، کیوں کہ مرحوم میں مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے اندر اتفاق و اتحاد قائم کرنے کا سچا جذبہ موجود تھا۔

ابن الانور مولانا محمد انظر شاہ مسعودی
شیخ الحدیث دارالعلوم (وقف) دیوبند

ہندوستان میں کم ہی ایسے خانوادے گزرے جن میں علم و آگہی، دین و دانش متوارث رہا اور اخلاف نے اپنے اسلاف کی روایات کو بدستور تابناک رکھا ہو۔ ان گنے چنے خوش قسمت خاندانوں میں دیوبند کا عثمانی خانوادہ بھی ہے جس کی خاندانی تاریخ روشن اور جاوید روایات بے مثال ہیں۔ مولانا ذوالفقار علی صاحبؒ، مولانا مہتاب علی صاحبؒ، شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ، مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی صاحبؒ، فقیہ الامت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ نقشبندی، حضرت علامہ مولانا شبیر احمد عثمانی صاحبؒ، مفکرِ ملت حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی صاحبؒ، یہ چند نام تو ارتجالاً قلم پر آگئے۔ ورنہ اس خاندان میں بہت سے گوہر شب چراغ اور در شاہوار ہیں۔ شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ ایک شخصیت ساز ادارہ کا نام ہے۔ جس طالب علم پر آپ کی نظر پڑگئی وہ خاک سے کاخ جا پہنچا۔ بارہویں صدی کے خاتمے اور تیرہویں صدی کے اوائل میں ہندوستان کے علمی حلقوں میں جتنی کوہ پیکر شخصیتیں نظر آتی ہیں وہ حضرت مرحوم کے بالواسطہ یا بلاواسطہ تلامذہ

ہیں، مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی تدبیر و تدبر کے دائرہ میں ایسی منفرد شخصیت لے کر آئے کہ آج بھی دارالعلوم دیوبند کا زرین دور ان ہی مرحوم کی بے مثال قابلیت اور بے نظیر انتظام کا مرہون منت ہے۔ شخصیت سازی کا وہ جوہر قابل اپنے سینہ میں رکھتے کہ دارالعلوم سے وابستہ علمی پرانوں کو کمالات کی شمعِ فروزاں بنا دیا۔

مولانا مفتی عزیز الرحمٰنؒ جو مفکر ملت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کے والد ماجد تھے۔ زہد و اتقاء کے پیکر، استغناء و للہیت کی تصویر، فنائیت و عبدیت کے ہالہ، تواضع و فروتنی کے قلزم، نقشبندیت کے امام، تفقہ کی دولتوں سے مالا مال، لیکن بایں ہمہ از صبح تا شام بیوہ عورتوں یتیم بچوں، بے سہارا انسانوں اور بیکسوں کے لیے غلام بے دام تھے، یہ تعبیر دل و دماغ کے لیے شدید ناگوار ہے مگر کیا عرض کروں کہ صورت واقعہ کی ترجمانی کے لیے کوئی اور تعبیر مہیا نہیں، وہ اپنے محلہ کی نالیاں اپنے ہاتھ سے صاف کرتے، بیوہ عورتوں کے غلوں کی بوریاں پسوانے کے لیے لیجاتے تمام محلہ کا سودا سلف بازار سے لاتے۔ اور اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ کا نعرہ لگا کر دنیا سے تعریف کے دو بول بھی لینے کے روادار نہیں تھے پھر بتائیے ایسے بے نفس کو غلام بے دام کہنے کی گستاخی نہ کروں تو صحیح صورت حال آپ کو کیسے سمجھاؤں، رہ گئے علامہ شبیر احمد عثمانیؒ تو ان کا میمون عہد اس منحوس قحط الرجالی دور سے اتنا قریب ہے کہ پاکستان میں کروڑوں اور ہندوستان میں لاکھوں ان کو دیکھنے اور سننے والے اب بھی موجود ہیں۔ علامہ خسرو علم، فصاحت و بلاغت کے شہسوار، تقریر و وعظ کے اپنے عہد میں بے تاج بادشاہ تھے، حق پسندی ان کا شعار، حق بیانی ان کا امتیاز تھا۔ جس مجمع

میں منکراتِ شرعی پر دار وگیر کی ہمت وحوصلہ بڑے بڑے شیخ الاسلاموں کو نہ ہوتا، وہاں علامہ کی حق پسندی کی آبدار و تابدار تلوار یکایک نیام سے باہر آجاتی اور پھر اس شمشیر کی کاٹ سے کبھی والیٔ حجاز کا لاشہ تڑپتا نظر آتا، کبھی خوسروتے دکن خونچکاں نظر آتے تو گاہے حافظ ابراہیم سابق وزیر کابینہ غلطاں وپیچاں دکھائی دیتے۔ بڑے بڑے مجمعوں پر چھا جانا حضرت علامہ کا ادنیٰ کرشمہ فصاحت اور حریف کو دو جملوں میں چت کر دینا مرحوم کا کمال فن تھا پھر ان سب اوصافِ جلیل پر عالمانہ معصومیت چھائی ہوئی، سینہ ایسا بے کینہ کہ کسی سے انتقام کی وہ سوچ ہی نہیں سکتے تھے، قلب و دماغ علوم وکمالات کا وہ خزینہ کہ جب چاہتے موتی رولتے۔ اب تو اپنی یہی سب سے بڑی سعادت نظر آتی ہے کہ ان ہستیوں کو دیکھنے کا موقعہ لم یزل و لایزال نے عنایت فرمایا، ورنہ اس منحوس دور میں انسان نما بھیڑیوں سے جو قدم قدم پر سابقہ اور دین و دانش کے عیار تاجروں سے جو مرحلہ مرحلہ لاحقہ ہے اس نے تو دنیائے دنی و دوں سے دل ہی اچاٹ کر دیا۔

خیر یہ تو قلم بے تابانہ و بلا ارادہ عثمانی خاندان کی بعض نادر الوجود ہستیوں کی طرف مڑ گیا ورنہ تو اصل ذکر و تذکار مولانا مفتی عتیق الرحمٰن کا پیش نظر تھا، قطعاً یاد نہیں آتا کہ مرحوم مفتی صاحبؒ سے دید و شنید کا آغاز کب سے ہے البتہ غالباً ۱۹۴۰ء کا واقعہ ہے یا اس کے آس پاس کا کہ مولانا عبد الحق میاں سملکی امیر انجمن خدام الدین کی معیت میں دہلی کا سفر ہوا، اس زمانہ میں مفتی صاحبؒ اپنا سارا کاروبار قرول باغ میں جمائے بیٹھے تھے — ندوۃ المصنفین کی پرشکوہ عمارت، عمارت میں سادگی، نظم وانتظام کی چستی، اہل علم کا اجتماع، دیدہ ور مصنفین کا حلقہ، ہر ایک زبان حال سے

کہہ رہا تھا کہ یہ چمن آرائی مفتی صاحبؒ کے سلیقے اور قرینے کی مرہونِ منت ہے۔ میں اس زمانہ میں نہ صرف بے ریش و بروت بلکہ کم سن تھا، لیکن بڑوں کی عظمت کا مظاہرہ ایسے ہی حالات میں ہوتا ہے۔ مرحوم مفتی صاحبؒ ایک نادان بچے کے لیے صرف استاذ زادہ ہونے کی بنا پر بدل و جان پذیرائی میں لگ گئے۔ بڑا مکلف کھانا تیار کرایا۔ گہرے جذبات محبت و شفقت سے کھلایا، گویا کہ شعور کے عالم میں مفتی صاحبؒ سے یہ پہلی ملاقات تھی۔ اس کے بعد میرا دہلی میں مستقل قیام تین چار سال رہا ——— ندوۃ المصنفین تو جانا یاد نہیں، البتہ ہر جمعہ کو بعد نماز جمعہ ادارۂ شرقیہ جامع مسجد دہلی کے عقب میں جس کے روحِ رواں مولانا ادریس صاحبؒ میرٹھی تھے۔ وہاں ....

...... دارالعلوم کے قدیم و جدید فضلاء کا اجتماع ہوتا مفتی صاحب کی یہاں بار بار زیارت کی سعادت نصیب ہوئی ۱۹۴۷ء کی قیامت خیزیوں نے مجھے دہلی سے اٹھا کر دیوبند پہنچا دیا، کچھ سال تعلیم میں گزرے اور رسمی فراغت کے بعد یہیں دارالعلوم میں تدریس کا موقعہ مل گیا۔ ملازمت کے دوران مشکلات پیش آئیں تو مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰنؒ کا ناخن گرہ کشا گرہ کشائی کرتا اس وقت کی مجلس شوریٰ میں مرحوم سکۂ رائج الوقت تھے۔ استاذ زادہ ہونے کی بنا پر ان کی شفقتیں و عنایتیں نصیب تھیں۔ مفتی صاحبؒ سے اس دور میں بھی تعلقات لیے دیے ہی رہے، مولانا حفظ الرحمٰنؒ کی وفات کے بعد اب ہمارے ملجا و ماویٰ مفتی صاحبؒ تھے اور لاریب کہ انھوں نے ایسی بزرگانہ شفقت کا معاملہ فرمایا جس سے ان کی شرافت نسبی، وضعداری، مروت کا دل پر نقش ہے۔

مفتی صاحبؒ شگفتہ و مہذب طنز میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے شگفتہ بیانی کی ملاوٹ اُسے نیش آلود نشتر کے بجائے شکر و انگبیں کا انجکشن بنادیتی۔

کشمیر میں علامہ انور شاہ سمینار کے موقعہ پر میر واعظ منزل میں عشائیہ کے پروگرام کے ساتھ نامور شخصیتوں کی تقریر کا پروگرام تھا۔ سعید صاحب کی تقریر ضرورت سے زیادہ طویل ہوگئی۔ سامعین تو نیازمند تھے کیا بولتے لیکن جب مفتی صاحب کھڑے ہوتے تو طویل تقریر پر چٹکیاں لیتے ہوئے اکبرالٰہ آبادی کی ایک رباعی پڑھی جس کا چوتھا مصرعہ ؏

تاثیر دکھا تقریر نہ کر

تھا۔ بے چارے سعید صاحب خندہ زیرلب کے ساتھ منقار در پر ہوکر رہ گئے۔

ایک رات جمعیۃ علماء ہند کے دفتر میں مولانا حفظ الرحمٰنؒ، مفتی صاحب مولانا محمد میاںؒ، مولانا نورالدین بہاریؒ، مولانا سید احمد رضا بجنوری وغیرہ موجود تھے۔ بے تکلف احباب کے اس مجمع کا موضوع شوہروں کا اپنی بیویوں کے ساتھ تعلق اور اس کی نوعیت تھی۔ اچانک مولانا حفظ الرحمٰنؒ اٹھے اندرونِ خانہ تشریف لے گئے اور معاً واپس آگئے، اس پر مفتی صاحب مرحوم نے اپنے خاص لہجے میں فرمایا۔

جی ہاں، یہ بھی ایک تعلق کی نوعیت ہے یعنی گرد ایک شے کے گھومنا ہے طواف!

یاد رہے کہ یہ حمدِ باری کا ایک مصرعہ ہے جس میں طواف کا ترجمہ کیا گیا ہے اس بھرپور طنز پر مجاہد ملت خاموش ہوکر رہ گئے۔

مفتی صاحب مرحوم کی کس کس ادا کا ذکر کیجیے اور کس کس بات کو یاد

کرکے ان کی یاد تازہ کیجیے۔ یہ حقیر تقریباً آٹھ سال دارالعلوم میں ناظم مجلس تعلیمی رہا، یہ عہدہ اپنے اثرو اقتدار کے لحاظ سے دارالعلوم میں اہتمام کے بعد دوسرا منصب تھا۔ مجلس شوریٰ میں مجھے بھی شرکت کا موقعہ ملتا۔ تعلیمات کی رپورٹ میں ہی پیش کرتا۔ اراکین شوریٰ میں مفتی صاحب کی شخصیت بڑی بھاری بھرکم تھی۔ کسی مسئلہ پر بحث و مباحثہ کے دروازے کھلتے اور یہ عقلائے کل دوربینی و دوراندیشی کے لیے بنیاد ہمالے تیار کرتے تو مفتی صاحبؒ کی دوٹوک رائے پر بحث کا اختتام ہوتا، اگر میں کسی مسئلہ پر بولتا اور میری قیل وقال مفتی صاحبؒ کے منشار کے خلاف ہوتی تو فرماتے۔

حضرت شاہ صاحبؒ (علامہ انور شاہ کشمیریؒ) ابن حزم اُندلسی کی تیزیٔ تحریر کی بنیاد طحال کا عارضہ اور حدت جگر بناتے، ہمارے شاہ صاحب (حقیر) بھی حدتِ جگر سے مریض ہیں اور اسی وجہ سے آپ کی رائے اس مسئلہ میں خاص بیماری کی نشاندہی کررہی ہے۔

یہ فرماکر میری گفتگو کو غیر وقیع قرار دیتے، اور اگر کبھی میری کوئی بات مرحوم کے منشا کے مطابق ہوتی تو فرماتے۔

جی ہاں سنی تو ناظم مجلس تعلیمی ہی کی جائیگی بڑا باوقار عہدہ ہے اور یہی ذمہ دار ہیں۔

غرضیکہ چٹکی بجاتے مفتی صاحبؒ الجھے ہوئے مسائل کو سلجھا لیتے حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ سے انھیں خصوصی تعلق تھا، بربناء معاصرت بے تکلفی بھی تھی۔ ایک روز مہتمم صاحب مرحوم دہلی میں مفتی صاحب کی رہائش گاہ پر زبردستی کے مہمان تھے۔ مفتی صاحب کبھی بریانی کی پلیٹ

پیش کرتے تو مہتمم صاحبؒ فرماتے کہ جی ہاں اسے بھی کھاؤں گا۔ کبھی کرسی کوفتوں کو بڑھاتے تو مہتمم صاحبؒ فرماتے۔ جی ہاں یہ بھی لوں گا۔ الوان و اقسام کے کھانے **مفتی** صاحبؒ نے اس طرح پیش کیے اور ہر ایک پر مہتمم صاحبؒ مرحوم کا یہی جواب تھا۔ **مفتی** صاحب مرحوم کھانے میں بہت محتاط بلکہ لیا دیا ہی کھاتے۔ مہتمم صاحبؒ کے اس طرز پر کہاں چوکنے والے تھے بپھر کر بولے۔

جی ہاں سب کھاؤں گا کسی چیز کا انکار نہیں ہے۔

ہم نیاز مند تو سناٹے میں آگئے لیکن مہتمم صاحبؒ جو **مفتی** صاحبؒ کے اداشناس تھے اس پر تبسم زیر ہو گئے۔

مفتی صاحبؒ میں حلم بھی غایت درجہ کا تھا، وہ ناگوار باتوں کو برداشت کرنے میں بے مثال واقع ہوئے تھے۔ دارالعلوم کے حالیہ ہنگاموں میں سعید صاحب اکبر آبادی اور منظور صاحب نعمانی سے بے حد دل گیر تھے مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ سے انھیں امتیازی و اختصاصی تعلق تھا، ایک بار میرے سامنے قاری صاحب مرحوم کو رخصت کرنے کے لیے باہر تشریف لائے خود ہی کار کا دروازہ کھول کر مہتمم صاحب کو سوار کیا اور بھراتے ہوئے لہجہ میں فرمایا۔

میری گور کی خاک بھی اڑ کر آپ کا ساتھ دے گی۔

لیکن اس کے باوجود آخری دم تک سعید صاحب اکبر آبادی کو نبھاتے رہے حالاں کہ ہم نیاز مند خوب جانتے تھے کہ دارالعلوم کے موجودہ معاملات میں سعید صاحب کی پالیسی نے **مفتی** صاحب کے قلب پر چوٹ لگائی تھی، مرحوم ایسے باوفا و بامروت تھے کہ دارالعلوم دیوبند میں والد مرحوم کے

بعد ایک دوسری شخصیت کا آفتاب اقتدار نمودار ہوا تو اس کی خیرہ کن چمک دمک سے والد مرحوم کے اکثر و بیشتر تلامذہ و متعلقین اُدھر ہی کے ہو کر رہ گئے لیکن حضرت **مفتی** صاحبؒ نے نہ اپنا طرز بدلا نہ اپنی روایت پر آنچ آنے دی نہ اپنے حضرت استاذ مولانا انور شاہ کشمیریؒ سے ان کے بے پایاں تعلق میں ذرا سی کمی آئی، بلکہ خوب جانتا ہوں کہ وہ اس دوسرے آستانے تک کبھی پہنچے تک نہیں۔ اس پوری صورت حال پر یہ شعر کس قدر صادق ہے ؎

وہ تیری گلی کی قیامتیں کہ قبر سے مُردے نکل پڑے
مگر اک مری جبین نیاز جہاں دھری تھی دھری رہی

مفتی صاحب کی علمی استعداد مضبوط اور سوادِ علمی ممتاز تھی، وہ دارالعلوم دیوبند میں دورۂ حدیث میں جو تعلیمی آخری سال ہے، امتیازی حیثیت سے کامیاب ہوئے، دارالعلوم کا وہ خیر القرون تھا جب یہاں مجرد کامیابی بھی بہت دشوار تھی چہ جائیکہ اختصاصی نمبرات سے کامیابی، اس پر ان کے استاذ حضرت علامہ انور شاہ کشمیری علیہ الرحمہ نے اپنی تصانیف کے ساتھ دو روپے نقد انعام عنایت فرمایا۔ مرحوم اس نقد انعام کو بطور تبرک سنبھالے ہوئے تھے۔ اس زمانہ میں درس نظامی کی دشوار تر کتاب بیضاوی سورہ بقرہ دورۂ حدیث سے فراغت پر ہوتی۔ **مفتی** صاحبؒ دارالعلوم میں معین المدرس مامور ہوئے تو آپ کو پڑھانے کے لیے دی گئی۔ بیضاوی کے درس میں پنجاب، پشاور، ایران، قازان، بخارا، سمرقند وغیرہ کے ممتاز طلباء شریک تھے۔ مزید برآں علامہ کشمیریؒ سے حدیث کا درس لیے ہوئے فاضل طلباء کو بیضاوی پڑھانا کھیل نہ تھا۔ اس لیے مرحوم کبھی کبھی بطور تحدیث نعمت فرماتے۔

حضرت شاہ صاحب جیسے جبل علوم کے یہاں پڑھے ہوئے طلبا کو پڑھانا

مولوی صاحب کوئی آسان کام نہ تھا۔

دیوبند کے ۱۳۴۵ھ والے واقعہ میں **مفتی** صاحب اپنے استاذ قدس سرہٗ کے جانبدار تھے اور جب یہ علمی قافلہ دیوبند سے بجانب ڈابھیل روانہ ہوا تو آپ بھی اس کے ایک رکن تھے۔ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں افتاء کے شعبہ کو سنبھالنے کے ساتھ حدیث وتفسیر وفقہ کی اہم کتابوں کے اسباق آپ سے متعلق رہے۔ کلکتہ میں تفسیر قرآن بیان کی جس کا حلقہ عام وخاص پر پھیلا ہوا تھا۔ **ندوۃ المصنفین** کے بعد اگرچہ ان کی تمام تر مصروفیات انتظامی تھیں لیکن اس کے باوجود علمی ذوق جو پختہ ہو چکا تھا بدستور قائم رہا۔ علامہ انور شاہ کشمیری سمینار میں اپنے استاذ پر جو ارتجالاً مقالہ لکھا وہ تمام مقالات میں بیت الغزل کی حیثیت رکھتا ہے۔ شعر وشاعری سے مناسبت ان کا خاندانی ورثہ تھا، چوں کہ شعر شناس خوب تھے اس لیے پر معنی شعر کو سن کر اچھل جاتے۔ خاص عادت یہ تھی کہ جو شعر پسند آتا اسے فوراً لکھ لیتے۔ چنانچہ ایک بار ایسا ہوا کہ ہوائی سفر کے مرحلوں میں جو پابندیاں موجودہ حکومت نے عائد کیں اور ہتھیار وغیرہ کی تلاشی کے لیے جو خصوصی تجسس ہوتا جاتا ہے، میں نے اس کا ذکر کرتے ہوئے یہ شعر مرحوم کے سامنے پڑھا ؎

زنہار کوئی چابی کمر بند میں نہ باندھے
کہ لوہے سے بہت ڈرتی ہے سرکار ہماری

مفتی صاحب پھڑک اٹھے اور فرمایا کہ بھائی اُسے لکھوا دو۔ تحریر بڑی شگفتہ تھی لیکن اس میں بھی طنز کا پہلو غالب رہتا، ایک مرتبہ **بُرھان** کا اداریہ لکھا تو دار العلوم کے قدیم وجدید دور کا موازنہ کرتے ہوئے تحریر کیا کہ،

دار العلوم کے قدیم دور میں دورہ حدیث میں آج کی طرح

پلٹنیں نہ ہوتی تھیں بلکہ گنے چنے طلبا ہوتے لیکن کوئی
علامہ کشمیری بن کر نکلتا تو کوئی علامہ عثمانی۔

پلٹنوں کے لفظ کو پڑھیے اور سر دھنیے۔ عام مجالس میں کبھی علمی موضوعات اگر چھڑ جاتے تو مفتی صاحب کو اپنے دماغ کے خزانے سے پرانے اور مستند معلومات نکالنے میں دشواری نہ ہوتی۔ ان کے زیرنگرانی ندوۃ المصنفین کی مطبوعات علمی شاہکار ہیں جنھوں نے ملک و غیر ممالک کے علمی حلقوں سے خراج تحسین حاصل کیا ہے۔

علالت کا دور شروع ہوا تو بار بار عیادت کے لیے حاضری ہوئی، اب مفتی صاحب اپنا ضبط کھو چکے تھے۔ دارالعلوم کے حالات سنتے تو بے اختیار آنسوؤں کی لڑی آنکھوں سے بندھ جاتی۔ میں بمبئی سے واپس ہو رہا تھا دلی اسٹیشن پر اتر کر سیدھا ان کے رہائشی مکان پر پہنچا ناسوتی زندگی میں مفتی صاحبؒ سے یہ آخری ملاقات تھی پھر انھیں دیکھنا نصیب نہ ہو سکا۔

یہ ہیچ پوش تحریر بزم عتیق میں شرکت کی ایک کوشش ہے۔ ورنہ ایک آدھ مقالہ مفتی صاحب مرحوم کے عظیم کارناموں کو کبھی نہیں سمیٹ سکتا، آج بھی محسوس ہوتا ہے کہ وہ ندوۃ المصنفین میں اپنی کرسی پر تشریف فرما ہیں، عینک ان کے ہاتھوں میں ہے اور اپنے خصوصی لہجہ میں فرما رہے ہیں۔

ڈھونڈو گے ہمیں ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہو جس کی حسرت و غم اے ہم نفسو وہ خواب ہیں ہم

●●●●●●●●●●●●●●●●●●

اُن کی یاد

کرنل بشیر حسین زیدی سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

میں غالباً پہلی مرتبہ مفتی عتیق الرحمٰن مرحوم سے مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم کی معیت میں ملا تھا۔ تقسیم ہند کے بعد ہندوستان کے مسلمان پریشان حال اور راہ گم کردہ تھے۔ اس زمانے میں مولانا ابوالکلام آزاد کے علاوہ دہلی میں دو ہستیاں تھیں جنھوں نے اپنے ایمان راسخ، خلوص، تدبر، دوراندیشی اور وسیع النظری سے ہمیں حوصلہ دیا، ہمت بندھائی اور اپنے مشوروں سے بھٹکے ہوؤں کو صحیح راستہ دکھایا۔ ان میں سے ایک مولانا حفظ الرحمٰن اور دوسرے مفتی صاحب تھے۔ مفتی صاحب مرحوم جید عالم کی حیثیت سے ایک بلند قامت شخصیت تھے مگر ان میں انتہائی انکسار اور فروتنی تھی۔ ان کا وسیع اخلاق اور ملنساری ملنے والوں کے دل موہ لیتی تھی۔ ان میں علم و فضل کے ساتھ عملی سوجھ بوجھ تھی اور پیچیدہ مسائل پر گہری نظر رکھتے تھے۔ میں جب تک دہلی میں رہا ان سے برابر ملتا رہا۔ جب وائس چانسلر کی حیثیت سے علی گڑھ چلا گیا تو جب بھی دہلی آتا تھا ان سے کوشش کر کے ملتا تھا اور وہ بڑی شفقت سے پیش آتے تھے ان کے یہاں چھوٹے بڑے کی تفریق نہ تھی، ان کا دروازہ سب کے لیے کھلا

تھا اوران کی ہمدردیاں عام تھیں۔ لوگ طرح طرح کے مسائل اورمعاملات سے متعلق ان کی خدمت میں مشورے کے لیے آتے تھے اور **مفتی** صاحب بڑی خندہ پیشانی اور توجہ سے ان کی سنتے اور اپنی رائے اور مشورہ دیتے۔ پریشان حال لوگوں کی خدمت کرنا ان کا روزمرہ کا معمول تھا۔ افسوس ہے کہ ان کو وہ مقام نہ ملا جس کے وہ مستحق تھے۔ اس کی انھیں شکایت بھی ہوسکتی تھی لیکن وہ بڑے صابر تھے اور کبھی لفظ شکایت میں نے ان کی زبان سے نہیں سنا۔

مسلمانوں کے پاس کوئی متحدہ سیاسی پلیٹ فارم نہ تھا اور وہ نامساعد حالات کے باوجود پارٹی بندی کا شکار تھے۔ جب اس بات کا احساس ہوا کہ مسلمانِ ہند کے جماعتی مسائل متقاضی تھے کہ ایک متحدہ محاذ ہو جہاں مختلف الخیال اشخاص مل کر تبادلۂ خیال اور مشورہ کرسکیں تو **مفتی** صاحب کی سرپرستی میں مجلس مشاورت وجود میں آئی۔ ہماری بدقسمتی تھی کہ **مفتی** صاحب کی صحت خراب ہوگئی اور وہ صاحب فراش ہوگئے۔ ان کے بعد ان کی جگہ اب تک پُر نہ ہوسکی ہے۔ اللہ تعالیٰ انھیں اپنی رحمتوں سے نوازے اور ہمیں ان کا صحیح جانشین تلاش کرنے میں کامیابی عطا فرمائے۔

مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی
(نقوش وتاثرات)

ڈاکٹر سید احتشام احمد
پروفیسر وصدر شعبۂ عربی، کالی کٹ یونیورسٹی، کیرالا

مفتی صاحب کو سب سے پہلے میں نے ندوہ میں دیکھا۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ کے انتقال پر دارالعلوم ندوۃ العلمار کے احاطہ میں ایک عظیم علمی جلسہ منعقد ہوا جس میں ملک کے ممتاز علمار ہندوستان کے کونے کونے سے شرکت کے لئے جمع ہوئے۔ حضرت سید صاحب پر مقالات پڑھے گئے اور تقریریں ہوئیں۔ جاڑوں کا موسم تھا میں ندوہ میں پڑھتا تھا۔ اس وقت مفتی صاحب کی تقریر پہلی بار میں نے وہیں سنی۔ حضرت سید صاحب پر انھوں نے بڑی دلچسپ اور علمی تقریر کی۔ پھر جب دہلی میں رہنے کا موقع ملا تو ۵ برس تک حضرت مفتی صاحب سے ملنے کے مواقع ملتے رہے۔ مولانا عبدالسلام قدوائیؒ کے ساتھ میں جامعہ میں رہتا تھا۔ مولانا کبھی کبھی دہلی شہر جاکر نماز جامع مسجد میں ادا کرتے۔ نماز بعد مفتی صاحب کی مجلس میں شرکت کرتے۔ اس محفل میں اکثر مولانا سجاد صاحب (مسجد فتحپوری) سے بھی ملاقات ہوتی۔ گفتگو تمام تر علمی ہوتی۔

ان نجی مجلسوں میں مفتی صاحب کے علم کا مظاہرہ خوب ہوتا۔ حق تو یہ ہے کہ ان کی علمی عظمت سے وہی واقف ہے جس نے ان کی محفلوں میں شرکت کی ہے۔ ایسے ایسے علمی گوشے ان کی گفتگو سے سامنے آتے کہ انسان متعجب ہوجاتا۔ قرآن و

احادیث، تاریخ و سیرت، علماء اسلام، اشخاص اور اداروں کے متعلق ان کا علم نہایت وسیع تھا۔ میں نے دیکھا کہ مفتی صاحب کے سامنے سارے اہل علم خاموش رہتے اور وہ بلبل ہزار داستاں کی طرح محفل کو اپنے علم اور حسنِ بیان سے گلزار بنا دیتے۔ ایک بار جمعہ کے بعد جامع مسجد سے سیدھے مولانا عبدالسلام قدوائیؒ کے ساتھ میں مفتی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ محفل جمی ہوئی تھی۔ مفتی صاحب نے نہایت عالمانہ گفتگو کی۔ جب ہم لوگ باہر نکلے تو مولانا عبدالسلام قدوائیؒ نے مجھ سے فرمایا کہ علوم اسلامیہ پر مفتی صاحب کی معلومات نہایت وسیع ہیں۔ واقعی ہم لوگ اس دن بہت زیادہ متاثر ہوئے۔

یہ واقعہ ہے کہ جو لوگ یہ تصور رکھتے ہیں کہ مفتی صاحب رسالہ بُرہان نکالتے ہیں کتابیں شائع کرتے ہیں مگر چونکہ ان کی توجہ لکھنے کی جانب نہیں تھی یہ انسان کا اپنا مزاج اور شوق ہوتا ہے اس لئے ان کو یہ اندازہ نہیں ہو سکتا کہ حضرت مفتی صاحب کس درجہ کے عالم تھے، میں اپنی بات کو مدلل کرنے کے لئے ذیل میں ایک واقعہ لکھتا ہوں۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں مولانا سعید احمد اکبر آبادی ڈین اور صدر شعبہ دینیات بن کر تشریف لائے۔ اسی وقت مولانا نے یونیورسٹی میں اہل علم کو بلانے اور ان سے استفادہ کا ایک پروگرام بنایا۔ مولانا حفظ الرحمٰنؒ کی تقریر ہوئی۔ پھر یونین ہال میں حضرت مفتی صاحبؒ کی تقریر ہوئی۔ اس موقع پر مولانا اکبر آبادی نے ایک تعارفی تقریر کی جس میں انھوں نے مفتی صاحب کے علمی عثمانی خاندان کا ذکر کیا پھر ان کی علمی عظمت بیان کی کہ مفتی صاحب ۵ برس تک دارالعلوم دیوبند میں مفتی اعظم کے عہدہ پر فائز رہ چکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک بڑی فضیلت ہے کہ ۵ برس تک وہ دارالعلوم دیوبند میں افتار کا کام کرتے رہے ظاہر ہے کہ اس عرصے میں ہزاروں فتوے انھوں نے دئے ہوں گے۔ اس کے بعد جب مفتی صاحب نے تقریر شروع کی تو لوگوں کی آنکھیں کھُل گئیں۔ انھوں نے اس موضوع پر توجہ دلائی کہ ابھی تک بہت سے ایسے مسائل ہیں جن پر علماء نے کوئی فتویٰ نہیں دیا

اور کوئی فیصلہ نہیں کیا حالانکہ یہ مسائل نہایت بنیادی ہیں ان میں آپ نے لائف انشورنس کا ذکر کیا۔ اور کئی ایسے مسائل ذکر کیئے جو اہم ہیں مگر واضح حل ان کا موجود نہیں یعنی اجماع امّت اب تک ان مسائل پر نہ ہوسکا جس پر عمل کر کے ایک مسلمان کو انشراح صدر ہوسکے۔

مفتی صاحب علمار سلف کی طرح نام ونمود سے اجتناب کرتے تھے چنانچہ رسالہ برہان انھوں نے نکالا۔ ندوۃ المصنفین میں وہ بحیثیت مؤسس کے شریک تھے مگر کہیں اپنا نام نہیں لکھا ورنہ درحقیقت وہ مینجنگ ایڈیٹر تو تھے ہی مگر مضامین پر نظر بھی رکھتے تھے۔ مجھے تعجب تو اس خلوص اور بے نفسی پر ہوتا ہے کہ تقریبًا نصف صدی تک رسالہ نکالا اور ان کا ذکر اور نام کہیں نہیں۔ روس کا سفر کیا تو سفرنامہ برہان میں شائع کیا۔ دیکھنے والے دیکھ سکتے ہیں کہ کس طرح اس سفرنامہ کو انھوں نے اپنی معلومات سے علمی گلدستہ بنادیا ہے۔ یہاں یہ عرض کر دینا بہتر ہے کہ ندوۃ المصنفین کی تاسیس میں مولانا حفظ الرحمٰن، مولانا سعید احمد اکبرآبادی، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی اور دوسرے علمار شریک تھے۔ مفتی صاحب مؤسسین میں سے ایک اہم رکن تھے، بعد میں سب الگ ہوگئے۔ مفتی صاحب پوری عمر اس ادارہ سے وابستہ رہے اور پورے ادارہ کو چلانے کا بار پوری عمر انھوں نے اٹھایا۔ مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے علمی معاونت کی۔ انھوں نے مسلسل نظرات لکھے، کتابوں پر تبصرے کیئے، مقالات اور سفرنامے لکھے، وفیات پر اپنے قلم اور جذبات کے جوہر دکھائے۔ اس طرح اس ادارہ کو ان دو اہل علم نے بام عروج تک پہونچادیا۔

مفتی صاحب نے مسلمانوں کے مسائل سے دلچسپی لی۔ مجلسِ مشاورت کو انھوں نے نئی زندگی بخشی۔ اس کا ایک ترجمان رسالہ بھی شائع کیا۔ ملک میں ان کی اہمیت اور عظمت بڑھ گئی۔ ان کا شمار ہندوستان کے چوٹی کے علمار اور مسلمانوں کے

زنار میں ہوتا تھا۔

مفتی صاحب گداز بدن کے آدمی تھے۔ داڑھی مان منوہر، سر پر سیاہ چوڑی ٹوپی، شیروانی، ہنستا ہوا چہرہ۔ ان کو دیکھ کر ان کی شخصیت اور ان کے علم کی اہمیت کا اندازہ ہوجاتا تھا۔ ندوۃ المصنفین، دہلی میں مفتی صاحب کی وجہ سے مقناطیسی شخصیت ان کو کھینچتی تھی۔

اہل علم اس حقیقت سے واقف ہیں کہ علمی وتحقیقی کتابیں شائع کرنا اور پھر ان کو فروخت کرنا نہایت اہم کام ہے خصوصاً ۱۹۴۷ء کے بعد جو اردو کی حالت ہوگئی تھی اس سے کون واقف نہیں۔ دارالمصنفین کی حالت تو اتنی خراب ہوگئی کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے وزارتِ تعلیم سے اس وقت ۷۰ ہزار روپے عطا کئے جس پر پارلیمنٹ میں ان پر اعتراضات ہوئے اور مولانا نے نہایت عمدہ تقریر کی اور جواب دیا۔ مگر اس ادارہ کو کہیں سے کوئی امداد نہیں ملی صرف مفتی صاحب کی شخصی محنت وسعی پیہم سے یہ ادارہ چلتا رہا۔ البتہ دارالمصنفین میں مصنفین ملازم ہیں، وہ ایک اکیڈمی ہے مگر ندوۃ المصنفین میں آغاز میں تو مصنفین تھے مگر اب تو وہ ایک اشاعتی ادارہ ہے تاہم غنیمت ہے کہ ہر ماہ علمی واسلامی موضوعات پر مقالات اہل شوق تک پہونچتے ہیں۔ کتابیں اعلیٰ معیار پر شائع ہوتی ہیں۔ ملک میں اس ادارہ کا وزن ہے۔ یہ ادارہ مفتی صاحب کی عظمت کا ترجمان ہے۔

"آباد رکھے ساقی تری محفل کو"

مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ

ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں تھی

مولانا محمد سالم القاسمی مہتمم دارالعلوم (وقف) دیوبند

دارالعلوم دیوبند ہمہ گیر فکر قاسمی کا وہ سدا بہار و زرنگار رنگ گلدستہ ہے کہ جو

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر ست

کا قرار واقعی مصداق ہے، وقت کے تیور بدلے اور اسلامی تعلیمات کے قدیم مسائل کو وقت کے جدید دلائل سے مرصع کرکے، نئے قرن کے جدید ذہن کو مطمئن کرنے کی ضرورت، جب پوری قوت و اہمیت کے ساتھ ہویدا ہوئی، تو مشیت ربانی نے برصغیر میں "اہل حق و اہل سنت والجماعت" کے تمام قدیم اسلامی مکاتب فکر کی باہم آمیزی کے ساتھ وقت کے تقاضوں کے مطابق ایک نئے اور جامع ترین مکتب فکر کی تخلیق کے لیے حجۃ اللہ فی الارض شیخ الاسلام حضرت الامام مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس اللہ سرہ العزیز کی عبقری شخصیت کو انتخاب سے نوازا۔

قدیم نظری اور جدید مشاہداتی حکمتوں کے متوازن و معتدل اختلاط کے ساتھ بالہام ربانی حضرت الامام النانوتویؒ نے اس جدید و جامع مکتب فکر کی تاسیس ۱۸۶۶ء میں بصورت دارالعلوم دیوبند فرمائی، جس میں حضرت بانی علیہ الرحمۃ نے دہلی کے ولی اللّٰہی تفسیری، لکھنؤ کے فقہی، خیر آباد کے معقولی،

اور حضرت بانی نے خود اپنے "حدیثی" مکتب فکر کو اس جدید و جامع مکتب فکر کے "عناصر اربعہ" بنا کر اپنی علمی جامعیت اور فکری عبقریت کو رہتی دنیا تک ناقابل انکار بنا دیا۔

یہ ہی وجہ ہے کہ قاسمی نسب علمی کے منکر یا محروم النسب بے نصیبوں سے قطع نظر "قاسمی نسبت" کے انتسابی لقب سے اس مکتب فکر کے متوسلین کا احترام واستثناء علمی دنیا میں کسی مزید اضافہ کا ضرورت مند نہیں رہتا۔

یہاں اس حقیقت کا اظہار برمحل ہوگا کہ حضرت بانی علیہ الرحمۃ اور ان کے مخلص و متدین رفقاء محترمین نے "دین" کو اصل قرار دے کر ضرورت وقت کے تحت "سیاست" کو بطور خادم دین استعمال کیا اور اسی ضرورت وقت کے تحت، وقت کی نزاکتوں کے بصیرت مندانہ تجربے کے بعد "حریت فکر" کو اس دینی دانشگاہ کی تعلیم میں اس طرح سمو دیا کہ نوے سالہ جنگ آزادی کی آزادیٔ وطن کی صورت میں کامیابی کو بلا خوف تردید اسی مؤمنانہ اور بصیرت مندانہ خادم دین سیاست پر ایک ناقابل انکار تاریخی دلیل کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

اس وضاحت کے بعد یہ حقیقت کسی دلیل کی محتاج نہیں رہتی کہ "دارالعلوم دیوبند" اور اس کے مقدس اکابر کی روایات کا فہم صحیح رکھنے والے انہی فرزندان دارالعلوم کو "ابنائے سعید" گردانا جا سکتا ہے کہ جنھوں نے "دین" کی مخدومیت کو بہرصورت محفوظ رکھ کر "سیاست" کو اس کا خادم بنایا ہو اور دین و سیاست میں بصورت تعارض بڑے بڑے سیاسی مفاد کو ٹھکرا دینے میں انھیں ذرہ برابر کبھی تأمل نہ ہوا ہو۔

"جماعت دیوبند" کی ایسی ہی باکردار شخصیات کو خراج عقیدت پیش کیا جانا بجا طور پر ایک جماعتی فریضہ بھی ہے اور ملی فریضہ بھی، جس کی ادائیگی

میں وہ نام نہاد سیاست زدہ منتسبین دارالعلوم سدِ راہ نہیں بن سکتے کہ جو اپنی بے راہی اور کج فہمی کی بنیاد پر اپنی حقیر اغراض کو" سیاست" کا نام دے کر "دین" کو اس کا آلۂ کار بنانے میں کوئی شرم محسوس نہیں کرتے۔

اس بارے میں دو رائیں نہیں کہ ملتِ اسلامیہ ہندیہ نے حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانیؒ کو دینی، علمی، فکری، اجتماعی اور سیاسی دائروں میں ایک متدین و باکردار شخصیت کی حیثیت ہی سے جانا اور پہچانا، اس لیے ان کی محترم شخصیت کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کا معیار بھی ان کے یہ ہی امتیازات ہو سکتے ہیں اور مستقبل کی نسلوں کو اس باکردار و متدین ذات سے متعارف کرانے کا وسیلہ بھی ان کی یہ ہی انمٹ خصوصیات بن سکیں گی۔

حضرت مفتی صاحب علیہ الرحمہ بیک وقت اصول و فروع پر وسیع النظر افتائی نقطۂ نظر سے احوالِ وقت سے باخبر، اہم علومِ دینیہ کے بصیرت مند عالم ذی رائے سیاسی زعیم، نکتہ آفریں مؤثر خطیب، کامیاب مدرس، قادر الکلام ادیب، شعر و سخن میں صاحبِ ذوقِ لطیف ہونے کی علمی، فکری اور کلامی جامعیتوں کے ساتھ بلند اخلاق انسان، پیکرِ تواضع اور تعلقات کی متضاد قدروں کو اس خوبی اور مروت کے ساتھ نبھانے والے باوضع بزرگ تھے کہ ہر ملنے والا یہ تاثر و تیقن لے کر اٹھتا تھا کہ حضرت مفتی صاحب کا قریب ترین مخلصانہ تعلق مجھ سے زیادہ شاید کسی دوسرے سے نہیں ہے۔

حضرت مفتی صاحب علیہ الرحمۃ نے خاندانِ عثمانی کی ایک مثالی شخصیت کی حیثیت سے خاندانِ قاسمی کے ساتھ بزرگوں کے وقت سے قائم اخلاص مندانہ تعلق کی عظمت و اہمیت کو نہ صرف زندگی بھر حسن و خوبی سے نبھایا ہے، بلکہ ہر دو خانوادوں کے نوعمروں کے دلوں میں اس تعلق کے قیام

ولقا کے لیے اُن کی بے تکلف و پُرشفقت تعبیرات قرب و قوت کا کامیاب ذریعہ بنتی رہتی تھیں۔

راقم الحروف کے لیے حضرت مفتی صاحبؒ کی شخصیت سے محبت و اخلاص آمیز وابستگی کی حقیقی بنیاد تو خاندان قاسمی اور خاندان عثمانی کا وہ تاریخی ارتباط ہی تھا کہ جو فیاض قدرت نے محسن ملت حجۃ اللہ فی الارض شیخ الاسلام حضرت الامام مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہ العزیز بانیٔ دارالعلوم دیوبند کو حضرت المخدوم المعظم مولانا فضل الرحمٰن صاحب عثمانی نوراللہ مرقدہٗ کے مخلصانہ تعاون و تعلق کی صورت میں عطا فرماکر قائم فرمایا تھا۔ پھر مشیت ربانی نے اگلی نسل میں شیخ الاسلام حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند اور حضرت اقدس مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند کے مابین ایمانی رشتۂ مواخات قائم فرماکر اس تعلق کی تجدید فرمائی۔

فکر قاسمی کے مظہر جمیل دارالعلوم دیوبند اور علمی تبحر اور عارفانہ بصیرت کے ساتھ اس قاسمی فکر کا قابل اعتماد شعور صحیح، قرار واقعی تحمل اور اس کے لیے مخلصانہ جذبۂ ارتقاء و تحفظ رکھنے والی شخصیات میں شیخ الاسلام حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی، شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری، جامع معقول و منقول غزالیٔ دوراں حضرت علامہ مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی، حضرت مولانا بدر عالم صاحب مہاجر مدینہ، حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی اور مفکر ملت حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی رحمہم اللہ کے اسماء گرامی بلاخوف تردید

پیش کیے جا سکتے ہیں۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے زریں دور اہتمام میں یہ متفق علیہ حقیقت کبھی دورایوں کا ہدف نہیں بنی کہ دار العلوم دیوبند کے علمی، دینی اور اجتماعی موقف کو گرد و پیش میں پھیلے ہوئے خود غرضانہ سیاسی ماحول میں حکمت و تدبر سے محفوظ رکھنے میں حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کا کردار دار العلوم کی تاریخ کا ایک ناقابل فراموش کردار ہے، حضرت بانیٔ دار العلوم کے الہامی اصول ہشتگانہ کی روشنی میں انھوں نے "مجلس شوریٰ" میں تمام مسائل کو متفق علیہ طور پر طے کرنے کی بزرگانہ روایت کو جس محنت و کاوش اور جس مشقت و کوشش سے برقرار رکھنے کی صبر آزما اور مخلصانہ جدوجہد فرمائی، اسی کا نتیجہ تھا کہ مجلس کے صحیح الفکر ارکان کی پوری کوشش یہ ہوتی کہ شوریٰ کی صدارت مفتی صاحب ہی فرمائیں، اور سیاسی غرض مندیوں کے باوجود مخالفین کو بھی مجلس شوریٰ میں بہ تسلسل ان کی تائید صدارت کی صورت میں اس کا اقرار و اعتراف کرنا پڑتا تھا۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ کی رسمی اور ظاہری تقدس نمائی سے گریز کے ساتھ زندگی کی سادگی کو دیکھنے والوں میں کم ہی لوگ اس حقیقت سے آشنا ہوں گے کہ حضرت مفتی صاحب اپنے اکابر کے علمی اور عرفانی امتیازات کے سچے عشاق میں سے تھے اور جماعت کے جس فرد میں اکابر میں سے کسی بزرگ کے امتیاز کی اگر جھلک محسوس فرماتے تو اس کی قدر دانی اور عزت و احترام میں یہ فرق روا نہیں رکھتے تھے کہ وہ علم و عمر میں ان سے چھوٹا ہے یا بڑا ہے، غالباً یہ ہی وجہ تھی کہ حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب کی ذات گرامی میں کہ جن کو حق تعالیٰ نے حضرت بانیٔ دار العلوم کی نسبی نسبت کے ساتھ ان کی علمی عظمت اور

فکری رفعت سے بھی حصہ وافر عطا فرمایا تھا اور اس کے ساتھ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کے عارفانہ تقدس، حضرت اقدس مولانا حافظ محمد احمد صاحب کے علمی تبحر، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی کے مثالی تدبر، حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کے علمی تحفظ، حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کے حقائق آفریں خطاب و تکلم، اور عارف باللہ حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب کے متواضعانہ تحمل کی صفات کو بھی جمع فرما دیا تھا۔ تقریباً ہم عمری کے باوجود حضرت مفتی صاحب علیہ الرحمہ کو حضرت حکیم الاسلام سے جو غیر معمولی تعلق زندگی بھر رہا ہے، اس پر ان کا یہ جملہ ہمیشہ ایک تاریخی اہمیت کا حامل رہے گا کہ

"میں مرجاؤں گا تب بھی میری خاک کے ذرے ذرے سے
طیب، طیب ہی کی صدا سنائی دے گی"

غالباً ۱۹۳۸ء میں حضرت مفتی صاحب علیہ الرحمہ نے اپنے مخلص اہل قلم رفقاء، مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب، مفکر جلیل مولانا حامد الانصاری صاحب غازی، مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی وغیرہ کے علمی اور تصنیفی تعاون سے ندوۃ المصنفین کے نام سے اس ادارہ کی تاسیس فرمائی کہ جو آج ملک و بیرون ملک میں مسلمانان ہند کی عزتوں میں اضافہ کا موجب بن رہا ہے، اس کے قیام کے لیے حضرت مفتی صاحب نے اپنی فکری اور ذوقی بلندی کے تحت قرول باغ میں فیض روڈ پر ایک شاندار کوٹھی کرائے پر حاصل کی، جو بہت مختصر وقت میں دہلی میں خاص طور پر، اہل علم و فکر کا مرجع بن گئی، ساتھ ہی ماہنامہ برہان کا اجرا بھی فرمایا۔ ۱۹۴۰ء میں راقم الحروف کو حضرت مفتی صاحب کی بزرگانہ شفقتوں سے زمانۂ طالب علمی میں بہرہ مند ہونے کا موقعہ میسر آیا۔ جس کا سبب ظاہری یہ بنا کہ ۱۹۴۰ء میں حضرت مولانا محمد سلیم صاحب رحمہ اللہ

ناظم مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ نے ندوۃ المصنفین کے قریب ہی ایک دوسری کوٹھی "فردوس منزل" میں مدرسۂ صولتیہ کا دفتر قائم فرمایا، اور اس سے "ندائے حرم" ماہنامہ کا اجراء فرمایا اور راقم الحروف کو حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ سے اجازت لے کر حضرت مولانا محمد سلیم صاحب نے خصوصی طور پر ابتدائی عربی تعلیم کے لیے اپنے پاس دہلی بلالیا۔ تقریباً ایک سال فردوس منزل میں حضرت مولانا کے یہاں احقر مقیم رہا، اس قیام کے دوران تقریباً روزانہ ہی احقر کی ندوۃ المصنفین میں حضرت مفتی صاحب کے ہاں حاضری ہوتی تھی اور حضرت مفتی صاحب اور حضرت مولانا محمد سلیم صاحب کی محترم شخصیات اور دونوں اداروں کی عظمت وافادیت، مشاہیر علماء، زعماء، ادباء اور شعراء کی تمام تر توجہات کو اپنی جانب منعطف کرنے کا کامیاب ذریعہ اور تعارف وملاقات کا مغتنم وسیلہ ہی نہیں بنی، بلکہ اس کو اگر دہلی کی لٹی ہوئی عظمتِ رفتہ کی جھلک دکھلانے کے عنوان سے بھی یاد کیا جائے تو شاید مبالغہ نہیں سمجھا جائے گا۔

حضرت مفتی صاحب سے فکری اور حضرت مولانا محمد سلیم صاحب سے علمی استفادہ کے اس دور میں جہاں مختلف مشاہیر علماء سے ملاقاتوں کے مواقع ملے، وہیں حضرت مفتی صاحب کی اس امتیازی اور غیر معمولی قابلِ ذکر خصوصیت سے بھی بہرہ مند ہونے کا خوش بختانہ موقعہ میسر آیا کہ مفتی صاحب اپنے چھوٹوں سے ازراہِ شفقت دوستانہ انداز اختیار فرماکر ان کو اتنا بے تکلف بنالیتے تھے کہ وہ اپنے حل طلب مسائل کو بے جھجک ان کے سامنے پیش کر کے ان کے مشوروں سے مستفید، اور ان پر عمل کر کے مطمئن ہوتے تھے۔ راقم الحروف کے بارے میں حضرت

مفتی صاحب کو جب یہ اندازہ ہوگیا کہ میں بڑوں کی مجالس میں بیٹھنے کا شوق رکھتا ہوں لیکن ادباً کچھ پوچھنے یا بات کرنے میں جھجک محسوس کرتا ہوں تو مفتی صاحب نے ہر اتوار کو بغرض تفریح جانے والے اپنے بے تکلف احباب میں باصرار مجھے بھی شامل فرمالیا۔ کبھی انڈیا گیٹ کبھی قطب صاحب کبھی جنتر منتر اور کبھی نظام الدین جاکر یہ باعلم و خوش طبع مجمع احباب حضرت مفتی صاحب مولانا حفظ الرحمٰن صاحب، مولانا حامد الانصاری غازی صاحب، مولانا سعید احمد اکبرآبادی صاحب، سید حسن شیرازی صاحب، محمد سعید جوہری اور راقم الحروف پر مشتمل ہوتا تھا۔ ہر فرد اپنے طور پر کوئی کھانا اپنے گھر سے تیار کرکے لاتا تھا۔ مفتی صاحب ان احباب میں مرغ پکانے میں ممتاز قرار دیے جاتے تھے اور اس موقعہ پر مفتی صاحب اس کا بطور خاص سب کے اصرار پر اہتمام فرماتے تھے۔ مذکورہ مقامات پر پہنچ کر مزاح و سنجیدگی کی باہم آمیزی کے ساتھ جو دلکش محفل جمتی تھی، تو بسا اوقات وہاں بیٹھنے والے دوسرے اہل ذوق بھی اپنی تفریحات چھوڑ کر اسی محفل میں شریک ہوجایا کرتے تھے۔ مجلس کا اختتام کھانے پر ہوتا اور اس کے بعد رات کو گیارہ بارہ بجے تک سعید جوہری صاحب اپنی گاڑی سے سب کو گھروں تک پہنچانے کے ذمہ دار ہوتے تھے۔

اس شفقت آمیز بے تکلفی کے تحت کبھی مفتی صاحب احقر کو مطالعہ کے لیے خود کوئی کتاب منتخب فرماکر دیتے اور کبھی کبھی کتابت شدہ کاپیوں کی تصحیح میں بھی احقر کو اپنے رفقاء میں شامل فرماتے۔

ادبی خوش مذاقی مفتی صاحب کا خاندانی ورثہ تھا، خود شعر نہیں کہتے تھے لیکن مختلف و منتخب شعراء کے چیدہ اشعار کا وافر ذخیرہ

ان کے ذہن میں محفوظ تھا۔ اس دور میں شاید ہی ان کی کوئی گفتگو ایسی ہوتی ہو کہ جس میں **مفتی** صاحب برجستہ اشعار پڑھ کر اور اپنی گفتگو کو انتہائی موثر و دل کش بنا کر اہل محفل کو پھڑکا نہ دیتے ہوں۔ عربک کالج اجمیری گیٹ دہلی کے پرنسپل جناب خورشید احمد صاحب تھے جو کالج کی تعلیمی اور انتظامی ذمہ داریوں میں اپنے سلجھے ہوئے پاکیزہ ادبی ذوق کی تشنگی **مفتی** صاحب کی محفل میں شریک ہو کر ہی بجھایا کرتے تھے۔ کالج میں پیش آمدہ حوادث و واقعات پر **مفتی** صاحب کے مشوروں کی صحت پر اپنے یقین کا اظہار یہ فرما کر کیا کرتے تھے کہ **مفتی** صاحب سے مشورہ کے بعد مجھے پھر کچھ سوچنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ ایک موقعہ پر خورشید صاحب کالج کے کسی واقعے کی وجہ سے پریشان ہو کر **مفتی** صاحب کے پاس آئے اور آتے ہی انھوں نے گفتگو کا آغاز کالج کی پرنسپل شپ سے استعفا دینے کے ارادہ سے کیا۔ واقعہ کی تفصیل معلوم کر کے **مفتی** صاحب نے نہ صرف مسئلہ کو حل کر دینے والے مشورے ہی دیے بلکہ اداری زندگی پر پیش آنے والے اس قسم کے صبر آزما حوادث کے تحمل و برداشت پر بڑی موثر تقریر بھی فرمائی، جس میں اپنی اجتماعی زندگی کے تلخ حوادث پر صبر و تحمل کے نتیجے میں ان کی خوش انجامی کے تذکروں سے خورشید صاحب کو مطمئن کر کے ان کے حوصلے کو بھی بڑھایا اور اس گفتگو کا اختتام اس شعر پر فرمایا ؎

اے شمع تجھ پہ رات یہ بھاری ہے جس طرح
ہم نے تمام عمر گزاری ہے اس طرح

اس شعر کو سن کر خورشید صاحب پھڑک اٹھے اور اظہار کیا کہ **مفتی** صاحب کے اس منظوم و منثور کلام نے مجھے واقعتاً نیا حوصلہ بخش دیا۔

حضرت مفتی صاحب عصرِ رواں کے علمی، فکری، صنعتی اور معاشرتی جدید تقاضوں کی رعایت کے ملحوظ رکھنے کو تبلیغ دین کا بنیادی عنصر قرار دیا کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ:

"دین اسلام ایک دائمی اور عالمگیر دین ہے، جس میں ہر دور کے اور ہر قسم کے تغیرات اور تقاضوں کو انگیز کرنے کی لچک اور بھرپور صلاحیت موجود ہے لیکن ان تقاضوں سے صرف نظر کرکے دین کی دعوت پیش کرنے والے نئے اذہان کو اس خطرناک غلط فہمی کا شکار بنا دیتے ہیں کہ "اسلام" آج کے مادی اور سائنسی ارتقاء کا ساتھ دینے کی صلاحیت نہیں رکھتا اور پھر طرفہ تماشا یہ کہ ایسے محدود مفکر مبلغین، دین کے بارے میں بدگمانی کا باعث تو خود بنتے ہیں لیکن اپنی کوتاہی فکر کے بجائے، اس کا مجرم نئے ذہن ہی کو قرار دیتے ہیں۔"

اسی طرح ماہنامہ برھان کے لیے ایک معروف عالم کا طویل مقالہ موصول ہوا، جس میں آمین بالجہر اور آمین بالسّر، فاتحہ خلف الامام اور درود ابراہیمی میں کاف تشبیہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں پیدا ہونے والے ابہام افضلیت پر طویل ترین بحثیں کی گئی تھیں اسے ملاحظہ کرنے کے بعد حضرت مفتی صاحب نے فرمایا کہ:

"لوگ درسی مباحث کو صحافت کے ذریعہ عوام کے سامنے لاکر دادِ علم وصول کرنے کے عادی بن گئے ہیں جب کہ اس قسم کے مباحث کو دیکھ کر عام لوگ جو اپنی معاشی، معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی الجھنوں کے شرعی حل کے آرزومند ہوتے ہیں، یہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ دین کچھ محدود طاعات و عبادات ہی کا نام ہے زندگی کے نت نئے احوال و مسائل سے دین کا کوئی تعلق نہیں ہے۔"

ایک گفتگو کے دوران بڑے تاثر سے فرمایا۔

"افراد و آحاد کے استثناء کے ساتھ اہل علم و دین کا عمومی معاشرہ ایسا بن گیا ہے کہ زندگی کی ان نئی قدروں پر دینی نقطۂ نظر سے دعوت فکر دینا بھی بے دینی میں شمار ہونے لگا ہے لیکن ہمیں تو یہ طرز فکر اور طریق تربیت، عالمگیر دین اسلام کے ساتھ قرار واقعی انصاف پر مبنی محسوس نہیں ہوتا۔

اس ارتقائی فکر کی حامل شخصیات اپنے وقت میں کم پہچانی جاتی ہیں لیکن اب ان کے اٹھنے کے بعد عصر رواں کی مادی ارتقاء کی تیز رفتاری نے۔ ان افکار و آراء کو فکری حدود سے نکال کر مشاہداتی حدود میں داخل کر دیا ہے اور وسیع الفکر اہل علم ان اقوال کی قدر و قیمت میں روزافزوں اضافہ محسوس کر رہے ہیں اور ہمیشہ کرتے رہیں گے۔"

خلاصہ کلام یہ کہ سیاسی فکر و عمل میں اعتدال، دین کے تفوق و برتری کا ہر مرحلے پر خیال اور بلا امتیاز ہر خواہش مند کی فکری اور عملی امداد کی ہر دائرہ حیات اور ہر طبقہ کے افراد پر محیط گوناگوں خصوصیات و امتیازات کی وجہ سے حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ واقعتاً اپنی ذات میں ایک انجمن تھے، اس لیے حضرت مفتی صاحب کی متدین سیاسی شخصیت کے اٹھ جانے سے، حق پسند اور حقیقت شناس مسلم اجتماعی اور سیاسی حلقے، وقت کے گزرنے کو، اس زخم کے اندمال کا سبب بننے کے بجائے اس حقیقت کے اعتراف کے ساتھ اضافے کا باعث بنتا ہوا محسوس کر رہے ہیں کہ ؎

مدت کے بعد ہوتے ہیں پیدا کہیں وہ لوگ
مٹتے نہیں ہیں دہر سے جن کے نشاں کبھی

۸۶

سراپا شفقت، مجسم شرافت میرے بزرگ حضرت مفکرِ ملت

(از حاجی محمد رفیع صاحب دہلی)

تیرہ و تار تھی پہلے ہی یہاں شامِ حیات　　دامنِ چرخ سے اک اور ستارا ٹوٹا

کوئی بتلاؤ میری قوم کے معصوموں کو　　کون برباد ہوا کس کا سہارا ٹوٹا؟

یوں تو یہ دنیا فانی ہے اور یہاں کی ہر چیز آنی جانی ہے بقول شاعر ؎

دُنیائے دَنی کو نقشِ فانی سمجھو

ہر چیز یہاں کی آنی جانی سمجھو

جو آیا ہے اُسے ایک روز جانا بھی ضرور ہے چھوٹا ہو یا بڑا۔ امیر ہو یا غریب، غلام ہو کہ بادشاہ۔ جاہل ہو یا عالم۔ اس میں کسی کی قید نہیں ہے، سب ایک ہی راستہ کے مسافر ایک ہی کشتی کے سوار اور ایک ہی راستہ کے راہرو ہیں ——— مگر یہ سچائی بھی ناقابلِ انکار ہے، کچھ لوگ جب اس دُنیا سے جاتے ہیں تو ان کو صرف ان کے اہل و عیال اہلِ خاندان اور ان کا مخصوص حلقۂ احباب روتا ہے، ان کی موت پر غم کے آنسو بہاتا ہے مگر کچھ شخصیتیں، کچھ سراپا اخلاص انسان اور گراں قیمت بزرگ ایسے بھی ہوتے ہیں تو یہ زمین و آسمان یہ کوہ بیاباں، یہ دشت و جبل یہ فضائیں اور یہ ماحول، یہ درو دیوار

اور لاکھوں انسانوں کے قلب و روح اُن کے سوگ اور غم میں درد و کرب کی ایسی کسک محسوس کرتے ہیں جو عرصہ تک ختم نہیں ہوتی۔

حضرت مفکرِ ملت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی جیسی عظیم و گراں مایہ شخصیت سراپا اخلاص و شفقت بزرگ ملک و ملت کے درد مند دینی و ملّی اور سیاسی و سماجی رہنما کی وفاتِ حسرت آیات بھی ایسا المناک حادثہ ہے جس پر آسمان اشک فشاں اور فضائیں سوگوار ہیں اور ہر درد مند دل افسردہ و مغموم ہے۔

ذاتی طور پر مجھے جن حضرات اکابر کو دیکھنے یا جن سے ملنے کا شرف حاصل ہوا ہے اُن میں مجاہدِ ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ مولانا احمد سعید صاحبؒ دہلویؒ جیسے بلند پایہ اکابرِ ملت اور مجاہدینِ وطن شامل ہیں حضرت حکیم الاسلامؒ میرے شیخ طریقت مرشد برحق اور رہنمائے دین تھے ــــ مگر حضرت مفکرِ ملت کی شفقتوں، عنایتوں اور دین و ملت کے سلسلہ میں ان کی بیش بہا خدمات نے مجھے ــ بہت زیادہ متاثر کیا ہے۔ ان کی یاد، ان کا تصور، ان کی بے غرض خدمات انجام دینے کا طریقہ اور ہر چھوٹے بڑے سے پُر شفقت انداز میں پیش آنے کا اُن کا وہ پیارا اور مقدس و منفرد انداز میرے لئے ناقابلِ فراموش ہے۔ اور اُن کی مہربانیوں کا معاملہ میری زندگی کا قیمتی سرمایہ ہے۔

اِس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ حضرت مفکرِ ملت نے دیو بند کی انقلابی، علمی و دینی فضاؤں میں تعلیم و تربیت پانے کے بعد سے گذشتہ ساٹھ سال تک ملک و ملت، دین، شریعت اور علم و اخلاق کی دُنیا میں ایسے گراں مایہ نقوش ثبت کئے ہیں جو اس صدی کا قابلِ فخر ملی سرمایہ اور گراں مایہ اثاثہ ہیں۔ کاش میں مضمون لکھنا جانتا تو اپنے احساسات و جذبات کو صحیح ڈھنگ سے پیش کرسکتا مگر میں تو اپنے مربّی و محسن کی یادگار "مفکرِ ملت نمبر" ــــ میں شرکت کو اپنی سعادت تصور کرتے ہوئے اس محفلِ علم و ادب کی خاکِ پا کی حیثیت سے یہ چند الفاظ پیش خدمت کر رہا ہوں +

مفتی عتیق الرحمن عثمانی

از: ڈاکٹر ماجد علی خاں جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

برصغیر ہندوپاک کے ممتاز عالم دین، مسلم مجلس مشاورت کے صدر، مسلم پرسنل لا بورڈ کے سابق صدر، بانی ندوۃ المصنفین (دلّی) اور درجنوں مدارس، انجمنوں ودیگر ملّی اداروں کے سرپرست وممبر حضرت مولانا مفتی عتیق الرّحمان عثمانی ۸۳ برس کی عمر میں طویل علالت کے بعد ۱۲ مئی بروز ہفتہ دوپہر ساڑھے تین بجے اس دارفانی سے رحلت فرماگئے۔ اِنا للہ وانا الیہ راجعون۔

مفتی عتیق الرحمان عثمانی صاحب کے انتقال سے ہندوستان کے مسلمان ایک مقتدر رہنما، ایک باشعور دینی مفکّر ایک جیّد عالم اور ملت کے ایک دردمند سے محروم ہو گئے، مفتی صاحب کا تعلق دیوبند کے مشہور خانوادۂ علم وفضل سے تھا۔ آپ کے والد حضرت مفتی عزیزالرحمن عثمانی اپنے دور کے مفتیٔ اعظم اور مشائخ طریقت میں سے تھے۔ جن کو حضرت گنگوہیؒ اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ جیسے بزرگوں سے تربیت وتلمذ کا شرف حاصل رہا۔ مفتی صاحب کی پیدائش ۱۹۰۱ء میں ہوئی۔ مفتی عتیق الرحمٰن صاحبؒ نے بھی اپنی تعلیم دارالعلوم دیوبند میں ہی حاصل کی اور محدث عصر حضرت علامہ انورشاہ کشمیریؒ سے تلمذ کا شرف حاصل کیا۔ ابتدا میں مفتی صاحب دارالعلوم دیوبند میں مدرس رہے اور بعد کو حضرت علامہ انورشاہ کشمیریؒ اور دیگر اکابر دیوبند کی ہم رکابی میں ڈابھیل چلے گئے جہاں

گجرات کی مشہور دینی درسگاہ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں کئی سال تک فقہ، حدیث اور تفسیر کی اونچی کتابوں کا درس دیتے رہے۔

ڈابھیل کے زمانۂ قیام میں گاندھی جی کی مشہور تحریک نمک ستیہ گرہ شروع ہوئی اس دوران انگریزی اقتدار کے ظلم وزیادتی کے خلاف اپنا تاریخی فتویٰ دیا جس کے نتیجہ میں بالآخر مفتی صاحب کو گجرات چھوڑنا پڑا۔ وہاں سے آپ کلکتہ تشریف لے آئے جہاں کی مشہور مسجد "کولوٹولہ" میں خطیب رہے اور اسی مسجد میں درس تفسیر بھی دیا جو خاص وعام میں بہت مقبول ہوا۔ کلکتہ میں مفتی صاحب کا قیام تقریباً ۵ سال رہا۔ اس دوران آپ نے تحریک آزادی میں سرگرم حصہ لیا۔ اسی زمانہ میں مولانا ابوالکلام آزاد سے بھی قریبی روابط قائم ہوئے۔

اس دور میں دنیا کے بدلتے ہوئے حالات اور وقت کے تقاضوں کا مفتی صاحب کے ذہن پر کافی اثر ہوا۔ چنانچہ دینی علوم کے میدان میں جدید طریقہ سے کام کرنے کی ضرورت کو محسوس کیا اور اسلامی علوم وفنون کو وقت کے تقاضوں کے مطابق پیش کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ اس احساس کے ساتھ انھوں نے کلکتہ کے قیام میں مولانا آزاد ودیگر حضرات کے تعاون سے اس ملک کی مشہور ومقبول ریسرچ اکاڈمی ندوۃ المصنفین کی بنیاد ڈالی۔ دہلی کی مرکزی حیثیت کو محسوس کرتے ہوئے اس اکاڈمی کو مفتی صاحب دہلی لے آئے جہاں ان کے رفقاء مولانا حفظ الرحمان سیوہاروی، مولانا سعید احمد اکبر آبادی اور مولانا بدر عالم میرٹھی کے علمی وقلمی تعاون سے یہ ادارہ پروان چڑھتا رہا اور آج اس ادارہ کی تقریباً دو سو بیش قیمت مطبوعات ہیں۔ اسی ادارہ کے تحت اردو زبان کا مشہور دینی وعلمی رسالہ "برہان" بھی جاری کیا گیا جو تقریباً ۴۶ سال سے حضرت مولانا سعید احمد اکبرآبادی صاحب کے زیرادارت نکل رہا ہے ۱۹۳۸ء سے جب سے ندوۃ المصنفین

قائم ہوا مفتی صاحب کی آخری سانس تک یہ ادارہ جس معیار سے چلتا رہا اس سے مفتی صاحب کی تنظیمی صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے امید ہے کہ یہ ادارہ آئندہ بھی اسی طرح چلتا رہے گا اور جدید تقاضوں کے پیش نظر امت مسلمہ کے لیے بالخصوص اور تمام انسانوں کے لیے بالعموم اسلامی علوم و فنون، تاریخ و سیرت وغیرہ پر باسلیقہ لٹریچر پیش کر کے مفتی صاحب کے باقیات الصالحات میں شمار ہوتا رہے گا۔ مفتی صاحب کی یہ تمنّا تھی جو ان کے دل میں ہی رہی کہ اس ادارہ کے تحت موجودہ تقاضوں کے پیش نظر انگریزی میں بھی اسلامی لٹریچر شائع ہو۔ راقم السطور سے کئی بار اس موضوع پر تفصیلی گفتگو بھی فرمائی۔ اگر مفتی صاحبؒ اپنی عمر کے آخری قیمتی حصے میں شدید بیماری کے باعث صاحب فراش نہ ہو جاتے تو یقیناً وہ اپنی اس تمنّا کو بھی پورا کر لیتے امید ہے کہ ندوۃ المصنفین کی موجودہ انتظامیہ مفتی صاحبؒ کی اس دیرینہ خواہش کو پورا کرے گی۔

مفتی صاحب کی سیاسی سرگرمیاں زیادہ تر جمعیت العلماء ہند سے وابستہ رہیں جس کے وہ سرگرم رکن و رہنما تھے اور حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ و مولانا حفظ الرحمان سیوہاروی جیسے مخلص حضرات کے ساتھ جمعیت العلماء کے پلیٹ فارم سے آزادی کے قبل انگریزی حکومت کے خلاف اور آزادی کے بعد فرقہ پرستی کے خلاف نہ صرف آواز بلند کرتے رہے بلکہ انتھک جدوجہد کرتے رہے۔ ایک طرف وہ مجاہدانہ شان سے قوم و ملک دشمن عناصر کے خلاف جہاد کرتے رہے تو دوسری طرف دینی علوم کی اشاعت میں بھی مصروف رہے اس طرح ان کی شخصیت میں اعتدال کے ساتھ دونوں چیزیں جمع رہیں وہ ایک طرف علوم اسلامیہ دینیہ کے حامل تھے تو دوسری طرف قوم پرور رہنما بھی۔

دارالعلوم دیوبند کی علمی حیثیت ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ یہ درسگاہ ازہرِ ہند کا

مقام رکھتی ہے مفتی صاحب کا اس علمی ادارہ سے بچپن سے ہی تعلق رہا۔ وہ یہاں کے طالب علم بھی رہے اور مدرس بھی اور بعد میں اسکی شوریٰ کے ایک اہم اور موثر رکن بھی۔ ان کی زندگی کے آخری دور میں اس ادارہ میں جو اختلافات رونما ہوئے وہ سب کے علم میں ہیں۔ مفتی صاحب سابق مہتمم حضرت مولانا قاری طیب ؒ صاحب کے ساتھ آخری وقت تک رہے لیکن اپنی طبیعت کے فطری اعتدال کی وجہ سے انھوں نے کبھی بھی دوسرے کیمپ کے لوگوں سے ربط وضبط میں کمی نہیں کی۔ اس قسم کی مثالیں اس دور میں ناپید ہیں۔

اگر یہ کہا جائے کہ مفتی صاحب ؒ مسلم پرسنل لاء بورڈ کے بانیوں میں سے تھے تو غلط نہیں ہوگا۔ اسکی تفصیلات کے لیے یہ مختصر مضمون ناکافی رہے گا۔ بورڈ کے ایک اہم رکن اور آخر میں اس کے صدر کی حیثیت سے انھوں نے مسلم پرسنل لاء میں حکومت کی مداخلت کو رد کرنے اور غلط فہمیوں کو دور کرنے کے سلسلے میں قابل قدر خدمات انجام دیں۔ اس سلسلہ میں بورڈ کو جو کامیابیاں ملیں ان کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ اس میں مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی جیسے مخلص حضرات شریک تھے، اپنی عمر کے آخری دور میں جب علالت نے کافی طول پکڑا تو انتقال سے چند ماہ قبل ان کے اصرار پر بورڈ کو دوسرا صدر منتخب کرنا پڑا۔ اس بات کا سب اعتراف کرتے ہیں کہ مذہبی علوم پر اپنے عبور اور ملک کے حالات سے اپنی گہری واقفیت کی بنا پر وہ مسلم پرسنل لاء کی افادیت اور اس کے تحفظ کی ضرورت کو نہ صرف حکومت کے ذمہ داروں بلکہ خود بعض مسلمانوں کو بھی ذہن نشین کراتے اور بالآخر ان کو اس سلسلہ میں قائل ہونا پڑتا اور مسلم پرسنل لاء کی افادیت کو تسلیم کرنا پڑتا۔ سادہ لیکن پرمغز وجامع الفاظ میں مخالف کو صحیح بات تسلیم کرانے کا ملکہ جس طرح موجودہ دور میں مفتی صاحب کے اندر دیکھا گیا شاید ہی کسی دوسری شخصیت میں

اس طرح یہ موجود ہو۔ بعض مرتبہ مفتی صاحب کے چند الفاظ بڑی بڑی تقریروں پر بھاری ہوتے تھے۔ ان کا یہ نظریہ تھا کہ اس ملک کو مضبوط اور متحد بنانے کے لیے مسلمانوں کے شرعی قوانین کا تحفظ ہونا ضروری ہے۔ اپنے اس نظریہ پر وہ آخر وقت تک قائم رہے۔

جب اس ملک میں فرقہ وارانہ فسادات کی کثرت ہوئی تو یہاں کے ذمّہ دار مسلمان رہنماؤں نے ایک تنظیم مسلم مجلس مشاورت قائم کی مفتی عتیق الرحمٰن صاحبؒ ان چند شخصیتوں میں سے ہیں جنھوں نے اس کے قیام کے لیے انتھک کوششیں کیں۔ دراصل یہ تنظیم مفتی صاحب کی شرکت اور صدارت کی وجہ سے اور زیادہ مستحکم ہوگئی۔ اس تنظیم نے فسادات کے خلاف ملک کی رائے عامہ کو بیدار کرنے میں ان کی وجہ سے پیدا ہونے والی مایوسی کو دور کرنے کے لیے جو اہم کردار انجام دیا وہ مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کی شخصیت کی وجہ سے زیادہ مؤثر ہوگیا۔ ان کا مقصد اس تنظیم کے ذریعہ مسلمانوں کے مسائل کو حل کرنا اور ان کی شکایتوں کا ازالہ تھا اور اس سلسلے میں وہ کافی حد تک کامیاب بھی رہے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بحران میں ہمیشہ انھوں نے حق پسند گروپ کا ساتھ دیا اور کوشش کی کہ یونیورسٹی کی انتظامیہ بغیر کسی مداخلت کے اپنے فرائض ادا کرسکے اور یونیورسٹی کے وقار کو بحال کرسکے۔ اس سلسلے میں دیگر اکابر ملت کے ساتھ مفتی صاحب بار بار علی گڑھ تشریف لے گئے اور وہاں قیام کرکے حالات کو درست کرنے میں کافی معین ومددگار ثابت ہوئے۔

راقم السطور کو مفتی صاحب سے پہلی ملاقات کا شرف علی گڑھ میں زمانۂ طالبعلمی میں ہوا اور آخری ملاقات ۱۲ مئی کو انتقال سے چند گھنٹے قبل تقریباً سوا دس بجے

ہوئی جب کہ مفتی صاحب پر بے ہوشی طاری تھی اور سب کا خیال تھا کہ اب وہ چند گھنٹے کے مہمان ہیں۔ سنہ ۱۹۶۱ء میں جب میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اسٹاف میں شامل ہوا تو مفتی صاحب سے ربط و ضبط میں بہت زیادہ اضافہ ہوگیا اور ہفتہ میں ایک بار عام طور پر مفتی صاحب کے یہاں حاضر ہونا معمول سا بن گیا تھا اگر کسی وجہ سے دیر میں جانا ہوتا تو فوراً سوال ہوتا کہ کہاں تھے اتنے دن کے بعد کیوں آنا ہوا۔ مفتی صاحبؒ نے ہمیشہ احقر کی حقیر چیزوں اور تحریروں کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا اور ہمت افزائی فرمائی۔ یہاں تک کہ ندوۃ المصنفین کا رفیق اعزازی بغیر کسی استحقاق و صلاحیت کے ازراہ شفقت بنایا۔ اس ادارہ سے چھپی ہوئی احقر کی کتاب "اسلام کے فلسفۂ سیاسیات کی بنیادیں" دراصل مفتی صاحب کی ہمت افزائی کے نتیجہ میں ہی وجود میں آئی۔

مفتی صاحب بعض فقہی مسائل میں کافی وسیع النظر تھے چنانچہ ایک مجلس میں تین طلاقوں کے مسئلہ میں وہ کہا کرتے تھے کہ فقہاء کو اس پر دوبارہ غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اپنی علالت کے دوران جب صاحب فراش تھے تو احقر سے کہا کہ اگر میں صحت مند ہوتا تو علماء کا ایک کنونشن منعقد کراتا اور اس مسئلہ پر غور کرنے کی دعوت دیتا کیونکہ ان کے نزدیک یہ مسئلہ اجتہادی ہے اور اجتہادی مسائل میں وہ وقت کے تقاضوں کے تحت دوبارہ غور و فکر کرنے کے متفق تھے۔

مفتی صاحب کی قوت حافظہ قابل رشک تھی۔ فالج کے دورہ کے بعد اس میں کوئی کمی نہیں آئی۔ اس جان لیوا دورے کے تقریباً چھ ماہ بعد ایک مسئلہ فتویٰ کے لیے آیا۔ بستر پر لیٹے لیٹے جب کہ کتاب بھی نہیں دیکھ سکتے تھے مجھ سے فرمایا کہ فتاویٰ عالمگیری کے فلاں باب میں فلاں عنوان کے تحت اس مسئلہ کا جواب درج ہے۔ تم کتاب دیکھ کر تحریر کر لاؤ۔ چنانچہ میں نے جامعہ ملیہ کی لائبریری میں آکر فتاویٰ

عالمگیری سے وہ عبارت نقل کی اور مفتی صاحب کی خدمت میں لے گیا اور پڑھ کر سنایا تو کہا صحیح ہے۔ اس کے بعد مجھ سے باقاعدہ فتویٰ لکھوایا اور اپنے بھانجہ شاداب میاں سے کہا کہ میری طرف سے دستخط کردو۔ اس زمانہ میں مفتی صاحب فالج کے اثر کی وجہ سے ہاتھ سے نہیں لکھ سکتے تھے۔ میں اس یادداشت کو دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ فتاویٰ عالمگیری کی عبارت کے جو عربی الفاظ زبانی بستر علالت پر بتائے تھے اسی طرح وہ کتاب کے اندر موجود تھے۔ مفتی صاحب کے اس حافظہ کے شاہد اور بھی حضرات ہیں۔ بعض حضرات کا خیال یہ ہے کہ فالج کے دورہ کے بعد حافظہ کم ہونے کے بجائے بڑھ گیا تھا۔

علالت کے دوران جب بھی میں مفتی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تو جامعہ ملیہ کے متعلق مستقل سوالات کرتے رہتے اور جاننے والے حضرات کا نام لے لے کر ان کے بارے میں دریافت کرتے۔ اسی طرح دیگر مسائل پر بھی گفتگو کرتے، آخری دور میں بات کے درمیان رقت طاری ہو جاتی۔ ان حالات کے پیش نظر ڈاکٹروں نے ہدایت کی کہ بات چیت کم سے کم کی جائے لیکن حضرت مفتی صاحب کو اپنی بیماری کی فکر نہیں تھی بلکہ دوسروں کے تفکرات زیادہ تھے۔ اس وجہ سے اس کا اہتمام کیا گیا کہ ملاقات کم ہو، لیکن مفتی صاحب پر یہ بھی شاق گزری تھی اور خدام عجیب کشمکش و پیچ میں مبتلا تھے۔

ان تنظیموں کے علاوہ جن کا تذکرہ اوپر کی سطور میں گزر چکا ہے۔ مفتی صاحبؒ مندرجہ ذیل اہم اداروں سے بھی وابستہ تھے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کورٹ کے ممبر اور تھیالوجی فیکلٹی کی کمیٹیوں وغیرہ کے ممبر تھے، فتحپوری ہائر سکنڈری اسکول دہلی کے صدر، مدرسہ حسین بخش دہلی کے صدر رہ چکے تھے اور آخری دور میں ممبر تھے۔ مدرسہ عبدالرب دہلی کے صدر، مسلم کلچرل و ایجوکیشنل سوسائٹی جامعہ نگر نئی دہلی

(جس کے تحت مدرستہ البنات چل رہا ہے) کے صدر تھے، دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے اہم رکن رہ چکے تھے اور ندوۃ العلماء لکھنؤ کی مجلس انتظامیہ کے ممبر تھے۔ ان کے علاوہ لاتعداد ایسے ادارے انجمنیں تنظیمیں تھیں جن سے سرپرستانہ تعلق ان کا تھا۔

انتقال کے وقت مفتی صاحب کے چار صاحبزادے اور ایک صاحبزادی تھیں۔ سب سے بڑے لڑکے مجیب الرحمان صاحب ایتھوپیا میں ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ میں ہیں اس لیے وہ جنازے میں شریک نہیں ہو سکے۔ ان کے بعد منیب الرحمان صاحب ہیں جن کی اُردو بازار میں دوائیوں کی بڑی ایجنسی ہے۔ پھر صاحبزادی کا نمبر آتا ہے جن کا نام مجیبہ صاحبہ ہے ان کے شوہر اظہر صدیقی صاحب آج کل دہلی میں ہی ہیں۔ پہلے وہ دارالعلوم دیوبند میں ملازم تھے، علالت کے دوران مفتی صاحب کی ان نیک صاحبزادی نے جس طرح والد بزرگوار کی خدمت کی ہے وہ مثالی ہے۔ لڑکوں میں تیسرے صاحبزادے عمید الرحمان صاحب ہیں جو ندوۃ المصنفین کے جنرل منیجر ہیں۔ سب سے چھوٹے صاحبزادے نجیب الرحمٰن صاحب گورنمنٹ آف انڈیا کی پیپر کارپوریشن میں ایک آفیسر ہیں، اللہ جل جشانہٗ ان سب حضرات کو اور دیگر پسماندگان کو صبر جمیل عطا کرے اور مفتی صاحب کے درجات عالیہ کو بلند کرے نیز اس خلاء کو پورا کرے جو ان کی وفات سے اس ملک کے مسلمانوں میں ہو گیا ہے۔

EHSANAT KI CHATTAN

احسانات کی چٹان

از: مولانا الحاج عبدالکریم پاریکھ صاحب

حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ سے میرے تعلقات ۱۹۶۶ء سے حضرت کے آخری ایّام تک رہے۔ حضرت مفتی صاحب مرحوم کے بارے میں تو ان کے ہم عصر علماء کرام میں بڑے بڑے لوگوں کے قلم سے جو کچھ لکھا جائے گا وہ تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن ہم جیسے چھوٹے لوگوں نے حضرت مفتی عتیق الرحمٰن صاحبؒ عثمانی سے جو کچھ فیض پایا، تربیت حاصل کی اور حضرت مرحوم سے وہ بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا جو ہم جانتے نہیں تھے۔ اس لیے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے "میرے تعلقات" پر لکھنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا۔

۱۹۶۴ء کا زمانہ غالباً ۱۹۶۴ء کا زمانہ رہا ہوگا۔ جب ڈاکٹر سید محمود صاحب مرحوم (وزیر خارجہ حکومت ہند) سے ہندوستانی مسلمانوں کے الجھے ہوئے معاملات پر میری ان کی خط و کتابت بار بار ہوتی رہی۔ اور ہم دونوں کے خیالات اور سوچنے کا طریقہ یکساں تھا۔ چونکہ ۱۹۶۴ء میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب مدظلہٗ العالی کی پکار پر لکھنؤ میں مسلمانانِ ہند کے مسائل پر ایک مشاورتی اجتماع ہوا۔ اور یہیں سے مشاورت کا قیام عمل میں آیا۔

ملت کے لیے قربانی ڈاکٹر سیّد محمود بہت جہاں دیدہ مدبّر آدمی تھے۔ اسی زمانے میں حضرت مفتی عتیق الرحمان صاحب عثمانی رح سے ان کا خاصہ جوڑ تھا۔ میں یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا کہ کل ہند مجلس مشاورت میں اس کے بانیوں کا جو حصہ رہا ہے اس میں سب سے زیادہ قربانی، ایثار اور سخت حالات میں بڑے صبر کے ساتھ ملّت کی اس کشتی کو طوفان میں چلائے جانا حضرت مفتی صاحب مرحوم کا ہی حصّہ تھا۔

میں جب پہلے پہل ان سے متعارف ہوا پھر سلسلے وار ملاقاتیں اور اسفار اور جلسوں میں ایک ساتھ رہنے کا مجھے الحمدللہ خاصہ موقع ملا۔ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن کی وفات کے بعد ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس خلاء کو اب پر نہیں کیا جا سکتا لیکن اللہ نے اپنی غیبی تائید سے مفتی صاحب رح کو کھڑا کر دیا اور آج جو کچھ آپ ہندوستانی مسلمانوں کی تنظیمیں ان کی اچھی کھلی آوازیں ان کی ملکی، ملّی، سیاسی تنظیمیں دینی و اصلاحی جتنی چھوٹی بڑی تحریکیں دیکھ رہے ہیں ان سب میں حضرت مفتی صاحب مرحوم کے تعاون کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنا مسلم مجلس مشاورت کے کل ہند پیمانے کے دوروں میں مسلمانانِ ہند کی ہمت کو بڑھا دیا اور ان کے ٹوٹے دلوں کو سہارا دے کر جوڑ دیا اس میں کوئی ایک دورہ یا سفر ایسا نہیں ہے جس میں مفتی صاحب رح شامل نہ ہوں۔

مولانا ابواللیث جماعت اسلامی ہند سے لوگ بہت خائف تھے حکومت بھی، عوام بھی، یہ مفتی صاحب مرحوم کا بہت بڑا کارنامہ ہے کہ جماعت کے قائد حضرت مولانا ابواللیث اصلاحی صاحب کو مفتی صاحب نے سامنے لا کر ان کی شخصیت کو متعارف کرایا۔

محمد اسماعیل صاحب مرحوم انڈین یونین مسلم لیگ کے صدر مولانا محمد اسماعیل صاحبؒ اور حال کے صدر جناب ابراہیم سلیمان سیٹھ صاحب کو جنوبی ہند سے نکال کر شمال لے آنے میں حضرت مفتی صاحب مرحوم کا بڑا حصہ ہے۔

پنڈت سندر لال اور یہ کارنامہ بھی حضرت مفتی صاحبؒ کا ایک نشان رہے گا کہ پنڈت سندر لال جیسی شخصیت کو انھوں نے مشاورت کے دوروں میں شامل کرکے یہاں کے اکثریت کے ذہنوں سے مسلم دشمنی کے نقوش مٹانے میں بڑی حد تک کامیابی حاصل کی۔

ڈاکٹر فریدی مرحوم یوپی میں ڈاکٹر فریدی صاحب کی شخصیت ابھری فریدی صاحب کی ملی زندگی میں تربیت کرنے والوں میں خاص ہاتھ مفتی صاحبؒ کا تھا۔ ڈاکٹر فریدی صاحب اور ڈاکٹر سید محمود صاحب میں الیکشن میں حصہ لینے پر شدید اختلافات ہوئے۔ بڑی حد تک ڈاکٹر فریدی صاحب مشاورت کو چھوڑ چھاڑ کر بیٹھنے کی تیاری میں تھے۔ اس زمانے میں حضرت مفتی صاحب نے انھیں سمجھانے منانے کے لیے اس عاجز کو لکھنؤ بھیجا تھا اور میں اس پر اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ مشاورت کی عاملہ کے اجتماع میں ڈاکٹر فریدی صاحب مرحوم کو شریک کرنے میں اور دلّی آنے میں اس عاجز کو اللہ نے کامیاب فرمایا۔

مجھے ناگپور سے کھینچ تان کر آل انڈیا فلسطین کانفرنس میں بلایا اور اسی زمانہ میں جامع مسجد کے سامنے اُردو بازار میں ایک بہت بڑا جلسہ ہوا یہ حضرت مفتی صاحبؒ کا مجھ پر بڑا احسان تھا کہ اس جلسہ میں مجھ سے تقریر کروائی میں چونکہ قرآن مجید کا ایک طالب علم رہا ہوں اور یہ سلسلہ الحمد للہ اب بھی جاری ہے۔

فلسطین کانفرنس یہودی عزائم، ان کی چالبازیوں اور مکاریوں پر قرآن مجید نے جو روشنی ڈالی ہے ان آیات کا متن اور ترجمہ اس عاجز نے آل انڈیا فلسطین

کانفرنس میں پیش کیا۔ الحمد اللہ اس کا خاصہ اثر ہوا اور مفتی صاحب مرحوم کے تقاضے پر ہی میں نے اپنی اس تقریر کے منتشر اجزا کو جوڑ جاڑ کر ایک خاکہ تیار کیا اور "قوم یہود اور ہم قرآن کی روشنی میں" اس نام کی ایک ضخیم کتاب اللہ نے تیار کروادی۔ حضرت مفتی صاحب نے اس کتاب کا مقدمہ تحریر فرمایا اور جب پہلی بار دلّی میں یہ کتاب چھپی تو اپنے ایک خاص رفیق عالمِ دین کو اس کی طباعت پر دیکھ بھال کے لیے مقرر فرمادیا۔

گوشۂ گمنامی کسی بڑے عالم کا کسی چھوٹے سے آدمی کی اتنی ہمّت افزائی کرادینا اور اسے گوشۂ گمنامی سے نکال کر عوامی زندگی میں لے آنا یہ احسان حضرت مفتی صاحب کا صرف مجھ پر ہی نہیں بلکہ اب صفِ اول کے کارکنوں میں جو لوگ بھی دکھائی دیتے ہیں اس میں بیشتر ایسے ہیں جن کی شخصیات کا عروج حضرت مفتی صاحبؒ مرحوم کے احسانات کی چٹان سے شروع ہوا ہے۔ نام گنانے پر شاید زندہ لوگوں کو اپنی شخصیت چھوٹی نظر آئے کوئی ناراض بھی ہو سکتا ہے لیکن یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا کہ دینی اور ملّی کارکنوں اور ہم سبھوں پر چاہے وہ جس جماعت اور مسلک سے تعلّق رکھتے ہوں مفتی صاحب کی دست گیری نے ہی اللہ کے فضل سے سب کو سہارا دیا اور ایسے حالات میں کاموں پر لگنے پر آمادہ کیا جب کہ طبیعتیں اچاٹ ہو گئی تھیں اور دل مایوس تھے۔

قرآن مجید میں دل کا سوز چاہے کوئی سفر، جلسہ یا کیسی ہی مصروفیت ہو حضرت مولانا مفتی صاحبؒ جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو عشقِ الٰہی میں ڈوب کر نماز پڑھتے اور خاص طور سے اِھْدِنَا الصِّرَاطَ کے جملے پر اللہ کے سامنے ان کا جو لہجہ سوز اور دل کا ساز ہوتا وہ آج نقل کر کے کسی کو سنا دینا ممکن نہیں ممکن نہیں معلوم ہوتا۔

مدتوں یاد کریں گے دہلی سے بمبئی، حیدر آباد، کلکتہ، بھوپال اور پورے ملک کے

بڑے بڑے شہروں کے مسلمان مدتوں یاد کریں گے کہ ممتاز عالم دین ایک مفتی ایک مفکر جو بار بار ان کے یہاں دوڑ دوڑ کر آتا تھا اب اس دنیا میں نہیں رہا۔

کل ہند مسلم پرسنل لا، بورڈ | بمبئی میں کل ہند پیمانے پر بورڈ کے قیام میں مختلف مسلک کے علماء کو جوڑ لینا اور روٹھے ہوؤں کو منا کر ایک ساتھ بٹھا کر بورڈ تشکیل کرا لینا اس کام میں حضرت مفتی صاحبؒ کی قیادت نے خاصہ اثر ڈالا الگ الگ کام کرنے والی کئی جماعتوں کو اور مختلف مکاتب فکر میں بٹی ہوئی شخصیات کا ملا جلا بورڈ بنا لینا یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ بے شک ہمارے تمام موجودہ اکابرینِ ملت کا اس میں بہت بڑا تعاون رہا لیکن ہم میں سے ہر ایک کو یہ شہادت دینے کے لیے مجبور ہونا پڑے گا کہ حضرت مفتی صاحب کی دل سوزی، صبر، استقلال، قوتِ گویائی اور طرزِ استدلال نے بورڈ کی تشکیل میں بڑا زبردست رول ادا کیا۔

اندرا گاندھی | اندرا گاندھی کی سیاسی پکڑ سے بہت سے لوگ واقف ہیں ان پر اپنی شخصیت کا دباؤ ڈالنے کے لیے اس زمانے میں ڈاکٹر سید محمود صاحب ہی وہ آدمی تھے جن کا نہرو خاندان پر خاصا اثر تھا یہ مفتی صاحب کی سیاسی اور ملی بصیرت تھی کہ ڈاکٹر سید محمود صاحب کو کھینچ کر مسلم مجلس مشاورت کی صدارت کی کرسی پر بٹھا دیا اور الحمد اللہ مسلم مجلس مشاورت کے لیے ڈاکٹر سید محمود صاحب اور خود مفتی صاحب کی شخصیت نے اس وقت کی پرائم منسٹر اندرا گاندھی کو ہندوستانی مسلمانوں کے لیے وہ بہت سے فیصلے کرنے پر مجبور کر دیا جو شخصی اور ملی دباؤ کے بغیر نہیں کرائے جا سکتے تھے۔

اس سلسلے میں مشاورت کے چھ نکاتی پروگرام کو اندرا جی کے ہاتھ میں تھما دینا اور یہ کہہ دینا کہ مسلمان اب لوٹ کا مال نہیں ہے کہ جو چاہے اسے بیچ لے خرید لے۔ اندرا جی سے ایسی دو ٹوک بات کہہ دینا حضرت مفتی صاحب ہی کا کارنامہ ہے۔

نئی نسل کو اسٹیج پر لے آنا | حضرت مفتی صاحبؒ نے مسلم نوجوانوں میں یہ حوصلہ

پیدا کیا کہ وہ حالات کے دھارے کو بدلنے کے لیے سامنے آئیں اور آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت کے پلیٹ فارم پر نوجوانوں کو ملّتِ اسلامی فی الہند کی خدمت کے لیے موقع دیا، دہلی، حیدرآباد اور بنگلور کے کل ہند اجتماعات میں نوجوانوں کو اگلی صف میں کھڑا کر دیا یہ منظر ۱۹۴۷ء کے بعد مفتی صاحب کی قیادت میں پہلی بار دیکھنے میں آیا۔

علماء کرام، صحافی اور اہل قلم کو اکٹھا کیا مسلم صحافیوں کو اور اہل قلم کو اور علماء کو ۱۹۶۴ء کے بعد حرکت میں لے آنا اس کے لیے مسلسل کوششیں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ العالی کی بڑے پیمانے پر ہوتی رہی اس میں خاص الخاص تعاون حضرت مولانا مفتی صاحب کا رہا اور الحمد للہ اس مقصد میں ملت کامیاب ہو کر اپنی منزل کے خاص چوراہے پر آ گئی۔

محمد مسلم صاحب (مرحوم) ایڈیٹر دعوت، مولانا سعید احمد اکبرآبادی صاحب، سید حامد صاحب، ملّا جان محمد (مرحوم)، قاری محمد طیّب صاحبؒ، مولانا منت اللہ رحمانی صاحب، مولانا مجاہد الاسلام قاسمی صاحب، بنات والا صاحب، ابراہیم سلیمان سیٹھ صاحب، ذوالفقار اللہ صاحب، شیخ عبداللہ صاحب (کشمیر)، میر قاسم اور میر واعظ مولانا فاروق صاحب، فخرالدین علی احمد (مرحوم) (سابق صدر جمہوریہ ہند) بدرالدین طیّب جی، ڈاکٹر فریدی اور دوسری سینکڑوں دینی و ملّی شخصیتوں کو اکٹھا کر دینے میں مفتی صاحب مرحوم کی ترکیب اور حکمت عملی اللہ کے فضل سے وہ کام کر جاتی جس کا اندازہ پہلے سے کر لینا بہت مشکل تھا۔

دینی مدارس میں مفتی صاحب کا رول ندوۃ العلماء، دیوبند، ندوۃ المصنفین، دارالمصنفین اور جنوبی ہند کے بیشتر اداروں سے متعلق رہے۔ ہر جگہ سلامتِ فکر، اصابت رائے، معاملہ فہمی، سنجیدگی اور علمی تبحّر لیے ہوئے مفتی صاحب کی شخصیت

چھائی رہتی ہے۔ چھوٹوں پر شفقت، بڑے موجود نہ ہوں تو چھوٹوں کو بڑا مان کر اکرام کر کے یہ کسر بھی پوری کر دیتے کہیں اگر الجھن پیدا ہو جائے اور مفتی صاحب موجود ہوں تو سمجھ لیجئے کہ سو فی صد انشاء اللہ مسئلہ حل ہو کر رہے گا۔ کسی کی ضد پر ضد کا اظہار نہ فرماتے۔ بلکہ ایسا طریقہ اختیار فرماتے کہ صحیح رخ سے ہٹ کر سوچنے والے بھی آخر وہی بات کہتے جو مفتی صاحب ان سے کہلوانا چاہتے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی | ۱۹۴۷ء کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جن حالات سے گذری اس کا احساس ہر علم دوست کو ہے۔ مفتی صاحبؒ کی شخصیت نے ہر موقع پر الجھتے ہوئے حالات میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مسئلے پر کام کرنے والوں کی رہنمائی فرمائی۔

فسادات کے موقع پر دورے | ہندوستانی مسلمان پر سب سے بڑی مصیبت جو تقسیم کے وقت آپڑی تھی وہ فسادات کا نہ ٹوٹنے والا تسلسل تھا حضرت مفتی صاحب مرحوم ایک طرف حکومت کے ذمّے داروں کے کان پر بات ڈالتے اور ان کی بھاری بھرکم شخصیت حکام کو مجبور کرتی کہ وہ پولیس اور فوج کے ذریعہ فساد زدہ علاقوں میں امن قائم کرے۔

دوسری جانب مفتی صاحب بذاتِ خود فساد زدہ علاقوں میں تشریف لے جاتے اور مسلمانوں کو ہمّت دلاتے۔ بھورے رنگ کی شیروانی اور اونچی دلیوار کی رعب دار سیاہ ٹوپی، عمر کی ڈھلوان کا اثر ساتھ میں جھرّیوں سے بھرا ہوا مبارک چہرہ لیے ہوئے یہ ممتاز عالم دین خطرے کے موقع پر بھی نکل آتے۔ مرادآباد کے فسادات کے وقت اندرا گاندھی سے حضرت مفتی صاحب مرحوم نے جس گھن گرج والی آواز سے گفتگو فرمائی وہ انھیں کا حصّہ تھا۔

۱۹۶۸ء میں ناگپور آمد | ۱۹۶۸ء میں ناگپور کے فسادات کے وقت حضرت مفتی صاحب تنہا تشریف لے آئے، حالات کا جائزہ لیا مجھ سے ملاقات کی

اور واپس دلّی تشریف لے گئے اور وہاں سے ملّا جان محمد مرحوم کی قیادت میں ایک وفد ناگپور بھیجا۔ ملّا جان محمد صاحب غالباً پندرہ بیس دن یہاں رہے اور ریلیف کا کام انجام دیا۔ یہ سب ترکیب اور ترتیب مفتی صاحب کی قائم کی ہوئی تھیں۔

کام کے صحیح رخ کے لیے ہر جگہ ایک لائن بناتے اور اس میں موزوں آدمیوں کا انتخاب کر کے انھیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر موقعۂ واردات پر بھیجتے۔ بہت کم عالم دین ایسے ہوں گے جن کے اندر یہ صلاحیت ہو۔ ایک طرف وہ علمی مسندوں سے خطاب کریں اور دوسری جانب خدمت خلق کے لیے عام کارکنوں کی طرح چلت پھرت حصّہ لیں۔

شخصیت کا رعب ایک متین اور سنجیدہ عالم تو تھے ہی لیکن موجودہ زمانے کے بعض سیاسی لیڈروں کے شخصی رعب کے مقابلے میں حضرت مفتی صاحبؒ کو ایمان، روحانیت، علم، خدمت خلق اور ملّت کے درد نے مل کر موصوف کی شخصیت کا رعب کچھ عجیب ہی بنا دیا تھا۔ کسی بھی اسٹیج (Stage) پر ان کی وجاہت، بیٹھنے کا طریقہ، لباس طرزِ گفتگو، عمیق فکر کے چہرۂ مبارک پر گہرے نقوش یہ سب نمایاں ہو جاتے اور کوئی شخص گردیدہ ہوئے بغیر نہ رہتا۔ پیچھے چاہے کچھ کہتے ہوں لیکن سامنے بولنے کی ہمت کسی کی نہ ہوتی۔

مضرابِ عجم سے دینِ عرب کا ساز جب بولتے اور بات کرتے یا تقریر فرماتے یا کسی مباحثے میں حصہ لیتے تو معلوم ہوتا تھا کہ یہ شخص بولتا مضرابِ عجم سے ہے لیکن سناتا دینِ عرب کی۔ سننے والوں کو محسوس نہ ہونے دیتے کہ مفتی صاحب ان پر تنقید کر رہے یا ان کی رائے بدلنے کی کوشش کر رہے ہیں بلکہ مفتی صاحب جب بات پوری طرح کہہ لیتے تو سننے والے حضرات کے دلوں میں حضرت کا احساس اپنا گھر بنا لیتا۔

بسترِ علالت، عمر کے وزن سے نڈھال چہرہ بدن کا ریشہ ریشہ فکروں سے مضمحل

رشتے ناطے والوں کی دیکھ بھال ان کی غربت کا خیال، اپنے اہل و عیال کی فکر۔ صبح سے شام تک کئی سو آدمیوں سے ملنا، دلی میں بھی آتے تو چین نہیں۔ اپنے رعب دار بنگلے میں ان کی شخصیت آنکھوں میں ایسی سما جاتی کہ بیماری کے ایام میں بھی ان کے چہرے کی رونق اور دبدبہ میں فرق نہیں آیا لیکن اہلیہ صاحبہ کی طویل بیماری کی وجہ سے حضرت مفتی صاحب سخت الجھن اور پریشانی میں مبتلا رہے۔ اس کے بعد حضرت کی طبیعت دن بدن گرتی گئی یہاں تک کہ بستر سے لگ گئے۔

ہم لوگ بھی دلی میں ہوتے تو زیارت کر آتے۔ فالج کے سخت حملے نے جسم کو ہلنے جلنے سے بھی معذور کر دیا تھا۔ لیکن میں نے دیکھا کہ چہرہ اپنی جگہ ویسا ہی ہے جیسا پہلے تھا۔ آنکھیں، دل اور دماغ برابر کام کرتے رہے جسم کا باقی حصہ شاید حضرت مفتی صاحب کے وصال سے پہلے ہی دنیا چھوڑ چکا تھا مگر ایسے وقت بھی ہم لوگوں کی حاضری ہوتی تو ایک ایک کو دیکھ کر پہچانتے دماغ پر زور دے کر نام لے کر خیریت تک پوچھتے حالات دریافت کرتے۔ ایک مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ ایک ضروری امور میں ہم لوگ مشورہ کے لیے محض برکت کی خاطر ان کے بستر کے آس پاس جمع ہوئے۔ تو فرمایا کہ کرسی لگائی جائے میں بھی بیٹھوں گا۔ اور ہم نے دیکھا کہ خدام سے ٹوپی، شیروانی طلب کی اور ایک مرتبہ پھر وہی جلوہ دکھایا جو ہر جلسے میں ہم دیکھ چکے تھے بس یہی آخری دیدار تھا۔

اب انشاء اللہ العزیز امید ہے کہ آخرت میں ان کا مقام صدیقین، صالحین، اور شہداء علی الناس میں ہوگا۔ اللّٰھم اغفر لہ، وتغمدہ برضوانک۔

پیکرِ علم و بصیرت
حضرت مفتی صاحب

حکیم سید محمد الیاس کٹھوری میرٹھ

حضرت مفکر ملتؒ کی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں۔ ہندستان و بیرون ملک کا علمی طبقہ مفتی صاحب کی شخصیت سے بخوبی واقف ہے۔ مفتی صاحب نے ندوۃ المصنفین کے قیام کے بعد جو علمی خدمات انجام دی ہیں جس کے فیوض و برکات سے ہزار ہا افراد مستفیض ہوئے ہیں، مفتی صاحبؒ علمی میدان میں ہی نہیں بلکہ سیاسی میدان میں بھی بہت کچھ خدمات انجام دیں ہیں جس کو تاریخ کبھی فراموش نہ کرسکے گی۔ غالبًا ایسی ہی نادر روزگار شخصیات کے سلسلہ میں کسی شاعر نے کہا ہے ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

مفتی صاحبؒ کی شخصیت مختلف پہلوؤں سے قابلِ توجہ ہے۔ انھوں نے زندگی کے بہت سے میدانوں میں نمایاں کارنامے انجام دیئے لیکن یہ بھی ایک حقیقت رہی ہے کہ موصوف کی شخصیت کا سیاسی پہلو تا دمِ آخر نمایاں رہا یہ تاریخ کے تقاضوں اور ہندوستان کے مسلمانوں کے حالات کی مجبوری اور حضرت مفتی صاحبؒ کا جذبۂ خدمتِ ملت و وطن ہی تھا جس نے اس سنگلاخ میدان میں

انھیں رد کے رکھا۔

مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی کی شخصیت کو اگر چند لفظوں میں نمایاں کرنے کی کوشش کی جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ موصوف ایک بیدار مغز مدبر، مفکر اور دانشور ہونے کے ساتھ ہی ساتھ اعلیٰ فقیہ، متبحر عالم اور بہترین منتظم ہونے کے ساتھ ہی مخلص و فعال سیاسی رہنما بھی تھے۔ جمعیۃ العلماء کی ذمہ دارانہ انتظامی امور کی انجام دہی میں جس طریقہ پر حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ اور مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ کے ہاتھ بٹانے میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ وہاں جمعیۃ العلماء ہند کے تاریخ ساز فیصلوں میں اپنی قیمتی آرا سے مستفید فرما کر سیاسی بصیرت و بصارت کا ثبوت دیتے رہے ہیں۔ مستقبل کی کوکھ سے اٹھنے والے ہنگاموں کو پرکھ کر عوامی قیادت کے نظریات کے خلاف ملت کی بقاء اور تشخص کو برقرار رکھنے نیز قومی و ملی مفاد کی حفاظت اور حقوق کا تحفظ کرنے کے لئے بروقت اقدام اور بروقت فیصلے کرنا بڑے نازک مراحل ہوتے ہیں جبکہ ملت کے سوادِ اعظم کا اعتماد بھی مجروح نہ ہو پائے۔ حضرت مفتی صاحبؒ کو ایسے فیصلے بھی کرنے پڑے۔

قیامِ مسلم مجلسِ مشاورت اور تاسیس مسلم پرسنل لاء بورڈ اور ان کے باصلاحیت افرادِ کار کا ملک کے کونے کونے سے نکال کر لے آنا اور آج اس کی افادیت کا چاروں طرف تسلیم کیا جانا مفتی صاحبؒ کے دانشورانہ تدبر اور سیاسی ژرف نگاہی کا بین ثبوت ہے۔ ابھی اس نسل کے لوگ الحمد للہ ہمارے درمیان موجود ہیں جو ان اہم تاریخ ساز فیصلوں کے پس منظر اور پیش منظر سے نہ صرف بخوبی واقف ہیں بلکہ جنھوں نے مفتی صاحب کے شانہ بشانہ ساتھ رہ کر ان قومی امور کی انجام دہی میں ان کا ہاتھ بٹایا ہے۔

حضرت مفتی صاحبؒ کی شخصیت میں شیخ الہندؒ کی دور بینی اور رازداری، حضرت نانوتویؒ کی بصیرت اور قوتِ عمل، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کا طرز تکلم، حضرت مدنیؒ کی تواضع وحسنِ اخلاق، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ کا تفقہ، حضرت مفتی اعظم مولانا کفایت اللہؒ کا حسن تدبر، اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانیؒ کا انتظام یکجا جمع ہو کر ایک ایسی مرکب شکل اختیار کر گئے تھے کہ موصوف سے وقت ملاقات سبھی اکابر کی یاد تازہ ہو جایا کرتی تھی۔

حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمن صاحب عثمانی صرف سیاسی ہی میدان میں ہمیں آگے نظر نہیں آتے بلکہ علمی میدان میں بھی ان کا صرف ایک کارنامہ اتنا بلند اور تاریخی اعتبار سے یادگار رہے گا کہ موصوف نے دینی فکر اور امتیاز کو اعلیٰ اعلیٰ منازل تک پہونچانے کے لئے ایک ایسے ادارہ کی بنیاد ڈالی جس کی کتابوں سے نسلاً بعد نسل ملت کے علماء وطلباء فیضیاب ہوتے رہیں گے اور یہ ادارہ تاریخ علم وادب میں ندوۃ المصنفین کے نام سے ہمیشہ بلند مقام کا حامل رہیگا جس کے ذریعہ وقت کے دتقاضوں کے مطابق مختلف تراجم اور تالیفات زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر قوم وملت کے کار آمد ثابت ہوتی رہیں گی۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ حضرت مفتی صاحب کے دامنِ فیض سے ملک کی بہت سی آج کی نمایاں شخصیات وابستہ ہو کر آسمانِ شہرت کو چھو رہی ہیں۔

مسلم پرسنل لاء جیسے نازک مسئلہ پر امت مسلمہ کو متحد الخیال بنانے کی جب بات آئی تو مفتی صاحبؒ حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کے ساتھ تعاون کرتے ہوئے آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے قیام میں انتہائی خلوص اور محنت ولگن کے ساتھ کام کیا جس کے نتیجہ میں آج وہ آواز جو دارالعلوم دیوبند سے نکلی تھی مسلمانوں کی اجتماعیت کا نشان اور اتحاد کی علامت

بن چکی ہے اور انشاء اللہ ملک میں اپنے تاریخی کردار کو پورا کریگی۔

میرٹھ سے حضرت مفتی صاحبؒ کا خصوصی تعلق

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا میرٹھ سے ہمیشہ خصوصی تعلق رہا ہے۔ ہندوستان کی مشہور و معروف شخصیت حضرت مولانا حکیم محمد اسحاق حذب کٹھوریؒ خلیفہ حضرت گنگوہی قدس سرہ و رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند کی خدمت میں ہمیشہ ہی تشریف لاتے رہتے تھے اور مفتی صاحب مرحوم کو ایک والہانہ تعلق رہا ہے بلکہ یہ ایک معمول سا بن گیا تھا کہ جب کبھی مجلس شوریٰ دارالعلوم کی میٹنگ ہوتی تو حضرت علامہ مفتی کفایت اللہ صاحب مرحوم، حضرت مولانا احمد سعید صاحبؒ، حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ، حضرت مولانا محمد میاں صاحب اور حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحبؒ دہلی سے بذریعہ کار روانہ ہو کر میرٹھ حضرت حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دولتکدہ پر تشریف لاتے اور حکیم صاحب کو اپنے ساتھ لے کر دیوبند تشریف لے جاتے تھے۔ واپسی میں بھی یہی معمول رہتا حضرت حکیم صاحبؒ کے وصال کے بعد آپ کے خصوصی شاگرد رشید جناب مولانا حکیم محمد اسلام مہتمم مدرسہ نور الاسلام شہر میرٹھ کے ساتھ حضرت مفتی صاحب کا ایک گہرا تعلق رہا حتی کہ مدرسہ نور الاسلام میں ختم بخاری تشریف بھی حضرت مفتی صاحب ہی بالالتزام رہے جبکہ اختتام بخاری شریف کو حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی زندگی کا جزلاینفک بنا لیا تھا۔ اللہ تعالیٰ ان بزرگوں کو اپنی بے حساب بخششوں سے نوازے اور علم دین کی ان کھیتیوں کو سرسبز و شاداب رکھے جن کی سیرابی ان اسلاف کے ہاتھوں ہوئی۔

حضرت مفتی صاحبؒ کے ساتھ ایک سفر

یوں تو بارہا حضرت مفتی صاحبؒ کے ساتھ ملک کے مختلف حصّوں کے طویل سفر کرنیکا اتفاق ہوا۔ زیر نظر مضمون میں صرف ایک سفر کے تذکرہ پر اکتفا کر رہا ہوں۔

عام طور پر لوگ یہی جانتے تھے کہ حضرت مفتی صاحبؒ علمی زندگی رکھتے ہیں۔ ہندوستان کے علماء اور پڑھے لکھے طبقہ میں ایک تعلق ہے لیکن پبلک زندگی کا حضرت مفتی صاحبؒ سے کیا تعلق۔ برادرم مولانا مسعود احمد صاحب صدیقی نے اجین جمعیۃ علماء کانفرنس کی صدارت کے لئے حضرت مفتی صاحب اور دیگر احباب کو دعوت شرکت دی۔

احقر بھی انھیں احباب میں شریک تھا اور مفتی صاحب کے رفیق سفر۔ ذہن میں بالکل یہ بات نہ تھی کہ کوئی استقبال وغیرہ ہوگا۔ اجین پہونچنے پر ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ بے پناہ لوگوں کا ہجوم حضرت مفتی صاحب کے انتظار میں پہلے ہی سے کھڑا ہوا ہے۔ مفتی صاحب کے پہونچتے ہی اجین شہر فلک شگاف نعروں سے گونج رہا تھا۔ پھولوں اور ہاروں کی بارش مفتی صاحب پر شروع ہوئی ایک کھلی ہوئی کار سجی ہوئی کھڑی تھی جس پر گاؤ تکیے، قالین لگے ہوئے تھے اسی پر بیٹھنے کا انتظام کیا گیا تھا گویا کہ شہر میں جلوس نکالنے کا پروگرام طے ہوچکا تھا۔ حضرت مفتی صاحب کو کار میں بٹھایا گیا۔ مولانا سید انیس الحسن جنرل مینجر اخبار الجمعیۃ سے فرمایا کہ میرے ساتھ گاڑی میں آجاؤ اس کے بعد یہی حکم میرے لئے کیا۔ چنانچہ حسب الحکم دائیں جانب مولانا انیس اور بائیں جانب یہ راقم تھا اور حضرت مفتی صاحب درمیان میں جلوہ افروز تھے

مفتی صاحب کی نشستگاہ کو اتنا اونچا بنادیا گیا تھا کہ ہر شخص بآسانی حضرت مفتی صاحب کو دیکھ سکے. گاڑی کے آگے مدعوین اور شہر کے معززین تھے سڑکوں پر پاؤں رکھنے کی جگہ نہ تھی مکانوں کی چھتوں پر مردوں، عورتوں اور بچوں کا ہجوم دکھائی دیتا تھا. پورے شہر میں نعروں کی آواز سنائی دے رہی تھی. ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے کسی پرائم منسٹر کا استقبال ہو. عجب چہل پہل تھی. جمعیۃ العلماء اجین کانفرنس جس شان وشوکت سے ہوئی وہ اپنی مثال آپ ہے.

دارالعلوم دیوبند کا قضیہ

حضرت مفتی صاحبؒ کے زمانہ علالت میں جبکہ ضعف کی انتہا ہو چکی تھی دارالعلوم دیوبند پر مخالفانہ قبضہ ہونے کا مرحوم کو جو صدمہ ہوا وہ یقیناً ناقابل برداشت تھا. اس کا اور بھی غم تھا کہ اپنوں کے ہاتھوں یہ سب کچھ ہوا. ظاہر ہے کہ یہ کچے لالچ کے مارے ہوتے تھے کہ عاقبت کی فکر سے بے پرواہ ہو کر دارالعلوم جیسے روحانی ادارہ کو اپنی طمع کا نشانہ بنایا. دیکھئے قدرت کے یہاں ایسے لوگوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جاتا ہے. دارالعلوم کے اس واقعہ کا یہ اثر ضرور ہوا کہ عوام کی نگاہ میں جو علماء کا وقار تھا وہ ختم ہو گیا اور آج مدارس دینیہ کے چندہ کرنے والوں کو عوام گری ہوئی نگاہ سے دیکھتے ہیں. اس پورے ملک میں علماء کی، علم دین اور مدارس کے خدمتگاروں کی اور ان نیک مساعی سے دلچسپی لینے والوں کی افسوسناک حد تک رسوائی اور دل شکنی ہوئی. والی اللہ المشتکیٰ.

****

مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کی شخصیت

ظہیر النبی لکھنؤ

۱۹۴۵ء کے اگست یا ستمبر میں مجھے دہلی جانے کا اتفاق ہوا۔ میں بی۔اے پاس کر چکا تھا اور کچھ کاروبار کرنا چاہتا تھا۔ مولانا سمیع اللہ قاسمی صاحب مرحوم نے از راہ شفقت کتابوں کی طباعت، اشاعت اور تجارت کی تجویز کی اور کام شروع کرنے کے خیال سے ایک کتاب کی اشاعت میں شرکت کا موقعہ دیا۔ لیکن اسی اثناء میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے یاد فرمایا۔ حاضر ہوا تو مولانا نے آنے والے الیکشن کے سلسلے میں نیشنلسٹ مسلم پالیمنٹری بورڈ کی تشکیل کا تذکرہ کیا۔ مولانا اس کے جنرل سکرٹری منتخب ہوئے تھے اور ان کی خواہش تھی کہ میں ان کے پرائیویٹ سکریٹری یا بورڈ کے آفس سکریٹری کی حیثیت سے کام کروں۔ غرض میں کاروبار چھوڑ کر مولانا کے ساتھ منسلک ہو گیا اور بورڈ کے دفتر میں کام کرنے لگا جو جمعیۃ العلمائے ہند کے صدر دفتر واقعہ گلی قاسم جان میں ہی تھا۔

مفتی عتیق الرحمٰن صاحب سے وہیں نیاز حاصل ہوا۔ دوسرے بزرگوں سے بھی فیض صحبت حاصل رہا جو اپنے اپنے میدانِ علم و عمل میں یگانۂ روزگار تھے۔ حضرت مفتی صاحب کی نرم مگر واضح اور صاف گفتگو، سادہ مگر پر وقار انداز نے مجھے بہت متاثر کیا خاص طور پر اس لئے بھی کہ میرے والد صاحب اور دادا صاحب کے

تعلق سے مفتی صاحب مجھ پر خاص عنایت اور توجہ فرماتے تھے۔

سیاسی محاذ آرائی اس زمانہ میں عروج پر تھی اور آخر سال میں تو الیکشن کی ہنگامہ آرائی نے اپنوں کو بیگانہ کر دیا تھا۔ جمعیۃ العلماء اور نیشنلسٹ مسلم پارلیمنٹری بورڈ کے کارکن اکثر اس بات سے ہراساں ہوتے تھے کہ اشتعال انگیزی کا آسان حربہ فرقہ پرست استعمال کرتے ہیں اور وہ ہر حال میں ان کے لئے مفید ہوتا ہے چاہے وہ اس موقعہ پر اکثریت میں ہوں یا اقلیت میں، ان کا مقصد امن خراب کرنا ہوتا ہے اور وہ بہرصورت پورا ہو جاتا ہے چاہے ان کو مار ہی پڑے۔ اس کے برخلاف اشتعال انگیزی کے مقابلہ میں امن اور سلامتی کی کوشش کرنے والوں کا کام مشکل ہوتا ہے اور غیر مقبول ہو جاتے ہیں۔ باہر اپنے جذبات پر قابو رکھ کر امن قائم رکھنے والے رضا کار جب دفتر میں اپنوں کے درمیان ہوتے تو اپنے مجروح جذبات کا اظہار کرتے۔ ایسے موقعوں پر حضرت مفتی صاحب اپنی نرم و شیریں گفتگو سے ان کے زخموں پر مرہم رکھتے تھے۔ ان کی ہمت افزائی کرتے تھے اور نیا حوصلہ ان لوگوں میں پیدا کرتے تھے۔ مرکزی اسمبلی کے الیکشن کے بعد پارلیمنٹری بورڈ کا کام ختم ہوا اور میں دہلی چھوڑ کر الہ آباد یونیورسٹی میں ایل ایل بی کرنے چلا گیا۔

پھر ۱۹۵۴ء میں ملازمت کے سلسلے میں دہلی گیا اور کئی برس تک وہاں رہا۔ ۱۹۴۷ء میں ملک کی آزادی کے ساتھ فرقہ وارانہ فسادات نے دہلی کا نقشہ ہی بدل دیا تھا۔ مفتی صاحب کا قرول باغ کا مکان اور برہانؔ اور ندوۃ المصنفین کا دفتر بھی ان ہنگاموں کی نذر ہو گیا تھا اور مفتی صاحب جامع مسجد کے علاقہ میں منتقل ہو گئے تھے۔ روزانہ شام کو دفتر جمعیۃ العلماء ہند میں تشریف لاتے تھے اور وہاں پر مولانا حفظ الرحمٰن صاحب اور مولانا محمد میاں صاحب بالعموم اور دوسرے اکابر جو دہلی میں موجود ہوتے اس مجلس میں شریک ہوتے تھے۔ قومی اور ملی معاملات پر غور و فکر اور اہم فیصلے ہوتے

تھے نیز ان اکابر کی صحبت سے حاضرینِ مجلس اس طرح بھی فیضیاب ہوتے تھے کہ بہت سے دینی مسائل پر گفتگو ہوتی تھی اور اس کے علاوہ پند و نصیحت کے بغیر ان حضرات کا طرزِ عمل اور زندگی کی مثال اپنی جگہ پر درس کا کام کرتے تھے اور دلوں پر گہرا اثر کرتے چلے جاتے تھے۔

برہان کا دفتر اور مفتی صاحب کی لائبریری اور مردانہ نشست گاہ ایک ہی تھے۔ مفتی صاحب صبح کی نماز کے بعد ناشتہ سے فارغ ہو کر نشست گاہ کے برآمدہ میں آکر بیٹھ جاتے تھے اور کام میں مصروف ہو جاتے تھے۔ اردو اور انگریزی کے روزانہ اخبار وہاں ہوتے تھے۔ ان کے مطالعہ کے بعد مفتی صاحب خطوط اور مضمون لکھنے کے کام میں مصروف ہو جاتے۔ اسی دوران میں لوگ ملنے کے لئے آتے رہتے تھے جو اپنے طرح طرح کے مسائل لے کر آتے تھے۔ مجھے اکثر حاضری کا اتفاق ہوا مفتی صاحب بہت توجہ سے ان لوگوں کی بات سنتے تھے اور ہر ممکن مدد کرتے تھے۔

سیاسی اور سماجی حلقوں میں کام کرنے والے سب ہی لوگ اور خصوصاً رہنما تو لوگوں کے مسائل حل کرنے اور ان کی خدمت کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ مفتی صاحب کی امتیازی شان یہ تھی کہ سائل کی بات کو توجہ اور صبر و تحمل کے ساتھ سن کر اس کے مسئلہ کی صحیح نوعیت کو آسان اور واضح الفاظ میں دوہرا دیتے تھے جس سے سائل کو راحت ملتی تھی اور اسے یہ محسوس ہونے لگتا تھا کہ اس کی مشکل کا حل مل ہی جائے گا۔ مفتی صاحب کی ہر دلعزیزی اور مقبولِ عام ہونے کی بڑی وجہ یہی تھی ان کا حلم، تواضع اور یہ انداز ہمدردی جس کا میں نے ذکر کیا۔

۱۹۶۲ء میں میرا تبادلہ دہلی سے آسام کا ہوگیا اور اس کے بعد کئی صوبوں میں اور یوپی کے کئی ضلعوں میں رہا۔ وقتاً فوقتاً دہلی جانا ہوا۔ مفتی صاحب کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتا۔ مفتی صاحب فرماتے کہ دہلی آؤں تو اُن کے ہاں

قیام کروں، چنانچہ کبھی کبھی مفتی صاحب کے ہاں قیام کرتا۔ کبھی بھائی منیب الرحمٰن صاحب کے کمرہ میں اور کبھی مہمان خانہ اور برآمدہ میں، مفتی صاحب ناشتہ اور کھانے کے لئے بہت اہتمام کرتے تھے اور بہت تواضع کرتے تھے۔

مفتی صاحب کی آخری علالت کافی طویل ہوگئی، اس دوران کئی مرتبہ میرا دہلی جانا ہوا اور مفتی صاحب کی عیادت کے لئے حاضر ہوا۔ مفتی صاحب اپنی بیماری اور تکلیف کا تذکرہ مختصر کرکے میری اور میرے بیوی بچوں کی خیریت دریافت کرتے تھے اور یاد کر کرکے ہر ایک بچے کے متعلق دریافت کرتے تھے کہ وہ کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے۔ خیریت سن کر خوشی کا اظہار کرتے تھے۔ دیگر عزیز و اقارب اور احباب کو یاد کرکے ان کی خیریت پوچھتے تھے۔ غرض یہ احساس نہیں ہونے دیتے تھے کہ بیماری کا خیال ان پر غالب ہے۔

کئی سال پہلے میں نے یہ خواہش کی تھی کہ ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد کچھ تصنیف و تالیف کے کام میں لگوں۔ اس کے لئے بہت وسیع مطالعہ اور مشق کی ضرورت ہے جو ملازمت کے دوران میں کماحقہٗ نہیں کر سکا، اس لئے ابتدا میں میں نے چاہا کہ اردو سے انگریزی یا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنے کا کام کروں۔ مفتی صاحب کو بیماری کے زمانہ میں بھی یہ بات یاد رہی اور ایک مرتبہ جب میں حاضر ہوا تو از خود فرمایا کہ مولوی ظفیر الدین صاحب کی کتاب "اسلام کا نظام مساجد" کا ترجمہ شروع کردوں۔ بھائی عمید صاحب نے بتایا کہ مفتی صاحب نے میری غیر حاضری میں ہی ان سے کہدیا تھا کہ یہ کتاب نکال رکھیں اور جب میں آؤں تو ترجمہ کے لئے دیدیں اور اس کے بعد مولوی ظفیر الدین صاحب کی ہی دوسری کتاب "اسلام کا نظام عفت و عصمت" کا ترجمہ کرائیں۔

مفتی صاحب اپنی مذہبی، سیاسی اور سماجی مصروفیتوں کے باوجود ندوۃ المصنفین

اور برہان کی اشاعت کے تعمیری کام میں مشغول رہتے تھے۔ مکتبہ کی مطبوعات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کتنا بڑا کام کیا۔ مفتی صاحب کو اپنے ذوق تصنیف و تالیف کی قربانی دینا پڑی تب جاکر یہ کام انجام پایا۔ "منارِ صدا" کے اقتباس میں مفتی صاحب فرماتے ہیں:

"۱۹۳۸ء میں جب ندوۃ المصنفین کا قیام عمل میں آیا تو دوسرے رفقائے کار کے ساتھ میں بھی ایک بڑھیا قسم کی بلوری دوات اور عمدہ قلم سنبھال کر بیٹھ گیا تھا اور لکھنے پڑھنے کا کام شروع کردیا تھا۔ علامہ ابن تیمیہ کی "الکلم الطیب" تشریحی نوٹوں کے ساتھ اور علامہ ابن جوزی کی "صید الخاطر" کا ترجمہ انہی دنوں کی یادگار ہیں، لیکن پوری صورت حال پر غور کرنے کے بعد جلد ہی یہ طے کرلیا کہ لکھنے پڑھنے والوں اور تصنیف و تالیف کے شہ سواروں کی تو کوئی کمی نہیں ہے! کمی جس چیز کی ہے وہ یہ ہے کہ ادارے کا انتظام کون چلائے اور کس طرح چلائے۔ اس فیصلہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک کوتاہ قلم اور کم سواد انتظامات کے خرخشوں میں پھنس کر رہ گیا اور شروع کیے ہوئے کام یونہی ناتمام رہ گئے۔ گذرے ہوئے دن واپس نہیں آتے اور اب افسوس کے علاوہ چارہ کار بھی نہیں۔"

یہ صحیح ہے کہ انتظامات کے خرخشوں میں پھنس جانے سے دنیائے علم بہت سی قیمتی تصانیف سے محروم رہی جو مفتی صاحب کے قلم سے ہم تک پہونچتیں۔ مگر یہ بھی صحیح ہے کہ اتنی کثیر تعداد میں بہت بیش قیمت اور اہم کتابیں جو مکتبہ سے شائع ہوئیں وہ شائع نہیں ہوسکتی تھیں۔ اور یہ خدمت بہت بیش قیمت اور قابل قدر خدمت ہے۔ دراصل ہر میدان میں آج بھی ضرورت ہے کہ خاموشی اور یکسوئی

سے کام کرنے والے اس طرح کی قربانی دیں اور تعمیری کام میں مصروف ہوں ۔ اور اس مکتبہ میں بھی اس طرح کام کرنے والوں کی ضرورت ہے جو مفتی صاحب کی روایات کو برقرار رکھیں اور کام کو آگے بڑھائیں۔

اللہ تعالیٰ مفتی صاحب کی روح کو اپنی رحمت کے سایہ میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، ان کے پسماندگان کو صبر عطا فرمائے، ان کی روحانی برکتوں سے فیضیاب کرے اور ان کی یادگار ندوۃ المصنفین اور برہان کو ترقی دے۔

خطیبِ میرٹھ مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی

افسوس ہے کہ ایک طویل سلسلۂ علالت کے بعد حضرت مولینا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی راہیِ ملکِ بقا ہوئے۔ حضرت مفتی صاحب ملک کے ایک ممتاز عالم اور مشہور سیاسی و ملی رہنما تھے۔ نصف صدی سے زائد انہوں نے ملک و ملت کی بیش قرار خدمات، جمعیۃ علماء ہند کے قائم مقام صدر اور مجلس مشاورت کے صدر کی حیثیت سے انجام دیں۔ اپنے انداز پر دارالعلوم دیوبند کا رکن ہونے کی حیثیت سے جب تک ان کی صحت نے کام کیا اسکی عظمت اور سربلندی کے لئے کام کرتے رہے۔

ان کا سب سے بڑا کارنامہ ندوۃ المصنفین جیسے علمی و دینی نشریاتی ادارہ کا قیام ہے جس کے لئے انہوں نے اپنے رفقاءِ کرام کے ساتھ مل کر ان تھک محنت کی اور اسے ملک کا اہم اسلامی و علمی نشریات کا مرکز بنا دیا۔

ان کے انتقال سے ملک میں علمی و دینی صفوں پر ایک ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے جس کا پُر ہونا اس قحط الرجال کے زمانہ میں مشکل ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کو جنت الفردوس میں درجات عالیہ عطا فرمائے اور اعزاء و احباب کو صبر جمیل کی توفیق دے۔

ایک سچا ہمدرد اور عظیم رہنما

(از حکیم، حافظ، محمد علی غوری، مہتمم دار العلوم العربیہ الاسلامیہ جودھ پور)

حضرت مفتی صاحبؒ کو میں ۱۹۳۶ء سے جانتا ہوں اس وقت میں جامعہ طبیہ قرول باغ دہلی میں زیر تعلیم تھا۔ وہ زمانہ سیاسی بحران کا زمانہ تھا، ملک کی آزادی کی تحریک بڑے زور و شور سے چل رہی تھی، زمانۂ تعلیم میں میں بھی جمعیۃ علماء ہند کے نصب العین کا حامی تھا۔

اس دور میں بڑے بڑے جلسے، سیاسی جماعتوں کے ہو رہے تھے کبھی کانگریس کا، کبھی مسلم لیگ کا، کبھی مجلس احرار کا کبھی جمعیۃ علماء کا۔

غرض یہ کہ اس بحرانی دور میں حضرت شیخ الاسلامؒ حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ مفتی کفایت اللہؒ حضرت مولانا نورالدین بہاریؒ سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعیدؒ مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمنؒ مفکر ملت حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانیؒ عطاء اللہ شاہ بخاریؒ وغیرہ وغیرہ۔

یہ بزرگ اپنے اپنے طریقے سے جنگ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے، جمعیۃ علماء ہند کانگریس کے دوش بدوش جنگ آزادی کی جد و جہد میں حصہ لے رہی تھی۔

بدقسمتی سے ۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم کی تجویز کانگریس نے منظور کر لی ملک تقسیم ہوا

تقسیم کے بعد جو حالات ہماری آنکھوں نے دیکھے وہ تحریر کرنے سے قاصر ہوں۔
مختصر الفاظ میں حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کے وہ جملے کہ "ملک کی تقسیم منظور کر لینے کا مطلب یہ ہوگا کہ کسی گھر میں ڈاکو گھس گئے ہوں اہل خانہ ڈاکوؤں کو گھر سے نکال دیں مگر ڈاکو اس کے مکان کی دہلیز پر قبضہ جما کر بیٹھ جائے ایسی صورت میں اہل خانہ سکون سے ہرگز نہیں رہ سکیں گے۔" یہ جملے آج تک ہمارے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ آج ملک کو آزاد ہوئے چالیس سال ہو چکے ہیں مگر ابھی تک ہند و پاک کے لوگوں کو سکون کی زندگی میسر نہ آسکی، ملک کی تقسیم کے بعد جمعیۃ علماء نے سیاست سے کنارہ کشی کا اعلان کر دیا، وہ صرف مسلمانوں کی مذہبی، ملی، تہذیبی، ثقافتی، اصلاحی خدمات کو سنبھالے رہی ملک کی تقسیم کے بعد جو خوں ریز فسادات رونما ہوئے، ہمارے کانوں میں صرف ایک آواز گونج رہی تھی کہ مسلمان ہندوستان سے نکل جاتے ان کا الگ ملک پاکستان بن چکا ہے، اس وقت ہمارے بزرگوں نے اللہ پر بھروسہ کر کے جمعیۃ علماء کے پلیٹ فارم سے فرقہ پرستوں کو للکارا اور ملک کے گوشے گوشے میں گھوم پھر کر مسلمانوں کی ڈھارس بندھائی، ببانگ دہل یہ اکابر فرقہ پرستوں کو للکار کر اپنی پرجوش تقاریر میں فرماتے تھے کہ ملک کی آزادی میں مسلمانوں نے برادران وطن کے ساتھ مل کر عظیم سے عظیم قربانیاں دی ہیں آزادی کی جنگ میں مسلمان حصہ لینے میں کبھی پیچھے نہیں رہے بلکہ ہمیشہ پیش پیش رہے، آزادی کے بعد ان بزرگوں نے اپنی قربانیوں کے بدلے میں کسی قسم کا عہدہ نہیں لیا۔ مختصر الفاظ میں یہ ہے کہ جب قوموں پر مصیبت اور آزمائش کا دور آتا ہے اس وقت قوموں کے عظیم رہنماؤں کے فیصلے قوموں کو تباہی سے بچا لیتے ہیں۔

الغرض ہمارے بزرگوں نے اللہ پر بھروسہ کرکے فرقہ پرستوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور للکارا، کسی بزرگ نے ملک سے جانے کی کوشش نہیں کی اور نہ کسی عہدہ کی خواہش کی بلکہ اپنے ملک وملت کے بچانے کی جدوجہد کی، ہندوستان کے دستور میں مسلمانوں کو برابری کا حق دلایا اور ہر ممکن جدوجہد سے مسلمانوں کو ہندوستان نہ چھوڑنے پر آمادہ کیا، آج انہی بزرگوں کی کوشش کی وجہ سے ہندستان میں مسلمان اپنے ملک وملت کی حفاظت کرتے ہوتے اللہ کے بھروسے پر جما ہوا ہے۔

۱۹۴۷ء کے بعد حضرت مفکر ملت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی رح کو نزدیک سے دیکھنے کا موقع ملا، جمعیۃ علماء کے دفتر میں بزرگوں کی میٹنگ روزانہ ملکی حالات کے سلسلے میں گھنٹوں تک چلتی تھی، آخر میں حضرت مفکر ملت مفتی صاحب رح کی تجویز پر اتفاق ہوا کرتا تھا، ایسا میں نے کئی بار دیکھا، ۴۷ء کے بعد سال میں کئی بار دہلی آنے کا اتفاق ہوا کرتا تھا۔ حضرت مفتی صاحب رح سے ملکی حالات کے سلسلے میں بات چیت اور مشورے لیا کرتا تھا۔ حضرت مفتی صاحب رح اپنی بصیرت آمیز نصائح اور مفید مشوروں سے ٹھوس اور پختہ رائے دیا کرتے تھے۔

مرحوم ومغفور مولانا محمد عاقل الہ آبادی کی مسلسل کوشش سے راجستھان میں جمعیۃ علماء ۱۹۴۸ء میں قائم ہوئی، پہلے ٹونک میں مولانا حکیم ظہیر احمد صاحب برکاتی مدظلہ نے قائم کی۔ مولانا کے ساتھ قاضی الاسلام صاحب، سید منظور الحسن صاحب جمعیۃ علماء کی تنظیمی کارروائیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے، اسی دوران ۴۸ء میں جودھپور میں جمعیۃ علماء کا قیام عمل میں آیا مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی رح کو جودھپور آنے کی

دعوت دی گئی، جودھپور ریلوے کلب میں ایک عظیم الشان جلسے سے مجاہد ملت نے خطاب فرمایا۔ جودھپور، ناگور، بیکانیر، جالور، پالی اور دیگر اطراف میں جمعیۃ علماء کی پینسٹھ شاخیں قائم ہوئیں، ہر قصبے میں جمعیۃ علماء کا دفتر اور جھنڈا لہرایا گیا۔

جودھپور راجستھان کے مغربی سرحد پر واقع ہے، پاکستان سے سرحدیں ملتی ہیں، پاکستان جانے کی گزرگاہ بھی ہے، سیکڑوں اور ہزاروں افراد ہجرت کرکے پاکستان جارہے تھے۔ جمعیۃ علماء نے ان کی ہر ممکن مدد کی۔ اس وقت جمعیۃ علماء راجستھان کے دو حصے تھے۔ جمعیۃ علماء مغربی راجستھان جودھ پور بیکانیر ڈویزن، جمعیۃ علماء راجستھان کے صدر حکیم ظہیر احمد صاحب برکاتی رہے اس کے بعد سیٹھ محمد اسلام صاحب، اس کے بعد سید عابد علی صاحب جمعیۃ علما مغربی راجستھان کے صدر حکیم محمد ابراہیم خاں صمصالی ۱۹۵۰ء تک رہے، اس کے بعد میرے کاندھوں پر اس کی صدارت کا بارگراں ڈال دیا گیا، اللہ کے فضل وکرم سے جماعت کی سرگرمیاں راجستھان میں بڑے دوررس تعمیری نتائج پیدا کرسکیں۔

مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ نے تین مرتبہ جودھ پور، ناگور، جالور کا دورہ فرمایا۔ حضرت کے انتقال کے بعد راجستھان میں جمعیۃ علماء کی سرگرمیاں دھیمی پڑگئیں بلکہ جمعیۃ علماء کا وجود راجستھان سے ختم سا ہوگیا۔

گاہ بگاہ مرکز سے کوئی شخص آتا ہے۔ چند افراد کو بلاکر جمعیۃ کا انتخاب کرا دیتا ہے، میری صدارت کے زمانے میں جمعیۃ علماء راجستھان کا آرگنائزر جناب مولانا عاقل صاحب الہ آبادی کو بنایا گیا۔ حضرت مولانا نے پورے راجستھان میں جمعیۃ علماء کی تنظیم کا جال بچھا دیا، اس مرد مجاہد نے اپنی انتھک کوششوں

سے جمعیۃ علماء راجستھان میں چار چاند لگا دیے۔

میرے ساتھ وکیل احمد بخش سندھی جمعیۃ علماء راجستھان کے سکریٹری کی حیثیت سے بیس برس کام کرتے رہے اور میرے ساتھیوں میں حکیم ابراہیم خاں صمصالی، صمصام الحق عرشی، عبدالرحمٰن انصاری، شوکت انصاری۔ ناگور میں وکیل رشید احمد صاحب، منشی محمد عمر صاحب، حافظ عبدالقیوم غوری، بیکانیر میں سید وزیر علی صاحب، مولانا کبیر احمد صاحب، جالور میں سید امتیاز علی سوجت میں سیٹھ محمد حنیف صاحب، قاضی محمد شفیع صاحب، سروہی میں سید رحید ر علی صاحب، باڑمیر میں مولوی احمد صاحب اور دیگر میرے احباب نے جماعتی تنظیم اور ملکی و ملی خدمات میں بے غرض ہو کر کام کیا۔ مجاہد ملت کے انتقال کے بعد جمعیۃ کی سرگرمیاں راجستھان میں کمزور ہو گئیں تو میں نے جودھپور شہر میں ایک مدرسہ جس کا نام دار العلوم العربیہ الاسلامیہ ہے ۱۹۶۳ء میں قائم کیا۔ حضرت والد شاہ عبدالغفور صاحب خلیفہ مجاز بیعت و ارشاد حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اس کا سنگ بنیاد رکھا۔

مغربی راجستھان میں دینی تعلیم نہ ہونیکے برابر تھی حضرت والد بزرگوار نے اطراف میں سوا سو مساجد بنوائیں نیز مدرسے بھی، وہاں سے مدرسین اور ائمہ کی مانگ ہو رہی تھی تو جمعیۃ علماء کی بنیادی غرض یعنی دینی تعلیم کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس مدرسہ کا یعنی دار العلوم العربیہ الاسلامیہ کا اول قیام کرایہ کے مکان میں عمل میں آیا۔ اسی دوران مفکر ملت حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰنؒ کو جودھپور آنے کی دعوت دی، دعوت نامہ کو شرف قبولیت بخش کر جودھپور تشریف لائے، مدرسے کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور اپنے مفید مشوروں سے نوازا، یہ واقعہ ۲ر نومبر ۱۹۶۸ء کا ہے، حضرت نے معائنہ رجسٹر میں

اپنے تاثرات کا اظہار فرمایا۔ اور مدرسے کی ترقی کے لیے دعاء فرمائی، ویسے میں ۱۹۴۷ء کے بعد چوں کہ دہلی سال میں چار پانچ مرتبہ جماعتی کاموں کے سلسلے میں جایا کرتا تھا، حضرت مفتی صاحب کی مجھ ناچیز پر خاص شفقت تھی، بڑی تواضع کے ساتھ حضرت پیش آیا کرتے تھے۔ حضرت کی منکسر المزاجی ایک عام عادت تھی۔ ملک کے بڑے بڑے دانشوران اور لیڈران صبح سے شام تک مفتی صاحب کی خدمت میں آیا کرتے تھے اور مفتی صاحب کے سامنے اپنی ضروریات اور ملکی کاموں کے سلسلے میں تعاون حاصل کیا کرتے تھے۔

حضرت مفتی صاحب خندہ پیشانی کے ساتھ اور باوجود بڑے ہونے کے پدرانہ شفقت کے ساتھ ہر آنے والے کو مطمئن فرماکر روانہ کیا کرتے تھے۔

جمعیۃ علماء کی بنیادی غرض، دینی تعلیم کو مدنظر رکھتے ہوئے جو مدرسہ قائم کیا گیا تھا وہ آج بحمداللہ راجستھان کا مرکزی مدرسہ بن چکا ہے اور چھوٹی عمر میں اس نے وہ کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں کہ یہ محض اللہ کا فضل ہی کہا جاسکتا ہے، اس مدرسہ کے ابتدائی دور میں حضرت مفتی صاحب نے جو کچھ معائنہ رجسٹر میں تحریر فرمایا تھا وہ مندرجہ ذیل ہے۔

> حسن اتفاق سے آج پہلی مرتبہ جودھ پور حاضری کا موقعہ ملا، حاضری کا مقصد دارالعلوم العربیہ الاسلامیہ کے سالانہ امتحان میں شرکت تھی، یہ دیکھ کر نہایت مسرت ہوئی کہ مدرسہ کے تمام کام ترقی پذیر ہیں، میرے خیال میں راجستھان کی یہ پہلی دینی درسگاہ ہے جس میں حفظ القرآن، تعلیم قرآن اور ابتدائی دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ عربی کی بھی بہت اچھی تعلیم ہورہی ہے، مجھے تھوڑے وقت میں طلبا کی اردو اور عربی تقریریں اور مقالات سننے کا موقعہ

بھی ملا اور بہت جلد ہی یہ اندازہ ہوگیا کہ مدرسہ کا طرز تعلیم حالات کے عین مطابق ہے، متعدد طلبا نے عربی میں بہت اچھی تقریریں کیں اور مقالات پڑھے اور پھر ان کا ترجمہ بھی دوسرے طلبا نے سلیقہ سے کیا۔ اردو کی تقریریں بھی موثر تھیں امید ہے کہ یہ مدرسہ جلد ہی ترقی کی منزلیں طے کرے گا اور اس صوبہ کا مستند دارالعلوم بن جائے گا، مدرسہ کے لیے ایک وسیع قطعہ زمین خرید ا گیا ہے جس کے قرض کا بار باقی ہے، اس کے بعد تعمیر کا مرحلہ ہے، یقین ہے کہ اصحاب خیر اس بہت اچھے مدرسہ کی اعانت کی جانب توجہ فرمائیں گے، میں مدرسہ کی توسیع و ترقی کے لیے دعا کرتا ہوں۔

مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی

۲ر نومبر ۱۹۶۸ء

محسن میوات

از حکیم اجمل خاںؔ

(معتمد مولانا آزاد میوات اکیڈمی)

۱۹۴۷ء کی افراتفری کا زمانہ تھا، تقسیم آبادی کی وجہ سے میو دیہات خالی ہو رہے تھے، اور ہمارے بہت سے بھائی قافلے بنا بنا کر ہجرت کرنے پر مجبور کر دیے گئے تھے، میری عمر اس وقت ۱۰-۱۲ سال کے لگ بھگ تھی۔ والد مرحوم مولانا حکیم عبدالشکور صاحب (ممتاز میو دانشور اور مؤرخ) نے مجھے ایک اعلامیہ دیا۔ کہ میں اس کی کاربن خوشخط کاپیاں تیار کر کے انھیں دوں، تاکہ وہ ان کو میوات کے دیہات میں بھیج دیں، اور اہل میوات ملی رہنمایان و لیڈران کی یقین دہانی پر پاکستان ہجرت کرنے سے باز رہیں۔ اس مختصر اعلامیے پر حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب مرحوم، مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی، آنجہانی پنڈت سندر لال، اور برشن بھان جی کے نام تھے، اعلامیے میں میو عوام سے اپیل کی گئی تھی، کہ حکومت ہند میوؤں کو جبراً نہیں نکالنا چاہتی ہے۔ وہ دوبارہ ان کے گھروں میں آباد کیے جائیں گے اس لیے لوگ ہجرت کرنا بند کر دیں۔؟

اعلامیہ کا پس منظر یہ تھا، کہ میو لیڈران نے مولانا آزاد مرحوم کے توسط سے مہاتما گاندھی سے ملاقات کی تھی اور انھیں بتایا کہ سرکاری افسران میوؤں سے جبراً دیہات خالی کرا رہے ہیں۔ اور انھیں پاکستان جانے پر مجبور کر رہے ہیں۔ نیز فسادات

میں ملوث ہیں۔ اس واقعہ کی اصلیت جاننے کے لیے گاندھی جی نے مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم، برش بھان جی، شری جے نرائن ویاس لیڈران پر مشتمل ایک وفد میوات بھیجا تاکہ وہ صورت حال کا جائزہ لے کر مہاتما جی کو واقف کرا سکے۔ یہ شکایت جب صحیح نکلی، تب مہاتما جی نے مسلم لیڈران کو متوجہ کیا کہ وہ میوٗ عوام کو حوصلہ دلائیں۔ اسی پس منظر میں یہ اعلامیہ نکلا تھا جو بڑے ہی اندوہناک حالات میں مجھ کم سن اور کم شعور کو نقل کرنے کے لیے والد صاحب نے دیا تھا۔ یہی اعلامیہ حضرت مفتی صاحب سے غائبانہ تعارف کا باعث بنا، جب ذرا حالات نارمل ہوئے، تو میوات میں بھی کچھ چہل پہل شروع ہوئی۔ چودھری محمد یٰسین خاں مرحوم اور مولانا محمد ابراہیم صاحب سیاما اور ان کے معاونین میوؤں کی قیادت کر رہے تھے، میوات میں امن کی بحالی اور اُجڑے ہوئے لوگوں کی دوبارہ آبادی کا مسئلہ سر پر تھا، الور و بھرت پور کے میوٗ لُٹ کھس کر پنجاب حتیٰ کہ دہلی کے پرانے قلعہ کیمپ میں بھی آ پناہ گزین ہوئے تھے۔ میوٗ لیڈران کو جب بھی کوئی پریشانی ہوتی، یا انھیں کوئی مفید مشورہ لینا ہوتا تو وہ بالعموم مولانا آزاد مرحوم، مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم، حضرت مفتی عتیق الرحمٰن مرحوم، جنرل شاہ نواز خاں، مولانا عبدالغنی ڈار، پنڈت سندر لال جی، لالہ کیدار ناتھ سہگل، سردار بچن سنگھ چودھری شیر جنگ ستیم بھائی، مسز سبھدرا جوشی، مردولا بہن وغیرہ لیڈران سے رجوع کرتے، اور اپنی باتیں سرکار تک پہنچانے کے لیے جمعیت علمائے ہند کے سالانہ جلسوں کے علاوہ دوسری کانفرنسیں اور جلسے بھی کرتے، جو اہم شخصیتیں ان پروگراموں اور جلسوں میں شرکت کرتی تھیں، ان میں مفتی صاحب مرحوم خاص طور پر قابل ذکر ہیں، وہ اہلِ میوات کی ہمیشہ ڈھارس بندھاتے انھیں مفید مشورے دیتے۔ میوات کے جلسوں ہی میں حضرت مفتی صاحب کی ہم نے پہلے پہل

زیارت کی۔ وہ بہت ہی پُرکشش اور ہر دل عزیز شخصیت کے مالک تھے، تمام پروگراموں کی جان ہوتے تھے۔ مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم اگرچہ بہت جری اور دلیر انسان تھے، مگر اصابت رائے، فیصلہ، فکر و دانش اور اونچ نیچ کو سمجھنے سمجھانے میں مفتی صاحب کا پلّہ بھاری تھا۔ مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم ہمیشہ ہی تمام معاملات و مسائل میں ان سے مشورہ کرتے۔ چودھری محمد یٰسین خاں مرحوم اور مولانا ابراہیم صاحب الوری مرحوم جب بھی میوات کے معاملات لے کر دہلی آتے تو حضرت مفتی صاحب سے ضرور ملتے۔ اسی طرح میوات کے مشہور کمیونسٹ لیڈر چودھری عبدالحیٔ کی تو رہائش ہی مفتی صاحب کے مکان کے بالکل قریب ہے۔ وہ بھی میوات کے معاملات میں برابر مفتی صاحب سے ربط رکھتے۔

سنہ ۱۹۵۲ء میں جب راقم الحروف کی سوشل سرگرمیوں کا آغاز ہوا، تب مفتی صاحب سے میوات کے مسائل پر براہ راست گفتگو کرنے کا موقعہ ملنے لگا، وہ بہت خوش ہوتے اور بڑے تپاک سے ملتے، آبادکاری کے کام کی رفتار کو خاص طور پر پوچھتے، مغربی پنجاب سے آئے ہوئے رفیوجی ملازمان و حکام انتقام پسندی تعصب کے عفریت کا شکار تھے، اس لیے وہ اہل میوات کو رشوت، عصبیت، مقدمہ بازی اور دوسرے مظالم کا نشانہ بناتے رہتے تھے، ان مظالم اور ناانصافیوں کی شکایت حضرت مفتی صاحب سے جاکر کی جاتی وہ یہ شکایتیں مولانا ابوالکلام آزاد کے ہاں پہونچاتے، اور کبھی قدوائی مرحوم اور جنرل شاہ نواز صاحب کے ہاں، خود جاتے اور فون بھی کرتے، پنجاب و راجستھان کے چیف منسٹروں کو تار، ٹیلیفون اور خطوط کے ذریعہ متوجہ کرتے، اس میں اگرچہ بہت سا وقت برباد ہو جاتا تھا، مگر اس وقت قانون و انصاف حاصل کرنے کا کوئی دوسرا راستہ ہی نہ تھا۔ پنجاب و راجستھان سرکاروں تک میوؤں کی رسائی بہت مشکل تھی۔

فرقہ پرست بار بار میوؤں کی حب الوطنی پر شبہ کا اظہار کرتے، ایک بار گورنر پنجاب چند دلال ترویدی نے برملا نوح کی ایک میٹنگ میں کہا کہ وہ میوؤں کی وفاداری کو مشکوک سمجھتے ہیں، یہ تمام باتیں بہت ہی جان لیوا اور پریشان کن تھیں، سابق ریاست الور میں بہت سے میوؤں کو شدھی (مرتد) کرلیا گیا تھا۔ ان کا معاملہ بہت سنگین تھا۔ جمعیت علمائے ہند، اور میو لیڈران نے جب ان کی اصلاح کی کوشش کی۔ تب فرقہ پرستی آڑے آنے لگی۔ مگر اس مرتبہ مفتی صاحب جیسے قائدین ملت کے مفید مشوروں اور ڈھارس سے یہ کام بھی پورا ہوا۔ جگہ جگہ دینی مدارس و مکاتب قائم کردیے گئے، مساجد آباد کردی گئیں، پھر تبلیغی سرگرمیاں بھی شروع ہوئیں۔

لوگوں میں سیاسی بیداری پیدا کرنے اور اعتماد بحال کرنے کے لیے جلسے منعقد ہوئے، پہلے پہل شکرادہ میں کانفرنس ہوئی، جس کا سلسلہ تین چار سال جاری رہا۔ اسی طرح جمعیت علمائے کے جلسے نوح، اٹاورڑ، مالب، بھادس، فیروز پور جھرکا وغیرہ مقامات پر منعقد ہوئے، جن میں حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا حفظ الرحمان مرحوم کے علاوہ حضرت مفتی صاحب مرحوم بھی تشریف لے جاتے۔

جلسوں کی کارروائی مفتی صاحب کے مشوروں سے چلتی، وہی ریزولیشن تیار کراتے، پھر انھیں ضروری کارروائی کے لیے اوپر بھجواتے۔

۱۹۵۷ء کے انتخابات میں حضرت مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم گوڑگانوہ کی پارلیمنٹری سیٹ سے کانگریس کے امیدوار بنائے گئے تھے، مولانا مرحوم کے پاس تو وقت کبھی نہ تھا اور نہ ہی وہ انتخابی جلسوں میں جانے کے عادی تھے، بس امیدوار تھے، حضرت مفتی صاحب کو چونکہ ان سے بہت لگاؤ تھا، اس لیے اپنے کارکنان کو کام کرنے کے لیے میوات بھیجا، اس انتخاب میں مولانا مرحوم بڑی اکثریت

سے جیت کر آئے۔

۱۹۵۷ء میں جب پہلی اُردو کانفرنس، جامع مسجد کے سامنے پارک میں منعقد ہوئی، جسے پنڈت جواہر لال نہرو، اور مولانا ابوالکلام آزاد نے ایڈریس کیا تھا، حضرت مفتی صاحب اس کانفرنس کے انتظام و انصرام میں پیش پیش تھے اس کے بعد ہی حضرت مفتی صاحب کے مشورے سے راقم الحروف نے اپریل ۱۹۵۸ء میں ایک اردو کانفرنس شکراوہ میوات میں منعقد کی، جس پر مفتی صاحب نے دلی مسرت کا اظہار فرمایا۔

۱۹۶۲ء کے الیکشن میں جب چودھری طیب حسین کو کانگریس کا امیدوار بنایا گیا، پنڈت جواہر لال جی حلقے میں تشریف لے گئے، اس وقت مفتی صاحب کو توجہ دلائی گئی تو مفتی صاحب نے مفتی ضیاء الحق صاحب کو بھیجا۔ کہ وہ میٹنگ کو جاکر ایڈریس کریں۔ اسی میٹنگ کے دوران یہ اندوہناک خبر بھادس میں ملی تھی کہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی رحلت ہوگئی ہے، اِنّا لِلّٰہ!

۱۹۶۴ء میں ہمارے علاقہ میں ایک تنازعہ کھڑا ہوگیا تھا۔ ایک گروہ شادی اور نکاحوں کے سلسلے میں پرانی روایت کو قائم رکھنے پر مصر تھا، تو دوسرا شرعی طریقے پر چاہتا تھا، آپس میں تناؤ بہت بڑھ گیا۔ اس تنازعے کی اطلاع جب حضرت مفتی صاحب کو ملی، تو وہ عوام کی افہام و تفہیم کے لیے ایک وفد، جس میں ان کے علاوہ حافظ محمد ابراہیم صاحب سابق وزیر حکومت ہند، مولانا قاضی سجاد حسین صاحب، مولوی سمیع اللہ صاحب شریک تھے، میوات لے کر گئے اور میو ہائی اسکول نوح میں جاکر فریقین کو سمجھانے کی کوشش کی، مگر کھچاؤ بہت تھا اور لوگ جہالت پر اترے ہوئے تھے، اس لیے وفد کو پھر کسی موقعہ پر دورہ کرنے کے لیے واپس لے آئے۔ ۱۹۶۵ء میں ہندو پاک جنگ ہوئی، تب

بعض شرارت پسندوں نے محب الوطن میواتیوں کے خلاف افواہ بازی کی، اور بعض کو جیل میں ڈلوا دیا، تب راقم الحروف اور چودھری طیب حسین ایم ایل اے پنجاب حضرت مفتی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کو سارا ماجرا سنایا مفتی صاحب نے کئی بڑے بڑے لیڈران اور وزیروں سے رابطہ قائم کیا اور ہمیں ان کے پاس بھیجا مفتی صاحب نے کہا کہ میوات میں غیر ضروری طور پر بے اطمینانی اور بے اعتمادی کی فضا قائم کرنا انتہائی نامناسب بات ہے، اس کے بعد ہم لوگ پروفیسر ہمایوں کبیر وزیر حکومت ہند سے ملے، اور انھیں میوات لے جا کر شاہ چوکھا میں زبردست ریلی کی۔!

۱۹۷۰ء میں پنجاب وقف بورڈ کی تقسیم کا معاملہ مسلمانان پنجاب ہریانہ، ہماچل کے سامنے درپیش تھا، عالی جناب فخرالدین علی احمد مرحوم اس وقت وزیر اوقاف تھے آپ نے اس مسئلے پر رائے حاصل کرنے کے لیے مسلمانان پنجاب، ہریانہ، ہماچل، کی سربرآوردہ شخصیتوں کی ایک میٹنگ طلب کی، حضرت مفتی صاحب چونکہ سنٹرل وقف کونسل، سنٹرل حج کمیٹی کے رکن تھے، اور مسلم معاملات پر وقیع رائے رکھتے تھے، اس لیے میٹنگ میں انھیں بھی مدعو کیا گیا۔ پیش آمدہ مسئلے کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد مفتی صاحب نے بھی بورڈ کو یکجا رکھنے کی تائید فرمائی۔ جس سے ہمیں بہت تقویت ملی، اور بورڈ بعض سیاست پسندوں کی سازش کے نتیجے میں تقسیم ہونے سے بچ گیا۔

اوقاف اور مساجد کے انخلاء کے بارے میں بھی حضرت مفتی صاحب سے برابر رائے مشورے ہوتے، تو اس میں بھی وہ ہماری رہنمائی فرماتے، اور کانگریسی لیڈران و وزراء کو توجہ دلاتے۔

۱۹۷۶ء کی ایمرجنسی کے زمانے میں میوات پر نس بندی کا زبردست وبال

آیا تھا، اور اہل میوات شرارت پسند اور ظالم افسران کے مظالم کا بری طرح شکار ہوئے، اس وقت راقم الحروف اور چودھری طیب حسین ان کی خدمت میں پھر حاضر ہوئے، اور انھیں نس بندی کے مظالم کی داستان سنائی، حضرت مفتی صاحب کو ان واقعات سے بہت اذیت پہونچی، انھوں نے کئی لیڈروں، اور وزیروں کو ان واقعات کی تفصیل بتائی۔

یوں تو راقم الحروف جب بھی جامع مسجد پر آتا مفتی صاحب کے دفتر میں ضرور حاضری دیتا، مفتی صاحب ہمیشہ ہی برآمدے میں بیٹھے ملتے۔ شاید ہی کبھی ایسا اتفاق ہوا ہو، کہ دو چار اہم آدمی اُن کے ہاں بیٹھے نہ ملے ہوں، ہندوستان بھر سے لوگ انھیں ملنے آتے، وہ سب کے مسائل سنتے اور سب کو اپنی رائے و مشورے سے آگاہ کرتے، ڈھیروں ڈاک ان کے سامنے پڑی رہتی، اسے بھی دیکھتے، دنیا بھر سے تازہ بتازہ اخبارات رسائل اور کتابیں ان کے ہاں آتی تھیں، وہ معلومات کا زبردست بھنڈار تھے، ملی مسائل پر ہمیشہ ہی ان کے ہاں بحثیں جاری رہتیں، پھر الیکشن کے لیے منصوبے بنتے، مشاورت کا پلیٹ فارم آپ نے ملت کو دیا، مسلم پرسنل لاء بورڈ میں جان ڈالی، دارالعلوم دیوبند کے مناقشات کا ان کی طبیعت پر زبردست بوجھ تھا، جس کا تذکرہ اٹھتے بیٹھتے برابر کرتے رہتے تھے۔

غرضیکہ مفتی صاحب علیہ الرحمۃ نہایت دردمند، اچھے دانشور، مخلص صلاح کار، اور گہری سوجھ بوجھ کے انسان تھے، جتنا انھیں قریب سے دیکھا، خوبیاں ہی خوبیاں ملیں، وہ بلاشبہ محسنِ میوات تھے۔

مفتی اعظمِ ہند

مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی رح
موسمِ بہار کا آخری گلاب بھی مرجھا گیا

از ڈاکٹر محمد یوسف الدین
سابق صدر شعبۂ مذہب و ثقافت عثمانیہ یونیورسٹی

سوویت روس ایک مذہب دشمن ملک سمجھا جاتا ہے لیکن آج بھی وہاں مفتی اعظم کا عہدہ برقرار اور بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ مفتی ضیاء الدین مرحوم اسلامی دنیا اور سوویت روس کے درمیان ایک رابطہ کا کام دیتے تھے۔ حضرت مفتی عتیق الرحمٰن صاحب اپنی اعلیٰ قابلیت، معاملہ فہمی، اور انتظامی صلاحیت کی وجہ سے آزاد ہند (انڈیا یونین) میں ایک اونچا مقام رکھتے تھے۔ حکومت ہند کے پاس ان کا ایک وقار تھا اور حکومتی حلقے ان سے مشورے لیتے اور پبلک میں بھی ان کی بڑی عزت تھی۔

گذشتہ ۳۵ سال سے، سال بھر میں تین چار چکر شمالی ہند کے لگاتا ہوں اور دہلی سے ہی واپسی کا ٹکٹ ریزرو کراتا ہوں۔ جب کبھی دہلی جاتا ہوں جامع مسجد دہلی کے آس پاس کے ہوٹلوں میں ٹھہرتا ہوں، ایک تو قدیم شاندار خوشنما تاریخی جامع مسجد دہلی میں نماز کی سعادت حاصل ہو جاتی ہے اور دوسرے حضرت مفتی عتیق الرحمٰن صاحب سے بعد نماز فجر شرف نیاز حاصل ہو جاتا۔ لیکن افسوس! صد افسوس! موسمِ بہار کا آخری

گلاب بھی مُرجھا گیا!

حضرت مفتی صاحب سے دلچسپ علمی گفتگو رہتی تھی، افسوس! اس پائے کا ہندوستان بھر میں کوئی جرأت مند اور عالم باعمل نظر نہیں آتا۔

آج سے پورے ۳۵ سال قبل، ایک سہانی صبح 'ندوۃ المصنفین دہلی کے دفتر پہونچا، بڑے بڑے چوٹی کے علماء تشریف رکھتے تھے، سلام علیکم کہہ کر کونے کی ایک کرسی پر چپکے سے بیٹھ گیا۔ پروفیسر سعید احمد صاحب اکبر آبادی بھی تشریف فرما تھے' حضرت مفتی صاحب سے انھوں نے کہا: "کیا آپ ڈاکٹر محمد یوسف الدین سے ملیں گے؟ جنھوں نے اسلام کے معاشی نظریے پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لیے تحقیقاتی کام کیا ہے" مفتی صاحب نے کہا: کیوں نہیں؟ ضرور ملوں گا۔ اُن کے تحقیقاتی مقالہ پر مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد دریا آبادی وغیرہ اور خود ماہنامہ برہان میں شاندار تبصرہ شائع ہوا ہے" پروفیسر سعید احمد اکبر آبادی نے کہا: "دیکھئے! کونے کی کرسی پر ڈاکٹر یوسف الدین نوجوان سے بیٹھے ہوئے ہیں" مفتی صاحب نے کہا: خوب! ذرا قریب تو آجائیے، فوراً مفتی صاحب کے قریب جا پہونچا۔ مفتی صاحب بھی سروقد کھڑے ہوگئے، میں نے ادب سے سر جھکا دیا، سر پہ ہاتھ رکھنے کی بجائے مفتی صاحب نے گرم جوشی سے گلے لگا لیا اور کہا کہ: "بھئی آپ نے تو کمال کر دیا اور انکساری سے ایک کونے کی کرسی پر جا بیٹھے۔ آپ تو میرے قدیم دوست مولانا سید مناظر احسن گیلانی صاحب صدر شعبۂ دینیات عثمانیہ یونیورسٹی کے شاگرد رشید ہیں، پھر مفتی صاحب نے اپنے ہی صوفے پر مجھے بھی بٹھا لیا۔ مجلس میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب بھی تشریف فرما تھے، انھوں نے مفتی صاحب سے مخاطب ہو کر مسکراتے ہوئے کہا: کہ ڈاکٹر صاحب کی تو اب مونچھیں نکل آئی ہیں گذشتہ سال تو یہ اور کمسن نظر آتے تھے، پولیس ایکشن کے بعد میں بلدہ حیدرآباد پہونچا۔ پہونچنے سے پہلے ان کا عنایت نامہ دہلی آیا کہ "مقامی

اخباروں میں اطلاع شائع ہوئی ہے کہ آں محترم بلدہ حیدرآباد آنے والے ہیں۔ میں آں محترم سے نیاز حاصل کر کے اپنے مطبوعہ مقالہ کی دونوں جلدیں پیش کرنی چاہتا ہوں کیونکہ آں محترم نے بھی اسلامی معاشیات پر کام کیا ہے۔ میں نے بھی جواب دیا کہ فلاں دن حیدرآباد پہونچ رہا ہوں شنکر باغ میں فلاں وقت رہوں گا۔ آپ کے دولت کدہ کا پتہ معلوم ہو تو ملاقات ہو جائے گی اور آپ کا تحفہ بھی حاصل کر لوں گا۔ ڈاکٹر یوسف خود ہی شنکر باغ پہونچ گئے۔ گارڈن پارٹی (بستانی ضیافت) ہو رہی تھی۔ پبلک بھی آنے لگی اور ایک طرف کرسی پر بیٹھنے لگی۔ یہ سماں دیکھ کر بستانی ضیافت چھوڑ کر پبلک کی طرف متوجہ ہوا۔ ہر ایک سے دُکھ بھری شکایتوں کو سنتے یا عرضیاں لیتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کی کرسی تک پہونچا اور پوچھا: آپ کو کیا شکایت ہے یا کیا دُکھ پہونچا ہے؟ انھوں نے کہا: مجھے کچھ شکایت نہیں ہے، یہ کہہ کر اپنے مقالہ کی دونوں جلدیں پیش کیں، میں نے پوچھا: کیا آپ کے بڑے بھائی ڈاکٹر یوسف الدین نے بھیجی ہیں؟" جمعیۃ علماء ہند کے مقامی صدر مولانا حمیدالدین قمر صاحب نے کہا: "یہی تو ڈاکٹر یوسف الدین ہیں، فوراً چونک پڑا اور گلے لگا لیا اور وہاں بھی آخری کرسی پر بیٹھے تھے۔ ہاتھ پکڑے ہوئے ٹیبل تک لے گیا اور پوچھا کہ میوہ کھاؤ گے یا کیک؟ مولانا قمر نے کہا: یہ کری کیک بڑی پسند سے کھاتے ہیں پھر گھنٹہ بھر اسلامی معاشیات اور ہندی مسلمانوں کی معاشی حالت خاص کر حیدرآباد کے آفت زدہ مسلمانوں کی معاشی حالت اور معاشی سدھار پر گفتگو رہی"۔ غرض ندوۃ المصنفین کے ہال میں بیٹھے ہوئے تمام حضرات میری طرف متوجہ ہو گئے۔ تب پروفیسر سعید احمد اکبرآبادی نے مفتی صاحب سے کہا کہ "مفتی صاحب! ڈاکٹر یوسف الدین نے فقہ و اصول فقہ کی ساری کتابیں بی۔ اے اور ایم۔ اے میں عربی دانوں سے پڑھی ہیں، مفتی صاحب نے کہا: پھر تو ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ ؂ عمر گذری ہے اسی دشت کی سیاحی میں!

میں نے فوراً ہی جواب دیا کہ یہ آں محترم کی ذرّہ نوازی ہے آپ کا مقام بہت بلند ہے میں تو ابھی طفل مکتب ہوں اس میدان فقہ میں تو ابھی قدم رکھا ہے اور ٹھاٹیں مارتا ہوا فقہ اور فقہی مسائل کا ایک سمندر میرے سامنے ہے، بات کاٹتے ہوئے مفتی صاحب نے کہا: عصر جدید میں ایسے ہی نوجوانوں کی ضرورت ہے کہ ایک طرف اصل عربی دانوں سے فقہ پڑھی ہو اور ساتھ ہی ساتھ انگریزی اور جدید علوم بھی پڑھے ہوں۔ پھر مفتی صاحب نے پوچھا: ایم۔ اے میں آپ کے مقالہ کا کیا عنوان تھا؟ میں نے کہا: حضرت مفتی صاحب آپ تو جانتے ہی ہیں معاشیات (اکنامکس) اور علم تجارت (کامرس) کے تمام ابواب فقہ کی کتابوں میں ملتے ہیں اس لیے اسلام کے چند معاشی نظریوں پر میں نے مقالہ لکھا تھا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب میرے مقالہ کے ممتحن مقرر ہوئے اور ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب نے مقالہ کو سراہتے ہوئے اپنی یہ جچی تلی رائے دی کہ مقالہ نگار کو اعلیٰ تحقیق کا موقع دیا جائے۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب کی سفارش پر ہی مجھے ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لیے کام کرنے کا موقع دیا گیا۔ محترم سعید احمد اکبر آبادی صاحب نے کہا: ڈاکٹر یوسف الدین صرف انگریزی یا عربی ہی نہیں بلکہ عربی کے ساتھ ساتھ فارسی، ترکی اور جرمن بھی جانتے ہیں، دکن کی دراوڑی زبان تلنگی بھی جانتے ہیں اور شمالی ہند کی ہندی اور ناگری رسم الخط بھی اور ساتھ ہی ساتھ ڈاکٹر انور اقبال قریشی صدر شعبۂ معاشیات عثمانیہ یونیورسٹی سے جدید علم معاشیات بھی پڑھا ہے اور پیرس یونیورسٹی کے ڈاکٹر حمید اللہ کے قریبی رشتہ دار بھی ہیں۔

غرض مفتی عتیق الرحمٰن صاحب سے گھنٹہ آدھا گھنٹہ کی پہلی ملاقات رہی لیکن مفتی صاحب کا خلوص، شفقت اور مفتی صاحب کی اعلیٰ قابلیت سے اتنا متاثر ہوا کہ جب بھی دہلی جاتا مفتی صاحب کی محبت کشاں، کشاں مجھے ندوۃ المصنفین کے دفتر لے جاتی تاکہ حضرت مفتی صاحب سے نیاز حاصل کروں، قریباً ساڑھے چار سال کی عمر میں مولانا

عبدالباری فرنگی محلی کو دیکھا تھا جب وہ بلدہ حیدرآباد آئے تھے اور خاکسار کی ماموں زاد بہن حفیظ جمال صاحبہ (جو خاکسار کی بڑی بھاوج بھی ہیں) انھیں بسم اللہ پڑھائی تھی۔ مولانا بحرالعلوم عبدالعلی لکھنوی اور ہمارے خاندان سے صدی ڈیڑھ صدی سے تعلقات ہیں۔ مولانا شوکت علی کو بھی دیکھا تھا جب وہ حیدرآباد آئے تھے۔ لڑکپن میں دہلی کے حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا محمد علی جوہر، مفتی کفایت اللہ وغیرہ کو دیکھا تھا۔ مولانا حسین احمد مدنی سے نیاز ہی نہیں حاصل تھا بلکہ درس حدیث بھی لیا تھا۔ مولانا عبدالماجد دریا آبادی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حفظ الرحمن، مولانا محمد میاں، رام پور کے مولانا عرشی اور ڈاکٹر ذاکر حسین وغیرہ سے تو بارہا ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ اسی اُجڑے دیار دہلی کی آخری شمع جو حضرت مفتی صاحب کی شکل میں روشن تھی، افسوس وہ آخری شمع بھی گل ہوگئی اور صرف ان کی یاد تازہ کرنی ہے۔ پہلی ملاقات اور دوبارہ ملاقاتوں کے بعد خاکسار نے مشرق وسطیٰ کا طویل سفر کیا اور مہینوں بغداد، دمشق، بیروت، بیت المقدس، انقرہ، استنبول، قونیہ اور بروصہ وغیرہ کی خاک چھانی اور وہاں کے نادر، نادر عربی مخطوطات سے استفادہ کیا۔ مشرق وسطیٰ کے علمار سے ملا۔ سال بھر بعد دہلی پہونچا تو مفتی صاحب سے نیاز حاصل ہوا تو بڑے تپاک سے ملے اور ایسے ہی خوش ہوئے جیسے کوئی شخص اپنے چھوٹے بھائی قریبی رشتہ دار یا اپنے لڑکوں سے مل کر خوش ہوتا ہے۔ طویل تعلیمی سفر کا حال سنایا تو مفتی صاحب بہت خوش ہوئے۔ مشرق وسطیٰ کے مخطوطات علوم اسلامیہ خصوصاً فقہ، اصول فقہ کی نادر، نادر کتابوں کا حال سنایا تو مفتی اعظم مولانا عتیق الرحمن بہت خوش ہوئے۔ میں نے بتایا کہ ایم۔ اے کی جماعت میں، خاکسار نے ابن الرشد الہند کی کتاب بدایۃ المجتہد پڑھی تھی، قونیہ میں مولانا روم کے مزار کے احاطہ کے قریب یوسف آغا لائبریری ہے وہاں ابن الرشد کی ایک اور کتاب نہایۃ المقتصد دو ضخیم جلدوں میں قدیم قلمی نسخہ ہے، استنبول کے کتب خانہ میں دبوسی کی اسرار الفقہ نامی کتاب دو ضخیم جلدوں

میں ہے اور عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ مخطوطات میں بھی دبوسی کی یہ کتاب موجود ہے۔ انقرہ یونیورسٹی وغیرہ کے کتب خانوں میں ابو اللیث سمرقندی کی تفسیر بھی ہے اور بلدہ حیدرآباد کے رین بازار کے کتب خانہ میں ابو اللّیث سمرقندی کی پوری تفسیر موجود ہے اور نیز ایک حصہ رام پور میں اور ایک حصہ کتب خانہ سعیدیہ جام باغ میں ہے، رین بازار کے کتب خانہ میں ابو اللّیث سمرقندی کی جو تفسیر ہے وہ وزیر اعظم ترکی کے لیے لکھی گئی تھی اور آج وہ بلدہ حیدرآباد میں ہے۔ ابو اللّیث سمرقندی کی خوبی یہ ہے کہ وقت واحد میں وہ مفسر بھی تھے، محدث بھی تھے اور فقیہ بھی اس لیے قرآن کی آیتوں سے انھوں نے حنفی مکتب فقہ کے بہت سے قانونی مسئلے اخذ کئے ہیں شمس الائمہ سرخسی کی اصول فقہ پر ایک معلومات آفریں کتاب ہے۔ اس ضخیم کتاب کا کتب خانہ سعیدیہ میں بھی ایک قدیم مخطوطہ موجود ہے، خیر اصول فقہ کی یہ بے مثل کتاب مجلس احیاء المعارف النعمانیہ حیدرآباد کی طرف سے شائع ہو چکی ہے۔

پھر حضرت مفتی صاحب فقہ، اصول فقہ اور فن فتاویٰ کی کتابوں سے دلچسپی کے علاوہ تاریخ اسلام پر بھی عالمانہ شان رکھتے تھے۔ میں نے کہا: گذشتہ دفعہ جب آں محترم حیدرآباد آئے تھے تو آں محترم نے کتب خانہ سعیدیہ میں قدیم مؤرخ ابنِ عساکر کی تاریخ دمشق دیکھی تھی جو خود ابن عساکر کے دستِ مبارک سے لکھی ہوئی ہے کتب خانہ سعیدیہ میں ابتدائی چھ جلدیں ہیں اور آخری دو جلدیں میں نے مکتبہ ظاہریہ دمشق میں دیکھی ہیں اور اب تاریخ دمشق چھپ رہی ہے تو مفتی صاحب کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا۔

پھر مولانا روم اور ان کی مثنوی کا تذکرہ آیا۔ میں نے بتلایا کہ مرور زمانہ سے مولانا روم اور ان کی لاجواب مثنوی سے ترکوں کی دلچسپی میں فرق نہ آیا۔ چپراسی سے لیکر وزیر اعظم اور صدر جمہوریہ ترکی تک سے ملاقات ہوئی، ہر ایک نے یہی پوچھا کہ جب آپ

ترکی آئے ہیں تو مولانا رومؒ کی زیارت کے لئے قونیہ بھی جاؤ گے یا نہیں ؟ میں نے کہا: کیوں نہیں، ضرور جاؤں گا۔ آج بھی ترکی کی تمام مسجدوں کے منبر سے مثنوی مولانا روم سُنائی جاتی ہے، مفتی صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا ؎ ہست قرآن در زبان پہلوی۔!

غرض دو چار ملاقاتوں کے بعد مفتی صاحب اپنے رشتہ داروں اور صاحبزادوں کی طرح مجھے بھی اپنے خاندان کا ایک فرد سمجھنے لگے، یہ مفتی صاحب کی ذرّہ نوازی تھی کہ گذشتہ ۳۵ سال سے ماہنامہ برہان بڑی پابندی سے غریب خانہ کے پتہ پر میرے نام آتا ہے۔ جب کبھی دہلی جاتا تو پوچھتا: مفتی صاحب! برہان کا چندہ بھی لیں گے کہ نہیں ؟ مسکراتے ہوئے کہتے: ڈاکٹر یوسف! کوئی اپنے چھوٹے بھائی یا لڑکے سے چندہ لیتا ہے! استاد محترم مولانا سید مناظر احسن گیلانی مرحوم کی دو کتابیں: ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت ج ۱، ج ۲، اور مسلمانوں کی فرقہ بندی کا افسانہ تحفۃً دیں، میں نے جیب سے روپے نکالے، مفتی صاحب نے کہا: حساب دوستاں در دل، منت سماجت کرنے پر بھی رقم نہیں لی۔ اور میں نے اس بزرگ ہستی کا تحفہ شکریہ کے ساتھ قبول کر لیا۔ لیکن ادائی کی ایک ترکیب نکالی کہ گنا میٹھا ہو تو یہ معنے نہیں کہ جڑ پیڑ سے کھا لیا! جب کبھی برہان میں دیکھتا کہ ندوۃ المصنفین کی جانب سے کوئی نئی کتاب شائع ہوئی ہے تو مکتبہ نشاۃ ثانیہ کے توسط سے منگوا لیتا۔

استاد محترم مترجم قرآن ڈاکٹر سید عبد اللطیف بھی مولانا ابو الکلام آزاد سے ملنے اکثر دہلی آتے۔ آزاد صاحب کی تحریری خواہش پر ڈاکٹر لطیف نے ترجمان القرآن کو انگریزی کا جامہ پہنایا۔ آخر عمر میں ڈاکٹر صاحب کی ایک آنکھ کا آپریشن ناکام رہا اور دوسری آنکھ بھی بوڑھی ہو چلی، ڈاکٹر لطیف صاحب اپنے سکریٹری کی حیثیت سے دہلی لے جاتے۔ آزاد صاحب کے دولت کدہ پر عموماً شام میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب اور

مفتی عتیق الرحمٰن صاحب وغیرہ آجاتے۔ ڈاکٹر لطیف صاحب سے ہمیشہ مفتی صاحب سے طویل گفتگو رہتی۔ مفتی صاحب سے ملاقات کے لیے آخری بار آیا تو نواب میر اکبر علی خاں صاحب سابق گورنر یوپی کی ایک: "میرے دوست ڈاکٹر لطیف" کو پڑھ کر سنایا۔ نواب میر اکبر علی خاں صاحب نے مولانا آزاد کے انتقال کے سلسلہ میں لکھا ہے:

"حضرت مولانا ابوالکلام کا جب انتقال ہوا، اس رات میں، اور ڈاکٹر لطیف صاحب رات بھر مولانا ہی کے گھر میں تھے۔ جب ڈھائی بجے مولانا صاحب کا انتقال ہوا، اور دس منٹ کے اندر ڈاکٹر بی۔سی رائے کے ٹیلی فون پر پنڈت جی وہاں آگئے اور اپنی کیبنٹ کونسل کی میٹنگ طلب کی اور اظہارِ تعزیت کیا۔ اور تدفین کے انتظامات کا پروگرام مرتب کیا، یہ انتظامات بطور خاص مولانا حفظ الرحمٰن اور مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی اور جناب بخشی غلام محمد (وزیر اعلیٰ کشمیر) کے سپرد فرمائے۔ تدفین کے بارے میں پنڈت جی نے فرمایا کہ: جہاں آپ لوگ مناسب سمجھیں اسی مقام پر جملہ انتظامات کئے جائیں گے اور میں چاہتا ہوں کہ پورے اسلامی احکامات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے مولانا آزاد کی تجہیز و تکفین کا انتظام کیا جائے چنانچہ موجودہ مقام کا جب انتخاب کیا گیا تو دہلی کے کمشنر نے یہ اعتراض کیا کہ یہاں پلاننگ کے تحت یہ مقام اس غرض سے نہیں دیا جا سکتا، جس پر پنڈت جی بے حد برہم ہوئے اور اس کا سختی سے تدارک کیا۔ پنڈت جی نے فرمایا کہ: نہ صرف یہ مقام بلکہ پورا ہندوستان مولانا صاحب کا ہے جو جگہ آپ (مولانا حفظ الرحمٰن صاحب، مفتی عتیق الرحمٰن صاحب) منتخب کریں حکومت ہند اس پر عمل آوری کرے گی، چنانچہ رات ہی میں ڈاکٹر راجندر پرشاد صدر جمہوریہ ہند اور ڈاکٹر رادھا کرشنن نائب صدر بھی مولانا صاحب کی قیام گاہ پر اظہار تعزیت کے لیے آئے تھے" صہ ۱۸

حضرت مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کو ہندوستان کے قدیم علمار کے کارناموں سے بڑی دلچسپی تھی، علوم اسلامیہ خصوصاً فقہ اصول فقہ اور فتادیٰ کی کتابوں سے تو گویا عشق تھا سال گذشتہ جب نیاز حاصل ہوا تو شہنشاہ عالم گیر کے استاد ملا جیون کی مشہور کتاب نورالانوار شرح منار کا تذکرہ آیا۔ پھر علامہ بہاری کو حیدرآباد کا حاکم عدالت مقرر کیا تھا پھر حیدرآباد سے بدخشاں کو شہزادے معظم کا اتالیق مقرر کر کے بھیجا۔ فتاویٰ عالمگیری اور پھر فتاویٰ تاتارخانیہ کا تفصیلی تذکرہ آیا۔ میں نے کہا: امام اعظم نے جو مجلس وضع قوانین چالیس علمار کی مقرر کی تھی اس کی حیثیت خانگی تھی، فتاویٰ تاتارخانیہ کی حیثیت نیم سرکاری تھی کہ سلطان غیاث الدین تغلق کے وزیر عدالت کی سرپرستی میں یہ کام ہوا، اور فتاویٰ ہندیہ یعنے فتاویٰ عالم گیری کی سرکاری حیثیت سے حکومت کی نگرانی میں تدوین عمل میں آئی اور اس کے بعد عثمانی ترک خلفار نے قانون مجلہ کی تدوین کی۔ آخر میں، میں نے کہا: ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے والد مرحوم کے کتب خانہ، خانہ خلیل، چارقندیل، آغا پورہ، حیدرآباد میں فتاویٰ تاتارخانیہ کا مکمل سٹ موجود ہے، حضرت مفتی صاحب اس خوشخبری سے اتنے مسرور ہوئے کہ گلے سے لگا لیا۔ آخری ملاقات کے لیے گیا فتاویٰ تاتارخانیہ کی پوری تفصیل سنی اور کہا کہ یہ تفصیل جناب حکیم عبدالحمید صاحب صدر ہمدرد ٹرسٹ دہلی اور مولانا سجّاد صاحب پرنسپل مدرسہ فتح پوری کو ضرور سنانا۔ میں نے کہا کہ آپ سے نیاز حاصل کر کے حسب روایت قدیم محترم حکیم عبدالحمید صاحب سے نیاز حاصل کروں گا۔ میں نے کہا: جناب مفتی صاحب! فتاویٰ تاتارخانیہ کو پبلک میں روشناس کرانے کا سہرا تو ندوۃ المصنفین دہلی کے سر ہے کہ "ندوۃ المصنفین کی شائع کردہ کتاب "ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت" از پروفیسر سید مناظر احسن گیلانی مرحوم میں فتاویٰ تاتارخانیہ کا تفصیلی تذکرہ ہے۔

حضرت مفتی صاحب سے آخری ملاقات گذشتہ سال، عیدالفطر کی تعطیلات میں

پی، ایچ۔ ڈی کا زبانی امتحان لینے کے لیے میں علی گڈھ پہونچا۔ علی گڈھ میں ہی اطلاع ملی کہ مفتی عتیق الرحمٰن صاحب علیل سے ہیں۔ مثل سابق علی گڈھ سے دہلی پہونچا۔ فجر کی نماز جامع مسجد دہلی میں ادا کی، خلاف توقع حضرت مفتی صاحب دکھائی نہ دیے، ناشتہ کر کے فوراً ندوۃ المصنفین کے دفتر پہونچا۔ گھنٹی بجائی۔ کوئی ہو تو جواب دے۔ اتفاق سے ایک طالب علم اُدھر سے گذر رہا تھا ازراہ عنایت پوچھا: آپ کس سے ملنا چاہتے ہیں ؟ میں نے کہا: حضرت مفتی عتیق الرحمٰن صاحب سے، تب اس نے کہا: کہ وہ تو عرصہ سے بیمار ہیں چل پھر نہیں سکتے۔ قریب ہی مفتی صاحب کا دولت خانہ ہے، پھر اس نے مفتی صاحب کے دولت کدہ کی نشان دہی کر دی، حضرت مفتی صاحب کے دولت کدہ پہونچا، گھنٹی بجائی۔ ایک لڑکا دوڑتا ہوا آیا اور پوچھا: آپ کس سے ملنا چاہتے ہیں ؟ میں نے کہا: حضرت مفتی صاحب کی خدمت میں سلام عرض کرنے کے لیے حیدر آباد سے آیا ہوں، میرا نام ڈاکٹر محمد یوسف الدین ہے، لڑکے نے کہا: دادا صاحب کو سلام پہونچا دیتا ہوں، آپ ذرا ٹھہریے، مفتی صاحب جواب دیں تو آکر پیام پہونچا دوں گا۔ دو ہی منٹ میں لڑکا دوبارہ آیا اور کہا: مفتی صاحب اندر آنے کے لیے کہتے ہیں۔ میں نے کہا: اندر گوشہ تو نہیں ؟ مسکراتے ہوئے کہا: زنانہ ہٹ گیا ہے۔ مفتی صاحب تو کہتے ہیں کہ وہ ہمارے رشتہ دار کی طرح ہیں۔ میں نے کہا کہ مفتی صاحب کی یہ ذرّہ نوازی اور عنایت ہے۔ پھر لڑکا آگے آگے اور میں پیچھے پیچھے چلا۔ کمرہ تک پہونچا دیا۔ مفتی صاحب مجھے دیکھتے ہی بستر سے اٹھ بیٹھے۔ میں نے سلام کیا اور ہاتھ کو بوسہ دیا، میری بھی خیریت پوچھی اور خوشی کا اظہار کیا: اور پلنگ پر ہی گاؤ تکیے سے ٹیکا لگا کر اطمینان سے بیٹھ گئے۔

آدھا گھنٹہ تک پُر لطف علمی گفتگو رہی۔ فالج کے باوجود دماغ اچھی طرح کام کر رہا تھا اور حافظہ بھی بلا کا تھا۔ خود ہی دریافت فرمایا: مولانا سید مناظر احسن گیلانی مرحوم کی یاد میں آپ نے گیلانی اسکول آف پرنٹنگ قائم کیا تھا۔ ایک رنگ والے نے ۵، ہزار

مالیت کے قرآن مجید کے بلاک توڑ پھوڑ دیے تھے اور میں نے فخر الدین علی احمد صاحب صدر جمہوریہ ہند کو توجہ دلائی تھی، پھر کیا ہوا؟ میں نے کہا: صدر جمہوریہ ہند نے ریاستی حکومت کو توجہ دلائی ۔ رنگ والا یوسف سیٹھ چپکے سے اپنے وطن مارواڑ میں جاکر عرصہ تک روپوش رہا اور فخر الدین علی احمد صاحب کی رحلت کے بعد مارواڑ سے پھر حیدر آباد آگیا ہے۔

پھر میں نے کہا: مفتی صاحب! فالج اب لا علاج نہ رہا۔ کالی کٹ، کیرالا کے دوا خانہ میں بہترین علاج ہوتا ہے۔ مجھے گٹھیا کی شکایت ہوئی تھی تو اسی دوا خانہ میں شریک ہوا۔ ہفتہ بھر میں صحت یاب ہو کر بلدہ حیدر آباد آگیا۔ دہلی سے راست ٹرین مدراس جاتی ہے اور مدراس کے ویٹنگ روم میں شام تک ٹھہرے رہیں تو وہاں سے سر مغرب کیرالا جانے کا اکسپریس ملتا ہے اور صبح سویرے کالی کٹ پہونچا دیتا ہے۔ دہلی، مدراس اور کالی کٹ کے اسٹیشنوں پر بیماروں کی سہولت کی خاطر ڈھکیلنے والی کرسیاں موجود ہیں ۔ انشاء اللہ آپ بھی کامل صحت یاب ہو جائیں گے ۔ پھر مفتی صاحب نے میرے ڈاکٹریٹ کے مطبوعہ مقالہ اسلام کے معاشی نظریے کے جدید ایڈیشن سے متعلق دریافت کیا ۔ میں نے کہا۔ مشرق وسطیٰ خصوصاً بغداد، دمشق، بیروت، حلب اور استنبول۔ قونیہ، بروصہ، ترکی کے کتب خانوں کی نایاب مخطوطوں سے بہت سا مواد اکٹھا کرلیا تھا اب تین سال قبل حج وزیارت کی سعادت حاصل ہوئی تو مکہ معظمہ اور خصوصاً مدینہ منورہ کے کتب خانوں سے مزید مواد اکٹھا کر لیا ہے اور پورے مطبوعہ مقالہ کی نظر ثانی کر رہا ہوں اور مزید معاشی معلومات کا اضافہ کر رہا ہوں۔ آخر میں حضرت مفتی صاحب سے کہا: کہ پاکستان کے پبلشروں اور ناشروں نے بغیر علم و اطلاع اور بغیر اجازت میرے مقالہ کو چھاپ دیا ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے خون اور ہڈیوں پر پاکستان کی تعمیر ہوئی اب بھی ان کا اخلاقی معیار ایسا ہے کہ رائلٹی تو کجا بغیر علم و اطلاع کتاب

چھاپ لیتے ہیں اور پھر ہندوستانی مطبوعات کا داخلہ عرصہ سے بند ہے۔ ایسے تمام ناشر جو بغیر اجازت ہندوستانی مطبوعات چوری سے چھاپتے ہیں، پاکستان اسلامی مملکت ہونے کا دعویٰ کرتا ہے تو چوری سے چھاپنے والوں کے ہاتھ کاٹنے چاہئیں، جرمانہ کے علاوہ رائلٹی وصول کرنی چاہیے۔ یہ سُن کر حضرت مفتی صاحب مسکرانے لگے اور کہا: ڈاکٹر یوسف! پاکستان والوں نے ایک نہیں بلکہ بہت سی ندوۃ المصنفین دہلی کی کتابیں چھاپ لیں اور بطور رائلٹی ایک پیسہ نہیں دیا۔ اس کے بعد ہی اندر سے چائے بسکٹ اور پان آ گئے۔ فارغ ہوتے ہی اٹھا لیکن مفتی صاحب نے کہا: عید ہی کا ہفتہ ہے اور جب آپ آتے ہی قدیم، قدیم نادر عربی کتابوں کا حال سُناتے ہو وہی میرے لیے عید کا دن ہے۔ غرض عطردان آیا۔ مفتی صاحب نے خود ہی عطردان آگے بڑھایا۔ عطر لے لیا اور خدا حافظ کہا۔ مفتی صاحب نے بھی ہاتھ ملایا اور فی امان اللہ کہا، مجھے کیا خبر تھی کہ یہ میری اُن سے آخری ملاقات ہے!

محترم حکیم عبدالحمید صاحب بھی، مفتی صاحب کی طرح تپاک سے ملتے ہیں۔ چند سال قبل میں سمّیت غذا کا شکار ہوا اور پورے دو ماہ بے ہوش رہا تو غریب خانہ پہونچ گئے اور جب انھیں معلوم ہوا کہ صحت یاب ہو چکا ہوں تو بنگلور کا سفر ملتوی کر کے بلدہ حیدرآباد پہونچے اور کہا کہ مکّہ مسجد (بلدہ حیدرآباد) چلیں گے اور عالمگیر کے سفید تخت کے پاس دو رکعت شکرانہ ادا کریں گے۔ چند ماہ بیشتر اطلاع ملی کہ جناب حکیم عبدالحمید صاحب کی محلی محترمہ کا انتقال ہو گیا ہے، اپنے کرم فرما طبیب پر یہ سانحہ میرے لیے غمگین تھا۔ پھر حضرت مفتی صاحب کے انتقال کی خبر ملی تو گویا دل ہی بیٹھ گیا۔ مجھے سن کر اسٹروک ہوا۔ اور ماہ مئی موسم گرما میں جاڑا۔ بخار آنے لگا۔ تین روز تک بے ہوش اور ۱۵ دن تک نیم بے ہوش رہا۔ پھر پرانا مرض گٹھیا عود کر آیا۔ کئی ہفتہ تک صاحب فراش رہا۔ جرمن مرہم Bayoline بیؤلین خاکسار کے بھانجے ہلال مرتضیٰ سلمہٗ نے

جدہ سے روانہ کیا تو اب میں صحت یاب ہوا ہوں۔ ہنوز لکڑی کے سہارے چلتا ہوں، بستر پر لیٹے لیٹے یہ چند صفحے لکھ دیے۔ حضرت مفتی صاحب پر میر تقی میر کا یہ شعر صادق آتا ہے۔ ؎

بارے دُنیا میں رہو غم زدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو
میرؔ

ندوۃ المصنفین دہلی حضرت مفتی صاحب کی قیمتی یادگار ہے۔ اس کو ترقی دینا اور آگے بڑھانا تمام اُردو داں طبقہ کا کام ہے۔

SHYAM LAL YADAV
Deputy Chairman
Rajya Sabha

Phones : Off. : 38 11 71, Res. : 37 64 66
Off. : 32, PARLIAMENT HOUSE
NEW DELHI
Res. : 4, AKBAR ROAD,
NEW DELHI

May 17, 1984

Dear Shri Munib Rahman,

I was deeply grieved to learn about the sudden demise of Mufti Atiqur Rahman. He was a great scholar of international repute. I had occasion to meet him several times. He was highly cultured and a secular leader in his own way. In his passing away we have lost a man of great distinction and learning. I convey my heartfelt condolences to you and other members of the bereaved family. I pray Almighty for his blessings to you all and peace to the departed soul.

Yours sincerely,

(Shyam Lal Yadav)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ذاتی تاثرات

"آسماں اُن کی لحد پر شبنم افشانی کرے"

از ڈاکٹر ریحانہ ضیاء
شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

بچپن میں اکثر اپنے والد صاحبؒ (مولانا ضیاء الدین احمد) سے بزرگان دین کی عظمت، علمیت کے واقعات دلچسپی سے سنا کرتی تھی جو بہت مؤثر اور سبق آموز اور اصلاحی ہوا کرتے تھے۔ خوش قسمتی اور حسن اتفاق کہ اس ناچیز کو علمی مشاغل اور اور مذہبی و ادبی ذوق کی وابستگی کی بناء پر بزرگان دین کی دعاؤں اور شرف ملاقات کا موقعہ بھی فراہم ہوا اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہمارے مشفق و مخلص بزرگ مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ تھے، آج جن کو مرحوم لکھتے دل دُکھ رہا ہے۔ لیکن درحقیقت موت، قدرت کا ایسا اٹل قانون ہے جہاں، عقل و خرد فہم و فراست کی تمام تدبیریں ناکام ہو جاتی ہیں۔ بقول علامہ اقبال ؎

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

لیکن بعض شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جو ہر دور میں اپنے کارناموں کی وجہ سے نظروں سے اوجھل ہونے کے باوجود دل و دماغ اور تاریخ کے صفحات سے کبھی فراموش نہیں ہوتیں۔

مفتی صاحب جن کو خاندانی گہرے مراسم دیرینہ کی وجہ سے ہم سب بہن بھائی

"اباجی"، کہا کرتے تھے اور وہ عملی طور پر اس طرح مشفق اور مہربان رہے ہمیشہ کہ والد صاحبؒ کی اچانک وفات کے بعد جب جب اس احساس نے تڑپایا کہ اس تعلق کو کہاں تلاش کریں تو بے ساختہ مفتی صاحبؒ کی طرف نظریں اٹھ جاتی تھیں۔ دہلی میں اپنے قریبی عزیز ہونے کے باوجود کبھی اُن سے ملے بغیر دہلی سے جانے کا تصور نہیں کیا۔ ان کے ساتھ سارے گھر والے خلوص سے پیش آتے تھے۔ لیکن ان کی اکلوتی صاحبزادی "شگفتہ باجی" سے اس درجہ مانوس اور بے تکلف ہیں کہ ان کے اخلاق و محبّت کی وجہ سے کہ وقت اتنی بجلی کی سی سُرعت کے ساتھ گزر جاتا کہ دوبارہ آنے کا وعدہ یا علی گڈھ آنے کی دعوت کا اصرار کر کے بادل ناخواستہ واپس آجاتے۔ ان کے یہاں دوران قیام بھی اکثر واسطہ اور تعلّق ان کی صاحبزادی سے رہتا جس وجہ سے ایسا محسوس ہوتا کہ وہ اپنے والدؒ کی اخلاق و صفات کا عکس ہیں اور ان کے ساتھ ساتھ مفتی صاحبؒ کے صاحبزادوں اور ان کے متعلقین کا خلوص درواداری بھی قائم رہتا۔

میں مفتی صاحبؒ کی عظمت و شخصیت اور علمیت کے اظہار کے قابل تو نہیں ہوں البتہ ان کی شفقت اور بے لوث تعلّق اور دعائیں جو ہمارے ساتھ رہی ہیں ان تاثرات قلبی کو قلم بند کرنے کی حقیر کاوش ہے جو ان کے شایان شان اگرچہ یقیناً نہیں ہیں تاہم ان کو یاد کرنے کا ایک ذریعہ ضرور ہے۔

طالب علمی کے سنہرے دور میں پہلی بار مفتی صاحبؒ سے جب ملاقات ہوئی جو کل کی بات لگتی ہے شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علیگڈھ میں استاد محترم پروفیسر سعید احمد اکبرآبادیؒ صدر شعبہ تھے ان کی محبّت افزائی سے .B.Th داخلہ لیا گیا۔ فائنل کا وائے وا ہونے والا تھا، تحریری امتحان سے زیادہ وائے وا کے تصور سے جو پہلی بار ہو رہا تھا (اور جب بھی ہوا پہلی بار ہی لگا) ہوش و حواس منتشر تھے۔ موجودہ ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ استاد محترم پروفیسر منظہر الدین بلگرامی صاحب تھے اور معلوم کر دہلی سے

Examiner بھی تشریف لا چکے ہیں، میرا نمبر آیا کمرے میں داخل ہوئی تو سامنے ہی مفتی صاحبؒ کا مشفق مسکراتا چہرہ نظر آتے ہی ایسا لگا کہ امتحان کے ہال کے تپتے ہوئے ماحول میں ٹھنڈی ہوا کا اک جھونکا آگیا۔ انہوں نے سوالات شروع کیے۔ بہت آسان تسلی بخش پرسکون انداز سے کہ قرآن و حدیث فقہ کے مشکل سوال بھی کافی حد تک آسان لگے اور میں اس دشوار مرحلہ سے بہ آسانی گزر گئی۔ خوش قسمتی اور حسن اتفاق کہ دینیات میں (M th) ایم۔ اے کرنے کے بعد جب ایم فل کیا تو اس وقت بھی میرے ایم فل اور P.H.D. کے (Examiner) محترم مفتی صاحبؒ مقرر ہوئے، اور اپنے ریسرچ کے سلسلہ میں والد صاحبؒ کے ہمراہ دیوبند تھانہ بھون، جلال آباد، سہارنپور کے کتب خانوں اور حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے خلفاء سے علمی استفادہ کرتی ہوئی دہلی مولانا سید محمد میاں صاحبؒ اور مفتی عتیق الرحمٰن صاحبؒ سے اپنے مقالہ کے موضوع پر مواد فراہم کرتی ہوئی علی گڈھ واپس آئی۔

مفتی صاحبؒ علماء کی آمد و رفت اور مہمانوں کے ہجوم کے باوجود بھی اس ناکارہ کو اپنے قیمتی وقت کا کچھ حصہ ضرور دیتے اور پھر بے حد خوش ہو کر دعائیں دیتے جس دل سے انھوں نے دعائیں دیں ہیں اور میری معمولی علمی محنت کو سراہا ہے اسی کا فیض ہے کہ حصول علم کی منزل سے چلنا آسان ہو گیا۔ جد و جہد اور کوشش کرنا انسان کا فرض اولیں ہے۔ لیکن بعض اوقات اس حقیقت کا بھی اعتراف کیے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ ؎

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

میرا تحقیقی کام جاری تھا کہ اچانک معلوم ہوا کہ ابّا جی پر فالج کا حملہ ہوا ہے۔ میرے بڑے بھائی (مولانا عبد الرحمٰن صدر شعبۂ عربی مغربی بنگال میں ہیں) ان کے ہمراہ دہلی گئی۔ مزاج پرسی کے لیے آنے والوں کا اک تانتا بندھا ہوا تھا۔ جب ذرا

ہجوم کم ہوا تو عمید بھائی نے ہماری آمد کے بارے میں جیسے ہی بتایا فوراً مفتی صاحب نے بلا لیا بہت دیر تک مختلف انداز سے ہم سب کی خیریت معلوم کرتے رہے۔ خصوصاً بھائی جان سے باوجودیکہ عمر کے لحاظ سے ان کی اولاد کے دائرے میں ہیں۔ لیکن بحیثیت عالم اس طرح احترام و تعلق سے پیش آئے کہ ہمیں ان کے حسن اخلاق، خندہ پیشانی اور گفتگو سے اس علالت کے باوجود حیران ہو رہی تھی۔ نہ اپنی تکلیف کا اظہار نہ تھکن کا احساس غرض اخلاق و کردار نرم گفتاری کا اک مجسمہ لگ رہے تھے، قوت برداشت کی انتہا یہ تھی کہ خود اپنی علالت سے قبل کئی سال سے (اہلیہ) جسمانی، ذہنی معذوری کے ساتھ صاحب فراش تھیں لیکن کبھی گھر دفتر اور سفر کے معمولات میں کسی خانگی الجھن یا ناگواری کا پتہ نہ چلتا تھا۔ حالانکہ امّاں جی، کے بارے میں سب جانتے تھے کہ کس قدر باوقار منظم اور سلیقہ مند دین دار خاتون تھیں لیکن ان کی طویل علالت کے باوجود مفتی صاحبؒ ان کی دل جوئی، علاج اس اہتمام پابندی سے کرتے رہے کہ حقوق کی ادائیگی اور حسب مراتب سب سے مروّت و لحاظ میں ان کے عالمانہ عظمت کی روشن دلیلیں نظر آتی تھیں۔ ان تمام مسائل کے ساتھ علمی کاموں میں آپ کی مصروفیت اور لگن کی بہترین مثال ندوۃ المصنفین دفتر برہان کا نظم و ضبط ہے جو آج بھی قائم نظر آتا ہے۔ خدا ہمیشہ اس کو قائم رکھے۔ اور ان کے صاحب زادے عمید بھائی کو ہمّت و قوت نصیب کرے جنھوں نے دفتر کو سنبھال رکھا ہے۔

میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ میرا اوائے وا اتنی جلدی ریسرچ کا دہلی میں مفتی صاحب کے زیر سایہ ہو جائے گا۔ علی گڈھ میں ایڈوانس اور بورڈ آف اسٹڈیز کی میٹنگ میں examiners کے دوسرا مقرر کرنے کے لیے طے ہونے والا تھا، جس کا مطلب یہ تھا کہ تحقیق کے کام کی تکمیل کے لیے ایک دو سال اور تاخیر ہونی ضروری تھی۔ لیکن جب ہمارے سابق وائس چانسلر سید حامد صاحب نے جو اکثر مفتی صاحب کی مزاج پرسی کو

تشریف لے جاتے تھے، یہ طے کردیا کہ وہ جسمانی طور پر معذور ہیں، مگر ذہنی طور پر اس قابل ہیں کہ ان کا وائے وادہلی میں ہوسکتا ہے تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی پھر میں وائے وا کی تاریخ مقرر ہونے کے بعد وقت مقررہ پر صدر شعبۂ دینیات، مسلم یونیورسٹی پروفیسر قاری رضوان صاحب مرحوم کے ہمراہ مفتی صاحبؒ کے ہاں دہلی میں وائے وا دینے گئی اور تادم زیست غالباً وہ وقت نہ فراموش کرسکوں گی جب مفتی صاحب زندگی کے آخری دور سے گزر رہے تھے اور میری اس تحقیق کا یہ آخری مرحلہ درپیش تھا، نصف گھنٹہ تک آہستہ آہستہ تفسیروں سے متعلق مقالہ کے بارے میں پوچھتے رہے ان کے چہرے کا اطمینان، لہجہ کی نرمی ان کی علمی صلاحیتوں اور ذہنی تازگی کے ساتھ برقرار تھی۔ پھر صدر شعبہ قاری صاحب سے کہا۔ اب آپ پوچھیے کچھ سوالات کریے، کچھ سوالات انھوں نے بھی کیے اور میں نہ جانے کس طرح جوابات دیتی رہی، امتحان کا وقت گزر گیا، اور خدا کا شکر کہ اک عالم وقت مشفق استاد، روحانی بزرگ کی توجہ سے اپنی ٹوٹی پھوٹی محنت کا لافانی صلہ لے کر علی گڈھ آگئی۔۔۔

پھر میری ملاقات ایک ماہ بعد اُن سے آل انڈیا میڈیکل انسٹی ٹیوٹ میں اس حالت میں ہوئی کہ ان کے دماغ میں کینسر جیسا موذی مرض تشخیص کردیا گیا تھا۔ وہ اس شدید مرض سے بھی ضبط و صبر کے ساتھ گزر رہے تھے، موت وحیات کی کش مکش میں ان کو اس کیفیت میں دیکھ کر برداشت نہ کرسکی، شام کو ان کی صاحب زادی کے ساتھ واپس گھر آگئی، گھر کے در و دیوار سے اداسی ٹپک رہی تھی۔ سب ان کی خدمت میں بے قراری سے لگے ہوئے تھے۔

علی گڈھ آئے ایک ہفتہ نہیں گزرا تھا کہ پتہ چلا حالت نازک ہے، دوسرے دن جو نہ سننا چاہ رہے تھے وہ بھی سُن لیا۔ مفتی صاحب اس دار فانی

سے رخصت ہو گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

وہ اپنی عظیم شخصیت کے ابدی نقوش چھوڑ گئے لیکن ہم ایک عظیم سائے سے محروم ہو گئے۔

بس خدا سے دعا ہے، خدا ہمیں، سب کو صبر دے، ان کا مقام بلند کرے

نمونۂ سلفِ صالحین تھا، نہ رہا

جناب مولانا محمد عثمان صاحب ساحر مبارکپوری۔ مدرس منبع العلوم، خیرآباد، اعظم گڈھ

نمونۂ سلفِ صالحین تھا نہ رہا ۔۔۔ امین رازِ کتاب مبین تھا نہ رہا

خبیرِ رمزِ حدیثِ رسول اصلِ اصول ۔۔۔ دلیلِ راہِ سلوک و یقین تھا نہ رہا

فقیہِ عصر مثال و نظیر کا مرجع ۔۔۔ وہ جزئیات کا بابِ حسین تھا نہ رہا

معاشرت کے نشیب و فراز کا واقف ۔۔۔ مشاورت کا قدیمی امین تھا نہ رہا

فلاحِ قوم کا دلدادہ، چارہ سازِ وطن ۔۔۔ ادا شناسِ دلِ مسلمین تھا نہ رہا

وہ پختہ کار، وہ علم و عمل کا مجموعہ ۔۔۔ مکانِ صدق و صفا کا مکین تھا نہ رہا

وقارِ گوشہ نشینان آسماں پیما ۔۔۔ چراغِ خانقۂ عارفین تھا نہ رہا

جمالِ مسندِ تدریس، مرکزِ افتا ۔۔۔ زبانِ قوم، سفیرِ امین تھا نہ رہا

سہیمِ رزمِ وطن، افتخارِ بزمِ سخن ۔۔۔ نقیبِ ملت و برہانِ دین تھا نہ رہا

سیاسیات میں الجھے ہوئے مسائل کا ۔۔۔ بطورِ خاص مشیر و معین تھا نہ رہا

امیرِ قافلۂ علم، خادمِ علما ۔۔۔ رہینِ حلقۂ عقدِ ثمین تھا نہ رہا

وہ غمزدوں کا بہی خواہ و معتمد ساحر

ستم رسیدوں کا حصنِ حصین تھا نہ رہا

مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کی رحلت

از اظہر صدیقی برہان آفس دہلی

کل ہند مسلم مجلس مشاورت کے صدر، جنگ آزادیِ ہند کے عظیم و محترم مجاہد باوقار قومی و ملی رہنما، حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی ۱۲ رمئی کو بعد ظہر دو سال کی علالت کے بعد انتقال فرما گئے۔ آپ کی نماز جنازہ دوسرے دن صبح ۸ بجے دہلی کی تاریخی جامع مسجد میں مولانا عبداللہ بخاری شاہی امام نے پڑھائی۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ جنازہ اور تدفین میں شریک ہوئے۔ آپ کے انتقال کی خبر سے پوری دہلی اور پورے ملک میں رنج و غم کی گھٹا چھا گئی۔

جامع مسجد اور آس پاس کے علاقہ کے تمام بازار بند ہو گئے۔ اور آپ کی رہائش گاہ پر لوگوں کا تانتا بندھ گیا۔

ہندوستان کے مختلف شہروں سے مفتی صاحب کے انتقال پر ملال پر تعزیتی جلسوں کی اطلاعات مل رہی ہیں۔ وزیراعظم ہند مسز اندرا گاندھی نے آپ کے انتقال پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے آپ کو بلند پایہ عالم دین، سرکردہ مجاہد آزادی اور عظیم محب وطن قرار دیا ہے۔

مولانا مفتی عتیق الرحمان عثمانی ہندوستان کے ممتاز صاحب بصیرت

درد مند عالم دین اور عظیم مسلم رہنما تھے۔ آپ ۱۹۰۱ء میں دیو بند کے ایک مشہور علمی خاندان کے بزرگ مولانا مفتی عزیز الرحمان صاحب عثمانی کے یہاں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم سے آخر تک دار العلوم دیو بند کے جیّد اساتذۂ کرام سے حاصل کی۔ اور امتیازی حیثیت سے کامیابی حاصل کی۔ فراغت کے بعد آپ کو اکابر دار العلوم نے افتار وتدریس کی خدمات سپرد فرمائیں۔ جس کو آپ نے نہایت قابلیت کے ساتھ انجام دیا۔

کچھ عرصہ بعد آپ ڈابھیل تشریف لے گئے۔ اور وہاں جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں مفتی و مدرس کی حیثیت سے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ اسی زمانہ میں گاندھی جی کی مشہور نمک تحریک کا آغاز ہوا۔ اور انگریز گورنمنٹ نے ان لوگوں کی جائیدادوں کو ضبط کرنا شروع کر دیا۔ جو اس تحریک میں حصّہ لے رہے تھے۔ آپ نے یہ فتویٰ صادر کیا کہ ان جائیدادوں کو خریدنا مسلمانوں کے لیے جائز نہیں ہے۔ اس فتویٰ سے جہاں تحریک میں جان پڑی وہاں گورنمنٹ بوکھلا گئی۔ اور اس نے مفتی صاحب کے خلاف وارنٹ جاری کر دیا اور آپ کو ملازمت ترک کرنی پڑی۔

آپ نے تحریک آزادیِ وطن میں سرفروشانہ حصّہ لیا اور اپنی پرجوش اور دلولہ انگیز تقریروں سے لوگوں کے دلوں میں آزادی کے جذبوں کی چنگاریاں روشن کیں۔

مفتی صاحب نے تقریباً پچاس سال تک سرگرمی، جانفشانی بصیرت اور اخلاص کے ساتھ ملّی خدمات سرانجام دیں۔ جمعیۃ علمائے ہند کے صفِ اول کے راہنماؤں میں شمار کیے جاتے تھے۔ جمعیۃ علمائے ہند کے علاوہ تمام مسلم تنظیموں اور بے شمار تعلیمی وسماجی اداروں میں آپ کی صلاحیتوں، اصابت رائے اور دانشمندانہ مشوروں کا اعتراف کیا جاتا تھا۔ اور آپ کی راہ نمائی سے فائدہ اٹھایا جاتا تھا۔

کل ہند مسلم مجلس مشاورت اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا، بورڈ کے لیے تو

آپ کی ذاتِ گرامی دل اور دماغ کی حیثیت رکھتی تھی۔ ان تنظیموں کو قائم رکھنے پروان چڑھانے اور ان کو زیادہ سے زیادہ مؤثر و مفید بنانے میں آپ کی بزرگ ومحترم شخصیت کی کلیدی حیثیت تھی۔ دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے اہم اور مؤثر ممبر تھے۔ کئی بار سنٹرل حج کمیٹی کے چیرمین رہے۔ سنٹرل وقف کونسل اور وقف بورڈ اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے کورٹ کے ممبر رہے۔

ندوۃ المصنفین دہلی جیسے ٹھوس علمی ادارہ کو قائم کرکے آپ نے ملت اسلامیہ عالم، دنیائے علم وادب اور دین ومذہب کی ناقابلِ فراموش خدمات انجام دیں۔ اہل فکر ونظر تسلیم کرتے ہیں کہ سخت اور دشوارکن حالات میں حضرت مفتی صاحب نے ایسا علمی کارنامہ سرانجام دیا ہے جس کا مقام تاریخ علم وادب میں بہت بلند ہے۔ کئی لاکھ صفحات پر مشتمل ٹھوس علمی وتحقیقی لٹریچر اس ادارہ سے شائع ہوا ہے جس کی قدر وقیمت اربابِ فکر ودانش اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ اخلاق و شرافت شائستگی وتہذیب، بلند حوصلگی وسعت قلب وفکر عفو ودرگذر وضعداری وپاسداری کی ایسی پاکیزہ خصوصیات آپ میں پائی جاتی تھیں جن کی وجہ سے آپ نہ صرف مسلمانوں کے تمام طبقوں بلکہ ملک وبیرونِ ملک کے دوسرے لوگوں میں بھی نہایت عزت واحترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ آپ صحیح معنوں میں انسانی ہمدردی اور خدمت خلق کا بہترین مجسمہ اور نکھرا ہوا نمونہ تھے۔ نہ جانے کتنے نوجوان ہیں جنہوں نے حضرت مفتی صاحب کی فکری رہنمائی کی روشنی میں اپنی زندگی کی راہوں کو روشن کیا ہے اور نہ جانے کتنے لوگوں کا مستقبل آپ کی اور آپ کی امداد و تعاون کی بدولت روشن ہوا ہے۔

تحریر وتقریر کے میدان کے کامیاب شہسوار تھے۔ زبان وقلم میں بلا کی شگفتگی ودلآویزی تھی۔ آپ کی تقریروں میں علم وروحانیت، فکر وبصیرت اور

تحقیق و کاوش کے جوہروں کے ساتھ ساتھ ادب کی چاشنی اور اسلوب کی دلآویزیاں چمکتی دمکتی نظر آتی ہیں۔ کئی اہم کانفرنسوں کی صدارت فرماتے ہوئے آپ نے جو خطبہ ہائے صدارت پیش کئے ہیں وہ بھی آپ کی ملّی ہمدردیوں، فکر و شعور کی پختگی، علم و دانش کی روشنی اور بلند پایہ تجربوں کا گراں قیمت اور قابل استفادہ نچوڑ معلوم معلوم ہوتے ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو سے دینی و مذہبی موضوعات پر آپ کی تقریریں کتابی شکل میں چھپ چکی ہیں۔ جو اہلِ علم کی نظر میں ہر اعتبار سے اہم اور منفرد قرار قرار پائی ہیں۔

مختصر یہ کہ حضرت مفتی صاحب کی ذاتِ گرامی قدیم روایات صالحہ کی قیمتی یادگار تھی۔ عالمانہ تہذیب و شائستگی کی ایک ایسی فلک بوس عمارت آپ کے انتقال سے زمین پر آرہی جو بڑی دلکش بڑی بلند پایہ اور قابل حفاظت تھی۔ آپ نے بیرونی ملکوں کے کئی سفر کیے اور اہم ترین کانفرنسوں میں اپنی بصیرت افروز رہنمائی کا مظاہرہ کیا۔

انڈونیشیا۔ روس۔ پاکستان اور سعودی عربیہ وغیرہ کئی ملکوں کا دورہ کیا اور ہر جگہ ہر عنوان اور ہر میدان میں اپنی بہترین صلاحیتوں۔ جذبات اخلاص اور بلند پایہ علمی مقام اور بے مثال تجربوں کی روشنی سے منور فرمایا۔ آپ کی تقریریں جو آپ نے آل انڈیا ریڈیو سے مختلف مذہبی و دینی موضوعات پر نشر کیں کتابی شکل میں "منارِ صدا" کے نام سے چھپ چکی ہیں۔

حضرت مفتی صاحب شیخ الہند مولانا محمود الحسن، مفتی اعظم مولانا مفتی عزیز الرحمٰن علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور علامہ انور شاہ کشمیریؒ جیسے آسمانِ علم کے آفتاب و ماہتاب ہستیوں کے نقوشِ تاباں کی ایک آخری یادگار اور قیمتی کڑی تھے اور شرافت و وضعداری، فکر و فہم۔ اعتدال و میانہ روی۔ حق شناسی اور علوم حقائق کے بحر بیکراں

کی تسنا وری میں اپنی مثال آپ تھے۔ تحریر ادب عالیہ کا ایک نمونہ تقریر ترتیب فکری و علمی کا شاہکار۔

اللہ تعالیٰ آپ کی بال بال مغفرت فرمائے اور آپ کے پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

آپ کے انتقال سے نہ صرف آپ کے صاحبزادگان، صاحبزادی اور دیگر اہل خاندان یتیم ہو گئے بلکہ ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی، علمی، سماجی اور دینی صفوں میں سناٹا چھا گیا ہے اور لاکھوں دلوں میں غم و الم کی درد انگیز کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔

آپ نے کبھی گورنمنٹ کا کوئی عہدہ و منصب قبول نہیں کیا مگر پھر بھی حکومت کے اعلیٰ ارکان، وزیراعظم اور دیگر وزرار نے آپ کی جدائی کو شدت سے محسوس کیا۔ اور ناقابلِ تلافی نقصان قرار دیا۔

COPY OF A CONDOLENCE MESSAGE FROM BEGUM SHIEKH MOHD ABDULLAH FROM SRINAGAR (KASHMIR)

...

DEEPLY GRIEVED AT THE SAD DEMISE OF MUFTI ATIQULRAHMAN GREAT FREEDOM FIGHTER AND NATIONALIST MUSLIM LEADER (.) WELL WISHER OF KASHMIR (.) IN HIM WE HAVE LOST A GREAT SYMPATHISER (.) CONVEY HEARTFELT CONDOLENCES TO ALL MEMBERS OF BEREAVED FAMILY ON MY BEHALF AND ON BEHALF OF MY FAMILY

...

مولانا فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی
مفتی دارالافتاء، مالیرکوٹلہ، پنجاب

میرے دادا مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ کے دو لڑکوں میں بڑے صاحبزادے مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ تھے اور میرے والد قاری جلیل الرحمٰن صاحب ان سے کافی چھوٹے ہیں۔ مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کو ہم سب بہن بھائی اباجان کہتے تھے اور والد صاحب کو ابا میاں کہتے ہیں۔

میں نے اپنے دادا صاحب کی زیارت نہیں کی، ان کا انتقال میری پیدائش سے بھی پہلے ہو چکا تھا مگر ان کے بارے میں اتنا کچھ اپنے خاندان کے بزرگوں سے سنا ہے کہ ان کی ایک زندہ تصویر میرے ذہن میں موجود رہتی ہے۔ ذکاوت ذہانت، فراست، علم اور اس کے ساتھ انکساری، تواضع، تقویٰ اور پرہیزگاری، سادگی، خشیت اور خدمت خلق کا مجسمہ۔

اباجان مرحوم میرے دادا کے اوصافِ حسنہ کا گویا عکس جمیل تھے۔ ان میں کبھی اپنے دادا کے علم کی گہرائی دیکھتا تھا اور کبھی ان کے اخلاق کا ایک زندہ پیکر اباجان کی صورت میں نظر آتا تھا۔

اباجان کے متعلق میری یادداشت کی کتاب کا آغاز قرول باغ دہلی میں ان کے دفتر ندوۃ المصنفین اور اوپر کی منزل میں ان کی رہائش گاہ سے ہوتا ہے اور یہیں سے بچپن کی وہ یادیں وابستہ ہیں جن کو انسان مرتے دم تک اپنے سینہ سے لگائے رکھتا ہے۔

۴۷ء کے ہنگاموں میں یہ دفتر کوٹھی جل کر خاکستر ہوگئے۔ جامع مسجد کے جنوب میں کٹرہ نظام الملک والی گلی میں پھر سے نئی زندگی شروع کی گئی، ہنستا کھیلتا بچپن رخصت ہونے لگا، شعور نے آنکھیں کھولنی شروع کیں، دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کرتا تھا، چند دن کی بھی چھٹی ملتی تو دلی کا رخ کرتا۔

اباجان کی باہر کی اور گھر کی زندگی میں کوئی فرق نہ تھا، کتنوں کو دیکھا ہے باہر جن کے غلغلے ہوتے ہیں گھر کی زندگی میں کھوکھلے نکلتے ہیں، مگر اباجان کی پوری زندگی ایک خاص سانچے میں ڈھلی ڈھلائی تھی، ان کی گفتگو میں لطافت اور ہر انداز میں نفاست تھی۔ کوئی مصنوعی پن نہ تھا، کوئی بناوٹ نہ تھی، کوئی دکھاوا نہ تھا، گہرائی تھی سمندر کی طرح، دل ربائی تھی ایک پھول کی طرح، شفقت تھی، مروت تھی، وضع داری تھی، خلوص اور ہر ایک کے ساتھ ہمدردی اور دلسوزی تھی۔

کسی کی شخصیت پر ان کا ایک جملہ، اس کی پوری زندگی کی تصویر ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ میں نے اُن سے پوچھا۔ آپ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے بہت نزدیک رہے ہیں، ان کی خصوصیت کیا تھی؟

اباجان نے کہا۔ میں نے ذاکر صاحب کو خود اپنے ہاتھ سے اپنے لان کی گھاس کھودتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ اور صدر جمہوریہ ہند کی کرسی پر بھی۔ مجھے ذاکر صاحب گھاس کھودتے ہوتے بھی اتنے ہی عظیم نظر آئے جتنے کرسیِ

صدارت پر۔

دارالعلوم دیوبند کے ایک ایسے صاحب کی بات چلی جو دارالعلوم میں بلا تنخواہ کام کرتے تھے، یہیں کے ایک صاحب کا ذکر ہوا جو گندم اور از قسم گندم کچھ نہیں کھاتے۔

جی ہاں یہ نیکوں کی قسمیں ہوتی ہیں۔ شیطان کی قسمیں متعین ہیں، نیکی کی قسمیں متعیّن کرنا مشکل ہے۔ اباجان کے اس بھرپور جملہ نے محفل کو لالہ زار بنا دیا۔

مجلس مشاورت کی میٹنگ کے سلسلہ میں دہلی گیا ہوا تھا۔ دریا گنج جانے کے لیے اباجان کے ساتھ گھر سے باہر نکلا تو کتب خانہ عزیزیہ کے پاس میر مشتاق کھڑے تھے۔ اباجان نے میر صاحب کے احوال دریافت کیے تو میر صاحب نے کچھ صحت اور حالات کی ناسازگاری کی شکایت کی۔

اباجان نے کہا۔ اباجی مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ آرام کے ساتھ تھوڑی سی بے آرامی بھی ٹھیک ہی رہتی ہے، آدمی بھٹکنے نہیں پاتا۔

ایک مرتبہ دفتر بُرہان میں چیدہ چیدہ لوگوں کا اچھا خاصا مجمع تھا۔ جمعیۃ علما کی کچھ پرانی اور نئی باتیں چل پڑیں۔

بات وقار اور اعتبار کی ہوتی ہے۔ اباجان بول رہے تھے۔ اُس زمانے میں جمعیت کے دفتر سے ایک ٹیلی فون جاتا تھا تو منسٹری ہل جاتی تھی۔ آج خود ناظم اعلیٰ وزیروں کے گرد چکر لگائیں تو وقار کہاں رہے گا۔ جمعیتہ کے چالیس سالہ ریکارڈ میں کوئی ریزولیشن ایسا نہ ہوگا جو میرے قلم سے نہ ہو۔ جمعیتہ کا یہ دماغ آج جمعیتہ اور ملت اسلامیہ ہند کی پر درد تاریخ دہرا رہا تھا، محفل پر سناٹا تھا۔ درد دل تھا کہ ٹپکا پڑتا تھا۔ اور آخر میں

ابا جان کی زبان سے جگر مرحوم کا یہ شعر ساری مجلس کے جگر چیر گیا ؎

جان کر منجملہ خاصانِ میخانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

آج جام و پیمانہ ہی نہیں سارا میخانہ ہی زار زار ہے کہ وہ خاصہ میخانہ بلکہ حاصل میخانہ اور میر میخانہ ہم میں نہیں رہا۔ اس غالبِ خوش خصال کی صورت ہم میں نہیں ہے مگر اس کے نقش پا کی شوخیاں ہماری زیست کے لیے حیات کا پیغام بنی رہیں گی۔

ابا جان مرحوم کھانے کے معاملہ میں بڑے خوش ذوق تھے، کم کھاتے تھے مگر اچھا کھاتے تھے۔ ایک مرتبہ مجھے ان کے ساتھ دہلی سے دیوبند سفر کرنے کا اتفاق ہوا۔ میرٹھ گاڑی پہنچی تو دوپہر کا کوئی ساڑھے بارہ ایک کا وقت ہوگا، اسٹیشن پر روٹی چھولے کی آوازیں لگ رہی تھیں۔ ابا جان نے دو روپے نکالے کہ روٹی چھولے لے لو۔ میں سمجھا صرف میرے لیے لے رہے ہیں۔ کہنے لگے۔ نہیں میں بھی کھاؤں گا، وہ پتلے سے چھولے اور ادھ کچری روٹی بڑی شوق سے کھائی۔ میرے اندازِ حیرت پر فرمانے لگے۔ وقت پر جو چیز مل جائے اچھی رہتی ہے۔ دیوبند پہنچ کر بے وقت کھاتے دوسروں کو زحمت ہوتی، پھر اچھی خاصی تعریف چھولوں کی کرتے رہے یہ اُن کی سادگی اور بے نفسی کا ایک روشن رُخ تھا۔

ایک مرتبہ مجھے ریڈیو کی ملازمت کا شوق چرایا۔ ان سے بالا بالا ساغر نظامی سے رابطہ پیدا کیا اور سروس میں جگہ کی بات پکی کرلی۔ جب بات تقریباً مکمل ہوگئی تو ابا جان سے تذکرہ کیا۔ بظاہر حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ جی ہاں ساغر صاحب اپنے ہی آدمی ہیں، میری طرف سے شکریہ ادا کردینا

اب کب ملوگے ؟

شام کو ملوں گا اور دو ایک روز میں جوائن کرلوں گا۔ میں نے جواب دیا۔

میرا خط لے جانا۔

لفافہ میں پرچہ رکھا تو اس کو بند نہیں کیا۔ میں نے پڑھ لیا۔ ہلکا سا اشارہ ایسا تھا جس سے میں سمجھ گیا کہ ابا جان کو یہ ملازمت پسند نہیں ہے۔ ارادہ کرلیا کہ پرچہ ساغر صاحب کو نہیں دوں گا۔ مگر جب ان سے ملا تو گفتگو کی روانی میں زبان سے نکل گیا کہ مفتی عتیق الرحمٰن صاحب نے آپ کے نام خط دیا ہے اور بے اختیار خط جیب سے نکال کر ساغر صاحب کو دیدیا۔ پھر وہی ہوا جس کا کھٹکا تھا۔ دوبارہ کبھی ریڈیو اسٹیشن کی صورت نصیب نہ ہوسکی۔

دراصل وہ چاہتے تھے کہ میں اپنے خاندان کی روایات کے مطابق علمی سلسلہ قائم رکھوں۔ "تفہیم علم" کا کام شروع کیا، چند مقامات ان کو سنائے۔ بہت خوش ہوئے، شاندار تحریر لکھی۔ بیچ میں سلسلہ رک گیا تو مالی امداد کرکے اس کو جاری رکھنے کی تاکید کی۔

مالیر کوٹلہ آگیا تو بہت خوش ہوتے جیسے گاڑی اپنی لائن پر آگئی ہو۔ قدم قدم پر رہنمائی کرتے رہے۔ حالات سے باخبر رہتے، حوصلہ بڑھاتے۔

میری بڑی لڑکی کی شادی طے ہوئی تو خود تاریخ طے فرمائی۔ اس کے بعد شدید بیمار ہوگئے۔ مگر اسی حالت میں دیوبند پہنچے۔ رخصتی کے وقت میری آنکھوں میں آنسو دیکھ کر فرمانے لگے۔ خوشی اور غم کے مرحلے انسان پر گزرتے ہیں، حوصلہ رکھنا ہوتا ہے صلہ رحمی، قرابت کے رشتوں کی اتنی پاسداری کم ہی لوگوں میں ہوتی ہے۔ علماء کے طبقہ میں وہ ایک آئیڈیل تھے، ایک نمونہ تھے، روشنی کا ایک مینار تھے، ایسے انسان صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں اور ان کی یادیں لازوال ہوتی ہیں۔ ٭

سانحۂ ارتحال

بر وفات مفکرِ ملت حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانیؒ

کفیل الرحمٰن نشاط

ہیں کربِ جاں کی پتیاں سکون کے گلاب میں
اداسیوں کا رنگ ہے حیات کی کتاب میں
کہاں سرور کی ضیا گہن ہے آفتاب میں
نشاطِ جاں کا ہر طرف شباب ڈھونڈتا ہوں میں
بغیر اس کے زندگی کا باب ڈھونڈتا ہوں میں

جو فخرِ ملک و قوم تھا وہ نیّرِ زماں گیا
جو کوہِ علمِ دین تھا وہ علمِ بےکراں گیا
امانتِ سلف گیا متاعِ خانداں گیا
نشاطِ جاں کا ہر طرف شباب ڈھونڈتا ہوں میں
بغیر اس کے زندگی کا باب ڈھونڈتا ہوں میں

فلاحِ ملک و قوم میں تھی غرق جس کی زندگی
سکھائے جس نے دہر کو رموزِ عقل و آگہی
رہے گی یاد دیر تک جہاں کو جس کی سادگی

نشاطِ جاں کا ہر طرف شباب ڈھونڈتا ہوں میں
بغیر اس کے زندگی کا باب ڈھونڈتا ہوں میں

جو تھا امیرِ کارواں وقارِ کارواں بھی تھا
وہ ایک گل کہ باعث جمالِ گلستاں بھی تھا
جو خود ہی داستاں بھی تھا اور اہل داستاں بھی تھا

نشاطِ جاں کا ہر طرف شباب ڈھونڈتا ہوں میں
بغیر اس کے زندگی کا باب ڈھونڈتا ہوں میں

حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ

شبیر احمد راہی، بھیونڈی

میں اسے باعثِ فخر و امتیاز سمجھتا ہوں کہ میرے تعلقات کسی نہ کسی حیثیت میں عہدِ حاضر کی اُن بیشتر اہم ہستیوں سے ہیں جنھیں قائدینِ ملت ہی میں نہیں، نفوسِ عالیہ میں بھی شمار کیا جاسکتا ہے۔ یہ مسلمانوں کی بدقسمتی ہے کہ بعض ہستیاں اپنے علم و عمل، ایثار و قربانی، جرأت و جلادت، سنجیدگی و متانت، فکر و اثر اور مستقل مزاجی و پامردی کے خوشگوار نتائج کو دیکھنے سے پہلے ہی اس دنیا سے اٹھ گئیں لیکن جو نقوشِ قدم چھوڑ گئیں، شکر ہے کہ وہ رہ نوردوں کی منزلِ مقصود کی سمت ہمیشہ رہنمائی کرتے رہیں گے۔ انہی میں ایک نہایت اہم ہستی حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی تھی جن کے تذکرہ کے بغیر بعد از تقسیم ہندستانی مسلمانوں کی تاریخ ادھوری رہے گی۔

کم و بیش ۲۵۔ ۳۰ سال قبل مفتی صاحب سے میری پہلی ملاقات اُن کی خاموش اور پرسکون کوٹھی، کٹرہ نظام الملک، جامع مسجد، دہلی میں ہوئی تھی۔ یہیں "برہان" کا دفتر ہے اور یہی مقام مفتی صاحب کی نشست گاہ بھی رہا ہے۔ یہی وہ تاریخی کوٹھی ہے جس میں ملت اسلامیہ ہند کے متعدد مسائل پیش ہوئے ہیں، بحثیں ہوئی ہیں، فیصلے کئے گئے ہیں اور پھر سارے ہندوستان کے مسلمانوں نے شدید مخالفتوں سے بے پروا ہو کر ان پر عمل بھی کیا ہے ہندوستان کی مختلف ریاستوں سے مندوبین کی آمد پر خصوصی مجلسیں عموماً "بچوں کا گھر" دریا گنج میں منعقد کی گئی ہیں لیکن کل ہند مجلسِ مشاورت کی نشستیں عام طور پر انہی دو

مقامات پر ہوتی تھیں جن میں ملک کے مشاہیر علماء و فضلاء، نامور زعماء، خطباء، قائدین اور اہلِ قلم شرکت فرماتے تھے۔ مجلسِ مشاورت کے صدر کی حیثیت سے بلاشبہ سب سے زیادہ فعّال شخصیت حضرت مفتی صاحب مرحوم و مغفور ہی کی تھی۔

مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ میں نے مفتی صاحب مرحوم کی خواہش کے مطابق دلی میں رہ کر مجلس مشاورت کی کچھ عرصہ تک اعزازی خدمت کی ہے اور شاید یہ سلسلہ مستقل طور پر قائم رہتا لیکن پہلی ہند پاک جنگ نے بدقسمتی سے اسے یک بیک منقطع کر دیا اور مجھے بھیونڈی واپس آنا پڑا۔

دراصل اُن دنوں مفتی صاحب نہایت پریشان اور بے چین رہتے تھے۔ یا تو وہ مجھے کسی حالت میں چھوڑنے کے لئے تیار نہ تھے یا اب ہر وقت ان کا اصرار تھا کہ میں جلد از جلد گھر پہنچ جاؤں تاکہ گھر والوں کو اُن پر آشوب حالات میں میری غیر موجودگی سے مزید پریشانیوں کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ انھیں میری متنازعہ حیثیت کا اچھی طرح علم تھا۔ وہ جانتے تھے کہ حکومت مجھے تلاش کرے گی اور اپنے مقام پر نہ پانے کی صورت میں گھر والوں کو پریشان کرے گی اور رائی کا پربت بنانے میں کوئی تکلّف نہیں برتے گی چنانچہ ریلوے عملے کے اعلان کے مطابق دلّی سے بمبئی کے لئے روانہ ہونے والی آخری ٹرین جنتا ایکسپریس سے بمبئی آگیا اور چند گھنٹے رک کر بھیونڈی پہنچ گیا۔

اس واقعے کے بعد متعدّد بار دلّی جانا ہوا اور مفتی صاحب سے برابر ملاقاتیں ہوتی رہیں، وہ مجھ سے مشاورت کے تعلق سے اکثر گفتگو بھی کرتے رہے اور موجود حضرات کے سامنے اپنی شرافتِ طبعی سے مجبور ہو کر میری تعریفیں بھی کرتے رہے مگر پھر مجھے مشاورت کی دفتری ذمہ داریاں سنبھالنے کا موقع نہ مل سکا جس کا ایک اہم سبب یہ تھا کہ میں کسی سیاسی یا مذہبی جماعت سے منسلک نہیں تھا اس لئے محض جذبۂ اخلاص اور حمیّتِ قومی کی بنیاد پر کوئی مذہبی یا سیاسی جماعت میری حمایت کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔

مفتی صاحب نہایت وسیع القلب انسان تھے۔ تنگ نظری انھیں چھو کر بھی نہیں گزری تھی۔ مجلس مشاورت اس حیثیت سے ایک وفاقی تنظیم رہی ہے کہ اس میں تمام قابلِ ذکر مذہبی اور سیاسی جماعتیں شامل رہی ہیں چنانچہ انھوں نے ہمیشہ کوشش کی کہ ملکی سطح پر بہر صورت یہ اتحاد قائم رہے اور کسی کو شکایت کا موقع نہ ملے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہے ورنہ اِس دورِ انحطاط میں مسلمانوں کا یہ عالم ہے کہ کسی کا نیک، مخلص اور صادق القول ہونا بھی پسندِ خاطر نہیں ہوتا بلکہ اُن کی مخالفت کی بنیاد بن جاتا ہے۔

شیخ محمد عبداللہ مفتی صاحب کا بہت احترام کرتے تھے۔ مفتی صاحب بھی ان کا خاص طور پر خیال رکھتے تھے۔ مشاورت کی نشستوں میں ایسا بھی ہوا کہ شیخ محمد عبداللہ، مرزا افضل بیگ، میر واعظ مولوی فاروق، مولانا ابواللیث، مولانا محمد مسلم، محمد اسمٰعیل صاحب، ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی، شہزادہ یوسف نجم الدین، ابراہیم سلیمان سیٹھ، صلاح الدین اویسی، غلام محمد میمن، ایڈوکیٹ احمد بخش، مولانا ضیاء الحق دہلوی اور مفتی صاحب موجود ہیں اور بحث و مباحثہ زور شور سے جاری ہے کہ تجاویز مرتب کرنے کا وقت آگیا۔ ظاہر ہے کہ سب سے پہلے مولانا محمد مسلم صاحب ہی پر نظر پڑنی چاہیئے جن کو مرحوم لکھتے ہوئے دل رُکتا ہے کہ اُن سے بہتر اردو میں تجویز لکھنا کسی اور کے بس کی بات نہیں تھی اور انگریزی میں ان کا بکمالِ خوبی ترجمہ کرنے کے لئے مرزا افضل بیگ کی موجودگی میں کسی اور کو منتخب کرنا ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ یہ اہم کام ان دو حضرات کو تفویض کیا گیا اور مجھ بے بضاعت کو بھی نہ جانے کیا سمجھ کر اُن سے منسلک کر دیا گیا۔ شاید مفتی صاحب اور مسلم صاحب تعلقِ خاطر کی بنا پر یہی چاہتے تھے۔

مرزا افضل بیگ مجھ سے واقف نہ تھے۔ وہ پہلی بار مشاورت کی نشست میں شریک ہوئے تھے۔ مسلم صاحب یہ سمجھ کر کہ ہم ایک دوسرے سے متعارف ہیں، غلط فہمی میں

پڑے رہے۔ مرزا افضل بیگ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں ماہرانہ دستگاہ رکھتے تھے۔ مجھے اُن کے ترجمہ کرنے کی زبردست صلاحیت پر سخت حیرت تھی۔ اتفاق دیکھئے کہ ایک مقام پر مرزا صاحب یکایک رک گئے اور میں نے غیر ارادی طور پر جملہ پورا کر دیا یہ سمجھ کر کہ مرزا صاحب وہی الفاظ کہیں گے جو میری زبان سے نکلے تھے۔ مرزا صاحب چونک پڑے اور میری طرف توصیفی نظروں سے دیکھ کر مسکرائے۔ افسوس کہ میرے ان سے بہت قریبی تعلقات قائم نہ ہو سکے اور پھر کچھ عرصہ کے بعد شیخ عبداللہ سے سیاسی اختلاف نے اُن کو افقِ سیاست سے بالکل غائب ہی کر دیا اور پھر وہ جلد ہی انتقال بھی کر گئے۔

ایک مرتبہ "بچوں کا گھر" دریا گنج میں مجلس مشاورت کا اجلاس ہو رہا تھا۔ تقریباً تمام اکابرِ ملت تشریف رکھتے تھے۔ مفتی صاحب نے مجھے دوپہر کے بعد کی دوسری نشست میں اظہار خیال کے لئے طلب فرمایا۔ میں نے اپنی تقریر میں مجلس مشاورت میں شامل بعض مذہبی اور سیاسی جماعتوں کی قابل اعتراض حرکتوں پر کسی قدر سختی سے گرفت کی اور تو کوئی کچھ نہیں بولا بلکہ جناب محمد اسمٰعیل صاحب صدر انڈین یونین مسلم لیگ اپنی تقریر میں بڑی محبت سے ہلکا سا اشارہ کر کے گزر گئے لیکن ابراہیم سلیمان سیٹھ مجھ پر بری طرح برس پڑے۔ اس سے پہلے کہ میں اپنا دفاع کرتا، صدر کی حیثیت سے مفتی صاحب کچھ بولنے ہی والے تھے کہ شیخ عبداللہ نے مضطرب ہو کر اونچی آواز میں ابراہیم سلیمان سیٹھ سے پوچھا کہ آخر راہی صاحب نے غلط کیا کہا ہے۔ اس کا جواب دیجئے۔ بہرحال بیچ بچاؤ کیا گیا اور بات ختم ہوگئی۔

میں شیخ عبداللہ صاحب کی اس بر وقت دفاعی مداخلت کو شاید کبھی نہ بھول سکوں گا۔ انھوں نے صرف ایک اصولی طور پر سچی بات کہی تھی مگر میرے دل میں ہمیشہ کے لئے نقش ہوگئی۔ میں نے جماعت اسلامی ہند، بمبئی کے تعلق سے بھی چند جملے کہے تھے لیکن حضرت مولانا

ابوالليث اور مولانا محمد مسلم کے دلوں میں کبھی مجھے ہلکا سا میل بھی محسوس نہیں ہوا بلکہ وہ مجھ سے ہمیشہ خندہ پیشانی سے ملتے ہوتے رہے۔

مفتی صاحب کے دل میں بھیونڈی آنے کی بڑی خواہش تھی۔ ظاہر ہے وہ اُن دنوں میرے سوا کسی اور سے اس کا اظہار نہیں کر سکتے تھے۔ ندوۃ المصنفین کے دفتر واقع قرول باغ کو فسادات میں زبردست نقصان پہنچایا گیا تھا۔ اس کی تلافی تو خیر کیا ہوسکتی تھی البتہ بھیونڈی سے مالی معاونت حاصل کی جاسکتی تھی۔ بھیونڈی کے مزاج سے شاید میں بڑی حد تک واقف ہوں لہٰذا میں نے انھیں سفر کا پروگرام بنانے کے لئے کہہ دیا لیکن یہ بات بھی واضح کردی کہ وہ اس مقام سے بہت بڑی توقع وابستہ نہ کریں۔ مفتی صاحب بھیونڈی تشریف لائے اور بے حد خوش اور مطمئن واپس ہوئے۔ اللہ کے فضل سے ایک اچھی سی رقم تھوڑی سی کوششوں سے اکٹھی ہوگئی اور ادارہ کے کام آئی۔ اس سلسلہ کی تعارفی مجلس مرحوم محمد مبین ماسٹر کے دولت کدہ پر منعقد کی گئی تھی جس میں شہر کے عمائدین شریک تھے۔

مفتی صاحب سے میں اکثر شکایت کرتا تھا کہ وہ میرے خطوط کے جواب نہیں دیتے۔ ایک مرتبہ میری شدید شکایت پر انھوں نے فرمایا۔ "راہی صاحب آپ تو جانتے ہیں میں بہت مصروف رہتا ہوں۔ پھر کوتاہ قلم بھی واقع ہُوا ہوں۔ خیال نہ فرمایا کریں" لیکن اس کے باوجود میرے نام اُن کے بھیجے ہوئے خطوط میرے پاس موجود ہیں جن کی تصویری نقلیں (زیروکس) روانہ کر رہا ہوں۔

"برہان" کا ایک خاص مزاج ہے۔ اُس میں کسی قسم کا رطب و یابس نہیں چھپتا۔ ادبیات کا معیار بھی بہت بلند ہوتا ہے۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر ایک غزل بھیجی تھی۔ غزل اہتمام سے چھپی جس پر مجھے بمبئی یونیورسٹی کے مشہور و معروف ڈاکٹر فرید صاحب اور چند نامور پروفیسروں نے مبارکباد دی۔

مفتی صاحب سے میرے تعلقات کی داستان بہت طویل ہے۔ وہ ایک بے حد

محتاط اور پھونک پھونک کر قدم رکھنے والے بزرگ تھے۔ مسلمانوں کی تمام کمزوریوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ ان کو کسی آزمائش میں ڈالنے کے لئے ہرگز تیار نہ ہوتے تھے حکومت کے حاشیہ بردار نہیں تھے لیکن بات بات پر تصادم کی حکمت عملی کو اختیار کرنے کے خلاف تھے، جس کی وجہ سے لوگوں میں غلط فہمیاں پیدا ہوتی تھیں۔ وہ مسلمانوں کی جان و مال کو نقصان پہنچنے کے تصوّر سے بھی پریشان ہو جاتے تھے۔ فرقہ دارانہ فسادات ان کے لئے سوہانِ روح بن جاتے تھے۔ ان کی غیر معمولی حساس طبیعت پر فسادات کا شدید ردِّ عمل ہوتا تھا۔ مختلف مذہبی اور سیاسی مسلم جماعتوں میں اختلافات کی غیر معمولی شدّت کو دیکھ کر بہت کڑھتے تھے اور آپ کو حد درجہ بے بس اور مجبور سمجھنے لگتے تھے۔ کبھی کبھی جھنجھلا اٹھتے تھے لیکن جھنجھلاہٹ میں بھی کسی کے خلاف جو کچھ کہتے تھے ایسا لگتا تھا کہ اس کا دکھ خود ہی جھیل رہے ہیں۔ میں نے اُن کی پاک وصاف زبان سے غصہ اور خفگی کے عالم میں بھی کبھی کوئی غیر ثقہ اور خلافِ تہذیب لفظ نہیں سنا۔ ایسے نستعلیق قسم کے بزرگ اب خال خال ہی رہ گئے ہیں، کچھ عرصہ بعد ڈھونڈے نہیں ملیں گے۔ اللہ تعالیٰ ایسے بزرگوں کے نقشِ قدم پر چلنے کی ہمیں توفیق اور خوش نصیبی عطا فرمائیں۔ آمین

مولانا سید محمد فاروق صاحب نگرانِ اعلیٰ و مہتمم بچوں کا گھر دہلی

مفکرِ ملت حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے میاں عمید الرحمٰن عثمانی سلمہ اللہ تعالیٰ نے ماہنامہ برھان کا ایک خصوصی نمبر شائع کرنے کا ارادہ کیا ہے معلوم ہو کر بہت مسرت ہوئی، مجھے یاد ہے کہ میں نے حضرت مفتی صاحبؒ کے وصال کے ایک ہفتہ بعد ہی میاں عمید الرحمٰن سلمہٗ سے کہا تھا کہ مفتی صاحبؒ سے متعلق اہل قلم اور اربابِ بصیرت اور معتقدین نے اپنے تاثرات اخبارات یا خطوط میں ظاہر کیے ہیں ان کا مجموعہ شائع کیا جائے لیکن بوجوہ اب تک ایسا نہیں ہو سکا۔

حضرت مفتی صاحبؒ سے میرا تعلق جمعیۃ علماء صوبہ کے رابطہ سے سنہء میں ہوا تھا، پھر یہ سلسلہ بڑھتا رہا۔ جماعتی تعلق سے ذاتی معاملات میں صلاح و مشورہ تک پہنچ گیا۔ ہفتہ دو ہفتہ میں ضرور ملنا ہوتا تھا۔ اگر زیادہ تاخیر ہو جاتی تو خود خیریت دریافت فرماتے۔

حضرت مفتی صاحبؒ کے علم و فضل کا اندازہ تو اہل علم حضرات کر سکتے ہیں۔ ہاں ان کی ذہانت و بصیرت اور معاملہ فہمی کے بہت سے واقعات

سامنے آتے۔ مرحوم کی رواداری، لحاظ و مروت بے مثال تھی سخت سے سخت مخالف سے بھی وہ اسی طرح پیش آتے تھے جیسے اپنے مخلص احباب سے۔ اپنی بات کہنے میں بیباک تھے، دو مخالف گروپوں میں ایسی میان روی کی بات کرتے تھے۔ جو باہم متفق ہو جاتے تھے۔ بعض جلسوں میں تنقید کرنے والوں کی بات پوری سننے کے بعد ایسا مدلل جواب دیتے تھے کہ ناقدین لاجواب ہو جاتے تھے۔ جلسہ کی صدارت کرتے ہوئے ہنگامی صورت حال پر اپنی موثر تقریر سے سامعین کو مسکت کر دیتے تھے۔

مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کے زمانہ میں جمعیۃ کی اہم تجاویز مرحوم کی ہی مرہون منت ہیں۔ مجاہد ملت سفر زیادہ کرتے تھے بلکہ سفر نہ کرنے سے بیمار ہو جاتے تھے۔ مفتی صاحب خاص خاص موقع پر سفر میں ساتھ ہوتے تھے۔ لیکن مجاہد ملت کے انتقال کے بعد بعض مرتبہ علالت کے باوجود ملک کے کونہ کونے میں مسلمانوں کے علمی و ثقافتی، جلسوں میں ملکی، سیاسی معاملات میں شریک ہوتے تھے۔ بعض مرتبہ احقر نے عرض کیا کہ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے آپ سفر نہ کیجیے انکار کر دیجیے۔ فرماتے کہ میں نے وعدہ کر لیا ہے۔

بعض مرکزی وزراء اور دانشور حضرات مشورہ لینے آتے تھے ندوۃ المصنفین کا دفتر مرجع خلائق ہو گیا۔

مجلس مشاورت کا قیام مرحوم کی ذہانت کا کارنامہ ہے۔ ملک کے سیاسی غیر سیاسی مختلف نظریات کی حامل جماعتوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر کے مسلم اور غیر مسلم حضرات کے ساتھ پورے ملک کا دورہ کیا۔ ملک کے آسمان پر فرقہ وارانہ نفرت کے جو بادل چھائے ہوئے تھے وہ چھٹ گئے اور برادرانہ، بھائی چارہ کی فضا پیدا ہو گئی۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کے بعد مسلم پرسنل لاء بورڈ کی صدارت کی ذمہ داری نہایت خوبی سے نبھائی۔
مولانا ابوالکلام آزاد، جواہرلال نہرو اور اندرا گاندھی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، مرحوم سیاسی نظریات میں اختلاف کے باوجود ایک عظیم مقصد کے پیش نظر سب کو ساتھ لے کر چلتے تھے اور سب ان کا احترام کرتے تھے۔
مفتی صاحب مرحوم کا بہت سے تعلیمی، سماجی، سوشل اداروں سے نہ صرف تعلق تھا بلکہ بہت اہم مقام رکھتے تھے۔ مرحوم بچوں کا گھر اور مدرسہ امینیہ اسلامیہ کے اہم رکن تھے۔ کسی مسئلہ پر فیصلہ نہایت بصیرت اور سوجھ بوجھ سے کرتے تھے لیکن اگر کسی معاملہ کا کوئی نیا پہلو اجاگر ہو جاتا تو اسے بخوشی قبول کر لیتے تھے۔
ندوۃ المصنفین مرجع خلائق تھا۔ دن ہو یا رات ہر خدمت کے لیے اور علالت کے باوجود تیار رہتے تھے۔

بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

مفکّرِ ملّت

(۱۹۰۱ء - ۱۹۸۴ء)

مولانا عطاءُ الرحمٰن قاسمی

جان کر منجملہ خاصانِ میخانہ مجھے
مدّتوں رویا کریں گے جام وپیمانہ مجھے

موزوں قد وقامت، گندمی رنگ، اڑی ہوئی بھوئیں اور سر پر برائے نام سفید بال اس پر قرینے سے دھری ہوئی سیاہ بالوں والی کشمیری کیپ، قدرے کشادہ پیشانی اس پر نصف صدی سے زائد کی درخشاں تاریخ کے زندہ وتابندہ نقوش، چہرے پر کسی بوسیدہ تاریخ کے بجلگ اوراق کی طرح بکھری ہوئی جھریاں جو عمر بھر کے تجربوں، بصیرتوں کا ثبوت اور زمانہ کے ہزار ہا نشیب وفراز کی نشاندہی کرتی تھیں۔

مشرع سفید داڑھی، عالمانہ طرز کی کتری ہوئی مونچھیں، موزوں شیروانی، چھوٹا کرتا جو عثمانی یونیفارم کا آئینہ دار۔

ملّتِ اسلامیہ کے دردمند رہنما، مذہب وسیاست کا مجمع البحرین، تحریک آزادی کے بطل جلیل، سیّد جمال الدّین افغانیؒ کی بے لوث صداؤں کی آخری صدائے بازگشت، قومی یکجہتی کے علمبردار، وطنی وفاداری کا نشان، مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی کا تفقہ، شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی خطابت اور مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ کی اصابت رائے کی نادر الوجود مثال، وضعداری شرافت کی جیتی جاگتی اور منہ بولتی تصویر، تہذیب وروایت کی دیوارِ چین، زہر کے گھونٹ پلانے والے قاتلوں کو مبتلائے مصیبت دیکھ کر تڑپ جانے والے بزرگ۔ امیر مینائی کے تقولاتی شعر کی صحیح معنوں میں عملی تفسیر ؎

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

غمخوار و غمگسار، سود و زیاں سے لاپرواہ ہو کر حق بولنے کی ہمت و جرأت رکھنے والے مرد آہن، قرون وسطیٰ کے مجاہدین اسلام کی ممتاز خصوصیات اور اوصاف کا عطر مجموعہ۔

یہ ایک ایسے چہرہ کا قلمی خاکہ ہے جس کا خیال آتے ہی ایک ایسی مغموم مسکراہٹ نگاہوں کے سامنے گھوم جاتی ہے جو اپنے اندر نہ جانے کتنی محرومیاں، نامرادیاں، تلخیاں، زیادتیاں اور غم دوراں سموئے رہتی تھی۔

لیکن آہ! اب یہ غمگین مسکراہٹ بھی قبرستان حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ میں منوں مٹی کے نیچے دبکر قیامت کی نیند سوگئی۔

قضا کس کو نہیں آتی ہے یوں تو سب کو آتی ہے
پر اس مرحوم کی بوئے کفن کچھ اور کہتی ہے

آپ سمجھے بھی یہ کون سی شخصیت ہے؟ یہ مفکر ملت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کی ذات گرامی ہے۔

مفتی صاحب اصلی معنوں میں انسانی اخوت اور خدمت خلق کا بہترین مجسمہ اور نکھرا ہوا نمونہ تھے۔ مفتی صاحب کی عظمت کا سب سے جدا اور منفرد پہلو یہ تھا کہ ان سے گفتگو کرتے وقت متکلم کو اپنی بڑائی اور عظمت کا احساس ہونے لگتا تھا۔ حضرت مفتی صاحب مخاطب سے کچھ اس انداز میں گفتگو کرتے تھے کہ اس میں یہ اعتماد ابھرتا تھا کہ وہ بھی کوئی حیثیت رکھتا ہے۔

مفتی صاحب خودستائی اور خودبینی کی انسانی کمزوریوں میں مبتلا نہ تھے۔ وہ اپنی ذات کے بارے میں بہت ہی کم باتیں کرتے تھے لیکن دوسرون کی شخصیت کے بارے میں اس قدر دلچسپی لیتے تھے جیسے وہ کسی عظیم اسکالر اور قدآور شخصیت کا مطالعہ کر رہے ہوں بقول مولانا بدرالحسن قاسمی کہ مفتی صاحب کی ایک عجیب و غریب ادا انکی بے انتہا تواضع تھی۔ اپنے چھوٹوں کے سامنے بھی وہ اس طرح بچھ جاتے تھے کہ شرمندگی ہوتی تھی بڑی

محبت سے ہر ایک سے ملتے۔ سب کا دکھ درد سنتے اپنی استطاعت کی حد تک پریشانی دور کرنے کی کوشش بھی فرماتے۔

اپنے گھر میں ہوں یا کسی اجتماع میں یا سرِ راہ ان کی وضعداری اور محبت میں کبھی فرق محسوس نہیں ہوتا۔ مفتی صاحب بڑے وضعدار قسم کے بزرگ تھے مرحوم اپنی وضعداری، مروّت رکھ رکھاؤ کی وجہ سے زہر کے گھونٹ بھی مسکراتے ہوئے پی جاتے تھے اور ازلی دشمنوں اور سیاسی حریفوں سے اس طرح ملتے جیسے ان سے ملنا خضر و مسیحا کی ملاقات سے بہتر ہو۔ ان کی وضعداری ہی تھی کہ تادمِ آخر کانگریسی رہے لیکن کانگریسیت کے ساتھ ساتھ سیاسی میدان میں ان کا رشتہ مختلف رجحانات کے لوگوں سے رہا۔

مفتی صاحب سیاسی لیڈر ہی نہ تھے لیڈروں کے لیڈر تھے۔ مشیروں کے مشیر تھے لیکن عام کانگریسی لیڈروں کی طرح کسی بڑے حکمراں سے فون پر بھی گفتگو کرتے ہوئے کانپتے وتھراتے نہیں تھے بلکہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتے تھے۔ مجھے کچھ معتمد قومی رہنماؤں نے بتایا کہ ایک کانفرنس میں جس میں آنجہانی اندرا جی بھی شریک تھیں۔ اندرا جی نے "بنگلہ دیشی مسلمانوں سے بڑی ہمدردی کا اظہار کیا تو مفتی صاحب نے برجستہ اسی مجلس میں اپنے مخصوص انداز میں فرمایا کہ آج کل ہماری محترمہ وزیرِ اعظم کو بنگلہ دیشی مسلمانوں سے کچھ زیادہ ہی ہمدردی ہو گئی ہے۔ مفتی صاحب باوجود بڑے کانگریسی لیڈر ہونے کے سودے بازی اور نعرہ لگانے کے فن سے کورے تھے۔ اگر مفتی صاحب چاہتے تو بڑے سے بڑا عہدہ ان کو آسانی مل سکتا تھا لیکن ان کی وضعداری تھی کہ کبھی کسی سرکاری عہدے کی لالچ نہیں کی۔

مفتی صاحب تحریر و تقریر کے میدان کے کامیاب شہسوار تھے۔ زبان و قلم میں بلا کی شگفتگی و دلآویزی تھی۔ آپ کی تقریروں میں علم و روحانیت فکر و بصیرت اور تحقیق و کاوش کے جوہروں کے ساتھ ساتھ ادب کی چاشنی اور اسلوب کی دلآویزی چمکتی و دمکتی نظر آتی ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ مفتی صاحب کو قدرت نے نثر نگاری کا جتنا صاف ستھرا ذوق دیا تھا ویسے ہی علمی حیثیت سے بھی بلند مقام کے آدمی تھے۔

مگر انھوں نے اپنی گراں قیمت زندگی کا تقریباً تمام تر حصہ چھوٹوں کو بڑا اور بڑوں کو اور بڑا بنانے میں صرف کیا۔ ؎

ہم نے ہر ادنیٰ کو اعلیٰ کر دیا
خاکساری اپنی کام آئی بہت!

بلاشبہ تاریخ میں ایسے بے لوث تعمیر پسند اور دوسروں کو ہر قدم اور ہر موڑ پر سہارا دینے والے کم ہی لوگ نظر آتے ہیں۔ نہ جانے کتنے نوجوان ہیں جو صرف حضرت مفتی صاحب کی حوصلہ افزائی، امداد اور تعاون کی بدولت صاحب قلم، صاحب تصنیف اور علمی و ادبی دنیا میں شہرت و عظمت کے حامل ہو گئے۔ اور مفتی صاحب نے خود کو انشاء پردازی کے میدان میں پیچھے رکھنے کی سعی کی اور شاذ و نادر ہی اور انتہائی مجبور کن حالات میں ہی کچھ لکھا۔ خود ہی ایک جگہ لکھتے ہیں۔

> ۱۹۳۷ء کے اوائل میں جب ندوۃ المصنفین کا قیام عمل میں آیا۔ دوسرے رفقائے کار کیساتھ میں بھی ایک بڑھیا قسم کی بلوری دوات اور عمدہ قلم سنبھال کر بیٹھ گیا تھا اور لکھنے پڑھنے کا کام شروع بھی کر دیا تھا۔ علامہ ابن تیمیہؒ کی "الکلم الطیب" تشریحی نوٹوں کیساتھ اور علامہ ابن جوزی کی "صید الخاطر" کا ترجمہ انہی دنوں کی یادگار ہیں۔ لیکن جلد ہی یہ طے کر لیا کہ لکھنے پڑھنے والوں اور تصنیف و تالیف کے شہسواروں کی کمی نہیں کمی جس چیز کی ہے وہ یہ ہے کہ ادارے کا انتظام کون چلائے اور کس طرح چلائے اس فیصلہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک کوتاہ قلم اور کم سواد انتظامات کے خرخشوں میں پھنس کر رہ گیا اور شروع کئے ہوئے کام یوں ہی ناتمام رہ گئے۔ گذرے ہوئے دن واپس نہیں آتے اور اب افسوس کے علاوہ چارہ کار ہی نہیں ہے۔" (انتہیٰ)

مفتی صاحب ایک عظیم المرتبت عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ ایک کامیاب ترین منتظم بھی تھے ان کی بے پناہ اور محیر العقول انتظامی صلاحیتوں کا اعتراف سبھی کرتے ہیں۔ ادارہ ندوۃ المصنفین ان کی بے پناہ انتظامی صلاحیتوں اور حیرت انگیز کاوشوں کا ثمرہ ہے۔ خدا حضرت مفتی صاحبؒ کے قائم کردہ اس ادارہ کو پروان چڑھائے۔ (آمین)

"اب اُنھیں ڈھونڈیں چراغِ رُخِ زیبا لیکر"

ڈاکٹر فوق کریمی علیگ

انسانی زندگی میں موت ایسے آتی ہے کہ آہٹ تک نہیں ہوتی اور نہ کسی کو کانوں کان خبر ہوتی ہے۔ چلتے پھرتے ہنستے کھیلتے لوگ پل بھر میں اپنے عزیزوں اور دوستوں کو چھوڑ کر ایسے موت کی آغوش میں سو جاتے ہیں کہ پھر نہ اُن کو عزیزوں کے رونے دھونے کا خیال ہوتا ہے اور نہ احباب دوستوں کی جدائی کا احساس۔

موت یوں تو ہر انسان کو آتی ہے اور جو انسان ابھی دنیا میں آیا ہے اسے ضرور موت کا ذائقہ بھی دیکھنا ہے لیکن کچھ موتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو جس محلہ میں کسی کی موت ہوتی ہے تو اس کی خبر پورے محلہ میں رہنے والوں کو نہیں ہوتی۔ کچھ موتیں ایسی ہوتی ہیں کہ اگر کوئی شہر کا با اثر شخص ہوتا ہے تو پورے شہر میں اظہار افسوس کیا جاتا ہے کچھ موتیں وہ ہیں جو ملکوں کو متاثر کر جاتی ہیں جیسے کسی بادشاہ کی موت ہو یا کسی ملک کے سربراہ کی موت ہو لیکن یہ سب وہ موتیں ہیں جن کے متعلق چند دن لوگ غم کا اظہار کرتے ہیں اور پھر بھول جاتے ہیں مگر بعض موتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو پورے عالم کو سوگوار بنا دیتی ہیں اور ایسی موتیں ہمیشہ تاریخ کے اوراق میں اہل علم کے لئے ایک مستقل سانحہ بن جاتی ہیں۔ ایسی ہی موت کے لئے کہا گیا ہے "موتُ العالِم موتُ العالَم" حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کی موت اک تمام عالم کی موت ہے وہ یہ یک وقت اک عالم دین بھی تھے مفتی بھی تھے اور اللہ نے ان کو سیاسی بصیرت

بھی عطا کی تھی۔ مفتی صاحب کی زندگی کے دو دور ہیں۔ اک آزادی سے قبل اور اک آزادی کے بعد۔ آزادی سے قبل ان کی جوانی علم دین حاصل کرنے اور انگریزوں سے وطن عزیز کو آزاد کرانے میں گذری۔ آزادی کی لڑائی انھوں نے جمعیۃ علماء کے پلیٹ فارم سے کانگریس کے متحدہ قومیت کے نعرہ کی حمایت اور ہمنوائی کرتے ہوئے لڑی۔ اس لڑائی میں انھوں نے انگریزوں کے مظالم بھی برداشت کئے اور اپنوں سے گالیاں بھی کھائیں لیکن کانگریس کے متحدہ قومیت کے نعرہ سے دست بردار نہیں ہوئے۔ انھوں نے مولانا ابوالکلام، پنڈت جواہر لال نہرو، مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن حضرت حسین احمد مدنی، حضرت مولانا احمد سعید دہلوی اور دیگر جمعیتی اور کانگریسی مجاھدین آزادی کے شانہ بشانہ ہوکر آزادی وطن کے لئے لڑتے رہے۔

آزادی کے بعد جو خواب مفتی صاحب اور ان کے رفیقوں نے آزاد ہندوستان کا دیکھا تھا وہ نظر نہیں آیا۔ آزادی کے بعد ہندوستانی مسلمانوں اور بالخصوص دہلی کے مسلمانوں پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ دہلی کے وہ گلی کوچے جن میں مسلمانوں کے خاندان پشت در پشت صدیوں رہتے چلے آرہے تھے وہ انھیں چھوڑنے پڑے اور اس طرح کہ ہجرت کے نام مسلمانوں کو اس طرح اجاڑا گیا کہ ان کے قافلے کے قافلے پاکستان بے یار و مددگار روانہ ہورہے تھے اور جو جانا نہیں چاہتے تھے کہ ان کو گلی اور کوچوں سے ٹرکوں میں لاد کر ہمایوں کے مقبرے پہنچایا جارہا تھا۔ ایسے حالات میں مفتی صاحب اور ان کے رفیق محترم مولانا حفظ الرحمٰن مجاہد ملت ان مسلمانوں کی خبرگیری کرتے رہے۔ جب حالات سازگار ہوئے تو دہلی اور ملک کی دوسری ریاستوں کے مسلمانوں کے سروں پر کسٹوڈین کی تلوار لٹکا دی گئی، جو مسلمان پاکستان چلے گئے ان کے مکانات تو کسٹوڈین نے لے ہی لئے تھے لیکن

ساتھ میں ایسے ہزار ہا مسلمانوں کو ان کے مکانات سے بیدخل کر دیا جو ہندوستان میں تھے اور ہندوستان کو اپنا وطن سمجھ رہے تھے۔ گھر گھر میں اک پریشانی کا عالم تھا، اس موقع اور حالات میں بھی مجاہد ملت اور مفتی صاحب ہی نے مسلمانوں کو تسلیاں بھی دیں اور ان کے مکانات کسٹوڈین سے واگذار کرائے۔ جب کسٹوڈین کے مظالم کم ہوئے تو ملک میں مسلم کش فسادات کا سیلاب شروع ہوگیا۔ اس کے لئے بھی مجاہد ملت اور مفتی صاحب حکومت سے لڑتے رہے اور ان لوگوں کے دلوں کو اس وقت شدید تکلیف پہنچی جب ان کے ساتھی جو حکومت میں وزارتوں کو ان ہی کے پہنچائے ہوئے تھے، وہ ان کی بات پر توجہ نہیں دیتے۔ احمد آباد گجرات کے فسادات پر مفتی صاحب اور ڈاکٹر محمود نے مجلس مشاورت قائم کی۔ اس کے پلیٹ فارم سے مسلمانوں کے مسائل کو حکومت کے سامنے مفتی صاحب رکھتے، دہلی اور ملک کے کسی حصہ میں جب بھی کوئی فساد ہوتا تو پنڈت جواہر لال اور اندرا جی سے رابطہ قائم کرتے اور ان کو مسلمانوں پر ہونے والے مظالم کو بتاتے۔

مفتی صاحب کے نام اور ان کے مقام سے تو میں ۴۶ء میں اچھی طرح واقف تھا۔ لیکن ۵۰ء میں حضرت مجاہدِ ملت کے ذریعہ ان سے قربت ہوئی کہ میں نے علی گڑھ سے اک عالمی اردو کانفرنس کی تحریک شروع کی تھی، میں اس کا بانی اور محرک اور کنوینر تھا۔ اس کانفرنس کی تائید حضرت مولانا مدنیؒ حضرت مجاہد ملت مولانا احمد سعید دہلوی حضرت خواجہ حسن نظامی، مولانا عبدالماجد دریا بادی، ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم، پروفیسر رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر عبدالعلیم قاضی محمد عبدالغفار جیسے اہل علم حضرات نے کی تھی۔ اس مسئلہ میں مفتی صاحب سے بارہا علی گڑھ اور دہلی ملنے کے مواقع مجھے ملے۔ میں جب بھی اُن سے ملتا بیحد محبت اور شفقت سے ملتے تھے۔ ایک بار دہلی میں جمعہ کی نماز پڑھ کر آیا تو

مفتی صاحب سے ملاقات ہو گی۔ خیریت معلوم کی اور پھر اپنے مکان کی طرف چلدیئے مگر چند سکنڈ کے بعد واپس پلٹے اور مجھ سے فرمانے لگے مجھے یاد آگیا آج شام ۵ بجے میں نے عبدالرحمٰن صاحب انتولے کو اپنے یہاں چائے پر بلایا ہے۔ تم ضرور آجانا میں نے کہا حاضر ہوں گا۔ میں وقت مقررہ پر پہنچ گیا۔ انتولے صاحب بھی تشریف لے آئے۔ مفتی صاحب نے میرا تعارف ان الفاظ میں انتولے صاحب سے کرایا۔ یہ علی گڑھ کے ایم۔ اے ہیں اور ہمارے پرانے ساتھیوں میں ہیں۔

اس نشست میں دہلی کے کئی ممتاز کانگریسی بزرگ تشریف رکھتے تھے۔ انتولے صاحب کو چائے پر مفتی صاحب نے اس لئے بلایا تھا کہ وہ حج بیت اللہ سے مشرف ہوکر آئے تھے اور غالباً یہ بات ۱۹۷۶ء کی ہے۔ انتولے صاحب نے فرمایا کہ جب وہ خانہ کعبہ اور مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو انھوں نے اندراجی کے لئے دعا فرمائی تھی میں ان کی گفتگو کو بڑی توجہ سے سن رہا تھا۔ جب موضوع بدلا تو دہلی کے کسی کانگریسی بزرگ نے انتولے صاحب سے فرمایا کہ پاکستان ہندوستان کے خلاف مسلم ممالک میں بہت پروپیگنڈہ کرتا ہے اور اس سے ہندوستان کا وقار گرتا ہے۔ یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ میں نے انتولے صاحب سے کہا۔ آپ اجازت دیں تو میں عرض کروں فرمایا۔ ضرور، میں نے کہا کہ میں اپنے بزرگوں کی بات کی تردید نہیں کرتا۔ مگر ایک بات آپ کے علم میں لانا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ اسلامی ممالک کو اگر پانچ ہزار انجنیروں کی ضرورت ہے تو پاکستان پانچ سو نہیں دے سکتا۔ ہندوستان پانچ ہزار دے سکتا ہے۔ جب عرب ملکوں کو انجنیر بھیجے جاتے ہیں تو ان میں مشکل سے ایک فیصدی مسلمان ہوتے ہیں۔ جب کہ ہر سال علی گڑھ سے دو ڈھائی سو انجنیر بن کر نکلتے ہیں میری اس بات کی تائید مفتی صاحب نے بھی فرمائی اور پھر میں نے کہا کہ بات یہیں تک ختم نہیں ہوتی اگر کوئی مسلمان لڑکا تعلیم کے لئے یورپ یا امریکہ جانا چاہے

تو اس کے لئے ہماری حکومت رکاوٹیں پیدا کر دیتی ہے۔ اس پر انتولے صاحب نے کہا کہ کوئی ایسی مثال ہے۔ میں نے کہا۔ جی میرے بیٹے کا داخلہ مانچسٹر یونیورسٹی میں ہو گیا اور دو سال تک میں نے کوشش کی لیکن کبھی ریزرو بینک مانع ہو جاتا تھا کبھی وزارت تعلیم کی طرف سے اجازت نہیں ملتی تھی۔ انتولے صاحب میری اس بات کو سُن کر مجھے ساتھ لے کر اپنی کار میں بٹھا کر اندرا جی کی کوٹھی لے گئے اور مجھ سے راستے میں فرمانے لگے کانگریس کو آپ جیسے مسلمانوں کی ضرورت ہے مگر جب ہم اندرا جی کی کوٹھی پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ اندرا جی تشریف نہیں رکھتیں مگر پھر بھی انتولے صاحب نے مجھے نہیں چھوڑا اور پھر وہ مجھے ہوم منسٹر صاحب کے پاس لے گئے ان سے میرا تعارف کرایا اور میں نے انھیں اپنے بیٹے کے مزید تعلیم حاصل نہ کرنے کی روداد سُنائی اور انھوں نے اپنے اسٹینو کو بلا کر نوٹ کرائی اور پھر انتولے صاحب سے کہا کہ یہ معاملہ وزارت تعلیم کا ہے۔ بات آئی گئی ہوئی۔

اک بار رمضان المبارک میں مفتی صاحب سے ملا۔ میرا روزہ تھا۔ فرمانے لگے، روزہ میرے ساتھ کھولنا مجھے مکان پر بلایا افطار کے بعد ان کا یہ اصرار تھا کہ کھانا کھالوں مگر میری ٹرین کا ٹائم ہو چکا تھا۔ مجھے علی گڑھ آنا تھا۔ میں نے معذرت کی مگر مفتی صاحب کو میرا بغیر کھانا کھائے چلے آنے کا افسوس تھا مگر مجھ پر روزہ کھولنے اور مفتی صاحب کی قربت کا کچھ ایسا اثر ہوا کہ میں نے دہلی سے لے کر علی گڑھ تک اُس دن ایک نظم نغمہ لاالہ الااللہ کے تحت کہدی۔ وہ نظم میں آج برہان کے اس خصوصی نمبر میں پیش کر رہا ہوں۔

مفتی صاحب پر اعظم گڑھ میں فالج کا اثر ہوا۔ لکھنؤ کے بلرام پور ہسپتال میں رہے پھر دہلی آگئے، میں انھیں کئی بار مکان پر دیکھنے گیا۔ میں جب بھی گیا اتفاق سے یا تو وہ سوتے ملے یا ان کے صاحبزادے نے بتایا کہ اس وقت کمزوری کے باعث غنودگی ہے لیکن ایک بار ایسا ہوا کہ مفتی صاحب جاگ رہے تھے۔ جب انھیں

میری اطلاع ہوئی تو فوراً اندر بلایا اور سب سے پہلے شکایت یہ کی کہ میں نے کئی بار تمھیں یاد کیا۔ تم مجھے دیکھنے نہیں آئے، میں نے کہا قبلہ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ میں آپ کو دیکھنے نہ آؤں۔ کئی بار حاضر ہوا مگر ہر بار معلوم ہوا کہ آپ سو رہے ہیں اس بات کو سُنکر آپ اپنے صاحبزادے پر خفا ہو گئے اور ان کو بتایا کہ تم نے مجھے اُٹھا کیوں نہیں دیا اور انھیں بٹھایا کیوں نہیں۔ یہ میرے عزیز ہیں۔ پھر جب کچھ غصہ کم ہوا تو مجھ سے خیریت دریافت کی۔ قاری رضوان مرحوم صدر شعبۂ دینیات کے سلسلے میں پوچھتے رہے۔

مفتی صاحب کے انتقال سے علمی اور مسلم سیاسی حلقوں میں تو بلاشبہ اک بڑا خلا ہو گیا۔ مگر ہم جیسے گمراہ لوگوں کو راہ بتانے والا بھی اب کوئی نہیں رہا۔ اب تو یہی کہہ سکتے ہیں کہ ع

"اب انھیں ڈھونڈیں چراغ رُخ زیبا لے کر"

لا الٰہ الا اللہ

"میں یہ نظم حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کی روح کی نذر اس لئے کر رہا ہوں کہ میرے ذہن میں اس کے کہنے کا خیال مفتی صاحب کے ساتھ روزہ کھولنے کے بعد ہوا۔
فوق کریمی

زمیں سے تا بہ فلک لا الٰہ الا اللہ — فلک سے تا بہ سمک لا الٰہ الا اللہ
ترے جمال سے رخشندہ تیرگی شب کی — سحر میں تیری جھلک لا الٰہ الا اللہ
طیورِ صبح کے نغموں میں ہے تری آواز — کلی کلی کی چٹک لا الٰہ الا اللہ
ہیں کوہ و دشت سمندر بھی تیرے مدح سرا — ہر ایک سو ہے کھنک لا الٰہ الا اللہ
نظر نظر میں سرور و نشاط کا عالم — نفس نفس میں مہک لا الٰہ الا اللہ
ہے جس کے جام میں صہبائے حدت عرفاں — کہا پھر اس کی جھلک لا الٰہ الا اللہ
تمام جلوۂ عالم تمام حسنِ بشر — دل و نظر کی چمک لا الٰہ الا اللہ
فسونِ حسنِ بتاں ہے طلسم ہوش و نظر — وہ کفر کفر ہے شک لا الٰہ الا اللہ
جہاں بھی اہلِ حرم نے تجھے پکارا ہے — وہیں پہ آئی کمک لا الٰہ الا اللہ
ندائے شب سے ہیں پیدا درود کے نغمے — خموشیوں میں چھنک لا الٰہ الا اللہ

مٹا سکے گی نہ اُسے فوق گردشِ دوراں
ہے جس کے دل میں کسک لا الٰہ الا اللہ

(ڈاکٹر فوق کریمی علیگ)

مفتی صاحبؒ

حکیم محمد مختار اصلاحی
(اصلاحی دواخانہ، محمد علی روڈ، بمبئی)

اپنے اس دیس میں بہت سے مفتی موجود ہیں نہایت قابل اور سرگرم عمل بھی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اِدھر کئی برسوں سے اس مختصر سے نام پر مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب مرحوم ہی کا قبضہ تھا۔ ان کے اس مختصر سے عوامی نام میں کیسی عظمت، کتنا خلوص اور کس قدر مٹھاس بھری ہوئی تھی اس کو الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں۔

بلاشبہ تقسیم ملک کے بعد مفتی صاحب مسلمانوں کے لئے ایک بہت بڑی ڈھارس تھے۔ مسلم پرسنل لا کا مسئلہ ہو یا ان کی جان و مال کی حفاظت کا، تعلیمی مسائل ہوں یا اقتصادی الجھنیں، ہر ایک کے لئے ان کی مخلصانہ خدمات اور سرفروشانہ جدوجہد ہمہ وقت حاضر رہا کرتیں۔

مرحوم نے ۸۴ برس کی عمر پائی اِدھر قریب ڈیڑھ سال سے وہ صاحب فراش تھے۔ علالت کے ان دنوں کو چھوڑ کر اس پیرانہ سالی میں بھی وہ ملک و ملت کی خدمت کے لئے جوانوں سے زیادہ عزم و ہمت رکھتے تھے۔ ان کے معالجین کا ہمیشہ یہ مشورہ ہوتا کہ ان کی عمر کا تقاضا ہے کہ اب وہ زیادہ بھاگ دوڑ نہ کریں لیکن بڑی سنجیدگی سے فرماتے: "میاں! جب گھر میں آگ لگی ہو تو اس حالت میں چین سے بیٹھنا کیوں کر ممکن ہے؟"

مفتی صاحب سے یوں تو میں ایک عرصہ سے واقف تھا لیکن اِدھر دو تین برسوں

سے علاج و معالجہ کے سلسلہ میں ان سے قریب رہا۔ بمبئی میں جب بھی آنا ہوتا فون سے اطلاع دیتے اور وقت مقررہ پر اصلاحی دواخانہ میں تشریف لاتے۔ میں ان کا بغور معائنہ کرتا اور مناسب دوائیں بھی تجویز کرتا۔ جب دوبارہ رونق افروز ہوتے تو تشخیص و تجویز کی ستائش کر کے حوصلہ افزائی فرماتے۔ میرا بھی اکثر دلی جانا ہوتا تو چاہے پروگرام کتنا ہی مختصر ہوتا مفتی صاحب سے ملنا ضروری تھا۔ اور جب بھی ان سے مل کر آتا ایسا محسوس ہوتا کہ میں نے اپنے ہی گھر کے کسی بزرگ سے ملاقات کی ہے، وہی سادگی، وہی بے تکلفی اور حد درجہ شفقت اور محبت بھی۔

مفتی صاحب کی شخصیت جامع صفات تھی وہ ایک علمی و دینی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ خود حافظِ قرآن، جید عالم، بلند پایہ مفتی، بہترین خطیب و مقرر، اچھے منتظم، اونچے مدبر و مفکر، جنگ آزادی کے مجاہد، سیاسی رہنما اور اپنی ذات سے خود ایک انجمن تھے۔ ان کی جن خوبیوں نے مجھے خاص طور سے متاثر کیا وہ ان کی شرافت، وسعت قلبی، معاملہ فہمی، دور بینی، صلح پسندی اور وضع داری تھی۔ غصے کی حالت میں بھی وہ کبھی آپے سے باہر نہ ہوتے اور نہ جذبات کے دھارے میں بہہ کر کبھی کوئی فیصلہ کرتے۔ مسلم پرسنل لا بورڈ کے ایک رکن کی حیثیت سے میں اس کے اکثر جلسوں میں شریک ہوتا رہا۔ بارہا یہ دیکھنے میں آیا کہ اہم مسائل میں مفتی صاحب کی جچی تلی رائے کو بڑی اہمیت اور وقعت حاصل ہوتی۔

مفتی صاحب نے اپنی اس طویل زندگی میں ہر طرح کے نشیب و فراز دیکھے۔ وہ بدترین دن بھی دیکھا جب تقسیم ملک کے وقت خود ان کی پیاری دلی خون میں ڈوبی ہوئی تھی۔ وہ روز سیاہ بھی ان کی نظروں سے گذرا جب ایمرجنسی کے دوران ان کے گھر کے قریب ہی زبردست تباہی مچی ہوئی تھی۔ آخر وقت میں جمعیۃ العلماء کی اندرونی چپقلش اور دیوبند کے المیہ سے وہ بہت زیادہ کبیدہ خاطر تھے۔ میں نے دیکھا جب

کوئی ان کے سامنے جمعیۃ یا دیوبند کے سانحہ کا ذکر کرتا تو اس کے جواب میں صرف ایک لمبی آہِ سرد کھینچتے جس سے ان کے دل کے گہرے گھاؤ اور ان کی اندرونی کرب کا اندازہ بآسانی لگایا جاسکتا تھا۔ اس کا زیادہ امکان ہے کہ مسلسل صبر وضبط کی وجہ سے ان کے اعصاب پر جو بُرا اثر پڑا، اس کا نتیجہ فالج کی صورت میں ظاہر ہوا ہو۔

مفتی صاحب کی کمزوری یہ تھی کہ اپنی انا اور اقتدار کی خاطر وہ کبھی ملک وملت کے مفاد کو داؤ پر لگانا پسند نہیں کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کھُل کھیلنے والوں اور سیاسی وذاتی مفاد رکھنے والوں کے مقابل میں ہمیشہ پیچھے ہی رہے۔ لیکن ملک میں ایسے لوگوں کی بھی کمی نہ تھی جو اس کمزوری کو جانتے ہوئے بھی انھیں بڑی قدر ومنزلت کی نظر سے دیکھتے تھے۔

اسلام اور مستشرقین پر جو عظیم الشان بین الاقوامی سیمینار دارالمصنفین اعظم گڈھ میں ۲۱، ۲۲، ۲۳ فروری ۱۹۸۲ء میں منعقد ہوا تھا۔ مجھے بھی اس میں شرکت کا فخر حاصل ہوا تھا۔ مفتی صاحب نے بھی اس کی ایک نشست کی صدارت فرمائی، اس کے بعد ہی اچانک طبیعت ناساز ہوگئی، مجھے یاد فرمایا تو میں ان کی جائے قیام پر حاضر ہوا۔ اعصابی کمزوری حد سے زیادہ بڑھی ہوئی تھی، میں نے عرض کیا کہ چند دن اعظم گڈھ ہی میں قیام وآرام فرماکر مکمل علاج کرلیں پھر سفر اختیار کریں تو بہتر ہوگا، دوسرے دن طبیعت کچھ سنبھل گئی تو سفر کا ارادہ کرلیا۔ بمبئی آیا تو معلوم ہوا کہ دوران سفر ہی فالج کا حملہ ہوگیا اور اب دلی ہی میں کسی ڈاکٹر کے زیر علاج ہیں۔ لمبی عمر میں فالج کا شدید حملہ ہو تو اکثر علاج کامیاب نہیں ہوتا۔ مفتی صاحب کے علاج وتیمارداری میں کوئی کوتاہی نہیں ہوئی لیکن فالج کا یہ حملہ جان لیوا ثابت ہوا اور ساری کوششیں وتدبیریں بے اثر رہیں۔

طویل علالت کے دوران جب کبھی دلی جانا ہوتا مفتی صاحب سے ضرور ملتا۔ بہت خوش ہوتے اور دیر تک بیٹھائے رکھتے۔ مرحوم سے میری آخری ملاقات ان کے دولتکدہ پر

ہی پر انتقال سے کچھ دنوں پہلے ہوئی تھی۔ کمزور زیادہ تھے۔ لیکن ہوش و حواس درست تھے۔ ایک بزرگ کی اس نصیحت کے پیش نظر کہ "مریض کے پاس دیر تک بیٹھنا مناسب نہیں" اجازت چاہی تو ہاتھ پکڑلیا اور دیر تک بیٹھائے رہے۔ نحیف آواز میں فرمانے لگے۔ کیا معلوم کہ پھر ملاقات کب لکھی ہے؟ اور لکھی بھی ہے یا نہیں؟ بچوں کی خیریت پوچھی، بمبئی کے چند بزرگوں اور دوستوں کا حال معلوم کیا اور اپنی حالت تفصیل سے بتاتے رہے پھر مخلصانہ دعاؤں کے ساتھ اجازت ملی، ان کی بات صحیح ثابت ہوئی۔ نہیں معلوم تھا کہ اس پیکرِ شفقت و شرافت کی یہ آخری ملاقات ہے۔

ندوۃ المصنفین اور ماہنامہ برہان کے ذریعہ انھوں نے علمِ دین اور ادب و تاریخ کی جو گرانقدر خدمات انجام دی ہیں انھیں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اور کچھ بھی نہ کرتے تو تنہا ان کا یہی کارنامہ ان کو زندہ جاوید بنانے کے لئے کافی تھا۔

علامہ اقبال نے اپنے دو شعروں میں مردِ مومن کی جو تصویر کھینچی ہے وہ مفتی صاحب پر حرف بحرف صادق آتی ہے ؎

اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دلفریب اس کی نگہ دل نواز
نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز

اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو منور کرے اور انھیں اپنی جوارِ رحمت میں جگہ عنایت فرمائے۔ (آمین)

کچھ ماہنامہ "برہان" کے متعلق

اس خاص شمارہ کیلئے رفیق ندوۃ المصنفین مولوی عبد اللہ طارق صاحب کا ایک طویل مضمون اتنی تاخیر سے ہمیں موصول ہوا کہ ہم نمبر کی مقررہ ضخامت پوری کر چکے تھے۔ مضمون کا بیشتر ندوۃ المصنفین سے متعلق تھا جو کم و بیش ایک دوسرے مقالے میں آچکا تھا البتہ اس مضمون کا دوسرا حصہ جو ماہنامہ برہان سے متعلق ہے ہم شریک اشاعت کر رہے ہیں

ماہنامہ برہان ندوۃ المصنفین کا ترجمان ماہنامہ "برہان" ادارے کے سن تاسیس ۱۹۳۸ء سے جاری ہے۔ اس کا پہلا شمارہ جولائی ۱۹۳۸ء جمادی الاولیٰ میں نکلا تھا اور آج تک پابندی سے نکل رہا ہے۔ آج ملک میں اردو رسائل میں اس کے ساتھ کے رسالوں میں دو ایک کو چھوڑ کر شاید کوئی بھی اس کا ہم عمر نہیں ہے اور پابندی وقت کے بارے میں مولانا سید مناظر احسن گیلانی کا ایک مقولہ نقل کر دینا کافی ہوگا جو میں نے مولانا ظفر احمد خاں صاحب مرحوم سے سنا تھا۔ مولانا گیلانی فنا فی العلم اور نیم مجذوبانہ حال میں رہا کرتے تو وہ فرماتے تھے کہ "مجھے پورے مہینے یہ یاد نہیں رہتا کہ آج کونسی تاریخ ہے، مہینے میں صرف ایک بار تاریخ یاد آتی ہے، جس دن ڈاکیہ 'برہان' میرے ہاتھ میں لاکر دیتا ہے تو وہ ہمیشہ انگریزی مہینے کی سترہ تاریخ ہوتی ہے۔"

مضامین کے سلسلے میں ہمیشہ اس میں یہ التزام کیا گیا کہ ہر مضمون نیا اور تازہ ہو جو کہیں مضمون کی شکل میں یا کسی کتاب میں چھپا نہ ہو، حتیٰ کہ جو مقالات کسی سمینار وغیرہ میں پڑھے جا چکے ہوں یا جو تقریر ریڈیو پر سنائی جا چکی ہو وہ بھی شائع کرنا پسند نہیں کیا جاتا کبھی اگر ایک دو تقریریں یا کوئی مقالہ ایسا چھاپنا پڑا جو عموماً اچانک وقتی ضرورت کے تحت ہوتا تھا تو اس کی معذرت شائع کی جاتی تھی۔

کوئی اکا دکا مضمون کسی مضمون نگار کی حرکت سے اگر ذمہ داران کی لاعلمی میں چھپ گیا ہو تو وہ اس کلیے سے مستثنیٰ ہے جیسا کہ کبھی کبھی ہوا بھی ہے، اس کا ایک

لطیفہ بھی موقع کی مناسبت سے لائق ذکر ہے۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی مرحوم سے نیاز مندی اور تعلق تو ۱۹۷۰ء سے ان کی وفات تک برابر ہی رہا مگر ۱۹۷۴ء سے ۱۹۷۸ء تک چار سال تک ایسا قرب رہا کہ گیارہ بجے دوپہر کو اور تین بجے سہ پہر چائے پر روزانہ دو بار ہم نشینی کا موقع ملتا تھا اور یہ نشست کم و بیش آدھے گھنٹے کی ہوتی تھی۔ اس میں طرح طرح کے ایک سے ایک موضوعات زیرِ بحث آیا کرتے تھے۔ ایک روز مولانا مرحوم نے مجھے مخاطب کر کے بڑے مسرت کے لہجے میں فرمایا کہ "ارے بھئی مولانا! یہ ایک بڑی خوشی کی بات ہے کہ ہمارے ملک میں تحقیق و تالیف اور مضمون نگاری کا علمی معیار نہایت بلند ہوتا جا رہا ہے، لوگ نہایت تحقیقی مقالات لکھنے لگے ہیں۔"

میں نے عرض کیا کہ اس میں شک نہیں مگر جناب کے پیشِ نظر خصوصیت سے اس وقت کونسا مضمون ہے؟ فرمایا "وہ گزشتہ شمارے میں آپ نے فلاں مضمون نہیں دیکھا؟ کس قدر تحقیقات سے لبریز ہے اور بال کی کھال نکال رکھی ہے۔"

میں نے عرض کیا کہ "حضور! میں نے بھی جب اسے دیکھا تھا تو یہی تاثر ہوا تھا مگر پھر کھٹک ہوئی کہ یہ بحث تو کہیں نظر سے گزر چکی ہے چنانچہ ادارے ہی کی شائع کردہ فلاں کتاب نکال کر دیکھی تو یہ مضمون من و عن اسی سے نقل ہے، میں نے کتاب سامنے رکھ کر ملا کر دیکھا ہے کوئی فرق نہیں ہے۔"

مولانا حیران ہو گئے اور فرمایا کہ "میں تو اب کے نظرات میں اپنی اس مسرت کا اظہار کرنے والا تھا اور شاید میں اس مضمون کا ذکر بھی کر دیتا اچھا ہوا آپ نے یہ واضح کر دیا۔"

ایسے علمی سرقوں سے تو دنیا کبھی خالی نہیں ہوگی خود میرا ایک مضمون حافظ زکی الدین منذری پر 'برہان' میں چھپا تھا اور ایک اعلیٰ درجے کے پرچے میں

ایک اعلیٰ درجے کے صاحبِ قلم نے اسے اپنالیا، ذرا سے حذف کے ساتھ اس کی تلخیص کی اور ایک لفظ بھی اس میں بڑھائے بغیر بلا حوالہ چھاپ دیا، یہ حرکتیں ہمیشہ ہوتی رہتی ہیں مگر اپنی دانست میں 'برہان' میں ہر مضمون ۔ مفتی صاحب اور مولانا اکبرآبادی صاحب کی حیات تک راقم سطور ذمہ داری سے کہہ سکتا ہے کہ ۔ نیا اور غیر شائع شدہ ہوتا تھا۔

ہر مضمون بلند پایہ علمی و تحقیقی ہوتا تھا۔ بعض مضامین بہت طویل ہوتے تھے جو کئی کئی قسطوں میں ہوتے تھے اکثر ان کو پھر کتابی شکل میں شائع کر دیا جاتا تھا۔ ان مضامین میں مختلف علمی موضوعات پر بے شمار اور نہایت اور نہایت قیمتی مضامین آئے ہیں جن کا اشاریہ (انڈکس) محترم جناب عابد رضا بیدار صاحب نے بڑی محنت سے مرتب کرکے برہان اپریل ۶۶ء میں شائع کرایا ہے جس کا عنوان ہے "علوم اسلامیہ کی انسائیکلوپیڈیا" کئی قسطوں میں آیا ہے۔

شروع میں "نظرات" کے نام سے اداریہ (ایڈیٹوریل) ہوتا تھا جو ہمیشہ روز ازل سے مولانا اکبرآبادی صاحب کی وفات تک اکبرآبادی صاحب کا ہوتا تھا۔ دو ایک بار مفتی صاحب نے بھی نظرات[1] لکھے ہیں۔ ایک بار راقم سطور نے بھی نظرات لکھے ہیں جلد ۳۰ یا ۲۱ میں عبادت بریلوی صاحب کے نظرات بھی آئے ہیں۔

نظرات میں ہمیشہ ملک کے عام حالات پر، ملی مسائل اور تعلیمی مسائل پر سنجیدہ اور متوازن اظہارِ خیال ہوتا تھا۔ کبھی کبھی علمی دنیا کی کسی خاص بات پر بھی اظہارِ خیال کیا جاتا تھا۔

برہان کے ابتدائی دور میں "اخبار علمیہ" کے نام سے بھی ایک مستقل کالم ہوتا

---

[1] چند مہینے ٹائٹل پر ایڈیٹر کی حیثیت سے مفتی صاحب مرحوم کا نام آیا ہے یہ غالباً وہ زمانہ ہے جب اکبرآبادی صاحب سینٹ اسٹیفنس کالج دہلی میں لکچرار ہو گئے تھے اس وقت قانوناً رسالہ پر ایڈیٹر کی حیثیت سے نام نہیں آسکتا تھا۔

تھا جس میں مختلف سائنسی اکتشافات کا ذکر ہوتا تھا۔ "ادبیات" کا کالم بھی ہوتا تھا جو اس سے بھی بعد تک چلتا رہا جس میں ملک کے بلند پایہ شعراء کا کلام کبھی نعت کبھی غزل کبھی کسی اور صنف سخن میں معیاری کلام ہوتا تھا، بعد میں جیسے جیسے مفتی صاحب مرحوم کی مصروفیات بڑھتی گئیں اور اکبرآبادی صاحب دہلی سے باہر رہنے لگے تو برہان کے مستقل کالم رفتہ رفتہ ختم ہو گئے۔

"برہان" کی ایک خاص چیز اس کے تبصرے بھی ہیں، تبصرہ اصلاً نئی شائع ہونے والی کتابوں کے بارے میں دیانت دارانہ مشورہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب کیسی ہے اور مشورے کا اصول یہ ہے کہ وہ پوری دیانت داری سے دیا جائے اور مشورہ لینے والے کے حق میں جو حقیقی اور ایمان دارانہ صحیح رائے ہو وہ ظاہر کی جائے۔ ارشاد نبوی ہے کہ المستشار مؤتمن۔ جس سے مشورہ لیا جائے اس کو امین ہونا چاہئے (سنن اربعہ)۔

تبصرہ نگار اگر کسی کتاب کے بارے میں جانبداری برتے یا اس کے مصنف سے کسی ذاتی رنجش کی بناپر اس کو اس کے جائز مقام سے گرائے تو وہ اپنے قارئین سے خیانت اور بد دیانتی کرتا ہے، برہان کے تقریباً اس نصف صدی کے طویل دور میں ہمیشہ دیانت دارانہ تبصرے ہوتے رہے ہیں اور انصاف کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوٹنے پایا، نہ کبھی ذاتی تعلق کی بناپر کسی کتاب کی بے جا تعریف ہوئی نہ ذاتی مخاصمت کی وجہ سے کسی کتاب کی تنقیص کی گئی اور نہ ہی کسی بلند قامت شخصیت کے لحاظ سے منصفانہ علمی تنقید سے گریز کیا گیا۔

اکبرآبادی صاحب کا زمانۂ ادارت بیشتر دہلی سے باہر گزرا مگر اداریہ اور تبصرے وہ ڈاک سے بھیجا کرتے تھے۔ مضامین عموماً مولانا ہی کے پاس پہنچتے تھے وہ دیکھ کر بھیجا کرتے تھے، تبصرے کی جو کتابیں دفتر میں آتیں کچھ کچھ عرصے کے بعد جب مولانا

دہلی آتے تو خود ساتھ لے جاتے یا خود مفتی صاحب بھیجتے رہتے تھے، کبھی کبھی اور اخیر دور میں تو اکثر ایسا ہوتا تھا کہ دوسرے حضرات بھی تبصرے لکھا کرتے تھے جیسا کہ اخیر دور میں راقم سطور نے اکثر لکھے ہیں۔

تبصرہ نگار کا نام عموماً اشاروں میں ہوتا تھا جیسے عبداللہ طارق کے بجائے (ع ط) لکھ دیا، طویل تبصرے ایک الگ عنوان "باب التقریظ والانتقاد" کے تحت ہوتے تھے۔

بُرہانؔ کی یہ بھی ایک نرالی اور تاریخی چیز ہے کہ اس کے تقریباً اس پورے نصف صدی پر پھیلے ہوئے زمانۂ اشاعت میں کوئی خاص نمبر نہیں نکلا۔ تاریخ کا یہ کیسا عجیب دل دوز سانحہ ہے کہ بانی کی وفات پر ہی اس کی یہ آن ٹوٹ رہی ہے اور پہلی بار خود انہی کا خاص نمبر نکالا جا رہا ہے۔

تأثرات

(از شمس الرحمٰن نوید عثمانی)

خدا کی "دولتِ جاوید" تیری ذات میں ہے
دلِ حیات کی دھڑکن تری وفات میں ہے!
تری نظر سے جو چھلکی شرابِ خُلقِ عظیم
بنامِ "حُبِّ نبوت" تخیلات میں ہے!
خدا کرے نئی ملت کی قوم نو سے ہو پُر
ترا عجیب خلا، بزمِ کائنات میں ہے!

شجرِ سایہ دار

اخلاق مرزا دہلوی حال مقیم کراچی پاکستان

زندگی واقعات و حوادث کے لامتناہی سلسلوں اور پیہم نشیب و فراز کا نام ہے بقول شاعر ؎

لحظہ لحظہ متغیر ہے انجام ہستی
دن ابھی رات ابھی صبح ابھی شام ابھی

ہر لمحہ کروٹ لیتی اور انقلابات کو جنم دیتی ہوئی اس دنیا کو کہیں قرار نہیں ہے، اس لیے زندگی میں پیش آنے والے واقعات اور وہ لاتعداد افراد ذہن کے پردہ اور دل کی دنیا میں باقی نہیں رہتے جن سے ہمیں سابقہ پڑتا ہے، اور زندگی کے مختلف ادوار میں جن سے مل کر بہت سے امور پر بات چیت کرنے ایک دوسرے کو سمجھنے اور ایک دوسرے کے خیالات سے واقف ہونے کی نوبت آتی ہے لیکن اسی دنیا میں، اسی زمین کے اوپر اسی آسمان کے نیچے لاکھوں کروڑوں، انسانوں کے اس بے پناہ ہجوم میں کچھ شخصیتیں، کچھ افراد اور کچھ بزرگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن سے ایک بار مل لینا، تھوڑی دیر ملاقات کر لینا عمر بھر کے لیے دل و دماغ اور روح کی گہرائیوں میں محفوظ ہو جاتا ہے اور ایسے تابندہ نقوش ثبت ہو جاتے ہیں جو زندگی کے آخری سانس تک یادوں اور حافظے کی سطح پر قائم و دائم رہتے ہیں اور کیا شک ہے کہ مفکرِ ملت مولانا عتیق الرحمن عثمانی رح

ایسی ہی ناقابلِ فراموش شخصیت کے مالک گراں مایہ قابلِ احترام اور زندہ جاوید بزرگ تھے۔

حضرت مفتی صاحب سے اس خادم کی ملاقات انقلاب اتھل پتھل، ہنگاموں اور قتل و غارتگری کے ایسے دور میں ہوئی جب ہند و پاکستان کے آسمانوں پر وحشت و بربریت کے سرخ، ہولناک اور وحشت آفریں بادل چھائے ہوئے تھے، انسانیت سر بگریباں تھی، شرافت انگشت بدنداں اور اخلاق و تہذیب کی دنیا میں ماتم کناں۔ زندگی کا چراغ خطرات کی یورشوں اور حوادثِ آلام آندھیوں کے تیز و تند جھکڑوں کی زد پر تھا۔ اور اس کی لَو تھرتھرا رہی تھی۔ ایسے ماحول ایسی خوفناک تاریکی اور پریشان کن صورت حال میں حضرت مفکرِ ملت سے میری ملاقات ایسی ہی تھی جیسے آندھیوں میں ٹھہراؤ آجائے۔ اندھیروں میں ایک چراغ — روشن تابناک اور درخشاں چراغ۔ جل اٹھے۔ ایسا چراغ جو زندگی کے لق و دق صحرا میں ہمیشہ کے لیے قائم رہے — ہمیشہ روشنی دکھانا اور رہنمائی کا فرض انجام دیتا ہے۔

یہ اُس وقت کی بات ہے جب حضرت مفتی صاحب قرول باغ سے آپ کی عمر بھر کی محنت و جانفشانی جد و جہد اور سعی و کاوش سے لگائے ہوئے ایک شاداب پُر بہار اور قیمتی گلستاں کو جنون و بربریت کی آگ کے ہلاکت آفریں شعلوں کے حوالے کر کے تن کے کپڑوں سے گولیوں کی بوچھار میں جامع مسجد تشریف لے آئے تھے اور بالکل نئے سرے سے نئی زندگی کا آغاز کرنے کے لیے علم و ادب دین و دانش اور علوم قرآن و حدیث کا ایک مرکز دوبارہ قائم کرنے کے لیے کمر ہمت کس رہے تھے، حالات بے حد مایوس کن تھے، ماحول غیر یقینی اور ہمت شکن تھا مگر قوم کے "ہیرو" عزم و ہمت اور صبر و استقامت کے

کوہِ گراں ــــ ہمارے حضرت مفتی صاحب ــــ اس طرف سرگرم عمل تھے کہ ایک طرف مسلمانانِ ہند کے اکھڑے ہوئے پیروں کو جمانے، توڑی ہوئی ہمتوں کو جوڑنے اور دلوں میں اعتماد و توکل کی ایک نئی مشعل تاباں روشن کرنے کی فکر میں شب و روز مشغول تھے ــــ اور اسی بھاگ دوڑ اور خوف و خطر سے لبریز زندگی علم و دین کے شکستہ قلعہ ــــ ندوۃ المصنفین ــــ کو دو بارہ تعمیر کرنے کی سعی و کاوش سے غافل نہ تھے ــــ حال کچھ ایسا تھا کہ بڑے بڑے باہمت و ذی حوصلہ حضرات مفتی صاحب کو سمجھانے پر مجبور تھے کہ یہ موقع اور یہ حالت اس قسم کے سنجیدہ و تعمیری کاموں کے لئے کسی صورت میں موزوں و ساز گار معلوم نہیں ــــ مگر مفتی حضرت مفتی صاحب عزم و ثبات کے ایک روشن مینار کی طرح فرماتے ہیں۔ ایسے ہی موقع پر تو انسان کے توکل اور ہمت و عزم کی پختگی کا امتحان ہوتا ہے۔ خدا چاہے گا تو علم و دانش کا یہ گلستاں پھر آباد ہو گا۔ ہزاروں نئے پھول اس میں کھلیں گے۔ عالمِ اسلام اور دنیائے انسانیت کو اپنی مہکتی ہوئی خوشبو سے معطر کریں گے ــ خیر یہ کہانی تو بہت ہی لمبی ہے۔ میں تو حضرت مفتی صاحب نور اللہ مرقدہ کے تذکرہ جمیل میں ایک عقیدت مند ایک سراپا نیاز اور ایک دیرینہ خادم کی حیثیت سے شرکت کا شرف حاصل کرنے کی غرض سے یہ چند سطور پیش کر رہا ہوں

حضرت مفتی صاحب سے ۱۹۴۷ء میں پہلی ملاقات اس وقت ہوئی تھی جب کٹرہ نظام الملک کے ایک مکان میں قیام کیا اور دوسرے مکان میں ندوۃ المصنفین کا دفتر قائم کیا گیا، ہم اسی گلی میں ہمیشہ سے رہتے تھے۔ حضرت مفتی صاحب کی تشریف آوری کے بعد اس چھوٹی سی، تنگ سی، غیر معروف سی گلی میں زندگی کی رونقیں نکل آئیں اور کچھ ہی عرصہ بعد دفتر ندوۃ المصنفین اور

حضرت مفتی صاحب کی ذات گرامی کی وجہ سے یہ ملکی ملّی، علمی اور مذہبی شخصیتوں کی توجہ کا مرکز بن گئی اور مسلسل ۳۸ سال تک دنیائے اسلام اور ہندوستان کی بڑی سے بڑی شخصیتیں یہاں آنے جانے لگیں۔ ملکی و ملّی تحریکوں کے سلسلہ میں اہم سے اہم تاریخ ساز اور عہد آفریں فیصلے اسی گلی میں واقع ادارہ ندوۃ المصنفین کے دفتر میں ہوتے تھے۔ بڑے سے بڑے اعلیٰ سے اعلیٰ عہدیدار یہاں آکر اور مفتی صاحب سے مل کر بڑی عزت و اعزاز محسوس کرتے تھے۔ اِدھر حضرت مفتی صاحب کے کمال اخلاق و شرافت کا یہ حال تھا کہ غریب سے غریب اور معمولی سے معمولی آدمی اس انداز سے ایسی تواضع و انکسار سادگی و شفقت سے پیش آتے تھے کہ ان کی عظمت و رفعت اور حُسنِ اخلاق کا سکّہ ہر ملنے والے دل و دماغ پر جم جاتا تھا۔ ایک نقش قائم ہو جاتا تھا۔

۱۹۵۴ء میں دہلی چھوڑ کر کراچی آگیا مگر حضرت مفتی صاحب سے تعلق برابر قائم رہا جب بھی دہلی جانا ہوتا حضرت مفتی صاحب سے ملاقات کرکے ان کی بے پناہ شفقت و عنایات ان کی عظیم و بلند شخصیت سے قلب و روح جیسے نئی تازگی و توانائی محسوس کرتے تھے۔

مفتی صاحب کی علالت کے دوران بھی اللہ نے ان کے پاس حاضری کی سعادت عطا فرمائی۔ ایک سرتاپا عمل با اصول وضعداری کے پیکر بزرگ کو بستر علالت پر مفلوج حالت میں دیکھ کر دل ڈوب سا گیا۔ آنکھیں بھیگنے لگیں مگر جب حضرت مفتی صاحب نے گفتگو فرمائی تو پھر ایک بار ذہن و شعور میں تازگی ہونے لگی، ان کا شعور، ان کی بصیرت، ان کی شفقت و عنایت کا وہی عالم تھا ــــ خود امراض کے حملوں اور کمزوری، نقاہت و ضعف میں مبتلا تھے۔ مگر دوسروں کی ہمدردی و غمگساری ہر وقت فرماتے رہتے۔ اسی بستر علالت

پر بھی نہ جانے کتنے لوگوں کے کام کرانے اور کتنی امداد لوگوں کی کرتے تھے، یہاں تک کہ برسرِ اقتدار لوگ وزرا اور حکام بھی آپ سے تعاون لیتے تھے — آہ ایک شجرِ سایہ دار کا سایہ سر سے اُٹھ گیا اور بہت نازک حالات میں ملّتِ اسلامیہ ایک بہت بڑے سرپرست، دانشور، معاملہ فہم، فکر و بصیرت اور صبر و تحمل کے کوہ پُر وقار سے محروم ہوگئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

دہلی اب بھی وہی ہے جامع مسجد شاہجہانی کے مینارے اب بھی آسمان کی بلندیوں کو چھو رہے ہیں۔ دنیا کی ہماہمی اور رونقیں اب بھی باقی ہیں۔ مگر حضرت مفتی صاحب کے سانحۂ ارتحال نے مجھے تنہائی کا گہرا، کربناک اور دلدوز احساس دے دیا ہے جس کی وجہ سے سب کچھ ہوتے بھی بہت بڑی کمی زندگی میں محسوس ہوتی ہے۔ انسان کی بے چارگی و بے بسی کا بھی کیا ٹھکانا ہے۔ بس یہی کہنا پڑتا ہے ؎

مشیت میں مجالِ دم زدن توبہ معاذاللہ
جسے یوسف بناتے ہیں اسے رکھتے ہیں زنداں میں

جس روز حضرت مفتی صاحب کے سانحہ ارتحال کی خبر ملی بتا نہیں سکتا کہ دل و دماغ کی کیا حالت اور کیسی کیسی کیفیتیں غم و اندوہ کے ان لمحات میں دل پر گذر گئیں اسی وقت ایصال ثواب کیا۔ دیر تک اُن کی یادوں میں کھویا ہوا آنسو بہاتا رہا، پھر اُن کی وہ یادگار تصویر جو ایک تقریب میں ہم لوگوں کے ساتھ لی گئی تھی نکالی اور اس کی ایک کاپی لے کر "جنگ" اخبار کے دفتر میں گیا اور ان کو بتایا کہ شیخ الاسلام پاکستان حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی کے لائق بھتیجے اور ہندوستان کے مشہور عالم دین کل ہند مجلس مشاورت کے صدر بلکہ روح رواں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے قائم مقام صدر اور بے شمار دینی مدارس و مراکز علم، و

ملی تنظیموں کے سربراہ اور لاکھوں انسانوں کے غمخوار و غمگسار حضرت مفکر ملت مولینا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی ٹھیک اس وقت اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ جب مسلمانان ہند کو حالت کی نزاکتوں نے گھیر رکھا ہے اور فہم وبصیرت فکر و دانش اور عظمت وبصیرت کے کوہ گراں کی سب سے زیادہ ضرورت ہے اُسی روز "جنگ" میں یہ دلدوز خبر اسی یادگار تصویر کے ساتھ چھپی جو میری زندگی کی بڑی قیمتی شے ہے۔ زندگی کی گاڑی چلتی رہے گی۔ وقت کا بے رحم مسافر سرگرم سفر رہے گا مگر حضرت مفتی صاحب علیہ الرحمہ کی یاد دل کے گوشہ گوشہ اور روح کی گہرائیوں میں ہر دم تازہ ہے اور ان شاء اللہ آخری سانس تک رہے گی۔

حضرت قبلہ مفتی صاحبؒ
یادیں، نقوش اور تاثرات

از محمد سعید الرحمٰن شمس
ناظم ادارۂ تصنیف و تالیف و مدیر ماہنامہ نصرۃ الاسلام کشمیر

برصغیر کے ایک ممتاز عالمِ دین، مفتی شرعِ متین وسیع النظر فاضل مفکرِ ملت حضرت علامہ قبلہ مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانیؒ جنھیں اب مرحوم لکھتے ہوئے آنکھیں پُرنم اور کلیجہ منہ کو آرہا ہے ہم سے جُدا ہوئے ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا ہے۔ افسوس صد افسوس مفتی صاحب اب ہم سے روٹھ کر ایسی دنیا میں جا چکے ہیں جہاں سے کوئی دوبارہ واپس نہیں آتا، آدمی بڑے سے بڑے حقائق کا انکار کرسکتا ہے لیکن موت ایک ایسی اٹل حقیقت ہے کہ ہر کہ ومہ، عامی و عالم اور احمق و دانا ماننے پر مجبور ہے، آہ! موت کے آگے انسان بے بس ہے۔!

مفتی صاحبؒ مرحوم اپنے لاکھوں عقیدت مندوں، ہزاروں وابستگان اور ملک کے کروڑوں عوام کو روتا بلکتا چھوڑ کر ایسی نازک اور ہوش ربا حالت میں چلے گئے جبکہ ملت اسلامیہ ہندیہ کی کشتی خاص طور پر بھنور میں پھنسی ہوئی ہے اور ملک وملت گوناگوں مشکلات، حوادث اور بحرانی حالات سے دوچار ہے۔

ملت کی سربراہی، بے لوث خدمت اور اسلامی صالح قیادت کا جو فطری جذبہ قدرت نے مرحوم کے دل ودماغ میں کوٹ کوٹ کر بھر دیا تھا، اور ملت کی حالتِ زار،

ان کی پسماندگی، زندگی کے مختلف میدانوں میں دوسروں کے مقابلہ میں ان کی سُست رفتاری، اور نااہلی دیکھ کر مفتی صاحبؒ کا افسردہ اور غمگین ہونا، ملت کی سربلندی اور خوشی میں خوش اور ان کے غم سے متفکر اور پریشان ہونا، اور پھر بغیر کسی دنیوی غرض، لالچ، طمع، حرص اور ذاتی مفاد کے بغیر ان کی بے پناہ مختلف النوع دینی، ملی، قومی، ملکی، سیاسی، اور سماجی خدمت، غیر معمولی قابلیت، خداداد صلاحیت جس کا پورے ملک اور برصغیر کے مختلف طبقوں اور حلقوں پر اثر تھا ان کی وفات کا عظیم ترین سانحہ اور المیہ میرے نزدیک کسی ایک فرد، ایک خاندان، ایک شہر اور ایک ملک کا نہیں بلکہ پوری ملّت اسلامیہ کا صدمہ ہے۔

حضرت مفتی صاحب قبلہؒ کی قدآور اور ہمہ گیر شخصیت کے بارے میں مجھ جیسے کم علم اور کوتاہ نظر کا کچھ لکھنا اور اپنے خیالات کا اظہار کرنا فی الحقیقت چھوٹا منہ بڑی بات ہے، یہ منصب اور مقام ہے حضرت مفتی صاحب کے رفقار کار، معاصرین اور اہل علم و نظر حضرات کا خاص طور پر مفکر اسلام حضرت قبلہ علّامہ سیّد ابوالحسن علی الندوی اور پروفیسر علامہ سعید احمد اکبر آبادی کا، لیکن صاحبزادۂ محترم کا حکم نامہ آیا کہ تم بھی اپنے تاثرات لکھ بھیجو! بادلِ ناخواستہ قلم سنبھالنا پڑا، بیتی باتوں اور یادوں کا ایک بحرِ بیکراں ہے جو عام لوگوں کے لیے مفید اور کارآمد نہ سہی کم از کم خاکسار کے لیے تو سرمایۂ حیات کی حیثیت رکھتا ہے۔

۱۹۷۷ء کے وسط میں جب پہلی بار اپنے وطن مالوف (مغربی بنگال) سے مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند آنے کی سعادت حاصل ہوئی اور اس گہوارۂ علم و ادب میں داخل ہوا تو پہلی مجلس شوریٰ کی میٹنگ کے موقع سے حضرت مفتی صاحب مرحوم کو دارالعلوم کے حسین مہمان خانے میں دیکھا، تعارف کے بعد جب موصوف کو یہ پتہ چلا کہ خاکسار کا تعلق مغربی بنگال سے ہے تو خصوصی شفقت اور توجہ فرمائی اور فرمانے

لگے میاں! مغربی بنگال سے تو مجھے خاص انس و محبت اور ربط و تعلق ہے، کلکتہ برسوں رہا ہوں اور وہاں کی گلی کوچوں سے بخوبی واقف ہوں اور پھر ایک بزرگ کی حیثیت سے مجھے محنت، لگن اور دلچسپی سے پڑھنے کی تاکید فرمائی۔

کم و بیش چار سال تک دارالعلوم میں خوشہ چینی اور اکابر اساتذۂ کرام سے شرف تلمذ کا موقع حاصل رہا اس دوران متعدد بار جب جب "مجلس شوریٰ" اور "مجلس عاملہ" میں دیوبند تشریف لاتے خاکسار دیرینہ نیازمندی اور تعارف کی بنار پر خدمت میں حاضری دیتا، سلام عرض کرتا اور دعائیں لیتا اور الحمدللہ برابر اس ربط و تعلق میں اضافہ ہی ہوتا رہتا جو پہلی ملاقات اور تعارف کے موقعہ سے ہوا تھا، ان ملاقاتوں اور خدمت میں وقتاً فوقتاً حاضری کے بعد حضرت مفتی صاحبؒ کے بارے میں مجھے جو اندازہ ہوا کہ مرحوم کے گوناگوں کمالات اور بے پناہ خصوصیات کے علاوہ جو سب سے اہم اور میری نظر میں لائق صد تحسین و تقلید خصوصیت تھی۔ (اور کوئی شک نہیں کہ یہ جوہر ان کے علمی اور تاریخی گھرانے کے ہوش مند اور قابلِ فخر فرزند ہونے کے ناطے ہونا ضروری تھا) وہ خورد نوازی اور اپنے چھوٹوں کے ساتھ گھل مل کر بات کرنے کی تھی۔

اتنے بڑے عالم اور مفتی ہونے کے باوجود مزاج میں رعونت، اکڑ فوں، تعلّی خودستائی اور شیخی نہیں تھی، محبت، اخوت، اخلاق، شرافت، دوستی، مروت، وضع داری، رواداری اور خوش مذاقی ان کے کردار کے خاص اوصاف اور نمایاں جوہر تھے اور بیشک ان کے اس جوہر نے ملّت اسلامیہ ہندیہ کے خاص طور اور برادران وطن کے عام طور سے دل جیت لیے تھے۔

مفتی صاحب بڑے حسّاس، ذہین، فطین اور شگفتہ مزاج تھے۔ مولویوں کی عام خشک مزاجی، ملّائیت اور کٹّرپن جس نے عام طور سے اس طبقہ کو بڑی حد تک

نئی نسل میں رسوا کیا ہے مفتی صاحبؒ میں بالکل نہ تھا، نکتہ سنج۔ بذلہ سنج اور مرنجان مرنج طبیعت کے مالک تھے، رہا غیر اور عزیزوں کے ساتھ بھی ان کی گفتگو اور عام برتاؤ میں شگفتگی اور خوش طبعی نمایاں رہتی تھی اور اس وصف نے مرحوم کی شخصیت کو باغ و بہار بنا دیا تھا!

بلاشبہ مفتی صاحب ایک وسیع النظر عالمِ دین اور صاحب فکر و بصیرت انسان تھے، آپ کا تدبّر و تفکر، سیاسی سُوجھ بُوجھ، معاملہ فہمی، شرافتِ نفس، ذکاوتِ حِس اخلاص و صداقت، صبر و ضبط، اور استقلال و لبسالت، سب مخالف موافق سبھی تسلیم کرنے پر مجبور تھے۔

بقول پروفیسر آل احمد سرور کہ "مفتی صاحبؒ جدید و قدیم کے درمیان ایک پُل کی حیثیت رکھتے تھے، اور اپنی خصوصیات، اوصاف اور کمالات کی بنا پر اپنے معاصرین میں ایک نمایاں اور ممتاز مقام کے مالک تھے۔"

آپ کی پوری زندگی زہد، قناعت، سادگی، خلوص، وفا، ایثار اور قربانی کی جیتی جاگتی تصویر تھی، اس کا اعتراف تو آج سبھی کرنے پر مجبور ہیں کہ مفتی صاحب نے پوری زندگی اپنے قول و فعل سے کسی بڑے چھوٹے کی دل آزاری گوارا نہیں فرمائی۔

ہندوستان جنّت نشان کو جن روشن فکر، حرّیت پسند اور قوم پرور علما، اور فضلاء پر فخر ہے (جنھوں نے ہی سب سے پہلے ملک میں آزادی کی شمع روشن کی) اور ملّت اسلامیہ ہندیہ کا سر جس بات سے اونچا ہے وہ یہی ہے کہ اس خاک پاک سے ایسی ذہین، عالی دماغ اور مفکّرین کی ایسی انقلابی اور فکری جماعت پیدا ہوئی جس نے ملک و قوم کو دین و شریعت، قرآن و سنت، حق و صداقت اور دعوت و تبلیغ کے سمجھنے اور سمجھانے کے مقدس مشن کے لیے پوری زندگیاں وقف کر دیں ان بزرگوں کی شاندار دینی، مذہبی، ملی، علمی، ادبی، تمدّنی، سیاسی اور سماجی، خدمات، علمی تبحّر و عبقریت،

فکری بلندی اور پرواز تخیل اور نیک مقاصد کے حصول کے لیے مخلصانہ اور سرفروشانہ جدوجہد اور قربانیوں کو پورے عالمِ اسلام اور حقیقت پسند ممالک نے خراج تحسین کیا ہے اور ان رجالِ کار نے تاریخ ساز کارناموں سے دنیا کے عام حریت پسندوں اور انقلابیوں نے کام کرنے کے لیے روشنی اور رہنمائی حاصل کی ہے۔

از ہر ہند دارالعلوم دیوبند جو ان علماء اور مجاہدین کی دانشگاہ، گہوارہ اور مرکز تربیت رہا ہے، حضرت مفتی صاحب اس علمی ادارہ کے پروردہ، یہاں کے بزرگوں اور اکابر کی یادگار اور اسلاف کی روایات کے جانشین حامل، اور امین تھے۔

مفتی صاحبؒ عصرِ حاضر میں مذہبی، اخلاقی، سیاسی، معاشرتی، تمدنی، معاشی اور ذاتی سطح پر، جو پیچیدگیاں پیدا ہو گئی ہیں اس کا بخوبی احساس زمانۂ حاضر کے چیلنجوں سے بھرپور واقفیت اور اس کے نتیجہ میں بحرانی صورتِ حال کشمکش۔ اقدار و روایات کی شکست و ریخت، یکجہتی اور مفارقت کا فقدان، صالح قیادت، خلاء، سیاسی ریشہ دوانیاں، رشک و رقابت، یاسیت، قنوطیت، اجنبیت، مجد، نفرت، ذہنی و جذباتی گھٹن وغیرہ وغیرہ مسائل روز بروز شدت سے ابھر رہے ہیں۔

مفتی صاحب مرحوم! اپنے وسیع معلومات، تجربات اور علم و وجدان کی بنا پر ان سب کا بہترین، متوازن، اور معتدل حل " اسلام کے نظامِ حیات " میں ہی سمجھتے تھے ان کے نزدیک دین و دنیا میں تفریق قطعاً روا نہیں تھا۔ اسلام کی آفاقی تعلیمات کی نشر و اشاعت اور فروغ کے سلسلہ میں آپ آخری دم تک جدوجہد کرتے رہے۔

سیاسیات حاضرہ سے بھی آپ ہمیشہ پوری طرح باخبر رہے، لیکن جب سے سیاست نے نیا رُخ اختیار کیا اس میں دھوکہ فریب، دھاندلی، اور شیطنت پوری طرح داخل ہو گئی، تملق، چاپلوسی، ڈپلومیسی اور سطحیت وغیرہ عناصر بری طرح سرایت کر گئے تو آپ اس سے متنفر ہو گئے اور عملاً سیاسی میدان سے اپنے آپ کو الگ

گویا، سیاسی لحاظ سے آپ کا نقطہ نظر ٹھیک وہی تھا جس کا اظہار شاعرِ مشرق دانائے راز علامہ اقبال مرحوم نے اپنے اس مشہور شعر کے اندر فرمایا ہے۔ ؎

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری سیاست ہو
جُدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

آپ سیاست کے اندر سچائی، خلوص، ہمدردی، دیانت، امانت اور وفا کے متلاشی رہے مگر افسوس آپ کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔ تقریر و تحریر میں مفتی صاحبؒ کو یدِطولیٰ حاصل تھا، ہزاروں سامعین تک اپنی بات کو مدلّل اور مبرہن انداز میں ذہن نشیں کردینا یہ آپ ہی کا کمال تھا، تقریر و خطابت کے ساتھ ساتھ تحریر و صحافت کا ستھرا اور پاکیزہ ذوق تھا۔

یہ مشاہدہ ہے اور تجربہ بھی جو عملی لوگ ہوتے ہیں وہ صرف عمل کرتے ہیں اور اس پہلو پر ان کی زیادہ کوشش اور محنت صرف ہوتی ہے، الفاظ کے گورکھ دھندے نہیں بناتے، مفتی صاحب کی پوری زندگی ایک کھلی کتاب کی حیثیت رکھتی ہے۔ آپ نے انتہائی مجبوری اور شدید ضرورت کے تحت ہی خاص محرک اور داعیہ کے تحت ہی تھوڑا بہت لکھا، اور جو کچھ لکھا انتہائی سلیقہ اور ٹھاٹھ سے لکھا، ادب اور شاعری کا ذوق بھی بہت ارفع اور بلند تھا، بہر حال جو تالیفات اور علمی نگارشات آپ کی رشحاتِ قلم کا نتیجہ ہیں، وہ بجائے خود جودتِ طبع، ندرتِ فکر اور علمی و ادبی شاہ کار کا درجہ رکھتی ہیں۔ کہنے والے نے بجا کہا ہے کہ "مفتی صاحبؒ مصنف سے زیادہ مصنف گر تھے"۔ چنانچہ آپ کی سرپرستی اور رہنمائی میں سینکڑوں مصنف، مؤلف، مرتب، ادیب، صحافی اور نقّادِ علم و ادب کی دنیا میں جلوہ گر ہوئے اور آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے اور اپنی بیش بہا تصنیفات و تالیفات کے ذریعے عزت و شہرت اور بقائے دوام حاصل کیا۔

یوں تو مفتی صاحبؒ کی پوری زندگی مفید عام اور فلاحی اور رفاہی کاموں میں صرف ہوئی اور بڑے مفید اور ٹھوس کارنامے آپ نے انجام دیے، لیکن میرے نزدیک مرحوم کا دیرپا، اثر انگیز، انقلابی، اور پائدار کارنامہ "ادارہ ندوۃ المصنفین" کا قیام ہے، اس بلند پایہ تصنیفی، اشاعتی ادارہ کے ذریعہ جو مذہب وملت، اور علم ادب کی بیش بہا خدمات ہوئی اور انقلاب انگیز تحقیقی، تاریخی اور صالح وشستہ لٹریچر اور اہم ومعرکۃ الآراء کتابوں کا جس قدر علمی اور عوامی حلقوں میں شیوع عام ہوا ذہنی اور فکری ارتداد کی روک تھام اور اسلام کی طرف سے مؤثر دفاع کا انتظام ہوا وہ بجائے خود ہماری ملّی تاریخ کا ایک روشن اور جلی عنوان ہے اور مفتی صاحبؒ کا زندہ جاوید کارنامہ۔

۱۹۴۷ء کے ہنگامۂ رست وخیز اور تقسیم کے نتیجہ میں ملک جن ہنگامی حالات سے دوچار ہوا اور خاص طور پر دہلی میں جو فرقہ وارانہ فسادات ہوئے اور وہاں کے مسلمانوں پر جو قیامت صغریٰ ٹوٹی اور گویا کہ دہلی اجڑ گئی اس کی زد اور اس بلائیں "ندوۃ المصنفین" جیسا خالص علمی ادارہ بھی آگیا اور حالات ہی کچھ ایسے نازک تھے کہ اب بظاہر اس ادارہ کی بقا اور دوبارہ قیام کی کوئی صورت نہیں تھی لیکن ربّ بے نیاز کی توفیق اور ظاہری اسباب کے تحت مفتی صاحبؒ اور ان کے رفقائے کار مجاہد ملّت مولانا حفظ الرحمٰنؒ اور مولانا سعید احمد اکبرآبادی کی ہوش مندی، عزم واستقلال اور سعی وجہد سے یہ علمی ادارہ پھر دوبارہ قائم ہوسکا۔ اور الحمد للہ تادم تحریر یہ علمی بافیض ادارہ فعّال، متحرک، اور اپنے شاندار مستقبل کی طرف مفتی صاحبؒ کے لائق فرزند برادر گرامی محترم عمید الرحمٰن عثمانی کی سربراہی میں گامزن ہے۔ اور اس کا آفیشل آرگن تحقیقی، علمی اور ادبی ماہنامہ "برہان" اپنی روایتی شان کے ساتھ برابر پابندی وقت کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ موجودہ وقت میں ضرورت اس بات

کی ہے کہ اس مرکزی ملی اور قومی ادارہ کی طرف اربابِ علم و فکر، صاحبِ خیر و صلاح، اور علم دوست حضرات زیادہ سے زیادہ توجہات مبذول فرمائیں اس لیے کہ یہ ادارہ مفتی صاحبؒ کی تاریخی یادگار اور خونِ جگر کا نتیجہ ہے، ظاہر ہے اس کی بقا، استحکام اور اس کے کاز کو زیادہ سے زیادہ تقویت پہونچانا ملت کے ذی حس افراد کی بنیادی اور پہلی ذمہ داری ہے۔

حضرت مفتی صاحبؒ سے ناچیز کو جو نیازمندی کا شرف حاصل تھا اس کا قدرتی اور لازمی تقاضا تھا کہ جب جب دہلی جانا ہوتا تو ملاقات کی ضرور کوشش کرتا ۱۹۵۱ء اور ۱۹۸۳ء کے وسط تک قائدِ کشمیر میرواعظ مولانا محمد فاروق صاحب کی رفاقت میں بارہا دہلی قیام رہا تو موصوف کے ہمراہ ملاقات اور حاضری کا موقع ملتا۔

۲۶ اکتوبر ۱۹۸۳ء کو میرواعظ کشمیر مولانا محمد فاروق صاحب صدر انجمن نصرۃ الاسلام کی گرانقدر تالیف "اسلام کا آفاقی پیغام" کا مسودہ برائے ملاحظہ اور حصولِ تقریظ کی خاطر خدمت میں حاضر ہوا تو حالانکہ صاحبِ فراش تھے، اٹھنے بیٹھنے، بولنے اور لکھنے کی سخت ممانعت تھی، بڑے خلوص، اپنائیت، اور محبت، اظہار فرمایا، اور میرواعظ خاندان کی کشمیر میں ہمہ جہت خدمات کی تفصیلات بیان فرماتے رہے، دوسرے دن خصوصیت سے ناشتہ پر بلایا اور فرمایا چائے کے بعد اپنے تاثرات املا کرا دوں گا، آپ کاغذ قلم ساتھ لائیں، صبح بروقت حاضر ہوا تو چائے تیار تھی اور مفتی صاحبؒ گویا میری آمد کے منتظر تھے، چائے سے فراغت کے بعد تقریظ املا کروائی جو الحمدللہ زینتِ کتاب ہے، لیکن افسوس کتابت اور طباعت کا مرحلہ اس وقت تکمیل پذیر ہوا جب موصوف اپنے رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے۔

یہ محض اتفاق ہی نہیں بلکہ میرے لیے حسنِ اتفاق تھا کہ انتقال سے صرف ایک روز پیشتر جب دہلی جانا ہوا تو مفتی صاحبؒ کے دولتکدہ پر میرواعظ دامت برکاتہٗ

کا ہدیۂ سلام پہونچانے اور مزاج پُرسی کو حاضری کا موقع ملا تھا، مفتی صاحب بسترِ علالت پر دراز تھے، اور مجھے ایسا لگا کہ موت جیسے اُن کے رگ و ریشہ میں سرایت کر رہی ہو، مشیتِ خداوندی میں بھلا کس کا چارۂ کار ہے؟ آخر وہ گھڑی آہی گئی جس کا ڈر اور کھٹکا عرصے سے لگا ہوا تھا۔

۱۲ مئی کی وہ صبح کتنی بھیانک اور ملک و ملّت کے حق میں تاریک ثابت ہوئی جب کہ مفتی صاحب نے "کُلّ نفسٍ ذَائِقَۃُ الْموت" کے اصول کے تحت اپنے آپ کو قضاوقدر کے حوالے کر دیا۔ اللہ بس باقی ہوس۔

اور اس طرح چشمِ فلک نے موت العالِم موت العَالَم کا اندوہناک اور دل دوز منظر دیکھا کہ جس کی حکایت اور تفصیل بیان کرنے کی ممکن نہیں۔

ملک کے سبھی قابلِ ذکر اخبارات، ذرائع ابلاغ، ریڈیو، ٹی وی نے خبر نشر کی اور رسائل، جرائد اور مجلّات نے تعزیتی اداریے، نوٹس مضامین، مقالے اور آرٹیکلس لکھے اور اس طرح حضرت مفتی صاحبؒ کو بھرپور الفاظ میں خراج تحسین و عقیدت پیش کیا۔

ملک اور بیرونِ ملک کی اسلامی، دینی، سیاسی، نیم سیاسی اور سماجی تنظیمات قائدین، زعماء، علماء، مفکّرین، دانشورانِ قوم، اسکالرس، حکّام، تجّار، اور ہر طبقہ کے ذمّہ دار حضرات نے براہ راست یا پھر دوسرے ذرائع سے مفتی صاحبؒ کے پس ماندگان اور اہلِ خاندان سے اظہارِ تعزیت کیا، اور اُن کے غم میں اپنے کو برابر کا شریک گردانا، مفتی صاحب کی وفات سے جو خلاء پیدا ہوا ہے بظاہر اس کے پُر ہونے کا سامان اب نظر نہیں آتا۔

قاری محمد سلیمان خادم مدرسہ تجوید القرآن آزاد مارکیٹ، دہلی

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی عملی اور پاکیزہ زندگی کے سلسلہ میں جن جن حضرات نے ان کی مذہبی، ملکی، اور قومی خدمات کے ساتھ ان کے اخلاق کریمانہ اور علوم دینیہ و شرعیہ میں تعمق اور وسیع النظری کے ساتھ اپنے اپنے فاضلانہ قلم سے اظہار تحریر فرمایا ہے۔ وہ

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

کا پورا مصداق اور مظہر ہے۔ کاش میرے سادہ قلم میں بھی علمی صلاحیت و استعداد ہوتی تو میں بھی حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی شایان شان کچھ لکھ کر دل کی حسرت و تمنا پوری کرنے کی سعادت حاصل کرتا لیکن اپنے ضعف قلم کی بنا پر بلا مبالغہ سادہ قلم کے ساتھ صرف اتنا ہی لکھنا اپنے لیے باعثِ سعادت سمجھتا ہوں کہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مجھ سے قرآن کریم کی خدمت کی برکت سے کم و بیش چالیس سال سے حد درجہ مشفقانہ اور کریمانہ تعلق رہا اس طویل زمانہ میں میں نے مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی پاکیزہ زندگی کو قریب و بعید سے جس ممتاز کریمانہ اخلاق حلم و بردباری کے ساتھ دیکھا۔ وہ مجسم نمونۂ عمل اور نمونۂ اسلام کی بنا پر میرے عقیدے میں بندگانِ خدا کے لیے درس عمل تھا۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ جہاں دینی علوم وفنون کے متبحر اور ممتاز عالمِ دین اور عالمِ ربانی تھے، وہاں حفظِ قرآن، تجوید وقرأت کے بھی دلدادہ شیدائی تھے۔ خود قرآن کریم نماز پڑھانے کی حالت میں جس خوبصورت، دل کش انداز کے ساتھ پڑھتے تھے اس سے دل پر خاص نورانی کیفیت پیدا ہوکر دل متأثر اور محظوظ ومسرور ہوتا تھا۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو مدرسہ تجوید القرآن آزاد مارکیٹ دہلی سے قلبی، بنیادی اور گہرا تعلق تھا۔ آپ ہر سال ہی معمول کے طور پر مع اپنے رفیقِ خاص سیّد الملّت حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور مفسرِ قرآن حضرت مولانا اخلاق حسین قاسمی صاحب بغرض معائنہ مدرسہ کو اپنی تشریف آوری سے نوازا کرتے تھے۔ الحمد للہ تینوں حضرات کی قلبی محبت وہمدردی کی برکت سے مدرسہ نے علمی اور عملی ترقی کی سعادت حاصل کی۔ اب مشیتِ الٰہی سے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت سید الملّت رحمۃ اللہ کے سایۂ محبت سے تو مدرسہ محروم ہوگیا

اللہ تعالیٰ حضرت مفسرِ قرآن مولانا اخلاق حسین قاسمی صاحب کے سایۂ محبت کو مدرسہ کے ساتھ تادیر قائم رکھ کر مدرسہ کے حق میں قبول و مبارک فرماتا رہے۔ آمین

دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ تینوں حضرات کو اپنی اپنی جگہ اپنے خزانۂ رحمت سے اس محبت وہمدردی کا بہترین صلہ اور اجر عطا فرمائے۔ آمین

دوسرا حصّہ

آپ بیتی، سفرناموں، ریڈیائی تقریروں
متفرق مضامین اور سوانحی خاکوں ــــ سے متعلق مفتی صاحبؒ
کے اسلوبِ تحریر کے نمونے

(مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی)

داستان یہاں سے شروع ہوتی ہے کہ غالباً ۱۹۲۰ء میں پہلی بار جمعیۃ العلما کے اس اجلاس میں شرکت ہوئی جو حضرت شیخ الہند کی مالٹا سے رہائی کے بعد دہلی میں منعقد ہوا تھا اور جس نے سارے ملک میں جوش و خروش اور بیداری کی ایک ایسی لہر پیدا کر دی تھی جو بالآخر ۱۹۴۷ء میں ایک ایسے عظیم الشان سیلاب کی شکل اختیار کر گئی جو اپنے ساتھ برطانوی حکومت کے سارے قہرمان نظام اور استبداد کی ساری قوتوں کو بہا کر لے گیا۔ آج تک جذبات کی وہ تیز لہر اپنے دل میں موجود اور محسوس ہوتی ہے جو اس اجلاس کے نظارہ سے اب سے ترپن ۵۳ سال پہلے پیدا ہوئی تھی۔ اس زمانے تک پلیٹ فارم غیر منقسم اور خلافت، کانگریس اور مسلم لیگ کے اجلاس ایک ساتھ اور ایک ہی مقام پر منعقد ہوتے تھے جمعیۃ العلما ہند کی یہ نئی تنظیم جس کا ابتدائی خاکہ لکھنؤ میں مولانا عبدالباری کی کوششوں سے بن گیا تھا اسی موقعے پر عالم وجود میں آئی۔ اس زمانہ کے سبھی مشہور اور معزز مسلم علماء اور رہنما اس جلسہ میں شریک تھے۔ اس جلسہ کے صدر حضرت شیخ الہند تھے لیکن ان کی علالت کے باعث ان کی نیابت مفتی کفایت اللہؒ نے کی تھی۔ صدر استقبالیہ حکیم اجمل خاں تھے اور آصف علی اس جلسہ کے انتظام میں پیش پیش نظر آ رہے تھے۔ نمایاں شخصیتوں میں ڈاکٹر سیف الدین کچلو بھی تھے جنھیں تھوڑے ہی دنوں پہلے جلیانوالہ باغ کے خوفناک واقعہ نے شہرت و عزت کے بام عروج پر پہونچا دیا تھا۔ صدارتی کرسی کے پیچھے دو اور کرسیاں نمایاں جگہ پر بچھائی گئی تھیں جن میں سے ایک پر مولانا

عبدالباری فرنگی محلی اور دوسری پر گاندھی جی تشریف فرما تھے۔ اس جلسہ میں شیخ الہند کی طرف سے ایک تحریر مولانا شبیر احمد عثمانی نے پڑھی، دوسری مفتی کفایت اللہ نے جسے آئینی طور پر خطبۂ صدارت بھی کہا جا سکتا تھا۔ ترکِ موالات کا فیصلہ اسی اجلاس میں ہوا تھا اور اسی اجلاس کی اہم ترین ــ اور ــ تاریخی تجویز کے مطابق پانچ سو علماء کا وہ فتویٰ شائع ہوا جس میں حکومت کی ملازمتوں کو حرام قرار دیا گیا تھا اور عدالتوں اور بدیشی مال کے بائیکاٹ کی تحریک شروع کی گئی تھی۔

اس فتوے کی اشاعت اور تبلیغ کے جرم میں ۱۹۲۱ء میں مفتی نثار احمد کان پوری، پیر مجدد صاحب، مولانا محمد علی اور مولانا مدنی پر مشہور کراچی مقدمہ چلایا گیا جس کی وجہ سے ہندوستان میں بدیشی مال کے بائیکاٹ کی تحریک اور بھی زور و شور کے ساتھ پھیل گئی۔ اور مقبولیت و بیداری کے تمام پچھلے ریکارڈ مات ہو گئے۔

اس کے بعد ۱۹۲۱ء کے آخر میں مولانا آزاد کی صدارت میں دوسرا جلسہ ہوا اسی جلسہ میں لطیف کی کہانی والے مشہور مولوی عبداللطیف گنگوہ کی سب انسپکٹری چھوڑ کر تحریک میں شامل ہوئے اس جلسہ میں قابلِ ذکر واقعہ موپلا تحریک کا تھا۔ مالابار کے موپلوں پر اس زمانے میں برطانوی حکومت نے ظلم ڈھائے تھے جس کا مقابلہ انھوں نے تشدد کے ذریعہ کیا تھا۔ برطانوی حکومت کی پروپگنڈہ مشینری نے اس واقعہ کو ہندو مسلم اختلاف پیدا کرنے کے لئے استعمال کیا اس کی طرف سے کہا جا رہا تھا کہ موپلوں کے ہندوؤں پر مظالم کو روکنے کے لئے برطانوی پولیس کو گولی چلانی پڑی۔ اس زمانے میں عدم تشدد کا عقیدہ، مقبولیت کی اس حد پر پہونچا ہوا تھا کہ سیاسی رہنماؤں کو موپلوں کی حمایت میں دشواری پیش آتی تھی۔ جمعیۃ العلماء کے اس جلسہ میں بھی دو گروہ ہو گئے، ایک گروہ موپلوں کی حمایت میں تجویز پاس کرنے پر مصر تھا اور دوسرا گروہ اسے عدم تشدد کی پالیسی کے خلاف سمجھتا تھا اور اس کی خواہش تھی کہ صرف تذکرہ اور تشویش کے اظہار تک تجویز کو محدود رکھا جائے۔ مولانا محمد شبیر احمد عثمانی

نے موپلوں کی حمایت کی تجویز پر بڑی زبردست تقریر کی لیکن مولانا آزاد کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ یہ تشدد کی ایک تحریک تھی اس کا سراہنا مناسب نہیں۔ مظالم شدید ہیں۔ مذمت ٹھیک نہیں۔ اس کشمکش نے جمعیۃ العلماء کے اس جلسہ میں بڑی گرما گرمی پیدا کی لیکن آخر میں مولانا آزاد کے موقف کو ہی حمایت حاصل ہوئی۔

۱۹۲۱ء ہی میں دیوبند میں ایک جلسہ ہوا جس میں آصف علی صاحب نے شرکت کی، یہ جلسہ ترک موالات کے خلاف ایک فتویٰ کی مذمت میں منعقد ہوا تھا جو خانقاہ اشرفیہ سے جاری ہوا تھا۔ مقررین نے اس فتوے کے خلاف بڑی گرما گرم تقریریں کیں لیکن کسی مقرر نے بھی مولانا ظفر احمد تھانوی کا نام لے کر مخالفت کرنے کی ہمت نہیں کی جو اس فتوے کے مصنف تھے۔ نوجوانی کے جوش میں مجھ سے نہیں رہا گیا اور میں نے برسرِ جلسہ کھڑے ہو کر پکار کر کہا:-

"مولانا نام نہیں لے رہے ہیں" (اس وقت مولانا شبیر احمد عثمانی تقریر کر رہے تھے۔) یہ فتویٰ مولانا ظفر تھانوی نے لکھا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے والد عیسائی ہو گئے تھے (اشارہ مولوی عبد اللطیف کی طرف تھا جنھوں نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا تھا) مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میری اس جرأت رندانہ سے جلسے میں بڑی سنسنی پھیلی اور میں ملک کے مقتدر رہنماؤں اور علماء کی نظروں میں آگیا۔

پھر ۱۹۲۱ء ہی میں سیوہارہ کی پولٹیکل کانفرنس منعقد ہوئی، اجتماع بہت بڑا تھا۔ اور حافظ محمد ابراہیم اس کانفرنس کے سکریٹری اور روحِ رواں تھے۔ سوامی سیتہ دیو اور مولوی عبد اللطیف بھی اس کانفرنس میں نمایاں رہے۔ مولوی بشیر احمد بھٹہ کی لیڈری اسی کانفرنس سے چمکی، غرض کہ ہر طرف بیداری، ہلچل اور جوش و خروش پھیلا ہوا تھا۔ آئے دن بڑے بڑے اجتماعات منعقد ہوتے تھے اور عوام کے جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ انگریز کی حکومت چند ہی دنوں کی مہمان معلوم ہوتی تھی۔

پھر ۲۲ء آیا اور گیا۔ میں خلافت، کانگریس اور جمعیۃ العلماء کے سالانہ جلسے

ایک ساتھ منعقد ہوئے جمعیۃ العلماء کے اجلاس کی صدارت مولانا اسحٰق مانسہروی نے کی۔ اسی مقام پر کانگریس میں "چینجرس" اور "نو چینجرس" کے دو گروہ پیدا ہوئے۔ ایک گروہ کے لیڈر مولانا محمد علی اور گاندھی جی وغیرہ تھے۔ دوسرا گروہ اسمبلیوں کی ممبری قبول کرکے اسمبلیوں کے اندر برطانوی حکومت کی مخالفت جاری رکھنے کے حق میں تھا۔ اس گروہ کی رہنمائی موتی لال نہرو اور دوسرے لوگ کر رہے تھے۔

۲۴ء میں پشاور کا اجلاس ہوا، اس جلسہ کے صدر حضرت انور شاہ صاحب کشمیری تھے اس جلسہ کا تذکرہ اس لئے ضروری ہے کہ اس میں مولانا محمد علی اور حسرت موہانی کے درمیان بڑے سخت مجادلہ تک نوبت پہونچ گئی تھی۔ مولانا حسرت موہانی اس زمانہ میں کانگریس کے چینجرس گروپ کے ساتھ تھے، اور اسمبلیوں میں حصہ لینے کے حق میں تھے۔ مولانا محمد علی نے مولانا حسرت موہانی کے اس مشہور شعر ؎

ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشہ ہے حسرت کی طبیعت بھی

کو بدل کر اس طرح پڑھا:۔

چکی کی مشقت بھی بائیکاٹ سے نفرت بھی
اک طرفہ تماشہ ہے حسرت کی طبیعت بھی

تو مجمع میں بڑی کھلبلی مچی، مولانا حسرت موہانی نے اپنے موقف کو درست ثابت کرنے کی بڑی کوشش کی لیکن میدان مولانا محمد علیؒ کے ہی ہاتھ رہا۔ اس جلسہ کے صدر استقبالیہ صاحبزادہ عبدالقیوم خاں تھے، اس کے بعد کلکتہ میں جلسہ ہوا جس کی صدارت سید سلیمان ندوی نے کی۔

جتنے واقعات کا اب تک ذکر آیا انھیں دیدنی یا زیادہ سے زیادہ شنیدنی کہا جاسکتا ہے۔ یہ سارے واقعات، اجتماع اور جلسے یادداشت میں اس لئے محفوظ ہیں کہ

انھوں نے اوران کے تاثرات نے وہ پس منظر تیار کر دیا تھا جو آگے چل کر قومی تحریکوں میں شمولیت اور جد وجہد آزادی میں کام کرنے کا محرک بنا اس سے بھی پہلے دیو بند میں جہاں شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ نے بیٹھ کر جد وجہد آزادی اور استخلاص وطن کے خواب دیکھے تھے ایک ایسا ماحول بنا ہوا تھا جو خواہ مخواہ انقلابی خیالات کو اُکسانے کا سبب بنتا تھا۔ وہ زمانہ شیخ الہند کی اسارت مالٹا کا زمانہ تھا اور ریشمی خطوط کی تحریک کا راز منکشف ہو جانے کے بعد اس سے متعلق کارکن بظاہر مختلف کاموں میں مشغول ہو چکے تھے اور پورا دیو بند ایک طرح سے برطانوی پولیس کی چھاؤنی بنا ہوا تھا جہاں سی۔ آئی۔ ڈی اور افسر لوگ ایک ایک مشتبہ آدمی کی نگرانی اور تحقیق و تفتیش میں لگے ہوئے دکھائی دیتے تھے لیکن اس کڑی نگرانی کے باوجود یہ کارکن قومی تحریکوں سے وابستگی اور تبادلۂ خیال کا موقع نکال ہی لیتے تھے۔ میری نشست منشی مہدی حسن[1] صاحب کی دوکان پر تھی، وہ تحریک خلافت کا لٹریچر اور دوسرے پمفلٹ چھاپ چھاپ کر فروخت کرتے اور عوام تک پہونچاتے تھے، مولوی محمد مبین خطیب اور منشی سعید اور منشی مہدی حسن صاحب کی یہ دوکان اس زمانہ میں ریشمی خطوط کی تحریک کے مرکز کے طور پر استعمال ہوتی تھی مولانا آزاد کا مشہور بیان "قول فیصل" مولانا محمد علی کی تقریریں اور سفر نامہ اسیر مالٹا، اسی زمانہ میں شائع ہوئیں میری نشست بھی اسی دوکان پر ہوتی تھی اور حالات حاضرہ پر تبصرے اور بحثیں ہوتیں تو میں بھی ان میں حصہ لیتا۔

پھر کراچی کانگریس ہوئی اور کانگریس اور جمعیۃ العلماء کے اجلاس اسی شہر میں ہوئے، زمانہ شاید ۱۹۲۳ء کے آخر کا تھا دونوں اجلاسوں کی صدارت مولانا آزاد نے کی گاندھی جی نے کانگریس کے علاوہ جمعیۃ العلماء کے اجلاس میں بھی شرکت کی اسی موقعے پر اجلاس میں موجود علماء کا گاندھی جی سے تعارف کراتے ہوئے مولانا آزاد نے وہ مشہور جملہ کہا جو آج تک میرے ذہن میں تازہ ہے۔ انھوں نے کہا:۔

"گاندھی جی! یہاں آپ کے سامنے یہ جو بوریہ نشین علماء بیٹھے ہیں انھوں نے انقلاب فرانس نہیں پڑھا لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس وقت مسلمانوں

[1] میرے والد صاحب جو تحریک عدم تعاون کے تحت مقامی انگریزی اسکول کی مدرسی چھوڑ کر تحریک میں شامل ہو گئے اور مدتوں کام کرتے رہے۔ (جمیل مہدی)

میں اور پورے ملک میں ان سے بڑی انقلابی جماعت کوئی دوسری موجود نہیں ہے۔"

اس اجلاس کی تاریخی اہمیت یہ تھی کہ اسی میں تحریکِ عدم تعاون کا نیا موڑ شروع ہوا اور گاندھی جی کی سول نافرمانی کی وہ مشہور تجویز پاس ہوئی جس نے تاریخ میں قانون توڑنے اور نمک بنانے کے نام سے شہرت حاصل کی اور جس کے تحت وہ مشہور ڈانڈی مارچ شروع ہوا جس نے کانگریس کو تمام ملک کی واحد سیاسی طاقت کی شکل میں انگریزوں کے سامنے کھڑا کر دیا۔ میں اس زمانے میں ڈابھیل میں آگیا تھا اور جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں درس و تدریس کے ساتھ فتوی نویسی کی خدمات پر بھی مامور رہا تھا۔ مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا سراج احمد اور مولانا بدرعالم میرٹھی اور مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی یہ سب وہیں جمع تھے کیونکہ حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری نے مشہور مناقشہ کے بعد دارالعلوم دیوبند کو چھوڑ کر گجرات کے اسی قصبہ میں اپنا مستقر بنا لیا تھا اور ہم سب لوگ انھیں کے ساتھ ڈابھیل آگئے تھے۔ ڈابھیل سے ڈانڈی تھوڑی ہی دور تھا اور گاندھی جی نے ڈانڈی سے اپنا مارچ شروع کرکے پہلی منزل دھراسیہ میں کی تھی جو ڈابھیل سے ڈانڈی کے راستہ پر ایک گاؤں ہے۔ گاندھی جی کی آمد کی خبر بجلی کی طرح چشم زدن میں سب جگہ پھیل گئی اور ہم لوگ بھی گاندھی جی سے ملنے دھراسیہ پہونچ گئے۔ جس وقت ہم پہنچے تو خیمے لگے ہوئے تھے اور بڑی چہل پہل تھی۔ ہم گاندھی جی کے پاس پہونچے تو وہ ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور بڑی خندہ پیشانی سے انھوں نے کہا:۔

آؤ مولانا۔

پھر ہم سے بیٹھنے کو بھی کہنے سے پہلے انھوں نے پوچھا کہ مولانا میں نے سنا ہے کہ آں حضرت رسول اللہ نے فرمایا ہے کہ پانی، گھاس اور نمک پر ڈیوٹی نہیں" میں نے اس کی تصدیق کی تو وہ اور خوش ہوئے اور دیر تک کرید کرید کر تفصیل پوچھتے رہے۔ میں نے تفصیلات بیان کیں تو انھوں نے کہا کہ بڑی مہربانی ہوگی اگر آپ انھیں لکھ کر بھیج دیں۔ ہم سب وہاں دن بھر رہے اور واپس آنے کے بعد میں نے لکھ کر بھیج دیا۔

سردار ولبھ بھائی پٹیل اس تحریک کے ہیرو تھے، انھوں نے ہی باردولی میں اس تحریک کو منظم کیا اور یہیں سے ان کی انتظامی اہلیت پورے ملک کے لئے مسلّم ہوئی۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل اس زمانہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے غیر متنازعہ اور نہایت مقبول اور محبوب متفقہ لیڈر تھے، اس تعصب اور تنگ نظری کا شائبہ بھی ان کے کردار میں نظر نہ آتا تھا جس نے آگے چلکر ان کی شخصیت کو متنازع چیز بنایا۔ میرا خیال ہے کہ سردار پٹیل کے ذہن کی تبدیلی کا پتہ اس وقت چلا جب انھوں نے ۱۹۴۶ء کے میرٹھ اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے "تلوار کا جواب تلوار سے دیا جائے گا" کا نعرہ اس زور سے بلند کیا کہ کانگریس کے سبھی چوٹی کے لیڈروں کے ساتھ خود گاندھی جی بھی سردار پٹیل کی زبان سے ایسی غیر متوقع بات سن کر حیران رہ گئے۔

خیر یہ تو بہت آگے کی بات ہے۔ اس وقت تذکرہ تو اس زمانہ کا تھا جب سردار پٹیل نے باردولی کی تحریک چلائی اور انگریزوں نے اس تحریک کو کچلنے کے لئے تشدد اور مار پیٹ کے ساتھ قید و بند اور جائدادوں کی ضبطی کا بھی خوفناک سلسلہ شروع کر دیا، اس سے لوگوں میں بڑی پریشانی پھیلی، یہیں وہ واقعہ پیش آیا جس نے میری زندگی کا رُخ پلٹ دیا اور اسے ایک خاص سمت لگا کر اس جگہ پہونچا دیا جہاں میں اب نظر آرہا ہوں۔

ہوا یہ کہ جائدادوں کی ضبطی اور نیلامی کے اس خوفناک دور میں گاؤں کے مکھیا نے جو وہاں پٹیل کہلاتے ہیں بحیثیت مفتی کے مجھ سے فتوے پوچھا۔ اس فتوے میں پوچھا گیا تھا کہ عدم ٹیکس کی وجہ سے نیلام پر چڑھی ہوئی جائدادوں کو خریدنا شرعی نقطہ نظر سے کیسا ہے۔ میں نے اس کے جواب میں لکھا کہ ضبط شدہ جائدادوں کو خریدنا ظلم وعدوان کی کھلی حمایت ہے، ایسی جائدادوں کو خریدنا اور اس کی بولی بولنا حرام ہے۔ اس فتوے کا دینا تھا کہ پورے گجرات میں ہلچل مچ گئی۔ پانچ سو علماء کا ۱۹۲۸ء کا فتویٰ اور میرا یہ فتویٰ مسلم پریس گجرات نے چھاپ کر لاکھوں کی تعداد میں تقسیم کیا اور اس فتوے کی وجہ سے وہاں مسلم پریس بھی ضبط ہوگیا۔ ہم اس زمانے میں رمضان کی وجہ سے دیوبند آئے ہوئے تھے میں عید کے بعد کچھ دیر میں پہونچا،

شاہ صاحب اور مولانا شبیر احمد عثمانی مجھ سے پہلے پہونچ چکے تھے جوں ہی شاہ صاحب وہاں پہونچے جامعہ ڈابھیل کے مہتمم مولانا احمد بزرگ نے ان سے میری شکایت کی انھوں نے کہا کہ مولانا! وہ تو فتویٰ دے کر شعبان میں چلے گئے، انھوں نے یہ بھی نہ سوچا کہ ڈابھیل بڑودہ کی ریاست میں ہے جہاں انگریزوں کی حکومت سے بھی زیادہ مطلق العنانی کی حکومت ہے۔ میں سارے رمضان مارا مارا پھرا ہوں اور اب نہیں کہہ سکتا کہ جامعہ ڈابھیل کا کیا حال ہوگا۔ میں عید کے بعد جس صبح کو ڈابھیل پہونچا تو میرے پہونچتے ہی سپرنٹنڈنٹ پولیس نے وہاں پہونچ کر فوری طور پر میرا بیان لیا۔ کسی کو بھی اور خود مجھے بھی گرفتاری سے بچنے کی کوئی امید نہیں تھی لیکن اتفاق ایسا ہوا کہ اس نے مجھ سے جس فتوے کے بارے میں پوچھا کہ وہ میرا لکھا ہوا ہے یا نہیں وہ فتویٰ وہی تھا جو مسلم پریس گجرات میں چھپا تھا اور گجراتی زبان میں تھا میں نے اس فتوے کو دیکھ کر کہا کہ یہ گجراتی میں ہے اور میں گجراتی نہیں جانتا، اس لئے میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ وہی فتویٰ ہے یا نہیں۔ وہ یہ بات سُن کر اس وقت تو چلا گیا مگر یقین تھا کہ صبح کو ضرور آئے گا اور اصل فتویٰ بھی ساتھ لائے گا۔ یہ دن کی بات تھی، دوسرا اتفاق یہ ہوا کہ رات کو بارہ بجے گاندھی ارون پیکٹ ہوگیا۔ تمام سیاسی قیدی چھوڑ دئے گئے۔ اس لئے میں بھی جیل کے دروازے سے واپس آگیا، گرفتاری نہیں ہوئی مسلم پریس بھی، جو ضبط ہوگیا تھا، چھوڑ دیا گیا، یہ سب تو بخیر و خوبی گذر گیا لیکن جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں بَل پڑ گیا۔ پہلے بڑے ٹھاٹھ کے مفتی سمجھے جاتے تھے اور دو تنخواہیں ملتی تھیں، ایک مدرسی کی اور ایک فتویٰ نویسی کی۔ اب اڑچنیں پڑنے لگیں، مجلس شوریٰ نے فیصلہ کیا کہ فتوے اہتمام کی نگرانی اور دیکھ بھال کے بعد جاری کئے جائیں۔ ونہ دو تنخواہوں کے بجائے ہم ایک تنخواہ دیں گے۔ ان پابندیوں سے دل بہت گھبرانے لگا۔ مولانا حفظ الرحمٰن کی غیر موجودگی ویسے ہی ناقابلِ برداشت بنی ہوئی تھی وہ اس سال سرے سے واپس ہی نہیں آئے تھے، مولانا سعید احمد اکبر آبادی اور مٹیل پڑھانے کے لئے دہلی چلے گئے۔ ادھر یہ

پابندیاں لگیں بڑی وحشت تھی، کسی کام میں دل نہیں لگتا تھا جتنا سوچتا طبیعت اور الجھتی جاتی، روزگار کا بھی مسئلہ تھا اُدھر دیوبند میں بھی جھگڑا تھا۔ اِدھر مولانا حفظ الرحمٰن کی مفارقت طبیعت بہت بے چین تھی اور دل اُکھڑا ہوا تھا پابندی ناقابلِ برداشت تھی لیکن سمجھ میں نہیں آتا تھا کیا کروں اس لئے میں نے طے کرلیا کہ جو فتوے اہتمام کی معرفت آئیں گے اُن کا جواب بھی اہتمام کی معرفت دیدیا کروں گا۔ کچھ دن اسی طرح سے چلتا رہا ذی الحجہ میں انھوں نے ایک فتوی کہیں سے پکڑا اور اس کے بعد ایک تحریر میرے پاس بھیجی کہ آپ نے یہ فتویٰ براہِ راست بھیج دیا اگر آئندہ ایسا ہوا تو شوریٰ کے فیصلہ کی رو سے تنخواہ روک لی جائیگی۔ عبدالحئی بیٹیل یہ تحریر لیکر آئے تو ایسا محسوس ہوا کہ ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔ میں نے اسی وقت اس تحریر پر لکھ دیا کہ یہ ناروا پابندی ہے جسے کوئی مفتی برداشت نہیں کرسکتا اس لئے میں اس کی پابندی سے معذور ہوں۔

میرے اس جواب سے سب لوگ پریشان ہوگئے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی نے آزردگی کے ساتھ مجھ سے کہا کہ مشورہ تو کرلیا ہوتا۔ میرا ذہن اس واقعہ سے اتنا مشتعل تھا کہ میں نے اُن سے کہا کہ میں رات کو یہاں نہیں ٹھہروں گا۔ میں رانديرجا رہا ہوں۔ یہ مختصر بات کرکے میں راندیر چلا آیا اور مفتی مہدی حسن کے یہاں ٹھہرا۔ مولانا شبیر احمد عثمانی نے فوری کوشش کرکے مجلس شوریٰ بلائی تاکہ فیصلہ تبدیل کیا جاسکے لیکن مہتمم نے کورم پورا نہیں ہونے دیا۔ مگر مولانا اس پر بھی مایوس نہیں ہوئے اور انھوں نے جدوجہد جاری رکھی اور مجھے مطلع کیا کہ کوئی فیصلہ ہونے تک میں راندیر سے نہ جاؤں، اسی عرصہ میں مولانا بدرِ عالم کا بھی خط آیا۔ اس خط میں لکھا تھا کہ "آپ کے بعد میں یہاں کیا کروں گا"۔ میں نے انھیں جواب میں لکھا کہ "آپ میری وجہ سے مشکل میں پڑجائیں گے، میرا تو دل کھلا ہوا ہے اور میں بالکل مطمئن ہوں کہ میں نے بالکل ٹھیک کیا۔ میرا خیال ہے کہ آپ ان جھمیلے میں نہ پڑیں" مولانا شبیر احمد عثمانی کی پیہم کوششوں سے مجلسِ شوریٰ نے یہ فیصلہ کیا کہ فتووں پر سے پابندی تو ہٹالی جائے گی لیکن وہ تنخواہ ایک ہی دیں گے۔ دوسری تنخواہ ابراہیم گاروی صاحب نے الگ سے

دینے کا ذمہ لیا اور ایک ہزار روپیہ اس مد میں دے بھی دیا اور یہ کہا کہ وہ پابندی سے اس دوسری تنخواہ کا انتظام کرتے رہیں گے۔

مولانا نے مجھے اس فیصلہ کی اطلاع دی اور یہ لکھا کہ آجاؤ مگر آنے سے پہلے استخارہ کرلو۔ میں نے جواب میں لکھدیا کہ میں تو استخارہ کرکے آیا تھا، اب آپ ہی استخارہ کرلیں، اور استخارہ آجائے تو مجھے اطلاع کردیں، میں آجاؤں گا۔ مولانا میرے اس جواب سے مایوس ہوگئے، اور یہ معاملہ ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا۔ اس عرصہ میں مولوی محمد موسیٰ نے مجھے خط لکھا اور روپئے بھی بھیجے۔ روپیہ کے ساتھ یہ تحریر بھی آئی کہ میرا خیال ہے کہ حج کرآؤ۔ ویسے پابندی نہیں، ضرورت ہو تو کسی دوسرے استعمال میں لے آؤ۔ یوں اس واقعہ کی بدولت پہلے حج کی سعادت میرے حصہ میں آئی۔

حج سے واپس آکر میں دہلی آگیا اور میں نے مولانا حفظ الرحمٰن اور سراج احمد میرٹھی کے ساتھ مل کر ایک ادارہ قائم کرنے کا پروگرام بنایا۔ اس زمانے میں چوڑی والان میں مولوی سعید احمد اکبر آبادی کے مکان پر ٹھہرا ہوا تھا۔ یہ ۳۳ء کی بات ہے مجلس علمی کا پہلا مشاورتی جلسہ بلیماران کی کوٹھی علی جان میں ہوا جہاں اس زمانہ میں جمعیۃ العلماء کا دفتر تھا۔ مولانا احمد علی لاہوری مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا احمد سعید، مفتی کفایت اللہ اور خواجہ حسن نظامی وغیرہ نے اس جلسہ میں شرکت کی اور سب نے اس تجویز کو پسند کیا۔ اسی جلسہ میں خواجہ حسن نظامی نے پیش کش کی کہ مشکلات القرآن میں چھاپوں گا اور مجلس کی طرف سے شائع کروں گا۔ یہ تیاریاں پورے طور پر جاری تھیں یہاں تک کہ دہلی آکر مشرب کے نام سے ایک رسالہ نکالنے کے لئے پوسٹر بھی چھاپ لئے تھے کہ حالات میں اک اور تبدیلی آئی، ہوا یہ کہ بجز ذہنی مشغولیت کے اس زمانے میں کوئی دوسری مشغولیت نہیں تھی، اس لئے سب لوگ ساتھ رہتے تھے اور اکٹھے ہی دہلی میدان میں نماز پڑھا کرتے تھے۔ نماز کے بعد کچھ ذکر و اذکار اور تقریر کا پروگرام بھی چل جاتا تھا اس زمانے میں اتفاق سے حاجی ادریس (جاپان ہاؤس والے) اور حاجی

اسمٰعیل جیون بخش بھی دہلی میں تھے۔ انھوں نے نہ معلوم کیا بات دیکھی کہ مجھ سے متاثر ہوگئے۔ ان دونوں کا شمار ہندوستان کے متمول تاجروں میں ہوتا تھا اور کلکتہ میں ان کا بہت بڑا کاروبار تھا انھوں نے قاضی سجاد صاحب سے میرے متعلق دریافت کیا اور پوچھا کہ مفتی صاحب کیا کرتے ہیں۔ قاضی سجاد نے ان سے میرا احوال بتایا۔ دونوں نے میرے سامنے کلکتہ چلنے کی تجویز رکھی اور اس حد تک اصرار کیا کہ میں بالآخر سارا پروگرام نامکمل چھوڑ کر کلکتہ پہونچ گیا۔ کلکتہ پہونچے تو درسِ قرآن اور فتویٰ نویسی کی خدمت سپرد ہوئی۔ کولوٹولہ کی مسجد میں درس قرآن شروع ہوا تو تھوڑے ہی عرصہ میں اس کی بہت زیادہ شہرت ہوگئی۔ لیکن تنہائی سے بہت جی گھبراتا تھا خصوصاً مولانا حفظ الرحمٰن کی جدائی اتنی شاق تھی کہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ میں رمضان سے پہلے کلکتہ پہونچا تھا اور آخر رمضان تک یہ حالت ہوگئی کہ کسی کام میں طبیعت نہیں لگتی تھی، اس زمانہ کی ذہنی کیفیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ کلکتہ میں ایک آدمی آواز لگا تعویذ بیچا کرتا تھا اور اس تعویذ کی اور خصوصیات میں یہ خصوصیت بھی بتایا کرتا تھا کہ اس کی برکت سے تسکین قلب حاصل ہو سکتی ہے۔ تو ایک دن بے ساختہ تعویذ لینے کو دل چاہا خیر تعویذ تو نہیں لیا۔ مقصد یہ بتانا تھا کہ دل کتنا اُلٹا ہوا تھا۔ اصل میں میری اور مولانا حفظ الرحمٰن کی روحیں اتنی ملی ہوئی تھیں کہ ایک کو دوسرے کے بغیر قرار نہیں ملتا تھا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت ہے کہ مولانا حفظ الرحمٰن اس دُنیا میں نہیں رہے اور میں جو ان کی جدائی کو کبھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ ان کے بغیر زندہ رہنے اور صبر کرنے پر مجبور ہوں میں نے اپنی حالت کا اظہار وہاں کے لوگوں سے کیا تو انھوں نے تجویز پیش کی کہ چنوٹیوں کی ایک انجمن تبلیغ اسلام ہے، مولانا وہاں آجائیں میں نے مولانا کو باقاعدہ خط لکھنے اور دعوت دینے کی تجویز پیش کی جو انھوں نے منظور کر لی۔ میں نے مولانا کو لکھا اور زور دیا کہ فوراً کلکتہ آجائیں محرم میں مولانا بھی آگئے اور ان کی پہلی تقریر محرم میں ہی ہوئی۔ اُن کا آنا تھا کہ عید آگئی۔ تھوڑے دنوں کے بعد مولانا سعید احمد بھی کلکتہ پہونچے اور مدرسۃ العالیہ میں ملازم ہوگئے۔ اب صورت یہ بن گئی کہ کولوٹولہ

کی مسجد میں تو میرا درسِ قرآن ہوتا تھا اور جمال الدین کی مسجد میں مولانا حفظ الرحمٰن کا، اب میں کہتا ہوں کہ اتفاق اور محبت کی ایسی مثال مشکل ہی سے ملے گی جو مولانا کے اور میرے تعلقات میں جاری وساری تھی۔ جیسا کہ قاعدہ ہے جب ایک ہی جگہ پر دو دو آدمیوں نے درس تدریس اور تقریر و تذکیر کا سلسلہ شروع کیا تو کچھ لوگوں نے مولانا حفظ الرحمٰن اور کچھ لوگوں نے میری تعریف شروع کی اور ایک کو دوسرے پر فضیلت دینی چاہی لیکن لوگ اپنی اپنی کہتے رہے اور ہم دونوں کے ذہن میں کبھی خیال تک بھی نہیں گذرا کہ لوگ کیا کہتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہم دونوں کی ہمہ وقت کی یکجائی نے باقی لوگوں کے لئے شناخت تک مشکل کردی تھی اور لوگوں کو یہ بتلانے میں دقت پیش آتی تھی کہ عتیق الرحمٰن کون ہے اور حفظ الرحمٰن کون۔ اکثر مختلف معاملات میں نام مخلوط ہو جاتے تھے۔ اسی زمانے میں مولانا آزاد سے بھی ملاقات کے بہت موقعے رہے، وہ ۱۹ اے ٹالی گنج کی کوٹھی میں رہتے تھے اور بڑے سخت حالات اور مالی دشواریوں میں مبتلا تھے، حالت یہ تھی کہ تنگدستی کی وجہ سے گاڑی انھوں نے بیچ دی تھی اور چونکہ گاڑی کے بغیر سفر نہیں کرتے تھے اس لئے ہفتوں کوٹھی سے نکلنے کی نوبت نہیں آتی تھی، اسفار تقریباً بند تھے۔ مولانا کی عادت تھی کہ وہ سفر خرچ یا کرایے کے نام پر کبھی پیسہ نہیں لیتے تھے، اس لئے انھوں نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ وہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کی شرکت کے علاوہ کسی دوسرے کام کے لئے سفر نہیں کریں گے۔ ورکنگ کمیٹی کے جلسے میں شرکت کا موقع آتا تو مولانا قرض کے ذریعے اس کے سفر خرچ اور اخراجات کا انتظام کرتے۔

ایک دن اثنائے گفتگو میں کہنے لگے کہ "علائق میں بس یہی ایک کانگریس ورکنگ کمیٹی میں شرکت کی پابندی باقی رہ گئی ہے سوچتا ہوں کہ اس بندش کو بھی توڑ دوں"۔

مولانا آزاد سے ہر پندرہ دن میں ایک بار ملاقات ہوتی تھی اور بڑی دیر تک گفتگو رہتی تھی، اس زمانے میں اُن کی مالی حالت اتنی خراب تھی کہ انھوں نے اپنی کوٹھی کا نچلا حصہ ایک یہودی کو کرایہ پر دے دیا تھا۔ صورت یہ تھی کہ کوٹھی کا کرایہ تو اُن کے ذمہ چڑھتا رہتا اور یہودی

وصول ہونے والے کرایہ سے وہ اپنا کام چلایا کرتے تھے۔ آخر میں جب شیخ مبارک علی اینڈ سنس نے مولانا کو ترجمان القرآن کی رائلٹی کے اکیس ہزار روپے دیے تب کہیں جاکر ان کے حالات نسبتاً آسان ہوئے، میرے کلکتہ کے دوران قیام ہی میں تاجپوشی کی تقریبات کے بائیکاٹ اور سبھاش چندر بوس کی مائی کنٹیکٹ کی مشہور تحریک کے واقعات پیش آئے اور اُن میں میں نے حصہ لیا لیکن ان سے پہلے ایک دلچسپ حادثہ کا تذکرہ ضروری ہوگا۔ اسی زمانہ میں قریب کی ایک مسجد میں مولانا ابراہیم سیالکوٹی نے جو جماعت اہلِ حدیث کے بڑے عالموں میں تھے کوئی قابلِ اعتراض تقریر کی جو میرے نام لگ گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ تقریر میری ہی اس زمانہ میں مشہور تھی جب پولیس کو یہ اطلاع ہوئی کہ کوئی قابلِ اعتراض تقریر ہوئی ہے تو قدرتاً ان کا خیال میری ہی طرف گیا۔ لال بازار کے تھانہ سے اطلاع آئی کہ چلیے، میں انسپکٹر کے ساتھ چلا گیا، وہ جمعہ کا دن تھا اور میرے ذمہ ہر جمعہ سے پہلے ایک گھنٹہ کی تقریر بھی تھی، تقریر کے وقت میرا پتہ نہ چلا تو تشویش پیدا ہوئی۔ مولانا حفظ الرحمٰن کو معلوم ہوا کہ مجھے پولیس لے گئی ہے تو بہت بگڑے۔ رفاقت اور ذمہ داری کا یہ احساس کہ سب سے پہلے تو جمعہ میں میرے بجائے تقریر کی اور جمعہ کے بعد تھانے آئے۔ دو گھنٹہ کی تحقیق و تفتیش کے بعد پتہ چلا کہ وہ تقریر میری نہیں بلکہ مولانا ابراہیم سیالکوٹی کی تھی تو گھر جانے کی اجازت ملی۔ بہرحال چار پانچ گھنٹے کے بعد واپس آیا۔ اس کے فوراً بعد تاجپوشی کے بائیکاٹ کی تحریک شروع ہوئی تو کولوٹولہ کے محلہ کے اکثر لوگ تاجر پیشہ ہونے کی وجہ سے حکومت کے خلاف کوئی کام کرتے ہوئے ڈرتے تھے۔

زبان سے تو انھوں نے کچھ نہیں کہا، لیکن اُن کی خواہش تھی میں کوئی کام ایسا نہ کروں جو حکومت کے خلاف ہو، اور غلط فہمی کا سبب بن سکتا ہو۔

اُدھر تاجپوشی کے موقع پر روشنی کے انتظامات ہو رہے تھے، اِدھر میں نے پوری

طاقت کے ساتھ اس کے خلاف مہم چلا دی یہاں تک کہ ایک زبردست تقریر روشنی کے انتظام کے خلاف کی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں کے سربرآوردہ حضرات کی خواہش کے باوجود روشنی نہیں ہوئی۔ کوئی بولا تو نہیں لیکن ایک چپقلش پیدا ہو گئی، اس عرصہ میں ایک واقعہ یہ بھی ہوا کہ مولانا حفظ الرحمٰن کو درد سر کے شدید دورے شروع ہو گئے اور انھیں مجبوراً واپس چلا جانا پڑا۔ مولانا حفظ الرحمٰن اس واقعے سے پہلے ہی جا چکے تھے جہاں اُن کے لڑکے کی وفات بھی ہو گئی تھی۔ چپقلش کا واقعہ تو ایک بہانہ ثابت ہوا ورنہ واقعہ یہ ہے کہ مولانا حفظ الرحمٰن کی واپسی کے بعد ہی میری طبیعت اکھڑ چکی تھی۔ میں نے جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو مجلس علمی کی تحریک پھر سے زندہ ہوئی۔ وہاں کے لوگوں کے اصرار کے باوجود میں دہلی چلا آیا۔ جاپان والوں نے مجھ سے یہ پیش کش کی کہ اگر میں کلکتہ میں رہ کر یہ کام کرنا چاہوں تو وہ اس کے کُل اخراجات خود برداشت کریں گے اور اگر دہلی میں رہ کر کرنا چاہوں تو پانچ ہزار روپیہ اس کام کے لئے دیں گے۔ میں نے دہلی کے قیام اور پانچ ہزار روپیہ کو ترجیح دی اور دہلی چلا آیا۔ دہلی آتے ہی سیدھا امروہہ مولانا حفظ الرحمٰن کو لینے کے لئے چلا گیا۔ مولانا اس وقت امروہہ میں مقیم تھے اور مولانا محمد میاں کے مکان پر رہتے تھے۔ امروہہ میں دو مدرسے تھے۔ ایک محلّہ چلّہ کا مدرسہ اور ایک پان باڑی کی جامع مسجد کا مدرسہ، ان دونوں کے درمیان ہمیشہ سے ہی بڑی شدید مخالفت رہتی تھی، مولانا نے ان دونوں مدرسوں کے اختلافات کو ختم کرنے میں بڑی زبردست کوشش کی اور دونوں کو ملا کر ایک کر دیا اور دونوں کا اہتمام اپنے ہاتھ میں لے لیا میں نے مولانا حفظ الرحمٰن سے مجلس علمی کے احیاء کی تجویز اور پانچ ہزار روپیہ سرمایہ کا ذکر کیا تو وہ حسبِ معمول جیسی ان کی عادت تھی بحث و مباحثہ پر اتر آئے، کہنے لگے کہ مفتی صاحب آپ کے بھی کام ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اتنے بڑے بڑے کام پانچ ہزار میں کہیں ہوا کرتے ہیں، فضول پریشانیاں مول لینے سے کیا فائدہ، میں اس طرح سے وقت ضائع کرنے کو تیار نہیں ہوں۔ آخر اسی جھگڑے میں رات کا ایک ڈیڑھ بج گیا۔ میں نے آخر میں اُن سے

کہا کہ اگر کرنا ہے تو اس سے بہتر کوئی موقع نہیں۔ آپ اس کام کا یہ پہلو کیوں نہیں دیکھتے کہ کام کرنے سے پہلے ہی پانچ چھ ہزار روپے مل گئے ورنہ ہوتا یہ ہے کہ کام کرتے برس گزر جاتے ہیں اور سرمایہ کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی۔ اس لئے کسی خلجان میں پڑنے کی ضرورت نہیں بس آپ سیدھے میرے ساتھ چلئے۔ میرے اس شدید اصرار کے بعد مولانا مجبور ہو گئے اور میرے ساتھ دہلی چلے آئے۔ دہلی میں آنے کے بعد پھر ایک مشاورتی مجلس ہوئی جس میں ہمارے علاوہ ظفر الملک علوی، فارقلیط صاحب اور غازی صاحب بھی شریک ہوئے "ندوۃ المصنفین" نام غازی صاحب کا تجویز کیا ہوا ہے، غازی صاحب اس زمانہ میں فارقلیط صاحب کے ساتھ الجمعیۃ میں تھے، لیکن دونوں کی نبھی نہیں، یہ واقعہ ۱۹۳۸ء کا ہے "ندوۃ المصنفین" نے اپنے قیام کے فوراً بعد علمی دنیا میں اپنا ایک مقام پیدا کر لیا۔ اس کے رسالہ برہان نے بھی علمی اور ادبی معیار کے لحاظ سے بڑی شہرت حاصل کی اور اس کے رفیقوں کی تصنیفات نے بھی علمی، تاریخی اور اسلامی خدمات کا جو شاندار ریکارڈ بنایا، وہ کسی کی نظر سے پوشیدہ نہیں ہے۔

پھر ۱۹۴۷ء آیا، دلی میں آگ لگی، سارا شہر قتل و غارت، لوٹ مار اور آتش زنی کی بھیانک وارداتوں سے جہنم بن گیا، قرول باغ جہاں ندوۃ المصنفین کا دفتر تھا مکمل طور پر فسادیوں کی نذرِ آتش ہو گیا، کشیدگی انتہا پر تھی اور سب لوگ مجھ سے اصرار کر رہے تھے کہ میں قرول باغ کو چھوڑ دوں لیکن میں نے کسی کی نہیں سنی اور بدستور وہیں مقیم رہا مولانا حفظ الرحمٰن روزانہ گاڑی میں بیٹھ کر خیر خبر کے لئے ندوۃ المصنفین کے دفتر ضرور آتے تھے مسلم لیگ کے صدر شیخ عبد السلام بھی باوجود نظریاتی اختلاف کے خبر گیری رکھتے تھے۔ مولانا حفظ الرحمٰن اس شام کو بھی حافظ نسیم کی گاڑی میں ندوۃ المصنفین آئے تھے جو قرول باغ میں ہماری آخری رات تھی، صبح آئی، تو صبح قیامت تھی۔

ندوۃ المصنفین کے دفتر کو آگ لگا دی گئی۔ ساری کتابیں، سارا سامان نذرِ آتش

کر دیا گیا۔ ایک ٹال والے کے یہاں بیوی بچے پناہ گزیں ہوئے اور ہم قصاب پورہ کے مدرسہ رحمانیہ میں جا پہونچے، قتل و غارت اور تباہی کی وہ شدت تھی کہ چار دن تک باوجود کوشش کے کوئی خبر لینے بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکا۔ کچھ لوگوں نے تو یہ خبر بھی سُن لی کہ مفتی صاحب قتل کر دئے گئے۔ چار دن تک ہماری کس مپرسی کا یہ عالم تھا کہ خورد و نوش کی کوئی چیز ہمارے پاس نہیں تھی، کہیں سے تھوڑے سے گیہوں مل گئے تھے وہی اُبال لیتے اور کھا لیتے تھے، پانچویں دن مولانا حفظ الرحمٰن پہونچے اور وہ ہمیں کسی نہ کسی طرح وہاں سے نکال کر لے آئے۔ یہاں پہونچنے کے بعد پھر سوال پیدا ہوا کہ اَب کیا کریں۔ شہر کے حالات معمول پر آئے تو میں نے دوبارہ ندوۃ المصنفین کو اُٹھانے کی ٹھانی۔ مولانا حفظ الرحمٰن حسبِ معمول پھر بگڑ گئے۔ اُنھوں نے کہا کہ ناممکن باتوں میں وقت ضائع کرنے سے کیا حاصل جو چیز ختم ہو گئی وہ دوبارہ پیدا نہیں ہو سکتی۔ ان کا اصرار تھا کہ اب اس باب کو بند کر دینا چاہئے لیکن میں نے ان سے پھر کہا کہ مولانا ایسے ادارے روز روز قائم نہیں ہوا کرتے اگر اس وقت چھوڑ دیا گیا تو برسوں کی محنت خاک میں مل جائے گی۔

مولانا حفظ الرحمٰن کی مشغولیات دوسری ہو چکی تھیں لیکن انھوں نے ختم کر دینے پر اصرار نہیں کیا اور کہا کہ آپ کا خیال ہے تو کر کے دیکھئے، مجھے اُمید نہیں۔ میں نے پوری جد و جہد سے ایک بار پھر اس ادارے کو قائم کیا اور آج یہ جیسا بھی ہے، سب کے سامنے ہے۔ ہم مکمل طور پر تباہ ہوئے تھے اور ہم نے انسانیت سوز اور بے رحمانہ قتل و غارت کے مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھے اور برداشت کئے لیکن اس کے باوجود میرے ذہن میں کوئی تلخی نہیں ہے۔ اس سلسلے میں میں ایک ہی بات کہتا ہوں کہ اس زمانے میں ہم پر جو لوگ فرقہ واریت کا الزام لگاتے ہیں وہ نہ صرف حق و انصاف کا خون کرتے ہیں، بلکہ بڑی زیادتی سے بھی کام لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر گرلیش ماتھر نے اپنے ایک کتابچہ مسلمان اور علیحدگی پسند سیاست کے صفحہ ۵۶ پر مجھے علماء اور مسلم سیاست دانوں کے اس گروپ کا رہنما بتایا ہے جن کا ایک

قوم کے تصور میں اعتقاد نہیں تھا۔ اس کتابچہ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ میں ان لوگوں میں ہوں جو ۱۹۴۷ء کے بعد جمعیۃ العلماء میں شریک ہوئے۔

مجھے گریش ماتھر صاحب سے کوئی شکایت نہیں ہے لیکن انھوں نے ایک جذباتی اور ناپختہ نوجوان کی غیر ذمہ دارانہ تحریروں پر اعتماد کرکے ایک خلافِ واقعہ بات لکھ دی — جو نہ صرف واقعہ کے بلکہ حقیقت کے بھی خلاف تھی —

اس کتابچہ میں یہ بھی الزام لگایا گیا ہے کہ 'برہان' میں ۱۹۴۲ء میں مولانا حسین احمد مدنیؒ کے نظریۂ قومیت کے خلاف ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ میں اس کے جواب میں کوئی گرم یا تلخ بات کہنے کے بجائے صرف اظہارِ حقیقت کرنا کافی سمجھتا ہوں۔ جیسا کہ اس رُوداد سے ظاہر ہوگا کہ قوم پرست تحریکوں سے میرا تعلق ۱۹۲۰ء سے غیر منقطع رہا ہے، اور میں ذمہ داری کے ساتھ یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ میں ایک ایسا آدمی ہوں جو مدت العمر ہندوستان کی تقسیم کو مذہب کی بُنیاد پر غلط قرار دیتا رہا۔ میں نے ہمیشہ اپنی تقریروں میں ہندوستان کی تقسیم کو فقہ کی اصطلاح میں "مالایقسم" چیزوں کے زمرے میں شامل کیا ہے اور مسلمانوں کو مدت العمر یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ فقہ کے اعتبار سے بھی یہ ملک ان چیزوں کے زمرے میں شامل کیا جانا چاہیے جو تقسیم نہیں ہوسکتیں۔ میں نے زور دے کر کہا کہ چارپائی، چکی اور پانی کی طرح اس ملک کی منفعت بھی ایک ہی رہتے میں ہے جس طرح چارپائی اور چکی اور پانی کا ہبہ تک نہیں ہوسکتا، اسی طرح ملک کی تقسیم بھی شرعی اعتبار سے درست نہیں، کیوں کہ علاقوں کے اعتبار سے یہ ملک بھی ایسا ہی ہے جو متحد رہ کر منفعت دے سکتا ہے، اس کا تقسیم کرنا پانی، چکی اور چارپائی کو توڑ کر تقسیم کر دینے کے مترادف ہے جو بالآخر اُن کی منفعت کو ختم کر دینے کا سبب بن سکتی ہے۔

"بُرہان" میں ۴۲ء کے مضمون کا قصہ یہ ہے کہ مولانا عبدالرحمٰن نے ایک مضمون بُرہان میں نظریۂ قومیت کے خلاف لکھا اور اس میں علمی بحث اُٹھائی۔ مضمون شائع

ہونے کے وقت مولانا حفظ الرحمٰن جیل میں تھے اور اُنھوں نے جیل ہی سے اس کا جواب لکھا جس میں مولانا عبدالرحمٰن کے نظریہ کی پُرزور تردید کی گئی تھی، یہ علمی بحث تھی جو بُرہان میں شروع کی گئی۔ آخر میں بُرہان نے ایک محاکمہ کیا جو شمس العلماء مولانا عبدالرحمٰن کے نظریہ کی تردید اور متحدہ قومیت کے نظریہ کی تائید میں تھا۔ میں نے بھی ایک مضمون اس کی تائید میں لکھا، جو نہ صرف موجود ہے، بلکہ "بُرہان" کے ریکارڈ سے دیکھا جا سکتا ہے۔ میں گریش ماتھر کی نیت پر شبہ نہیں کرتا، لیکن مجھے افسوس ہے کہ اُنھوں نے میرے بارے میں اتنی بے خبری کا ثبوت دیا کہ تحقیق اور تفتیش کی زحمت اُٹھائے بغیر ایک بے بُنیاد الزام مجھ پر عائد کر دیا۔

بات کہاں سے چلی تھی کہاں تک پہونچ گئی، یہ پچاس برس کی روکھی پھیکی زندگی کی جھلکیاں ہیں جو عزائم کی فرمائش پر میں نے قلم بند کرا دیں ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ ؎

اک کہانی ہے زندگی اپنی
اور کیا بے مزہ کہانی ہے

———— ❊ ————

دو ہفتہ دورۂ رُوس کی روئدادِ سفر

(از مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی)

عزیز بھائی مولانا اکبرآبادی! السلام علیکم!

یہ خط لینن گراڈ سے لکھ رہا ہوں، اس وقت یہاں شام کے ½ ۷ بجے ہیں، وہاں ½ ۱۰ بجے ہوں گے، ہم لوگ آج صبح ہی یہاں پہنچے ہیں۔ تاشقند سے رات کے ۱۰ بجے اُڑے تھے۔ پونے چار گھنٹے یا ساڑھے تین گھنٹے میں ماسکو پہونچے، ماسکو کا ہمارا پروگرام ۲۸، ۲۹، ۳۰ کا ہے ۳۱ کو کسی وقت دہلی کے لئے روانہ ہوجائیں گے، اس وجہ سے ماسکو کے ہوائی اڈہ پر اُتر کر رات کے باقی حصے میں وہیں رہے کیونکہ اُس وقت لینن گراڈ کے لئے کوئی جہاز نہیں تھا، پورے سفر میں پروگرام میں تھوڑی سی غلطی کی وجہ سے یہیں تکلیف ہوئی کہ رات کے باقی حصے میں ویٹنگ روم میں رہنا پڑا، ورنہ پورا سفر انتہائی اعزاز و احترام اور آرام سے گذرا۔ بہر حال صبح کو لینن گراڈ کے لئے ماسکو سے روانہ ہوئے، ماسکو اور لینن گراڈ میں آٹھ سو سے زیادہ کیلومیٹر کا فصل ہے جہاز صرف پچاس منٹ میں پہونچ گیا، تاشقند سے ماسکو ساڑھے تین ہزار سے کچھ کم کیلومیٹر ہے، اتنا بڑا فاصلہ ساڑھے تین گھنٹے میں طے ہوگیا۔ بس خدا کی قدرت کا کرشمہ ہے۔ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ۔

اُس روز دہلی سے ساڑھے چھ بجے صبح کو چلے تھے اور چار گھنٹے سے کم میں تاشقند پہونچ گئے تھے۔ ہوائی اڈّے پر مولانا مفتی ضیاء الدین باباخان اور دوسرے بڑے بڑے علماء اور آئمہ مساجد کے علاوہ حکومت کے شعبۂ سیاحت کے ہیڈ وغیرہ بھی موجود تھے، تاشقند ہوٹل جو شہر کا سب سے

بڑا اور نفیس ہوٹل ہے، اس میں قیام کا انتظام تھا، اس ہوٹل میں بیک وقت اٹھارہ سو آدمی قیام کر سکتے ہیں۔ ہر چیز نفیس، صاف ستھری، اعلیٰ درجہ کا بستر، اور کمبل وغیرہ، تاشقند ازبکستان کا دارالسلطنت ہے اور نہایت ہی صاف وشفاف اور طویل وعریض شہر ہے اس کے مختلف حصوں میں بعض چھوٹی نہروں کے علاوہ نہر کیکاؤس بہتی ہے جس نے پورے شہر کو گلزار بنا دیا ہے پھلوں کی کثرت کا کچھ ٹھکانا نہیں ہے۔ قسم قسم کے بہترین انگور، آڑو، ناکھد، سیب، خوبانی، انجیر وغیرہ۔ انار بھی بکثرت ہوتے ہیں مگر ابھی ان میں ایک مہینے کی دیر ہے، خربوزہ تو ایسا ہوتا ہے کہ سبحان اللہ، رسیلا، خوشبودار، بے حد شیریں، اس کی بھی بہت سی قسمیں ہیں، اس وقت ہر قسم کی ریل پیل ہے، تربوز بھی بہت نفیس ہوتا ہے، دو ڈھائی روز تک شہر اور اطرافِ شہر کے مختلف قدیم وجدید تاریخی آثار دیکھے، پروگرام اس قدر ٹائٹ رہے کہ صبح سے رات تک کمر لگانے کی بھی فرصت نہیں ملتی تھی، یہی وجہ ہے کہ آج یہاں پہونچ کر پہلا خط آپ ہی کو لکھ رہا ہوں، ترجمان کوئی نہیں ملا۔ اس لئے تمام بات چیت عربی میں زیادہ اور فارسی میں کم ہوتی تھی۔ اخبارات کو انٹرویو بھی دینے پڑے اردو میں کچھ ریکارڈ بھی ہوئے، وہ تو یوں کہئے کہ آب وہوا اچھی تھی ورنہ دم ٹوٹ جاتا۔ دہلی سے چل کر تاشقند کے ایرپورٹ پر اترا تو وہی پرانا مرض شروع ہوگیا۔ کیونکہ جہاز کم وبیش تیس ہزار فیٹ کی بلندی پر اڑا تھا، سردی کے اثر سے ناک سے بے تحاشا پانی اور چھینکیں آنا شروع ہوگئیں۔ بے حد فکر مند تھا کہ ابھی سفر کی پہلی منزل بھی شروع نہیں ہوئی اور میں اس مرض میں گھر گیا، مگر ایک ڈاکٹرنی نے ہوائی اڈے کے ویٹنگ روم ہی میں میری نبض دیکھی اور صرف ایک گولی دی اور چھینکیں لگی ہی کافی ہوگی۔ اس کے بعد ہوٹل کے ڈاکٹر نے دو روز ناک میں قطرے ٹپکائے، طبیعت ٹھیک ہوگئی، اس کے بعد سے طبیعت بحال ہے اور تھکن کے سوا جو قدرتی طور پر ہونی چاہئے کوئی تکلیف نہیں ہے۔ تاشقند میں اس وقت اٹھارہ بڑی مسجدیں ہیں جن میں جمعہ اور عیدین کی نمازیں بھی ہوتی ہیں، کم وبیش ایک سو چھوٹی مسجدیں ہوں گی جن میں برائے نام پانچ وقت کی نمازیں ہوتی ہیں، جمعہ نہیں ہوتا۔ نوجوان نمازی خال خال ہی نظر آئے، معلوم ہوا

جمعہ کے علاوہ نماز نہیں پڑھتے یا پھر نام کے مسلمان ہیں، تاشقند کی آبادی دس لاکھ کے قریب بتائی جاتی ہے جن میں اسّی فی صدی مسلمان بتائے جاتے ہیں، بہر حال اس میں شک نہیں کہ مسلمان بہت کافی ہیں ہم نے مسجد امام قفال[1] میں جو ادارۂ دینیہ کے ساتھ ہی ساتھ ہے ظہر کی نماز پڑھی، اس روز دوپہر کے بعد کا کھانا غذی ادارۂ دینیہ ہی میں تھا، شام کو مفتی صاحب موصوف نے اپنے مکان پر نہایت پُر تکلف دعوت دی۔ اس مسجد کے علاوہ دو اور مسجدوں میں نماز ادا کرنے کا اتفاق ہوا، مسجد زین الدین ولد شیخ شہاب الدین سہروردیؒ اور مسجد رکحت میں، ۱۹ اکو ہم لوگ سمرقند کے لئے روانہ ہوگئے، سمرقند، تاشقند سے تین سو کیلومیٹر سے زیادہ ہے، عجیب سرسبز و شاداب شہر ہے، درختوں سے بھرا ہوا، پھلوں میں رچا ہوا۔ اس شہر میں متعدد چھوٹی چھوٹی نہروں کے علاوہ بڑی نہر زر افشاں بہتی ہے جس نے پورے شہر کو محبوب کا سبزۂ خط بنا دیا ہے حافظ نے اس شہر کو سوچ سمجھ کر ہی ترک شیرازی کی نذر کیا تھا سمرقند پہونچ کر پہلے ہی روز ہم لوگ خرتنگ حاضر ہوئے یہیں امیر المومنین فی الحدیث آیۃ من آیات اللہ حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ کا مرقدِ مبارک ہے۔ خرتنگ کم و بیش پانچ ہزار کی آبادی کی ایک بستی ہے سمرقند سے اس کا فاصلہ بیس کیلومیٹر ہے۔ امام عالی مقام کے مزارِ مبارک پر حاضری دی۔ اور تقریباً دو گھنٹے وہاں قیام کیا، فاتحہ پڑھتے وقت قلب کی عجیب کیفیت ہوئی۔ امام والا مقام اور ان کی کتاب کی خصوصیات کے نقوش حافظے میں اُبھرنے لگے، اس وقت اگر کوئی مجھ سے امام بخاری پر تقریر کراتا تو کہہ نہیں سکتا

---

[1] محمد بن علی بن اسمٰعیل القفال الکبیر الشاشی الشافعی، تفسیر، حدیث، کلام، لغت و شعر اور فقہ کے مشہور و معروف امام جن کے متعلق امام ابو عبداللہ الحاکم کا قول ہے "الفقیہ الادیب امام عصرہ بما وراء النہر للشافعین واعلمہم بالاصول واکثرہم رحلۃ فی طلب الحدیث" امام ابوالحسن اشعری سے بلاواسطہ علم کلام حاصل کیا اور خود امام اشعری نے ان سے علم فقہ کی تحصیل کی۔ ۳۶۵ھ میں "شاش" میں وفات پائی، ان کے تفصیلی حالات جاننے کیلئے شیخ تاج الدین سبکیؒ کی "طبقات الشافعیہ" جلد ثانی دیکھنی چاہیے۔

کس طرح کی ہوتی، استاذ مرحوم کی شفقتوں کا نقشہ آنکھوں میں پھر گیا حضرت شاہ صاحب رح کا چہرۂ انور اس وقت آنکھوں کے سامنے تھا معلوم ہوتا تھا ہم سب بخاری شریف کے درس میں بیٹھے ہیں اور استاذ کی محققانہ، ناقدانہ اور بصیرت سے بھرپور تقریر سن رہے ہیں حقیقت یہ ہے کہ امام محمد بن اسمٰعیل بخاری رح کے مزار پر حاضری کا شرف اس طویل سفر کا حاصل ہے حضرت الاستاذ ہمیں پڑھا پڑھا کر دنیا سے تشریف لے گئے اور مزارِ بخاری پر حاضری میرے مقدر میں تھی، سمرقند میں بھی کافی مسجدیں ہیں، شاید بیدرہ مساجد جامع ہوں، باقی چھوٹی چھوٹی ہیں، مسجد خواجہ عبید اللہ احرار رح اس وقت سمرقند کی وسیع اور پُر رونق مسجد ہے، ہم نے ظہر کی نماز وہیں پڑھی اور خواجہ مرحوم کے مزار پر حاضری دی، ان ہی کی قبر کے پاس "شرح عقائد نسفی" کے مصنف اور "اصول الشاشی" کے مؤلف کی قبریں بتائی جاتی ہیں مگر یہ بات تحقیق طلب ہے۔ یہاں کی دوسری بڑی مسجد مسجد ذو المراد یا زود مراد ہے، یہاں بھی نماز پڑھنے کا اور بہت سے نمازیوں سے ملنے کا اتفاق ہوا، نمازی ہر جگہ وہی بوڑھے، ضعیف گرے پڑے ہیں، کہتے ہیں جمعہ کے روز یہ مسجدیں نمازیوں سے پُر ہو جاتی ہیں اور عیدین میں تو سڑکوں تک نمازی ہوتے ہیں، سمرقند اسلامی تاریخ کی یادگاروں کا عظیم الشان مرکز ہے۔ دو روز میں ہم نے بہت سے آثار دیکھے، دینی بھی اور دنیوی بھی! بابر اور الوغ بیگ کی قبروں پر جا کر عبرت حاصل کی اور قثم بن عباس رض کے مزارِ مبارک سے روحانی فیض حاصل کیا، اور بھی کتنے ہی مقامات پر جانا ہوا۔ یہیں الوغ بیگ[1] کی ہیئۃ الافلاک کا کچھ مٹا ہوا اور کچھ ابھرا ہوا تاریخی نمونہ ہے۔ اس رسدگاہ کو میں بہت دیر تک دیکھتا رہا، قدیم آثار کے ساتھ جدید ترقیاں بھی دیکھیں، ہڈیوں کے مرض کا ہسپتال، لائبریری، بچوں کی تربیت گاہ سب ہی چیزیں دیکھیں، سمرقند میں بھی ستر فی صد مسلمانوں سے کم نہیں ہیں، اس لیے یہاں کی زندگی میں قدرتی طور پر زیادہ دلچسپی ہیں، لائبریری کا عربی خاص طور پر مخطوطات ایک نہایت مہذب مسلمان لڑکی متوزہ نے دکھائے، اشعۃ اللمعات قلمی، برہان شرح مواہب الرحمٰن، مشکوٰۃ شریف اور تفسیر و تاریخ کی بعض عمدہ قلمی کتابیں دیکھیں، جلدی میں معائنہ کی چند سطریں بھی لکھدیں، یہیں مشترک کاشت کا فارم بھی دیکھا، اس فارم کا نام لینن آباد ہے اور یہ سمرقند سے چند کیلو میٹر

[1] (حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کے فاصلے پر بہت بڑا میلوں میں پھیلا ہوا فارم ہے، اس کا اصل نام کالخوص ہے، عربی میں الاراضی الشعادیۃ ہے، میری رائے میں موجودہ نسل میں جبر و قہر کا تصور ختم ہو چکا ہے، لوگ خوش خوش اس کام میں حصہ لیتے ہیں اور خوش حال ہیں، ان کی کاشت کی تمام آمدنی حکومت کی ہوتی ہے حکومت ان کے کھانے، کپڑے اور مکان کی ذمہ دار ہے، کچھ مزید بھی دیتی ہے، ان کاشتکاروں کے پاس اپنی بھی تھوڑی تھوڑی زمینیں ہیں جو ان کی مِلک ہیں، اِن زمینوں میں یہ کاشت بھی کرتے ہیں اور باغ وغیرہ بھی لگاتے ہیں۔ ان کا رہنا، سہنا شہر سے الگ ہے اور ان کی زندگی خاص طرح کی ہے، یُوں ہر طرح آزاد ہیں۔ مثلاً مسلمان کاشتکار جمعہ و عیدین کی نماز کو بے تکلف جاتے ہیں، شاید صرف اطلاع دینی ہوتی ہے، واقعہ یہ ہے کہ سوویت یونین نے روزگار کا مسئلہ پوری طرح حل کر لیا ہے۔ یہاں روزگار انسانوں کو آواز دیتا ہے، آدمیوں کو روزی تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ بہر حال ہم نے اس وسیع و عریض فارم کے اکثر حصوں میں بذریعہ کار چکر لگایا۔ اس کی ایک ایک چیز دیکھی، گایوں کی نسل کشی کا منظر بھی عجیب ہے، ہزاروں گائیں قطار اندر قطار کھڑی ہیں، ہر گائے کی عمر، نسل، دودھ کی مقدار، کب گابھن ہوگی، کب بچہ دے گی، کونسی گائے گابھن ہونے کے لائق ہے، کونسی ابھی چھوٹی ہے، یہ سب چیزیں آپ کو ایک پلیٹ پر لکھی اور لٹکی ہوئی ملیں گی۔ اس تاریخی فارم کا ہیڈ مسلمان ہے، لاہا قُل اَللہ قُل یعنی عبداللہ، ہم نے فارم ہی پر عشائیہ تناول کیا، دُنبہ کا بھنا ہوا گوشت، تکے، نفیس پھل، شہد خالص، میں نے

(حاشیہ گذشتہ صفحہ سے) سلطان الوغ بیگ مرزا سلطان شاہ رُخ مرزا کا بڑا بیٹا اور امیر تیمور کا پوتا تھا، ۱۲؁ھ میں اس کے باپ نے اس کو ماوراء النہر کا حاکم اعلیٰ بنایا۔ ۸؁ھ میں والد کے انتقال کے بعد مستقل طور پر زمام سلطنت ہاتھ میں لی، علم ہندسہ کا ماہر اور زبردست عالم و فاضل تھا۔ اس نے اپنے زمانۂ اقتدار میں بڑے مدرسے قائم کئے اور ان کے نصاب میں اصلاح کی بھی زبردست کوشش کی۔ الوغ بیگی زیچ کا اگرچہ نصف سے زیادہ حصہ مِٹ چکا ہے پھر بھی اس کے نقش یا کی شوخی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

یہاں بھی معائنہ لکھا ہے تیسرے روز سمرقند سے بخارا ہوائی جہاز سے گئے، دونوں شہروں کا فاصلہ تقریباً تین سو کیلومیٹر ہوگا، چھوٹا جہاز تھا پھر بھی پچاس منٹ میں پہونچ گیا۔ دن کے ایک حصہ میں بخارا ہے اور سہ پہر کو سمرقند واپس آگئے، شہر کی حالت خستہ سی ہے، چونکہ کسی ریاست کا دارالحکومت نہیں ہے اس لئے حکومت کی توجہ بھی ادھر کم ہے، یہاں بھی بہت سے آثار دیکھے الوغ بیگ کے مشہور مدرسہ کے علاوہ شیخ عبداللہ امیر بخارا اور دوسرے امراء کے مدارس بھی دیکھے، مگر یہ سب مدرسے اُجڑے ہوئے ہیں، سب سے بڑی جامع مسجد جس کو پہلے قتیبہ بن مسلم نے لکڑیوں سے بنایا تھا اور پھر جلادی گئی تھی، بعد کو غالباً شیخ عبداللہ نے اس کو تعمیر کرایا تھا، دیکھنے کے قابل مسجد ہے، اِن دنوں سوویت یونین کی حکومت لاکھوں روبل خرچ کر کے بڑے پیمانے پر اس کی مرمت کرا رہی ہے، یہ مسجد بھی ادارۂ دینیہ جلد ہی واگذار ہو جائے گی۔ میں نے اپنی آخری تقریر میں ادھر توجہ بھی دلائی ہے۔ قریب ہی ایک دوسرا تاریخی مدرسہ ہے، اس میں مفتی ضیاء الدین صاحب کے "ادارۂ دینیہ" کی طرف سے اچھے پیمانے پر مدرسہ قائم ہے۔ ان دنوں مدرسہ میں تعطیلِ کلاں تھی، بخارا کے موجودہ آثارِ تاریخی میں قابلِ دید عمارت ابوبکر سامانی کے مقبرے کی ہے۔ اینٹوں کی عجیب و غریب سنگین عمارت ہے، اس کے قریب ہی چشمۂ ایوب ہے، یہاں ابوایوب سختیانی استاذ امام بخاریؒ کی قبر ہے۔ ساتھ ہی ایک چشمۂ ابل رہا ہے، بخارا سے بیس پچیس کیلومیٹر پر حضرت خواجہ بہاؤالدین نقشبندؒ کا مزار ہے۔ مگر ادھر کی سڑک ٹھیک نہیں تھی، زیرِ مرمت تھی اور ہمارے پاس وقت بھی نہیں تھا، اس وجہ سے وہاں حاضری نہ ہوسکی تاہم معلوم ہوا ہے کہ مزار کی عمارتیں اب اچھی حالت میں ہیں، ہم لوگ شام کو سمرقند واپس آگئے اور رات کے وقت پاپیادہ سیر کی، کہیں کہیں لوگ ہمیں حیرت واستعجاب سے دیکھتے تھے، سمرقند میں نہر کے کنارے اور شہر سے دور باغ میں نفیس دعوتیں ہوئیں، ۱۲ کی صبح کو ہم لوگ دوشنبہ کے لئے روانہ ہوگئے۔ دوشنبہ تاجکستان کی راجدھانی ہے اور بالکل جدید طریقہ پر آباد کیا گیا ہے۔ اعلیٰ درجہ کی چوڑی سڑکیں شاداب باغ شہر کی رونق کو دوبالا کر رہے ہیں۔ یہاں چھوٹی نہروں کے علاوہ دو بڑی اور تیز بہنے والی نہریں ہیں، نہر وخش اور نہر دوشنبہ نہر وخش کچھ فاصلے سے اور نہر دوشنبہ پورے شہر میں جاری

ہے دوشنبہ کا ہوٹل بھی، تاشقند کے ہوٹل سے کسی طرح کم نہیں تھا۔ اس ہوٹل کا نام غالباً ہوٹل وخش ہے۔

دوشنبہ کا جدید نام استالن آباد تھا، اب پھر وہی پرانا نام رکھ دیا گیا ہے۔ آب و ہوا کے لحاظ سے یہ مقام شاید سب سے عمدہ ہے، یا کم سے کم ہلکی خنکی کے اعتبار سے نمایاں ہے، یہاں ہم نے جدید چیزیں زیادہ دیکھیں اور نہر کے کنارے پر تفریح بھی خوب کی، دوشنبہ کے ہوائی اڈے سے ہم لوگ سیدھے مولانا محمد یعقوب چرخی کے مزار پر گئے، یہ وہی مولانا محمد یعقوب ہیں جن کی روایات آپ نے تفسیر کی کتابوں میں پڑھی ہیں اور حضرت شاہ عبدالعزیز رہ تو تفسیر عزیزی میں زیادہ روایتیں انہی سے لیتے ہیں ان کے مزار کے متصل ایک وسیع مسجد بھی ہے۔ ہم نے ظہر اور عصر کی نمازیں یہیں پڑھیں، زار کے زمانے میں دوشنبہ ایک ویرانہ تھا، آج گلزار اور سبزہ زار بنا ہوا ہے، یہاں بڑے بڑے کارخانے بھی ہیں۔ سوتی کپڑے کا ایک بڑا مل ہم نے بھی دیکھا، اس کا تعلق بس دیکھنے سے ہے، یہاں بچوں کی تربیت کا ایک عظیم الشان اور لاثانی مرکز بھی ہے۔ "معہد تربیۃ الاطفال" اس میں ایک ہزار بچے، بغرض تعلیم و تربیت رکھے جاتے ہیں، مرکز کی ہیڈ چالیس سالہ مسلم خاتون ہیں جنہوں نے بکمال خندہ پیشانی ہمیں مرکز کے بڑے حصے کی سیر کرائی اور اس کی خصوصیتیں بتائیں — یہ مرکز ایک وسیع و عریض باغ میں ہے جس میں ہر قسم کے فواکہ کثرت سے پیدا ہوتے ہیں، پورے باغ کے مالی اور نگہبان بچے ہی ہیں۔ اور باغ کے تمام پھل بھی ان ہی کے لئے ہیں، اس مرکز کو دیکھ کر روح میں بالیدگی اور آنکھوں میں روشنی آگئی، اس کا انتظام بھی عجیب ہے، لائق دید، تفصیل زبانی بتاؤں گا۔ اس شہر میں "مکتبہ فردوسی" کے نام سے ایک عظیم لائبریری ہے، اس لائبریری میں کم سے کم ساڑھے سات لاکھ کتابیں ہیں، عمارت بھی دیکھنے کے قابل ہے۔ ہم نے یہاں عربی کی بعض نایاب قلمی کتابیں دیکھیں، حدیث، تفسیر، فقہ وغیرہ کی قلمی کتابیں بڑی بڑی رقمیں دے کر خریدی جاتی ہیں، ۲۳ تاریخ کا جمعہ بھی ہم نے اسی شہر کی دوسری مسجد کلاں میں پڑھا، اس کے امام مولانا سید عبداللہ جان ہیں جو "ادارہ دینیہ" کی

طرف سے قاضی بھی ہیں، فہیم اور خلیق عالم ہیں، جمعہ کی نماز ہزاروں نمازیوں کو میں نے پڑھائی اور نماز کے بعد یا شاید پہلے فارسی میں مختصر تقریر بھی کی، لوگوں پر بہت اچھا اثر ہوا، مصافحوں کا منظر دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا، فوٹو گرافر ہر جگہ ساتھ رہے چنانچہ یہاں بھی بہت سے فوٹو لئے گئے۔ ہندوستان کی بات تو دوسری ہے مگر یہاں آکر مشرب میں توسع ہوگیا جو غالباً ناگزیر تھا یہاں کے ایک فوٹو میں چوغے کے لباس میں ہوں اور ٹوپی بھی وہیں کی اوڑھ رکھی ہے، اسی روز شام کو "بستانِ نویسندگان" میں نہر کے کنارے تفریح کا پروگرام تھا۔ یہ پروگرام ہمارے تفریحی پروگراموں میں سب سے زیادہ دل آویز رہا، عصر، مغرب، عشا تین نمازیں یہیں پڑھیں یہ دوشنبہ سے پچیس ۲۵ تیس ۳۰ کیلو میٹر کے فاصلہ پر پہاڑوں کے بیچ میں ایک شاداب اور پر فضا مقام ہے، یہاں نہر کا پاٹ بھی خوب چوڑا ہے اور پانی بہت تیزی سے بہتا ہے پانی اتنا شفاف تھا کہ "الماء کاللجین" کی ترکیب سامنے آگئی۔ کھانا، پھل، چائے کبود اور چائے اسود ہر چیز سلیقے سے سجی ہوئی رکھی تھی، بہترین لکڑی کا کھلا ہوا مکان تھا جس سے نہر کا تیز رفتار پانی ٹکرا ٹکرا کر دوڑ رہا تھا متعدد ادیب اور شاعر بھی شریکِ محفل تھے، بہت سے مشہور لکھنے اور کہنے والے اسی علاقے میں رہتے ہیں، میں نے "آبِ رواں" کے ساتھ "سبزۂ جواں" کی ترکیب استعمال کی تو ایک ادیب جن کا نام اس وقت ذہن میں نہیں رہا پھڑک اٹھے، فضا کی مناسبت سے حافظ خسرو، عرفی، فیضی، غالب، شریف خاں شیرازی، آتشی قندھاری اور نظیری وغیرہ کے بہت سے اشعار بھی یاد آگئے، غرضکہ یہ مجلس بڑی ہی لطیف، سبک، اور پر مسرت رہی۔ ۲۴ر کو ہم لوگ پھر تاشقند واپس آگئے اور جیسا کہ لکھ چکا ہوں، دس بجے شب میں لینن گراڈ کے لئے روانہ ہوگئے ــ امام سید عبد اللہ صاحب کی طرف سے سلام مسنون! موصوف بہت اچھے رفیقِ سفر ثابت ہوئے، ہر طرح کا خیال رکھتے ہیں۔

لینن گراڈ جیسے تاریخی شہر کے حالات اور خصوصیات کا بیان خط میں نہیں ہو سکتا۔ میں نے اب تک ایسا نفیس خوبصورت اور باضابطہ شہر نہیں دیکھا تھا، لینن گراڈ میں ایک

ہی مسجد ہے، مگر عالی شان ہے۔ اس کی تعمیر سلطان ترکی نے کرائی تھی۔ ایک وقت کی نماز یہاں بھی پڑھی اور چند جملے بھی کہے۔ امام جامع مسجد مولانا عبدالباری صاحب جو ایک زندہ دل اور شگفتہ مزاج عالم دین ہیں ہم نے ظہر کی نماز کے بعد کھانا انہی کے یہاں کھایا ان کی اہلیہ، لڑکیاں سب یورپین لباس میں تھیں سب نے مل کر ہماری خوب خوب مدارات کی۔ ان کی ایک لڑکی دوشنبہ یونیورسٹی میں عربی کی لکچرار ہے۔ ان دنوں چھٹیوں میں گھر آئی ہوئی تھی۔ اس سے عربی میں کھل کر باتیں ہوئیں میرے ساتھ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی کتاب "اسلام کا اقتصادی نظام" کے تین نسخے تھے۔ ایک نسخہ مفتی صاحب کو اور دوسرا مولانا سید عبداللہ جان قاضی دوشنبہ کو دے چکا تھا تیسرا یہاں مولانا عبدالباری کو دیدیا۔ ایک نسخہ اور ہوتا تو ماسکو کی مسجد کے امام صاحب مولانا احمد جان صاحب کو دیتا۔ مولانا وسیع النظر عالم ہیں، تقریر بھی خوب کرتے ہیں۔

لینن گراڈ کی خصوصیات کا خلاصہ کن لفظوں میں آپ کے سامنے رکھوں۔ اشارہ بھی کروں تو کن چیزوں کی طرف۔ ہمارے میزبانوں نے پروگرام خوب سوچ سمجھ کر ایسا بنایا ہے کہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ اہم چیزیں دیکھی جا سکتی ہیں۔

یہ شہر "سوویت یونین" کا قدیم دارالسلطنت ہے اور بانیِ انقلاب لینن کی سرگرمیوں کا سب سے بڑا مرکز، چنانچہ بازاروں میں گھومنے کے بجائے ہم نے بہت سا وقت تاریخی مقامات دیکھنے پر ہی صرف کیا۔ سب سے پہلے زارِ روس کا سردیوں کا محل دیکھنے گئے۔ ان دنوں یہ محل ایک عجائب خانہ کی شکل میں ہے۔ حکومت نے اس بے مثال اور لاجواب محل کی ایک ایک چیز کو تاریخی اہمیت اور درسِ عبرت کے طور پر محفوظ کر دیا ہے۔ قصر کے سیکڑوں کمروں اور لق ودق ہالوں میں زاروں کی عیش کوشیوں کا کروڑوں بلکہ اربوں روپے کا سامان لگا ہوا ہے اور دیکھنے والوں کو عیش پرستی کے انجامِ بد کی خبر دے رہا ہے۔ ایک مہذب خاتون نے ہمیں اس عجائب خانے کی تمام قابلِ دید چیزیں دکھائیں۔ ہم نے تو ہر چیز عبرت ہی کی نگاہ سے دیکھنے کی کوشش کی۔ یہ کروڑوں روپیہ جو قیصروں کے اندھے تعیش اور بہری ہوس پرستی پر خرچ ہوتا

تھا اب عوام کی زندگی اور خوشحالی کی ضرورتوں پر صرف ہو رہا ہے اور یہ بات ایسی نہیں جس کو اوپری کانوں سے صرف سُن لیا جائے۔ بے شبہ یہ سبق لینے کی بات ہے۔

قصرِ شتائی کی سیر سے فارغ ہو کر ہم نے "کنیسۂ اسحاق" دیکھا۔ یہ کنیسہ زارِ اول نے تعمیر کرایا تھا۔ دیکھنے کے لائق عمارت ہے اور یوں بھی مقدس ترین کنیسہ سمجھا جاتا ہے۔ وسطِ شہر میں نہرِ نیفا اپنی تمام وسعتوں، رعنائیوں اور جولانیوں کے ساتھ بہتی ہے اور اکثر بڑی بڑی عمارتیں اسی کے کنارے پر ہیں، میں نے لینن گراڈ میں ایک شخص کو بھی فٹ پاتھ سے علیحدہ ہو کر چلتے نہیں دیکھا کسی کو راستے میں کھاتا ہوا اور تھوکتا ہوا بھی نہیں دیکھا۔ شہر کی سڑکیں نہایت صاف ستھری اور عمارتیں بہت ہی باقاعدہ بنی ہوئی ہیں۔ جن میں فنِ تعمیر کا کمال اور خوبصورتی پوری طرح جلوہ گر ہے "نیفا" اور اس کی شاخوں نے شہر کے حُسن کو اور بھی نکھار دیا ہے۔

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے گذشتہ جنگِ عظیم کے آخری دنوں میں اس شہر کے باشندوں کی مدافعت نے تاریخی اہمیت حاصل کر لی تھی اور جیتن کے حملہ کے بعد دہلی میں جو پہلی پبلک تقریر ہوئی تھی اس میں لینن گراڈ کے اس ڈیفنس اور اس کے باشندوں کے عزم و حوصلہ کا خاص طور پر ذکر کیا تھا۔ اس لئے اُس خاص مقام کو دیکھنے کا یوں بھی اشتیاق تھا۔ جہاں اشتراکی فوجیں فولاد کی دیوار بن کر کھڑی ہو گئی تھیں اور انھوں نے جرمن فوجوں کو اس جگہ سے ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھنے دیا تھا۔ یہ مقام شہر کے بالکل قریب چند کیلومیٹر کے فاصلے پر ہے، یہاں پتھر کا ایک ستون کھڑا ہے جس میں جدید دُنیا کی تاریخ کے اس سب سے بڑے ڈیفنس اور دفاع کی ضروری تفصیل مندرج ہے، ہم لوگ دیر تک اِس جگہ بیٹھے رہے اور شیخ محمد یوسف جو ادارۂ دینیہ "تاشقند" کے خاص کارکن اور "جامعۂ ازھر" کے فاضل ہیں۔ مجھے ہٹلر کی فوجوں کے محاصرے اور اشتراکی فوجوں کی قوتِ صبر و برداشت کے واقعات سُناتے رہے شیخ موصوف پورے سفر میں آخر تک ہمارے ساتھ رہے۔ ان سے عربی میں ہر طرح کی باتیں ہوتی ہیں۔ اگر یہ ساتھ نہ ہوتے تو سفر کا لطف پھیکا ہو جاتا۔ اُزبکی اُن کی مادری زبان ہے اور رُوسی تقریباً مادری عربی بھی

بے تکلف اور زناٹے سے بولتے ہیں۔ بقدرِ ضرورت فارسی بھی جانتے ہیں۔ اشتراکی فوجوں کی سرفروشی، صبر و استقلال اور شجاعت و بسالت کے حالات سن کر قلب میں ایک خاص طرح کی خلش اور کسک پیدا ہوتی تھی اور رہ رہ کر خیال آتا تھا کاش وطن کی آبرو، اور آزادی کی حفاظت کا یہ جذبہ بے پناہ خدا اور آخرت پر ایمان لانے والوں کے دلوں میں بھی اپنے مذہب ایمان کی عزت بچانے کے لئے اس سے بڑھ کر نہیں تو اتنا ہی ہوتا۔ لینن گراڈ تقریباً تین سال تک ہٹلر فوجوں کے محاصرے میں رہا اور اس طویل مدت میں شہر کی عام آبادی جن مصائب و آلام کا شکار ہوئی اس کا بیان لفظوں میں نہیں ہو سکتا۔ دن میں کئی کئی بار بمباریاں ہوتی تھیں اور پورا شہر جہنم کا نمونہ بن جاتا تھا۔ مگر جیسے ہی ہوائی حملہ رکتا ہر شخص اپنے کام پر لگ جاتا۔ کارخانوں میں کام ہونے لگتا، دفاتر کھل جاتے، سڑکیں صاف ہونے لگتیں، اور مردوں سے زیادہ عورتیں یہ خدمت انجام دیتیں ہمیں بتایا گیا کہ تین سال کی طویل مدت کے محاصرے اور ہوائی حملوں کے نتیجے میں کم سے کم تین لاکھ انسانوں کی جانیں گئیں۔ ان میں ایک بھاری تعداد اُن کی تھی جن کی موت مسلسل فاقوں کی وجہ سے ہوئی۔ یہ سب کچھ ہوا مگر عوام کے حوصلے پست نہیں ہوئے اور وہ انتہائی بے جگری سے ان مصیبتوں کا مقابلہ کرتے رہے یہاں تک کہ "نہر نیفا" اُن کی زندگی کا پیغام اس عنوان سے لائی کہ تیسرے سال کی سردیوں کی شدت میں اس کا پانی معمولی سے زیادہ جم گیا اور اشتراکی فوجوں کے ایک قلیل حصے نے برف کی اس سڑک کے ذریعے ماسکو سے رابطہ قائم کر لیا اس جمے ہوئے پانی پر بھی جرمن بمباروں نے بے تحاشا بمباری کی اور برف کی چٹانیں پگھل پگھل کر بہنے لگیں اس طرح اشتراکی فوجوں کا بہت کچھ جانی نقصان بھی ہوا مگر ماسکو سے فوج کے جس حصے کا تعلق قائم ہو چکا تھا جرمن فوجیں اس کو توڑ نہیں سکیں۔

لینن گراڈ کے محاذ پر نازی اور سرخ فوجوں کے تاریخی مقابلے اور قوت آزمائی کی تفصیل ۱۹۴۳ء کے ہندوستانی اخباروں میں بھی موجود ہے۔ خط میں اس سے زیادہ کیا لکھوں یہ مقام دیکھ کر قیام گاہ "یورپ ہوٹل" واپس آیا تو بہت دیر تک دماغ میں ان واقعات و حالات کا تصور

جمارہا اور بار بار یہی خیال ہوا کہ ہمت، ارادے کی پختگی، موت سے بے خوفی، ڈسپلن اور اعلیٰ تربیت کے سامنے عسکری طاقت کی ہولناکی اور قہرمانی کس طرح بے حقیقت ہو کر رہ جاتی ہے۔

اس ہوٹل میں آزادی سے پہلے کے ایک انگریز گورنر سے اتفاقی طور پر ملاقات ہوگئی۔ ان کا نام امام صاحب کی کاپی میں لکھا ہوا ہے مجھے اس وقت یاد نہیں رہا۔ گورنر صاحب نے ہمیں دیکھا تو بڑے تپاک سے ملے اور اچھی خاصی اُردو میں باتیں کیں۔ کہتے تھے میں صوبۂ سرحد میں گورنر رہا ہوں۔ تقسیم کے وقت حکومتِ ہند کا ڈیفنس سکریٹری تھا اور سکندر مرزا میرے نیچے کام کرتے تھے۔ یہ انگریز افسر تقسیم ہند کے نتائج اور خاص طور پر اُس وقت دہلی کے پرانے قلعے میں مسلمانوں کی جو حالت تھی اُس پر دیر تک باتیں کرتا رہا۔ خیال تھا اس سے دوبارہ اطمینان سے ملیں گے مگر نوبت نہ آئی۔ انگریز گورنر کو اس بے تکلفی اور سادگی میں دیکھ کر زمانے کے انقلاب کی تصویر آنکھوں میں گھومنے لگی۔ دوسرے روز ہم وقت کے پہلے حصے میں شہر کے سب سے زیادہ اثر انگیز اور سبق آموز مقام پر گئے یہاں جگہ خاص شہر سے چند کیلو میٹر پر ہے۔ اس کا نام ....

PISKAROVSKY یعنی مقبرۃ الشہداء ہے۔ یہ وطن کے ان تین لاکھ سپوتوں کا مدفن ہے جنھوں نے وطن کی حفاظت پر جانِ عزیز قربان کر دی اور اپنی زندگی کو اہلِ وطن کے لئے نمونہ بنا گئے۔ جیسے ہی ہم کاروں سے اُترے عجائب خانے کے کارکن مصافحے کے لئے آگے بڑھے۔ اور پہلے ہمیں میوزیم میں لے گئے۔ یہ میوزیم بھی دیکھنے کی چیز ہے۔ اس میں لینن گراڈ کے دفاع اور اشتراکی فوج کے کارناموں کو بڑے سلیقہ سے دکھایا گیا ہے۔ ہم لوگ دیر تک میوزیم کے ایک ایک نقشے اور ایک ایک تصویر کو غور سے دیکھتے رہے۔ بہر حال اس ساز و سامان کو دیکھ کر جنگ کے دنوں کے لینن گراڈ اور اس کے باشندوں کے حوصلوں اور ناقابلِ شکست عزم کا مکمل نقشہ سامنے آجاتا ہے اور یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے کہ کسی وقت عسکری طاقت کم بھی ہو تو اس کمزوری کی تلافی ملک کے عام رہنے والے کس طرح کر سکتے ہیں۔

میوزیم کی سیر کے بعد ہم قبروں کے چبوتروں کے قریب سے گزرے۔ قبروں کے ان چبوتروں

کو بہترین سبزہ زاروں کی شکل دے دی گئی ہے۔ بیچ کا راستہ گلاب کے اعلیٰ درجے کے سُرخ پھولوں سے لدا ہوا ہے۔ چبوتروں کی روش پر اُترنے سے پہلے سیڑھیوں کے قریب ہی زمین کے نیچے کی سطح پر آگ روشن ہے۔ یہ آگ کسی وقت نہیں بجھتی۔ اس کو گیس سے روشن رکھا جاتا ہے اور اس کی سُرخی کو دیکھ کر دماغ ایک خاص طرح کا اثر لیتا ہے۔ چبوتروں اور بڑی بڑی روشوں سے گزر کر ہم لوگ ایک پُرہیبت مجسّمے کے قریب پہنچے۔ یہ مادرِ وطن کا مجسّمہ ہے جس کے آس پاس کی دیواروں پر مختلف تحریریں ہیں۔ ان کتبوں کا ترجمہ مجھے شیخ محمد یوسف نے سُنایا۔ مادرِ وطن نے وطن کی عزت پر قربان ہونے والے اپنے بچوں کے جانبازانہ کارناموں کو بڑے ہی رقت انگیز پیرایہ میں سراہا ہے۔ ان تحریروں کو پڑھ کر فرزندانِ روس کے حوصلے بڑھنے ہی چاہئیں۔
سہ پہر کو ایک دوسرا بڑا عجائب خانہ دیکھا جو لینن کے عجائب خانہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس کو دیکھ کر لینن کی شخصیت کی تمام خانگی، انفرادی اور اجتماعی گوشے سامنے آجاتے ہیں۔
تیسرے دن صبح کو زار کا گرمیوں کا محل دیکھنے گئے۔ یہ محل شہر سے ۳۰ کیلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ محل ایک نہایت پُرفضا اور طویل و عریض باغ میں ہے۔ خلیج بالٹک کے کنارے پر قصر کے محلِ وقوع کے حُسن کی باریکیاں آپ کو کیسے سمجھاؤں۔ نوکِ قلم ان لطافتوں اور باریکیوں کو تحریر کرنے سے قاصر ہے۔ یہاں بھی ایک خاتون گائڈ نے ہمیں باغ اور محل کے ضروری حصّوں کی سیر کرائی اور ہر چیز کی مختصر تاریخ بھی بتائی گئی۔ شیخ محمد یوسف مجھے سب باتیں عربی میں سمجھاتے رہے۔ یہ محل تین سال تک جرمن فوجوں کے قبضہ و تصرف میں رہا تھا جس کا لازمی نتیجہ یہی ہونا چاہئے تھا کہ جب یہ فوجیں واپس ہوئیں تو محل کے بڑے حصّے کو برباد کر گئیں۔ سوویت یونین کے کارفرماؤں نے ان تمام برباد شدہ عمارتوں اور اشیاء کو ٹھیک ٹھیک پہلے نمونے پر بنوا دیا۔ اور یہ کام کچھ اس انداز سے کیا گیا کہ نقشِ اوّل اور نقشِ ثانی میں کوئی فرق باقی نہیں رہا۔ وقت کی قلت اور مقام کی وُسعت کی وجہ سے ہم اس باغ اور محل کے تمام حصّوں کو نہیں دیکھ سکے۔ پھر بھی بہت کچھ دیکھا اور خوب دیکھا۔ اس محل کی تاریخ سے متعلق ایک کتاب

خریدی ہے۔

دوسری خصوصیتوں کے علاوہ اس محل کی سب سے بڑی خصوصیت اس کے عجیب و غریب بلکہ ورطۂ حیرت میں ڈال دینے والے فوارے ہیں۔ ان سنہرے اور نفیس فواروں کی تعداد ایک سو پچاس کے قریب ہوگی۔ ہر فوارے کی بجو بگی دیکھنے اور سمجھنے سے تعلق رکھتی ہے ـــــ آج ہم خوب تھک گئے ہیں اور بہت دیر تک آرام کرنے کو جی چاہتا ہے۔ مگر نظام الاوقات کے جرس کی فریاد یہی ہے کہ "بربند محملہا" چنانچہ ہم نے اس جرس کی فریاد سنی اور تھوڑا سا آرام کرکے زمین دوز ریلیں دیکھنے چلے گئے۔ فولاد کے برقی زینوں سے پھسل کر ایک زمین دوز اسٹیشن پر پہنچے اور کئی میل کی سیر کی۔ متعدد اسٹیشنوں پر بھی اترے، ہر اسٹیشن اپنے اپنے رنگ میں دیدہ زیب، اعلیٰ اور شاندار ہے۔ عمارتوں کے نقش و نگار میں لینن کی شخصیت اور اشتراکی پروپگنڈے کی بھی خوب خوب نمائش کی گئی ہے لینن گراڈ میں کم سے کم تیس زمین دوز اسٹیشن ہیں۔ ہر منٹ یا دوسرے منٹ پر ٹرین آتی ہے۔ ٹرین کے ڈبے نہایت سبک اور خوبصورت ہیں۔ ریل کی یہ تفریح خاصی دلچسپ رہی اس لئے بھی کہ اس کو دیکھنے کا یہ پہلا موقع تھا۔

تین روز تک لینن گراڈ کی سیر و سیاحت کے بعد رات کے دس بجے کی ٹرین سے ماسکو کے لئے روانہ ہوگئے۔ ہمارے پروگرام میں ریل کا سفر ایک یہی تھا ورنہ ہر جگہ ہوائی جہازوں سے آئے گئے۔ ریل کے سفر کا پروگرام اس لئے رکھا گیا تھا کہ "سوویت یونین" میں ریلوں کے سفر کی نوعیت کا مشاہدہ ہوسکے۔ ؎

؎ ہم نے یہ سفر میل ٹرین میں کیا۔ ٹرین کی سبک گامی اور تیز رفتاری کا کیا کہنا گیلری میں اچھی قسم کے قالین بچھے ہوئے تھے۔ برتھ بھی آرام دہ تھی۔ اعلیٰ قسم کا لگا لگایا بستر بہترین نرم و گرم کمبل اور دوسرا ساز و سامانِ استراحت ـــــ ہر دو آدمیوں کے ایک کیبن میں ریڈیو بھی فِٹ تھا۔ اسباب بنچوں کے نیچے نہیں بلکہ بڑے سلیقہ سے سامنے کی ایک کوٹھی میں رکھا جاتا ہے۔ یہ کوٹھی ہر کیبن کے ساتھ ہے۔

جیساکہ لکھ چکا ہوں لینن گراڈ اور ماسکو کا فاصلہ آٹھ سو کیلو میٹر کے قریب ہے ہم رات کے دس بجے ٹرین پر سوار ہوئے اور صبح سات بجے ماسکو پہنچ گئے ہیں۔ ماسکو کا ایک اسٹیشن لینن گراڈ ہے۔ ہم اسی اسٹیشن پر اترے اور قریب ہی کے ایک ہوٹل میں کہ اس کا نام بھی لینن گراڈ ہوٹل ہے قیام کیا۔ اس ہوٹل کی اکیس منزلیں ہیں اور یہ ماسکو کے بڑے ہوٹلوں میں ایک ہے۔ ہماری قیام گاہ خاص طور پر وسیع اور نفیس ہے۔ اس میں چار بہترین فرنشڈ کمرے ہیں جن میں اعلیٰ درجے کے قالین بچھے ہوئے ہیں۔ صوفے بھی اعلیٰ قسم کے ہیں۔ پیانو، ریڈیو، ٹیلی ویژن سب ہی چیزیں لگی ہوئی ہیں۔ ماسکو کی سیر کی تفصیل اب اس خط میں نہیں آسکے گی خط طویل ہو گیا ہے اور اس شہر کی خصوصیتوں کا مطالبہ ہے کہ ان پر اطمینان سے لکھا جائے۔ اس وقت صرف چند چیزوں اور مقامات کی نشان دہی کرتا ہوں۔

شہر کی آبادی کم سے کم ساٹھ لاکھ ہے۔ ماسکو لینن گراڈ سے ایک تہائی زیادہ بڑا ہوگا لینن گراڈ کی آبادی چالیس لاکھ بتائی جاتی ہے۔ دوسری جنگِ عظیم کے وقت صرف دس لاکھ تھی جس کے معنی یہ ہوئے کہ ہوائی حملوں اور فاقوں سے شہر کی ایک تہائی آبادی ختم ہو گئی تھی۔ میری رائے میں لینن گراڈ کے رہنے والوں نے ملک کے لئے بے مثال قربانی دی ہے۔ ماسکو پہنچ کر سب سے پہلے نمائش کی سیر کو نکلے۔ یہ نمائش وقتی نہیں دائمی اور مستقل ہے۔ اور اس میں سوویت یونین کی تمام ریاستوں کی مصنوعات بڑے اہتمام اور شان سے سجائی گئی ہیں۔ ہر ایک ریاست کا جدا اسٹال ہے۔ نمائش کی وسعت کا اندازہ کرنا آسان نہیں ہے۔ ہم لوگ خاص اجازت سے موٹروں میں گھومے اور کئی گھنٹے تک گھومے۔ پھر بھی اس کا ایک حصہ ہی دیکھ سکے۔ ہندوستان کی تاریخی نمائش ہمارے ماسکو پہونچنے سے چار روز پہلے ختم ہو گئی تھی۔ اس لئے اس کے دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ اس نمائش کی تقریب سے بہت سے ہم وطنوں سے ملاقات ہوئی۔ ہندوستانی نمائش کی یہاں خوب شہرت ہے اور مصنوعاتِ ہند کو روسیوں نے بہت پسند کیا ہے۔

ہم ۲۸ اگست کی صبح کو یہاں پہنچے تھے، ۲۸ کو نمائش دیکھی اور ۲۹ کو "ادارۃ الصداقتہ"

گئے۔ دوسرے ملکوں کے عوام و خواص سے دوستانہ روابط مضبوط و مستحکم کرنے کے لئے یہ ایک اہم اور مشہور ادارہ ہے، اس کی شاخیں تمام ریاستوں میں پھیلی ہوئی ہیں تاشقند، سمرقند اور دوشنبہ میں بھی ان اداروں میں جانا ہوا تھا۔ ماسکو کا "ادارہ الصداقتہ" شہر کی بہت ہی نفیس اور عالیشان عمارت میں ہے، ہمارے صدر جمہوریہ ڈاکٹر رادھا کرشنن جب "سوویت یونین" میں ہندوستان کے سفیر تھے۔ اسی مکان میں رہتے تھے اور سفارت کا دفتر بھی یہیں تھا۔ "ادارہ الصداقتہ" میں ہمیں باضابطہ مدعو کیا گیا تھا اور بہت سے صحافی اور اربابِ علم و ادب ہم سے ملاقات کے لئے یہاں آئے تھے۔ دونوں ملکوں کے تعلقات اور دوسرے سماجی اور ثقافتی مسائل پر یہاں بہت دیر تک بے تکلفانہ باتیں ہوتی رہیں۔ ایک نوجوان روسی نے جن سے ایک دفعہ دلّی ہی میں ہماری ملاقات ہوئی تھی اردو زبان میں ہمارا استقبال کیا اور ادارے کے بعض دوسرے عہدیداروں نے روسی میں ——— میں نے اُردو میں ان تقریروں کا جواب دیا۔ اور اسی نوجوان نے میری تقریروں کا روسی زبان میں ترجمہ کر دیا۔ پُرلطف اجتماع کافی دیر تک رہا ——— شام کو ہم نے یہاں بھی میٹرو (زمین دوز ریلوں) کی سیر کی، کہتے ہیں ماسکو جیسی زمین دوز ریلیں ساری دنیا میں نہیں ہیں۔ ان ریلوں کے کم و بیش نوے ۹۰ اسٹیشن ہیں اور ہر اسٹیشن پر رونق ہے۔ ۳۰ کو ہم ماسکو یونیورسٹی دیکھنے گئے، اس یونیورسٹی کی شہرت پہلے بھی سُنی تھی۔ اب دیکھنے کا موقع مل گیا۔ یونیورسٹی کی وسیع اور سنگین عمارت ایک پہاڑی پر ہے اس وجہ سے اس کی خوبصورتی اور دل رُبائی میں اور بھی اضافہ ہو گیا ہے۔ ماسکو یونیورسٹی کا شمار دنیا کی مشہور ترین یونیورسٹیوں میں ہوتا ہے۔ اس کی ایک ایک چیز دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے ہم نے یہاں کئی گھنٹے صرف کئے مگر یونیورسٹی کا دسواں حصہ بھی نہ دیکھ سکے، اندازہ یہ ہوا کہ اس کے تمام شعبوں کو سرسری طور پر بھی دیکھنے کے لئے کم سے کم ایک ہفتہ کی ضرورت ہے۔ ہم نے چند گھنٹوں میں یہاں جو کچھ دیکھا اس کے بیان کے لئے بھی ایک دفتر چاہیے۔ یونیورسٹی کا میوزیم بھی کئی منزلوں میں پھیلا ہوا ہے۔ اس میں عجیب عجیب چیزیں دیکھیں۔ شہابِ ثاقب کا اکتالیس کیلو وزن کا ایک ٹکڑا بھی دیکھا۔ یونیورسٹی کی عمارت اپنے محلِ وقوع کے اعتبار سے بھی دل آویز ہے۔ وسیع و عریض سبزہ زاروں اور فصیلوں کے

سامنے نہر ماسکو بہہ رہی ہے۔ اور یہاں سے پورا شہر ایک کٹورے کی شکل میں نظر آتا ہے۔
لینن گراڈ کی طرح ماسکو میں بھی ایک مسجد ہے۔ مگر لینن گراڈ کی مسجد اس سے عالیشان ہے۔ آج جمعہ کی نماز ہم نے اسی مسجد میں پڑھی۔ مرد، عورتیں ملا کر نمازیوں کی تعداد کئی ہزار تھی۔ نماز سے پہلے میری تقریر ہوئی جس کا روسی ترجمہ ایک اشتراکی نوجوان نے کیا۔ یہ نوجوان اُردو سے زیادہ ہندی جانتا ہے۔ اس لئے اصرار کرتا رہا کہ ہلکی پھلکی زبان میں آہستہ آہستہ تقریر کیجئے۔ اس کا خیال رکھا گیا۔ خط میں تقریر کا خلاصہ لکھنے کی گنجائش نہیں ہے۔ میں نے مسلمانوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ ایک طرف وہ ملک کی معاشی اور سماجی زندگی میں زیادہ سے زیادہ دخیل ہونے کی کوشش کریں اور دوسری طرف اپنے مذہبی عقائد پر مضبوطی سے جمے رہیں۔ بوڑھوں کا فرض ہے کہ نوجوانوں اور بچوں کو مذہب کی ضرورت اور عظمت سے روشناس کرائیں۔ جمعہ کی نماز میں نے ہی پڑھائی۔ نمازی قرأت سے کافی متاثر ہوئے۔ نماز کے بعد امام مسجد مولانا احمد جان صاحب کے یہاں کھانا کھایا۔ کھانے میں بہت سے حضرات شریک تھے، یہ مجلس بھی دلچسپ رہی۔

عراق میں نوروز

از قلم گوہر بار مفتی عتیق الرحمن صاحب عثمانی

بغداد کی عالمی اسلامی کانفرنس "موتمر علمار المسلمین" میں شرکت کے لئے ۱۰ر فروری ۱۹۷۵ء کی صبح کو دہلی سے عراق ایرویز سے روانگی ہوئی، راستے میں ۴۵ منٹ کے لئے بحرین ٹھہرا اور اس طرح چھ گھنٹے سے کم میں یہ سفر طے ہو گیا، مہمانوں کے خیر مقدم کے لئے ہوائی اڈہ پر معقول انتظام تھا، اسی وقت ابوظہبی کا وفد بھی پہونچا تھا اور کچھ دوسرے اصحاب بھی، عرب ممالک کے بہت سے وفود پہلے ہی پہونچ چکے تھے "شارع سعدون" بغداد کی اہم اور مشہور سڑک ہے۔ مندوبین کی بڑی تعداد کے قیام کا انتظام اسی سڑک کے اول درجے کے ہوٹلوں میں تھا، ابوظہبی، یمن، بنگلہ دیش اور ہندوستانی مندوبین "ہوٹل خیام" میں ٹھہرائے گئے، اسی روز شب میں دیوان رئاسۃ الاوقاف کے صدر شیخ نافع قاسم قیام گاہ پر تشریف لائے اور بڑے ہی خلوص اور تپاک سے معانقہ کیا۔ دیر تک گفتگو کرتے رہے۔ گزشتہ اگست میں دورۂ سمرقند و ماسکو کے موقع پر موصوف سے ماسکو میں ملاقات ہوئی تھی اور اسی وقت معلوم ہو گیا تھا کہ ہندوستان سے جن علمار کو بلایا گیا ہے ان میں میرا نام بھی شامل ہے بلکہ شیخ قاسم نے اصرار کے ساتھ فرمایا تھا کہ تمہیں "بغداد کانفرنس" میں ضرور آنا ہے، ضابطے کا دعوت نامہ جلد پہونچے گا، اس طرح گویا حقیقی دعوت نامہ ماسکو ہی میں مل گیا تھا لیکن یہ اگست کی بات تھی اور اب اتنا وقفہ ہو گیا تھا کہ اجلاس کے التوا کا خیال ہونے لگا تھا۔ اِدھر عمر کے تقاضے اور اضمحلال

کی وجہ سے اب کسی طویل اور اہم سفر کی ہمت نہیں ہوتی۔ امام بخاری کے بارہ سو سالہ جشن ولادت کی تقریب میں مولانا سعید احمد صاحب رفیقِ سفر تھے اس لئے وہ طویل سفر سبک ہو گیا تھا، مولانا کی رفاقت میں یوں بھی بے فکری رہتی ہے کہ مقالات، مذاکرات اور مجالس کی ذمہ داریوں کو قابلیت سے انجام دیتے ہیں۔ اجتماع کی تاریخیں پہلے ۱۰ر سے ۲۲ر فروری تک رکھی گئی تھیں، دوسری اطلاع میں یہ تاریخیں ۱۳ر سے ۱۸ر فروری تک کر دی گئیں۔

۱۰ر فروری کی شام سے ۱۳ر فروری تک کا وقت فارغ تھا، خیال ہوا کہ اس فرصت سے فائدہ اٹھایا جائے، کانفرنس کے دوران بندھے ہوئے پروگرام کے علاوہ کہیں آنا جانا دشوار ہوگا چنانچہ شدید سردی کے باوجود اپنے مقامی رفیق کے ساتھ سب سے پہلے جامعہ مستنصریہ کی ہلکی اور اجمالی سیر کی، رات ہو گئی تھی اور وقت بھی کم تھا اس لئے اس عظیم الشان یونیورسٹی کی جو عراق کی جدید ترین لاجواب یونیورسٹی ہے، تفصیلی سیر نہ ہو سکی۔ یونیورسٹی کی ہر چیز لائق دید ہے، ہزار ہا طلبار اور طالبات اس میں تعلیم پاتے ہیں، ہم نے مغرب کی نماز قدرے تاخیر سے یونیورسٹی کی لائبریری کے ایک حصہ میں جماعت سے پڑھی اور لائبریری کے ذمہ داروں سے دیر تک باتیں کرتے رہے۔ جامعہ کے سالانہ میگزین کا آٹھ سو صفحات سے زیادہ کا ایک ضخیم نمبر بھی ہمیں تحفتاً دیا گیا، اس کو پڑھ کر "جامعہ" کی خصوصیتوں اور سرگرمیوں کی ضروری تفصیل معلوم ہو جاتی ہے، کڑاکے کی سردی میں یونیورسٹی سے واپس ہوئے تو قدرتی طور پر تھکن محسوس ہوئی اور جلد آرام کرنے کو جی چاہا، عشار کی نماز کے بعد جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے، مؤتمر کی روح اور رئاسۃ دیوان الاوقاف کے صدر اعلیٰ جناب نافع قاسم صاحب تشریف لے آئے، قاسم صاحب نہایت قابل، ذہین اور اعلیٰ درجے کے منتظم ہیں اور حکومت کے تمام ہی شعبوں میں ان کا غیر معمولی رسوخ ہے۔ رئیس مملکت کے معتمدِ خاص اور

درستِ زاس ہیں، اُن سے باتیں کر کے تھکن میں تخفیف ہو گئی، نیند بھی خوب آئی۔

بغداد صدیوں تک اسلامی تہذیب وثقافت اور ادب وسیاست کے دل کی دھڑکن رہا ہے، اس نے ایک زمانے میں دنیا کے بڑے حصے پر حکمرانی کی ہے، دوسرے مورخین کی زبردست کاوشوں کے علاوہ علامہ خطیب بغدادی نے متمدن دنیا کے اس لاجواب شہر کی تاریخ ۱۴ جلدوں میں لکھی ہے، خطیب کا سنہ وفات ۴۶۳ھ ہے اس لئے ان کی کتاب میں اسی سنہ تک کے واقعات آئے ہیں بعد کے واقعات تاریخ وثقافت کی دوسری کتابوں میں موجود ہیں۔ خطیب کی تاریخ کے مطالعہ سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس سرزمین نے علوم وفنون کے کیسے کیسے امام پیدا کیے اور علم وفن کے ان محققوں اور ماہروں نے کس ولولہ وشوق سے اس دارالسلام اور عروس البلاد کا رخ کیا اور پھر یہیں آباد ہو گئے، اس لئے یہ کہنا مبالغہ سے پاک ہوگا کہ دانشوروں، مذہبی رہنماؤں، ادیبوں، شاعروں اور اربابِ صدق وصفا کا اجتماع اتنی بڑی تعداد میں کسی بھی دوسرے اسلامی شہر میں نہیں ہوا۔

جہاں تک میرا تعلق ہے بغداد کے بازاروں اور سڑکوں پر قدم رکھنے کے ساتھ ہی عباسی دور کے ادیبوں اور شاعروں کے ادبی اور شاعرانہ کمالات کا نقشہ آنکھوں میں گھوم گیا۔ ابو نواس تو یوں معلوم ہوتا تھا کہ ساتھ ہی ساتھ چل رہا ہے، معلوم نہیں کیوں مجھے اس موقع پر الاغانی اور الف لیلا وغیرہ کے بجائے "نفحۃ الیمن" کی حکایتیں زیادہ یاد آئیں۔ شارع ابی نواس سے جب بھی گزر ہوتا دجلہ کی موجوں کو دیکھ کر عباسی خلیفہ ہارون الرشید کے دربار کے سب سے بڑے بزلہ سنج شاعر ابو نواس کی تصویر سامنے آجاتی۔ رقاشی، مصعب اور ابو نواس کی طبع آزمائیاں لوحِ حافظے میں ابھر آئیں اور ۶۰ سال پہلے کی پڑھی ہوئی کتاب

کے اوراق مصور ہو کر سامنے آجاتے۔ یہ تو میری بات تھی، مولانا سعید احمد ساتھ ہوتے تو رنگین اشعار کے دفتر کے دفتر دریائے دجلہ کی چمکتی ہوئی لہروں کی نذر کردیتے۔
۱۱ر فروری کی دوپہر کو امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی مسجد میں حاضری دی، یہ مسجد نہایت وسیع، سادہ اور شاندار ہے، پہلے امام والا مقام کے مرقد مبارک پر حاضر ہوئے اور وقت کا ایک حصہ اسی پرسکون، باوقار اور خاموش نورانی فضا میں گزارا، یہاں آکر طبیعت کا رنگ کچھ اور ہی ہوگیا، امام عالی مرتبت کے مسلک کی وسعت اور گہرائی دماغ پر چھاگئی، حضرت الاستاذ علامہ سید محمد انور شاہ صاحبؒ کی تحقیقات عالیہ اور مولانا شبلی کی سیرۃ النعمان کی بہت سی باتیں یاد آگئیں، افسوس ہے کہ مراقبہ کے فن سے آشنا نہیں ہوں ورنہ یہاں مراقب ہونے کو دل چاہتا تھا، کوئی پختہ کار مراقب ساتھ ہوتا تو اس کے ہمراہ میں بھی مراقبہ کرتا اور مراقبے کی دنیا کی روحانی سیر سے لطف اندوز ہوتا، بعض محدثین کرام اور فقہائے عظام نے امام اعظم کے کچھ مسائل پر جس طرح کی بے رحمانہ یورشیں کی ہیں اس فضا میں بار بار ان کا خیال آیا اور مسلک امام کی طرف سے مدافعت کرنے کو جی چاہا۔ لیکن ان باتوں کا تعلق وقتی جذبات اور اس خاص ماحول سے تھا، خیال تھا کہ قیام بغداد کے دنوں میں یہاں بار بار حاضری ہوگی، لیکن دوبارہ موقع نہیں ملا؟ اِدھر ظہر کی نماز کا وقت قریب تھا، جلد ہی مسجد آگئے، حنفی امام کی اقتدا میں نماز ادا کی اور قیام گاہ پر واپس آگئے، کھانا کھایا اور تھوڑی دیر آرام کیا۔ پروگرام کے مطابق مغرب سے قبل حضرت شیخ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں حاضری دی، یہ بغداد کا نہایت مشہور، مقبول اور بابرکت مقام ہے، آنے جانے والوں کا یہاں ہر وقت تانتا بندھا رہتا ہے، مسجد، مزار، مقبرے کا عالی شان گنبد، مسافرخانہ اور کتب خانہ تمام ہی عمارتیں شاندار اور جاذب ہیں۔ ان دنوں بڑے پیمانے پر مسجد کے مرکزی حصے کی مرمت اور

صفائی ہو رہی تھی اس لیے برابر کے حصے میں نماز ہوتی ہے، ہم نے اسی حصے میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھی، نماز کے بعد مزار پر حاضر ہوئے، یہاں عام طور پر زائرین کا وہی رنگ ہے جو اجمیر، کلیر اور دہلی وغیرہ کے زائرین کا ہے، جس وقت ہم فاتحہ پڑھ رہے تھے، ایک فوجی کو دیکھا کہ مزار کے پائنتی پر سجدہ کرکے تڑپ رہا ہے اور تڑپ تڑپ کر دعائیں مانگ رہا ہے، فاتحہ سے فارغ ہو کر کتب خانہ دیکھا، یہ بہت اچھا کتب خانہ ہے جس میں حدیث، تفسیر، فقہ، تاریخ، ادب اور تصوف ہر طرح کی قدیم و جدید کتابیں موجود ہیں، وقت کی قلت کی وجہ سے کتب خانہ میں زیادہ نہ ٹھہر سکے۔ یہ بھی خیال تھا کہ دوبارہ آنا ہو ہی گا مگر نہ ہو سکا۔ شارع امام اعظم، شارع جمہوریہ، شارع عبدالرشید، شارع ابی نواس اور دجلہ کے سبزہ زاروں اور پارکوں کی سیر کرتے ہوئے ہوٹل واپس آگئے، معمول کے مطابق کھانا کھایا، عشاء پڑھی اور سو گئے، رہ رہ کر یہ خلش ہو رہی تھی کہ پیرانِ پیر قدس سرہٗ کی ہنگامہ خیز اور تقدس و تقویٰ میں رچی ہوئی موحدانہ مجلسوں اور مرقد مبارک پر ہونے والے ان اعمال میں کیا نسبت ہے اور ان حرکتوں کو دیکھ کر شیخ کی روحِ پاک پر کیا گذرتی ہوگی۔ بہر حال ہر ایک کو اپنا مسلک محبوب ہے اور تاویلوں کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔ ۱۲ر فروری کی سہ پہر کو مشہور صوفیائے کرام حضرت سری سقطی، حضرت جنید بغدادی اور بہلولِ دانا وغیرہ کے مزارات پر حاضر ہوئے، اکابرِ صوفیہ کے یہ مزارات عام قبرستان میں ہیں، قبرستان کے اسی حصہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھی "پیغمبر یوشع علیہ السلام" کا مزار بھی بتایا جاتا ہے یہ مزار ایک علٰحدہ کمرے میں ہے، وہاں بھی حاضر ہوئے اور گرو نانک جی کے اس حجرے کو بھی دیکھا جس کے متعلق مشہور ہے کہ گرو جی نے اس حجرے میں قیام کیا، ایک چھوٹے سے سادہ کمرے میں تخت پر صاف ستھری چادر بچھی ہوئی تھی اور اس پر پھول بکھرے ہوئے تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ ان مزارات پر حاضری کے وقت قلب پر ایک

خاص کیفیت طاری ہوئی اور ان پاک باز ہستیوں کے روحانی اور اصلاحی کارناموں کا نقشہ سامنے آگیا۔۔ حاضری تو رواروی میں چند ہی مزاروں پر ہو سکی لیکن ابونعیم اصفہانی کی کتاب "حلیۃ الاولیاء" اور علامہ ابن جوزی کی "صفۃ الصفوۃ" وغیرہ زیرِ نظر تھیں جن میں اس سرزمین کے سیکڑوں اولیاء اللہ کا تذکرہ موجود ہے اور اب ان قبروں کا نشان بھی نہیں ملتا، پروگرام کے مطابق ۱۳ فروری کی صبح کو ۱۰ بجے مؤتمر کے تمام مدعوئین کو قصرِ جمہوریت پہونچ کر "سجل التشریفات" میں اپنے نام درج کرانے تھے، یہ وہ رجسٹر ہوتا ہے جس پر باہر سے آنے والے معزز مہمان دستخط کرتے ہیں اور رجسٹر صدرِ جمہوریہ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے، یہ ایک اخلاقی رسم ہے جو ممتاز مہمانوں کو ادا کرنا ہوتی ہے، قصرِ جمہوری میں قدم رکھتے ہی ماضی کی بہت سی دل خراش اور عبرت خیز یادیں تازہ ہونے لگیں اور تِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ کی تفسیر اپنی عبرت انگیزیوں کے ساتھ آنکھوں میں پھر گئی قصر کی صفائی ستھرائی، وسعت اور ظاہری رونق خوب تھی، پچاسوں موٹریں سیکڑوں مشاہیرِ وقت کو وسیع وعریض محل کے صحن میں پہنچا رہی تھیں اور علمائے کرام رجسٹر پر دستخط کر کے واپس ہو رہے تھے۔ کانفرنس کے آخری دن رئیس جمہوریہ جناب احمد حسن بکر سے بہت اچھے ماحول میں قصر کے بڑے ہال میں خوشگوار ملاقات ہوئی، تھوڑی تفصیل آگے آئے گی، شام کو ٹھیک ۶½ بجے اجلاس کی باضابطہ کارروائی شروع ہوئی، اجتماع کا انتظام علاقہ اعظمیہ کے قاعۃ النعمان میں کیا گیا تھا۔ ۳۲ ممالک کے کم وبیش ۱۵۰ نمائندے اجتماع میں شریک تھے، نمایندوں کے علاوہ مدعوئین خصوصی کی بھی خاصی تعداد موجود تھی، وسیع اور شاندار ہال بھرا ہوا تھا، عجیب طرح کی دلکشی تھی، اجلاس کا افتتاح بغداد کے ایک مشہور خوش لہجہ قاری صاحب کی تلاوت سے ہوا۔ قاری صاحب نے سورۂ اسرا کی آیات وَقَضَيْنَا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ

فِی الْکِتَابِ لَتُفْسِدُنَّ فِی الْاَرْضِ مَرَّتَیْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا کَبِیْرًا (الیٰ) اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا ○ سوز و گداز میں ڈوبے ہوئے لہجے میں پڑھیں تو سامعین پر وجد کی کیفیت طاری ہوگئی۔ آیات پاک کا سادہ ترجمہ آپ بھی سنتے جائیں، تفسیر و تشریح کا یہ موقع نہیں۔

ہم نے کتاب میں یعنی تورات میں بنی اسرائیل کو اس فیصلے کی خبر دیدی تھی کہ تم ضرور ملک میں دو مرتبہ خرابی اور فساد پھیلاؤ گے اور بڑی ہی سخت سرکشی کروگے پھر جب اُن دو وقتوں میں سے پہلے وقت آگیا تو اے بنی اسرائیل ہم نے تم پر ایسے بندے بھیجدیے جو بڑے ہی خوفناک تھے، وہ تمہاری آبادیوں کے اندر پھیل گئے اور اللہ کا وعدہ تو اس لیے تھا کہ پورا ہوکر رہے۔

پھر دیکھو ہم نے زمانے کی گردش تمہارے دشمنوں کے خلاف اور تمہارے موافق کردی اور مال و دولت اور اولاد کی کثرت سے تمہاری مدد کی اور تمہیں پھر ایسا بنادیا کہ بڑے جتھے والے ہوگئے، یاد رکھو، اگر تم نے بھلائی کے کام کیے تو اپنے ہی لیے کیے اور برائیاں بھی کیں تو اپنے ہی لیے کیں، پھر جب دوسرے وعدے کا وقت آیا تو ہم نے اپنے دوسرے بندوں کو بھیجدیا تاکہ تمہارے چہروں پر رسوائی پھیردیں اور اسی طرح مسجد میں داخل ہوجائیں جس طرح پہلی مرتبہ حملہ آور گھسے تھے اور جو کچھ پائیں توڑ پھوڑ کر برباد کر ڈالیں،۔ کچھ عجب نہیں کہ تمہارا پروردگار تم پر رحم فرمائے (اگر اب بھی باز آجاؤ) لیکن اگر تم پھر سرکشی و فساد کی طرف لوٹے تو ہماری طرف سے بھی پاداشِ عمل لوٹ آئے گی اور ہم نے منکرین حق کے لیے جہنم کا قیدخانہ تیار کر رکھا ہے،

بے شبہ قرآن اس راستے کی طرف رہنمائی کرتا ہے جو سب سے زیادہ

سیدھا راستہ ہے اور ایمان والوں کو جو نیک عمل میں سرگرم رہتے ہیں بشارت دیتا ہے کہ انھیں بڑا اجر ملنے والا ہے اور اس بات کا بھی اعلان کرتا ہے کہ جو لوگ آخرت کا یقین نہیں رکھتے ہم نے ان کے لئے درد ناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

تلاوت قرآن پاک کے بعد لجنۃ التحضیریہ (تیاری کمیٹی) کی طرف سے ڈاکٹر حمد الکبیسی نے ابتدائی تقریر کی جس میں مؤتمر کی ضرورت اور مقاصد پر روشنی ڈالی گئی تھی، اس کے بعد رئیس جمہوریہ جناب احمد حسن بکر کا پیغام ڈاکٹر احمد عبدالستار جواری نے پڑھ کر سنایا۔ پیغام میں اس اہم اجتماع کا خیر مقدم کیا گیا تھا اور مسئلہ فلسطین کی اہمیت واضح کی گئی، پیغام خاصا جاندار تھا اور اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ صدر جمہوریہ کے ذہن میں عرب اسرائیل جنگ اور مسئلہ فلسطین کی سیاسی اہمیت ہی نہیں بلکہ وہ اس کی مذہبی عظمت کو بھی اچھی طرح سمجھتے ہیں۔

اب رئاستہ دیوان الاوقاف کے رئیس اور کانفرنس کے روح رواں نافع قاسم کھڑے ہوئے اور انھوں نے مؤتمر کی کارروائیوں کو ضابطے، قاعدے میں لانے کے لئے صدر، دو نائبین صدر اور جنرل سکریٹری کے نام برائے انتخاب پیش کیے، جو متفقہ طور پر منظور کئے گئے۔

۱۔ صدر مولانا شیخ عبداللہ غوشہ قاضی القضاۃ مملکت ہاشمیہ اردن

۲۔ نائب صدر اول مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی ہندوستان

۳۔ نائب صدر دوم مولانا شیخ ہادی فیاض نجف اشرف

۴۔ جنرل سکریٹری مولانا شیخ عبداللہ النخلی بغداد

ہندوستان کے نمائندے کو نائب رئیس اول بنانے پر مجھے تعجب سا ہوا، کیونکہ بہت کچھ ہونے کے باوجود ہندوستان اصطلاحی طور پر "مسلم مملکت"

نہیں ہے، اس پر بھی ہمارے ملک کو یہ امتیاز بخشا گیا، اس چیز کو مؤتمر میں شریک ہونے والے تمام ہی نمائندوں نے مسرت آمیز انداز میں محسوس کیا اور مجھے مبارکباد دی____
عہدہ داروں کے انتخاب کے بعد چند کمیٹیاں بنائی گئیں، خاص طور پر مؤتمر میں پیش ہونے والی تجویزیں مرتب کرنے کے لئے ایک کمیٹی کی تشکیل ہوئی۔ اور پہلی نشست کی کارروائی اس مرحلے پر ختم ہوگئی۔ رات کے کھانے کا انتظام ڈاکٹر احمد عبدالستار جوازی وزیر دولت اور رئیس لجنۃ التحضیریہ مؤتمر علماء المسلمین کی طرف سے "اُمّ الطبول کی جامع الشہداء" میں تھا، "جامع الشہداء" بغداد کی تاریخی اور نہایت شاندار مسجد ہے، اس کی وسیع جدید عمارت دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اجتماع کی پہلی نشست سے فارغ ہوکر پروگرام کے مطابق تمام نمائندے "جامع الشہداء" پہونچ گئے اور عشاء کی نماز باجماعت میں شریک ہوئے، مسجد کے ساتھ بڑے بڑے ہال بنے ہوئے ہیں، کھانے کا انتظام یہیں تھا، رات زیادہ ہوگئی تھی ورنہ اس خوبصورت مسجد اور اس کے کتبوں اور تحریروں کا اطمینان سے مطالعہ کیا جاتا، کھانے کے بعد واپسی میں اس کے دروازوں پر سرسری نظر ڈالی اور قیام گاہ لوٹ آئے، پہلے یہ مسجد "جامع ام الطبول" کے نام سے مشہور تھی، جدید تعمیر کے بعد اس کا نام جامع الشہداء ہوگیا۔
جامع الشہداء کا یہ ڈنر ہر لحاظ سے شاندار رہا، محفل کی چہل پہل بڑی ہی دل آویز تھی، دور دور سے آئے ہوئے نمائندے کھلے دل سے باتیں کر رہے تھے، مذاکروں کا رنگ ادبی بھی تھا اور علمی بھی۔ یہ پُر رونق اجتماع کم و بیش دو گھنٹے رہا، شیخ نافع قاسم اور ڈاکٹر عبدالستار مجلس کی نوک پلک درست کرنے میں ہمہ تن مشغول رہے۔
جمعہ ۱۴ر فروری کی صبح کو سامرا جانے کا پروگرام تھا، قرارداد کے مطابق تمام وفود پہلے "قاعۃ النعمان" میں جمع ہوئے اور ۱۰ بجے کے قریب بسیں اس اجڑے ہوئے تاریخی شہر کے نشانات دیکھنے کے روانہ ہوگئیں، سامرا کی قدیم تاریخ کے بہت سے نقوش

ذہن میں تھے اس لیے قدرتی طور پر عباسیوں کے اس دوسرے فنی شاہکار کے کھنڈر دیکھنے کا شوق تھا۔ "برہان" کے تلخیص و ترجمہ کے تحت جولائی ۱۹۳۹ء کیپٹن کرسیول پروفیسر جامعہ فواد اول مصر کا ایک محققانہ مضمون شائع ہوا تھا، مقالے کے مترجم ندوۃ المصنفین کے رفیق مولانا محمد ادریس صاحب میرٹھی تھے جو ان دنوں دار العلوم الاسلامیہ نیوٹاؤن کراچی میں استاذ ہیں، پروگرام میں سامرّاء کا نام دیکھا تو ۳۶ سال قبل کے شائع شدہ مضمون کی یاد تازہ ہوگئی، یہ مضمون "برہان" کے چار نمبروں میں شائع ہوا تھا اور بہت پسند کیا گیا تھا۔ مورخ "یعقوبی" نے سامرا (سُرَّمن رائی) کی تاسیس کے متعلق لکھا ہے "سُرّمن رائی خلفائے بنو ہاشم کا دوسرا فنی شاہکار ہے، یہ آٹھ عباسی خلفاء کا مرکزِ حکومت رہا ہے جن کے نام یہ ہیں: معتصم ابن ہارون الرشید، واثق ہارون بن معتصم، متوکل جعفر بن معتصم، منتصر محمد بن متوکل، مستعین احمد بن محمد بن معتصم، معتز ابو عبد اللہ بن متوکل، مہدی محمد بن واثق، معتمد احمد بن متوکل، سرمن رائی (جس نے دیکھا مسرور و شاداں ہوا) سامرّا (SAMARRA) کا اصل تلفظ یہی ہے اور سامرا اسی کا اختصار ہے، یہ بغداد اور تکریت کے درمیان دجلہ کے مشرقی ساحل پر بغداد سے ۹۰ میل (تقریباً ۱۵۰ کیلومیٹر) ہے اسی شہر میں وہ مشہور سرنگ ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ امام مہدی یہیں سے نکلیں گے، کہتے ہیں اس شہر کو سب سے پہلے سام بن نوح نے آباد کیا تھا اور یہ اسی کی طرف منسوب ہے، فارسی میں اس کا تلفظ سام راہ (سام کا راستہ) ہے، مشہور ہے کہ اس مقام کے متعلق برکت کی روایتیں سن کر سفاح نے بھی یہاں شہر آباد کرنا چاہا تھا اور پھر منصور اور ہارون الرشید نے بھی، بالآخر قرعۂ فال ہارون الرشید کے بیٹے معتصم کے نام نکلا اور اس نے ۲۲۱ھ میں اس کو آباد کیا۔ (معجم البلدان ج ۵ ص ۳۸) پروگرام کے مطابق سب سے پہلے ہمارا قافلہ جامع متوکل باللہ العباسی کے لق و دق میدان میں پہونچا، اسی میدان میں جمعہ کی نماز

کا انتظام کیا گیا تھا، جامع متوکل کا اس وقت کا نقشہ یہ ہے کہ ایک بہت وسیع میدان اونچی اونچی دیواروں سے گھرا ہوا ہے، یہ دیواریں بھی کافی قدیم معلوم ہو رہی تھیں، جمعہ کی نماز دیواروں سے گھرے ہوئے اسی میدان میں ہوئی، وفود موتمر کے علاوہ مقامی آبادی کا بھی ایک طبقہ نماز میں شریک ہوا، نماز جامعہ ازہر کے وکیل العام مولانا شیخ عبدالرحمٰن بلیار نے پڑھائی، شیخ کا خطبہ جمعہ بھی زوردار اور اثر انگیز تھا، سنتوں سے فراغت کے بعد دیر تک ہم سب اس اجڑی ہوئی مسجد کے طول و عرض کو دیکھتے رہے، متوکل باللہ کے دور کی یہ مسجد جس کے زمین اور آسمان کی بات ہو رہی تھی، کبھی اپنی وسعت اور مضبوطی میں بے مثال سمجھی جاتی تھی۔ "سرمن رائی" کی تعمیرات کے ساتھ اس مسجد کی تعمیر کی بھی تفصیل ملتی ہے، عام تاریخوں میں ہے کہ حیرہ کے شروع ہی میں آبادی سے دور اور جاگیروں اور بازاروں سے الگ تھلگ ایک بہت بڑی عالیشان مسجد تعمیر کرائی گئی۔ جعفر متوکل نے یہ مسجد غایت درجہ مضبوط، مستحکم اور وسیع بنائی تھی، اس میں ایک پانی کا فوارہ تھا جس کا پانی کبھی بند نہ ہوتا تھا، وادیِ ابراہیم بن ریاح سے جو سڑک نکلتی تھی اس پر تین نہایت کشادہ اور بڑی بڑی سڑکیں تین جانب سے اس مسجد کی طرف آتی تھی۔ ہر سڑک پر ہر قسم کے تجارتی سامان کی بڑی بڑی فرمیں اور صنعت و حرفت کے کارخانے موجود تھے، ہر ایک سڑک کی چوڑائی کم سے کم سو ہاتھ تھی تاکہ جب خلیفہ اپنے خدم و حشم کے ساتھ مسجد میں آئے تو راستے میں تنگی اور دشواری نہ ہو۔ قلتِ وقت اور بندھے ہوئے پروگراموں کی وجہ سے نہ تو ہم اس قدیم دار السلطنت کے محلوں، بازاروں اور حویلیوں کے پرہیبت کھنڈر دیکھ سکے، نہ اس کی جدید آبادی ہی میں گھوم پھر سکے بلکہ اس کے ٹوٹے اور مٹے ہوئے نقش و نگار اور شکستہ دیواروں کو چشم تصور سے دیکھ کر آگے بڑھ گئے، اور زبانِ حال سے "تِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ط" کے غیر فانی اصول کی معجز نمائیوں کا ورد کرتے رہے۔

جامع متوکل باللہ کی یہ تھوڑی سی تفصیل اس لئے بھی دی گئی کہ اس کی زیارت ہمارے پروگرام کا اہم ترجزو تھی رنیز یہ کہ پڑھنے والوں کے ذہن میں ہزاروں سال پہلے کی اس مسجد کا ہلکا سا اجمالی نقشہ آجائے، مؤتمر کے کارپردازوں نے خوب کیا کہ نمازِ جمعہ کا پروگرام زمانۂ قدیم کے اس لاجواب تاریخی شہر کی جامع مسجد میں رکھا۔ پروگرام میں گنجائش ہوتی تو شہر کے دوسرے بے شمار نشانوں اور کھنڈروں کو بھی دیکھتے اور عبرت حاصل کرتے لیکن واپسی ہمروزہ تھی اس لیے مسجد سے سیدھے حکومت کے قائم کئے ہوئے دواسازی کے مرکز "الشرکتہ العامتہ الصناعات الادویہ" کی سیر کے لیے روانہ ہو گئے گویا قدیم کھنڈروں کی دنیا سے ایک جدید اور متمدن دنیا میں آگئے، ہمیں بتایا گیا کہ دواسازی کا یہ کارخانہ نہ صرف عراق بلکہ پوری مشرق وسطیٰ میں سب سے بڑا کارخانہ ہے، قاعدے میں اس عظیم الشان کارخانے کو دیکھنے کے لئے کئی گھنٹوں کی ضرورت تھی مگر ہم اس کا سرسری ہی معائنہ کر سکے۔ ایک دوا مرحلہ بہ مرحلہ کس طرح تیار ہوتی ہے، بے شمار عرقوں، سفوفوں، گولیوں اور کیپسولوں کی تیاری کے لیے کتنی مشینوں کی ضرورت ہوتی ہے، رواروی میں ہم نے اس کا جائزہ لیا، بعض باتیں دریافت بھی کیں، یہ دیکھ کر بہرحال مسرت ہوئی کہ اب ہماری مسلم مملکتیں بھی سائنس اور ٹیکنالوجی کی کارفرمائیوں سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ میری کمزوری اور اضمحلال کو دیکھ کر ایک شیعی نوجوان محمد علی نے خوب سہارا دیا، ان کے سہارے سے کارخانے کی کئی منزلیں دیکھ سکا، خیال کرتا رہا ضعیفی بھی کیا نعمت ہے کہ نوجوانوں کو بوڑھوں کی خدمت پر آمادہ کرتی ہے، تیزگامی کے باوجود وقت اندازے سے زیادہ لگ گیا اور اس وسیع وعریض کارخانے کے بہت سے حصے دیکھنے سے رہ گئے، دوپہر کے کھانے کا انتظام محافظ بغداد کی طرف سے سامرّا ہی میں تھا، کارخانے کے معائنے کو ادھورا چھوڑ کر تمام مہمان لبسوں سے طعام گاہ تک پہونچا دیے گئے، دعوت کا انتظام ایک وسیع ہال میں کیا گیا تھا، کھانے سے پہلے نشستوں

کا نظم بھی اعلیٰ درجے کا تھا، نفیس قسم کے صوفا سیٹ بچھا دیے گئے تھے اور مشروباتِ طیبہ کا اہتمام بھی خوب تھا، لنچ اور اس کے لوازمات سے چار بجے کے قریب فراغت ہوئی اور فوراً ہی بغداد کے لیے روانہ ہو گئے، بسیں آرام دہ اور تیز رفتار تھیں، ۵½ بجے سے قبل ہی بغداد پہونچ گئے۔

شنبہ کی صبح کا یہ پروگرام بنایا گیا کہ کانفرنس کے اجتماع سے قبل امام ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ کی مسجد اور مزار پر ہو آئیں، اور کاظمین کی زیارت سے بھی فارغ ہو جائیں، قاضی ابویوسف کی مسجد اور مزار کاظمیہ کے قریب بلکہ ایک دوسرے سے لگے ہوئے ہیں، ہم لوگ پہلے قاضی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مسجد کے دفتر میں پہونچے، منتظم صاحب نے ہمارا پرتپاک خیر مقدم کیا اور دیر تک باتیں کرتے رہے، متعدد اہم کتابیں بھی ہدیے میں دیں، وقت کی تنگی کا عذر کر کے ان سے اجازت چاہی اور مسجد و مزار کی زیارت کرانے کے لیے رہبر ساتھ لے لیا، ان دنوں مسجد اور اس سے ملحقہ عمارتوں کی توسیع و تجدید ہو رہی تھی، ہم نے مسجد کے ایک گوشے میں تحیۃ المسجد کی دو رکعتیں پڑھیں اور مزار پر حاضر ہو گئے۔ بنگلہ دیش کا ڈیلی گیشن بھی ساتھ تھا، مرقدِ مبارک کے پائینتی دیر تک فاتحہ پڑھتے رہے، عجب طرح کا سکون محسوس ہوا، پوری فضا نور سے بھری ہوئی معلوم ہوتی تھی، ان لمحات میں قدرتی طور پر امامِ والامقام کے عظمت کے نقوش قلب پر مرتسم ہو گئے اور امام اعظم کے سایۂ عاطفت میں رہ کر انھوں نے امتِ مرحومہ کی جو لازوال خدمت کی ہے اس کی پرچھائیاں آنکھوں کے سامنے آنے لگیں، دیگر بے شمار کمالات کے علاوہ حضرت قاضی صاحب کی یہ خصوصیت بھی غیر معمولی ہے کہ آئمۂ جرح و تعدیل اور اساطینِ حدیث نے ان کو حفاظِ حدیث میں شمار کیا ہے، امام ابی حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے سب سے بڑے شاگرد اور فقہ حنفی کے اس مینارۂ نور کو محدثینِ کرام اس مرتبۂ عظمیٰ سے نوازدیں، یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے، اس ماحول میں وہ وصیت نامہ بھی یاد آ گیا جو خلیفہ ہارون الرشید کی حکومت

کے چیف جسٹس (قاضی القضاۃ) نے خلیفہ کی فرمائش پر تحریر فرمایا تھا، اس وصیت نامے اور تاریخی مکتوب کو پڑھ کر امام عالی مرتبت کی قدر و منزلت اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ ان کی وصیت و نصیحت کا انداز کس قدر بے لوث اور جرأت مندانہ ہے، موقع ملتا تو یہاں اس مکتوب اور وصیت نامے کے جستہ جستہ حصے تحریر کیے جاتے، مگر مجھے تو آگے بڑھنا ہے۔ امام دار الہجرۃ مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ کا وہ مکتوب بھی تاریخ کے سینے پر ثبت ہے جو امام عالی مقام نے ہارون الرشید کے نام تحریر فرمایا تھا اور جس میں عقیدہ و عمل کی تمام ہی بنیادیں اپنی زبردست اثر انگیزیوں کے ساتھ موجود ہیں، لیکن یہ ظاہر ہے کہ امام دار الہجرۃ حکومت کے رکن نہیں تھے، ان کے ارشادات اور نصائح کا رنگ ان کی شان کے مطابق ہونا ہی چاہیئے تھا، قاضی صاحب حکومت کے رکنِ رکین تھے اور حکومت بھی ایک مطلق العنان بادشاہ کی تھی لیکن وصیت نامے کے ایک ایک فقرے میں علم و تقویٰ احقاقِ حق اور جرأت و بے خوفی کی شان جس طرح جھلک رہی ہے اس کا حقیقی اندازہ پورا وصیت نامہ پڑھ کر ہی ہو سکتا ہے، مجھے اس تاریخی وصیت نامے کے بہت سے حصے یاد ہیں یا ان کا خلاصہ ذہن میں ہے مگر یہ موقع امام صاحب کے سوانح حیات تحریر کرنے کا نہیں ہے، اس وقت جہاں اور بہت سی باتیں یاد آئیں امام صاحب کی عدیم النظیر اور مایۂ ناز تالیف "کتاب الخراج" کی خصوصیات خاص طور پر زیادہ یاد آئیں۔ اور حضرت الاستاذ قدس سرہٗ کا یہ ارشاد بھی دماغ میں ابھرا کہ امالیِ ابو یوسف کی چالیس جلدیں جرمنی میں محفوظ ہیں۔

کانفرنس کا وقت قریب آرہا تھا اور ہمیں بغداد کے مشہور ترین مقام کاظمین کی زیارت سے بھی ابھی فارغ ہونا تھا۔ کاظمین جس کا دوسرا نام کاظمیہ ہے اپنے رنگ کی نہایت نفیس عمارت ہے، عمارت کی برجیاں، چوگوشے، گنبد، سب ہی شاندار ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سونے کا محل کھڑا ہے، یہ امام موسیٰ کاظم اور ان نامور پوتے

محمد تقی الجواد کا مدفن و مرقد ہے، ان دونوں حضرات کا شمار اثنا عشری اماموں میں ہوتا ہے، یہ مقام خاص طور پر شیعہ حضرات کا مرکزِ عقیدت ہے، اس کے وسیع دالانوں میں ہر وقت سیکڑوں زائرین موجود رہتے ہیں اور سیکڑوں آتے جاتے رہتے ہیں، منتیں مانگتے ہیں اور اپنے اپنے طریقے سے عبادت کرتے اور عقیدت وارادت کا اظہار کرتے ہیں، ہم نے ان مزارات پر فاتحہ پڑھی اور چند منٹ تعمیر کی خوش نمائی، مضبوطی اور صنعت کاری کا جائزہ لیتے رہے، کلسوں، برجوں، محرابوں اور گنبد کا بڑا حصہ زرِ خالص سے مطلّیٰ اور مرصّع ہے، آبِ طلا سے نہیں، سونے کی چادروں اور چوکوں سے، عمارت کا پورا ماحول اور دروبست آنکھوں کو خوب خوب دعوتِ نظارہ دیتا ہے، وقت بالکل نہیں رہا تھا ورنہ یہاں کے منتظمین سے ملاقات کرتے اور ضروری تاریخی معلومات حاصل کرتے۔

۹½ بجے کے قریب جلسہ گاہ (قاعۃ النعمان) واپس آگئے، جلسہ کی کارروائی شروع ہی ہوئی تھی کہ ہم بھی پہونچ گئے، آج کی صبح وشام کی دونوں نشستوں میں مقالے پڑھے گئے، مقالے پڑھنے والے زیادہ تھے اور وقت ان کی تعداد کے لحاظ سے کم تھا، اس لیے صدر اجلاس ہر صاحبِ مقالہ سے اختصار وتخفیف کی درخواست کرتے رہے، لیکن مقالہ نگاروں کا مزاج ہر جگہ کا یکساں ہی ہوتا ہے کہ پڑھنے والا پڑھتا ہی رہتا ہے اور سننے والے گھٹتے رہتے ہیں، اس اجتماع میں تو عرب ہی عرب تھے جن کا زورِ خطابت، قوتِ بیان اور شعلہ مقالی ضرب المثل ہے، پھر بھی رئیسِ مجلس نے غیر معمولی انتظامی صلاحیت کا ثبوت دیا اور پڑھنے والوں نے بھی ان کے منصب کا پورا پورا لحاظ رکھا۔ اجلاس کے بعد شام کو شہر کے بازاروں میں گھومنے کا پروگرام تھا۔ بازاروں کی سیر وتفریح سے فارغ ہوکر متعدد اہم مساجد بھی دیکھیں جیسے جامع الخلفاء، جامع عائشہ خاتون، جامع اربعۃ عشر، یہ تمام مسجدیں عظیم الشان اور لائق دید ہیں، جن میں بار بار نماز پڑھنے کو جی چاہتا تھا، معلوم ہوا کہ چند کیلومیٹر کے اس ٹکڑے میں سیکڑوں مسجدیں ہیں جو سب کی سب وزارۃ الاوقاف کی نگرانی میں ہیں اور

وزارتِ اوقاف ہی ان کے مصارف برداشت کرتی ہے، عام مسجدوں کے اماموں اور خطیبوں کی تنخواہیں بھی ہمارے یہاں کے اعتبار سے بہت زیادہ ہیں بلکہ یہاں اور وہاں میں کوئی نسبت ہی نہیں ہے، لیکن مشہور اور بڑی مسجدوں کے ائمہ اور خطباء عام طور پر بڑے علماء ہوتے ہیں جو سوسائٹی میں اعلیٰ مقام رکھتے ہیں اور جن کو ہزاروں روپے ماہانہ منصب ملتا ہے، ان حضرات سے خوب بے تکلفانہ باتیں ہوئیں، مسجد ارلعبتہ عشر کے امام صاحب جو ان دنوں مسجد عائشہ خاتون کے خطیب ہیں، انڈونیشیا میں بھی ہمارے ساتھ تھے۔ مؤتمر کے اجتماعات سے فراغت کے بعد صرف بغداد میں کم سے کم ایک ہفتہ قیام کی ضرورت تھی، اور مزید قیام کے لیے شیخ نافع قاسم صاحب کا اصرار بھی تھا مگر مجھے "مسلم مجلس مشاورت" اور "مسلم پرسنل لا" کے اجتماعات میں شرکت کے لیے ۱۲ فروری کو بنگلور پہونچنا تھا اس وجہ سے قیام میں توسیع کا کوئی سوال ہی نہیں تھا اور بغداد کی تفصیلی سیر کے علاوہ موصل، بصرہ وغیرہ کے پروگرام بھی ملتوی کرنے پڑے، اتوار کا دن خاص طور پر مقالات کے ہجوم کا دن تھا، پہلی نشست ٹھیک ۹ بجے شروع ہوئی جو مسلسل پانچ گھنٹے تک جاری رہی، اس نشست میں مصر، شام، اردن، کویت، الجیریا، لیبیا، مراکش، ٹیونس، ابوظبی، افغانستان، ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش، بلغاریہ، یوگوسلاویہ، روس اور افریقہ کی متعدد ریاستوں کے نمائندوں کو اپنے مقالے پڑھنے تھے، اکثر مقالات مسئلہ فلسطین، بیت المقدس کی غیر معمولی اہمیت اور صیہونیت کے جارحانہ عزائم سے متعلق تھے، بعض مقالات نہایت پرجوش اور ولولہ انگیز تھے، مقالات کا ایک حصہ تعلیماتِ اسلامی کی خصوصیات اور دیگر الہامی مذاہب کے بارے میں اسلام کے موقف کی وضاحت پر مشتمل تھا، اور اسلام کے اس موقف کو دل پذیر اور دل نشین قالب میں پیش کیا گیا تھا کچھ ایسے مقالات بھی تھے جن کو سن کر محسوس ہو رہا تھا کہ از راہِ ثواب صرف آیاتِ قرآنی کی تلاوت کی جا رہی ہے، اس طرح کی چیزوں کے بابرکت ہونے میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں لیکن ہر بات

کا ایک موقع محل ہوتا ہے، اس اجتماع میں یہ طریقہ کچھ زیادہ موزوں نہیں معلوم ہو رہا تھا۔"ادارۂ دینیہ تاشقند و قزاقستان" کے صدر مولانا مفتی ضیاء الدین بابا خانوف نے بھی ایک سلجھا ہوا مختصر مقالہ پڑھا۔ آج کے اجتماع کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ جمہوریۂ عراق کے نائب صدر جو بالکل نوجوان ہیں، اجلاس میں شریک ہوئے اور نہایت مؤثر اور جان دار تقریر کی، ان کا انداز خطابت بھی دلچسپ اور دل پسند تھا۔ ان کی تقریر پہ بار بار چیئرز دے کر مجمع نے پسندیدگی کا اظہار کیا، تقریر کا خلاصہ اور لبِّ لباب یہ تھا کہ "ہم جان کی بازی لگا کر بیت المقدس کی حفاظت کریں گے صیہونیت کے خلاف ہمارا جہاد جاری رہے گا، اور ہم اسرائیل کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیں گے، اور یہ کہ اتحادِ عرب اور اتحادِ اسلامی ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں" نائب صدر نے تقریر ہی نہیں کی بلکہ بہت دیر تک ارکانِ موتمر کے ساتھ بیٹھے رہے اور اجلاس کی کارروائی سے دل چسپی لی، ۲ بجے تک مقالات کی خواندگی کا سلسلہ جاری رہا۔ آج بغداد کے میئر کی طرف سے دوپہر کے کھانے کا انتظام "قصر السلام" میں تھا، "قصر السلام" شہر کی مشہور ترین، شاندار عمارت ہے۔ بڑی بڑی دعوتیں یہیں ہوتی ہیں، وفودِ موتمر کے علاوہ دوسرے بہت سے حضرات بھی کھانے پر مدعو تھے، خوب رونق رہی اور دیر تک آزادانہ تبادلۂ خیالات ہوتا رہا، لنچ سے ۴ بجے کے قریب فراغت ہوئی اور مہمان اپنی اپنی قیام گاہوں پر واپس ہو گئے، ظہر کی نماز سے "قصر السلام" ہی میں فارغ ہو گئے تھے تھکن کافی ہو گئی تھی، دو گھنٹے کے قریب آرام کیا اور شام کی سیر کے لیے تازہ دم ہو گئے، شام کو اجتماع نہیں تھا اور یہ وقت تفریح کے لیے خالی تھا، ہم نے اس فرصت سے فائدہ اٹھا کر "سُلمان پاک" کا پروگرام بنا لیا، "سلمان پاک" شہر سے ۳۰ کیلو میٹر کے قریب ہے، ہم لوگ ہوٹل سے ایسے وقت چلے کہ مغرب کی نماز وہاں پڑھ لیں چنانچہ ٹھیک مغرب کے وقت پہونچ گئے اور جماعت سے نماز ادا کی، یہاں پہونچ کر دل اور دماغ کی کچھ اور ہی کیفیت ہو گئی، بغداد اور اس کی چہل پہل سے اب ہمارا کوئی واسطہ نہیں تھا۔ اس خطۂ پاک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کے دو مشہور اور بڑے درجے کے صحابی آرام فرما ہیں، (۱) حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ اور حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ، دونوں مزار مسجد کی بغل میں ہیں، ہم نے ادب واحترام کے جذبات سے سرشار ہو کر سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے ان برگزیدہ ترین اصحاب کے مزارات پر حاضری دی اور کچھ دیر ان کے قدموں میں بیٹھے رہے، مناقب و فضائل صحابہ کا باب نہایت وسیع ہے، حضرات صحابہ میں ہر ایک کی اپنی خصوصیات ہیں، اس وقت قدرتی طور پر رسول اللہؐ کے ان دو مقدس ساتھیوں کے خاص خاص فضائل و کمالات کا نقشہ سامنے آگیا۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے اپنے اسلام لانے کا واقعہ جس اثر انگیز پیرایہ میں بیان کیا ہے، دل کا تقاضا ہے کہ اس کے ضروری ٹکڑے یہاں تحریر کیے جائیں، لیکن پھر یہ سفر کی روداد نہیں رہے گی کچھ اور چیز ہو جائے گی، اس لیے قلم پر جبر کر کے آگے بڑھتا ہوں۔

غزوات کی تاریخ میں غزوۂ احزاب یا غزوۂ خندق اپنی خاص نوعیت کے لحاظ سے حد درجہ اہم غزوہ خیال کیا جاتا ہے، یہود نے قبائل قریش کے ساتھ سازباز کر کے ان کو تمام عرب کی متحدہ جنگ بنا دیا تھا اور چوبیس ہزار انسانوں کے اس لشکر گراں نے مدینہ طیبہ پر حملہ کرنے کا خوفناک منصوبہ بنالیا تھا، آنحضرتؐ کو یہ خبریں پہنچیں تو آپؐ نے اصحاب کرام سے مشورہ کیا، اس پیچیدہ اور نازک مرحلے پر حضرت سلمان فارسیؓ نے جو ایرانی ہونے کی وجہ سے خندقوں کے طریق جنگ سے اچھی طرح واقف تھے، یہ رائے دی کہ موجودہ حالت میں کھلے میدان میں مقابلہ کرنا مصلحت نہیں ہے، بہتر یہ ہوگا کہ ایک محفوظ مقام پر لشکر جمع کیا جائے اور اس کے گرد خندق کھود دی جائے۔ حضورؐ نے حضرت سلمان کی اس رائے کو پسند کیا اور خندق کھودنے کے آلات مہیا کیے گئے، مدینہ طیبہ کے تین طرف نخلستان اور مکانات کا سلسلہ تھا جو عملاً شہر پناہ کا کام دیتا تھا، صرف شام کی جانب کا رُخ کھلا ہوا تھا۔ آنحضرتؐ نے تین ہزار ساتھیوں کے ساتھ شہر سے باہر نکل کر اس رُخ پر خندق کھدوانے کی تیاریاں شروع کیں اور اپنے

دستِ مبارک سے اس کی داغ بیل ڈال کر دس دس آدمیوں پر دس دس گز زمین تقسیم فرمائی، تین ہزار فاقہ مست جسموں اور بابرکت ہاتھوں نے بیس روز میں یہ کام پورا کیا، شدید سردی کی راتیں تھیں، تین تین روز کا فاقہ تھا، فداکارانِ اسلام اپنی پیٹھوں پر مٹی لاد لاد کر پھینک رہے تھے اور جوشِ ایمان اور ولولۂ محبت میں کہتے جاتے تھے۔

نحن الذی بایعوا محمدًا　　　علی الجہاد مابقینا ابدًا

خود سردارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم بہ نفسِ نفیس اس کام میں شریک ہیں، جسمِ مبارک گرد سے اٹا ہوا ہے اور اٹھا اٹھا کر مٹی پھینک رہے ہیں، زبان پر یہ رجز ہے:

واللہ لولا اللہ ما اھتدینا　　　ولا تصدقنا ولا صلینا

فانزلن سکینۃ علینا　　　وثبت الاقدام ان لاقینا

پتھر کھودتے کھودتے ایک سخت چٹان آگئی جس پر کسی کی ضرب کام نہیں دیتی تھی، جاں نثارانِ اسلام پریشان تھے کہ حضورؐ قریب تشریف لائے، تین دن کا فاقہ تھا، شکمِ مبارک پر پتھر بندھا ہوا تھا، اسی حالت میں کدال ماری تو چٹان ریزہ ریزہ ہوگئی حضرتِ سلمان کے اس برمحل اور قیمتی مشورے سے اثر پذیر ہوکر مہاجرین و انصار دونوں بے تابانہ اور والہانہ انداز میں پکار اٹھے، "سلمان منا" مہاجرین کہتے تھے۔ "سلمان ہماری برادری اور خاندان میں شامل ہیں" انصار کہتے تھے "سلمان ہمارے ہیں اور ہم میں داخل ہیں" آنحضرتؐ نے انصار و مہاجرین کے ان ولولہ انگیز نعروں کو سن کر فرمایا "سلمان منا اہل البیت" "سلمان ہمارے خاندان اور اہلِ بیت میں شامل ہیں" یہ نعرے کس کے لیے لگ رہے تھے۔ یہ عزت و احترام کے بام عرش پر کس کو پہونچایا جارہا تھا۔ ایک ایسے شخص کو جس نے ایمان اور حق کی تلاش و جستجو کے لیے آزادی کی زندگی کی جگہ غلامی کی زندگی پسند کی تھی اور اسی حق کے لیے جہاد اور آزادی کی زندگی میں آیا تھا۔ حق کی جستجو میں تڑپنے والے اس پاک باز سے سوال کیا گیا۔ تمہارا نسب کیا ہے اور تمہارے

والد کا کیا نام ہے۔" اس شیدائے حق اور جاں نثارِ نبی نے جواب دیا "سلمان ابن اسلام" (سلمان فرزند اسلام) حدیث شریف میں ہے حضورؐ نے ارشاد فرمایا: "جنت تین شخصوں کی خاص طور پر مشتاق ہے علی، عمار، سلمان۔" سلمان کے متعلق محدثین اس کی وجہ بیان کرتے ہیں: "لان سلمان وقع فی الغربۃ مدۃ کثیرۃ من الزمن وابتلی بالعبودیۃ والمحن" یعنی سلمان ایک طویل مدت تک غربت اور بےکسی میں رہے اور غلامی کی آزمائش اور طرح طرح کے مصائب و آلام میں مبتلا ہوئے اس کے باوجود ان کے پائے صبر و استقلال میں لغزش نہیں آئی۔

دیگر فضائل کے علاوہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کے لیے یہ شرف ہی کیا کم ہے کہ بڑے بڑے اصحابِ کرام اور اَجلّہ خلفاء کی موجودگی میں بھی یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رازدارِ خاص تھے، تمام صحابہ ان کو "صاحب سرِّ رسول اللہ" کے لقب سے یاد کرتے تھے، یہ ہمرازی اور رازداری کیا تھی اور یہ لقب ان کو کیوں ملا تھا، عام روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ منافقوں، ان کے نسب ناموں اور ان کے مکر و خداع کے پیچ وخم سے حذیفہ سب سے زیادہ باخبر تھے، اس خاص کام میں حضورؐ نے انہی کو اپنا ہمراز بنا رکھا تھا اور ان کو منافقین کے رازہائے سربستہ سے آگاہ فرمایا کرتے تھے، ان کی اسی خصوصیت کا اثر تھا کہ فاروق اعظم نے اپنے عہد خلافت میں ان سے دریافت کیا "أفی عمالی احدٌ من المنافقین؟ قال نعم واحد، قال من هو، قال لا اذکرہ، قال حذیفہ فعزلہ، کانما دل علیہ" یعنی فاروق اعظم نے حذیفہ سے دریافت کیا "میرے عاملوں میں کوئی منافق تو نہیں ہے؟" حذیفہ نے جواب دیا "ہاں ایک ہے" پوچھا وہ کون ہے، حذیفہ نے کہا "اس وقت نہیں بتاتا" حذیفہ کا بیان ہے کہ عمر فاروق نے بہرحال اس شخص کو معزول کر دیا، خلیفۂ ثانی ایسے جنازے میں بھی شریک نہیں ہوتے تھے جس میں حذیفہ نہ ہوں، یہی خلش رہتی تھی کہ

حذیفہ کی عدم شرکت کے کوئی معنی ہیں، اس لئے کبھی کبھی مجمع سے برملا دریافت کرتے تھے "حذیفہ بھی موجود ہیں یا نہیں؟" حذیفہ نہ ہوتے تو اس جنازے کی نماز میں شریک نہ ہوتے تھے، ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے ایک خاص عالم کیف میں ساتھیوں سے فرمایا کسی چیز کی تمنا کرو، ساتھیوں نے ایسے گھر کی تمنا کی جو سونے چاندی اور جواہرات سے بھرا ہوا ہو اور وہ اس کو اللہ کے راستہ میں خرچ کریں، عمر فاروقؓ نے والہانہ انداز میں فرمایا لیکن ابوعبیدہ، معاذ بن جبل اور حذیفہ بن الیمان جیسے انسانوں کی آرزو اور تمنا کرتا ہوں کہ ان کو خدمت خلق کے لئے ذمہ دارانہ عہدوں پر مقرر کروں اور وہ احکام خداوندی کی اطاعت بجالائیں۔ اس کیف آور گفتگو کے بعد خلیفۂ امت نے حضرت ابوعبیدہ کے پاس کچھ مال بھیجا اور کہا دیکھو یہ اس مال کا کیا کرتے ہیں، ابوعبیدہ نے وہ مال ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیا، اسی طرح حضرت حذیفہ کے پاس ایک رقم بھیجی اور کہا دیکھو وہ اس رقم کو کس مصرف میں لاتے ہیں، حذیفہ نے ساری رقم حاجت مندوں کو دے دی، اب حضرت عمرؓ کو یہ کہنے کا موقع ملا "سوچو میں نے تم سے کیا کہا تھا" نہاوند کے مشہور و معروف معرکے میں حضرت نعمان بن مقرن کی شہادت کے بعد امیر الجیش حذیفہ ہی بنائے گئے اور ہمدان، رے اور دینور انہی کے ہاتھ پر فتح ہوئے، فاروق اعظم نے اپنے زمانۂ خلافت میں حضورؐ کے اسی ہمراز خادم کو مدائن کا عامل بنا کر بھیجا تھا، حذیفہ مدائن پہونچے تو شہر کے عوام نے ان کا پرجوش استقبال کیا اور خلیفہ کی ہدایت کے مطابق ان سے دریافت کیا "جس چیز کی ضرورت ہو بتائیے"۔ مدائن کے اس افسر اعلیٰ نے کہا "مجھے صرف معمولی کھانے اور اپنے گدھے (سواری) کے لئے گھاس کی ضرورت ہے، جب تک تمہاری خدمت کے لئے یہاں ہوں میرا صرف یہی ہے، ایک زمانے کے بعد امیر المومنین نے ان کو بلا بھیجا، حذیفہ مدینہ کے لئے روانہ ہوئے اور امیر المومنین کو ان کی آمد کی خبر ہوئی تو راستے میں کہیں چھپ کر بیٹھ گئے، "عامل مدائن" کو جب

اسی حالت میں دیکھا جس حالت میں عامل کرتے وقت اپنے سے جدا کیا تھا تو بے اختیارانہ ان کو لپٹ گئے اور کہا "انت اخی وانا اخوک"

ذکر سلمان پاک اور ان دو بلند پایہ اصحاب رسول اللہ کے مزارات پر حاضری کا چل رہا تھا، اسی خطے میں بعض تابعین اور اہل بیت کرام کے مزارات بھی ہیں، ان مزارات پر بھی فاتحہ پڑھی اور تھوڑی مسجد کے امام صاحب کے پاس بیٹھے، امام صاحب سنجیدہ اور باوقار عالم دین ہیں، ان سے باتیں کرنے کو جی چاہتا تھا لیکن اندھیرا ہوگیا تھا اور ہمارے گائڈ اور لائق انجینئر شیخ محمد شامل اور ہندوستانی سفارت خانے کے ٹرانسلیٹر مولوی عبدالودود صاحب اعظمی کا اصرار تھا کہ جلد آگے بڑھیں۔ ہمارے آج کے پروگرام میں "طاق کسریٰ" کا معائنہ بھی شامل تھا، شیخ محمد شامل نے بتایا کہ "طاق" یہیں سامنے ہے، اگرچہ رات ہوگئی تھی لیکن اس غیر معمولی تاریخی عمارت اور اس کے کھنڈروں کا دیکھنا بھی ضروری تھا، ہم لوگ مسجد کے احاطے سے باہر آکر موٹر پر سوار ہی ہوئے تھے کہ "طاق کسریٰ" کے نیچے پہونچ گئے، اس پر ہیبت اور عظیم الشان اجڑی ہوئی محراب کا نظارہ جس سمت سے زیادہ صاف اور کھلا ہوا ہو سکتا تھا اندھیرے کی وجہ سے ہم وہاں نہیں گئے اور جاکر بھی کیا کرتے کہ مقصد نظارہ نہیں عبرت پذیری تھا اور اس کے لئے نہیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں تھی، میرے سامنے اس وقت جغرافیہ کی کوئی کتاب نہیں ہے اور سچی بات یہ ہے کہ کسی کتاب کے مطالعہ کی فرصت بھی نہیں ہے ورنہ فتوح البلدان بلاذری کا اور معجم البلدان یاقوت حموی کا مطالعہ کرتا اور اس محل کے کھنڈروں کے در و بست کی نشان دہی کرتا، یہ بظاہر اسی قصر ابیض کی محراب کا ایک ٹکڑا ہے جس کے مفتوح ہونے کی بشارت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی تھی، ہم اس ٹوٹی ہوئی محراب کی بلندی اور قدامت کو دیکھ کر اوراقِ ماضی میں گم ہوگئے اور مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کا نقشہ سامنے آگیا — ابھی لوٹ ہی رہے تھے کہ

شیخ محمد شامل نے بتایا۔ یہاں سے چالیس، پچاس کیلو میٹر کی مسافت پر دریائے دجلہ کا وہ حصہ بھی ہے جس میں زبردست طغیانی کے باوجود حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے اپنے گھوڑا سوار لشکر کو دریا پار کرنے کا حکم دیا تھا۔ شیخ شامل کا یہ کہنا تھا کہ میرے سامنے تاریخ عالم کے اس لاثانی واقعہ کی پوری تفصیل آگئی اور کچھ دیر تک ہم سب اس واقعہ کا تذکرہ کرتے رہے، رات کا وقت نہ ہوتا اور پروگرام کی بندش نہ ہوتی تو دجلہ کے اس مقدس کنارے کو ضرور دیکھنے جاتے لیکن ہمیں تو ابھی بغداد واپس ہونا تھا اور صبح کے دوسرے طے شدہ پروگرام تھے، اب جب کہ ہمارے گائڈ نے یہ واقعہ یاد ہی دلادیا ہے تو آپ بھی اس کا ضروری خلاصہ سنتے جائیں۔ حضرت سعد بن ابی وقاص عراق فتح کرکے قادسیہ کے زبردست معرکے سے فارغ ہوچکے تو فارس کے دارالحکومت مدائن کا قصد کیا، دجلہ کی مشرقی جانب میں مدائن واقع تھا جس کو مدائن قصویٰ بھی کہتے تھے اور غربی جانب میں بھرسیر تھا جس کو مدائنِ دنیا کہتے تھے۔ قصویٰ کے معنی بعید اور دنیا کے معنی قریب کے ہیں، مسلمان دریائے دجلہ کی غربی جانب سے آرہے تھے اس لیے پہلے ان کے راستے میں بھرسیر آتا تھا اور اسی وجہ سے اس کو مدائن دنیا کا لقب دیا۔ مدائن دوسرے کنارے پر تھا اس لیے اس کو مدائن قصویٰ کا نام دیا گیا۔ حضرت سعد دجلہ کی جانبِ غرب کو فتح کرتے ہوئے بھرسیر تک پہونچ گئے اور دریا کی غربی جانب میں سرزمین عرب تک جتنا فارس کا ملک تھا مسلمانوں کے قبضے اور اطاعت میں آگیا تھا، صرف خاص بھرسیر باقی رہ گیا تھا جس کا محاصرہ دو مہینے تک جاری رہا، محصورین نے پریشان ہوکر حضرت سعد کی خدمت میں پیغام صلح بھیجا، آخر کار بھرسیر کا گورنر شہر کے باشندوں اور لشکر کو لے کر مدائن چلا گیا۔ اب مدائن کی مہم سامنے تھی، اہل فارس نے دجلہ کے ساحل سے تمام کشتیاں ہٹادیں اور دریا پار کرنے کی کوئی صورت نہ رہی، بارش کی کثرت سے عام طور پر دریاؤں میں طغیانی زیادہ تھی، حضرت سعدؓ اسی تردد میں تھے کہ دجلہ کی طغیانی اور بڑھ گئی

اور اس کے پھیلاؤ کی انتہا نہ رہی، مسلمان یہ حالت دیکھ کر حیران و پریشان تھے کہ حضرت سعدؓ کو خواب میں دکھایا گیا "مسلمان دجلہ میں داخل ہو گئے ہیں"، خواب نے آپ کو ادھر متوجہ کر دیا اور آپ نے لشکر کے سامنے یہ تقریر کی، دشمن نے دریا کی طغیانی میں پناہ لے رکھی ہے، تم اس پر حملہ نہیں کر سکتے، وہ جب چاہے حملہ کر سکتا ہے، میری رائے یہ ہے اس سے پہلے کہ دنیا تم پر غالب آئے اور اس میں ملوث ہونے سے تمہارے حالات تبدیل ہو جائیں اور صدق و اخلاص کی یہ شان باقی نہ رہے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے کچھ کر جاؤ، میں نے تو فیصلہ کر لیا ہے کہ گھوڑوں کو دریا میں ڈال دوں اور اسی حالت میں دریا کو پار کروں، آپ کا یہ تمام کا تمام لشکر سواروں کا تھا اس میں پیادے نہیں تھے، سب نے یک زبان ہو کر جواب دیا کہ ہم دل و جان سے حاضر ہیں اور آپ کے حکم کے تابع ہیں، اللہ تعالیٰ آپ کے ارادے میں برکت عطا فرمائے، آپ نے حکم دیا کہ پہلے کچھ سوار آگے بڑھ کر پرلے کنارے پر قبضہ کر لیں، عاصم بن عمرو اور ذوالباس چھ سو سواروں کو لے کر دریا میں کود گئے اور معمولی مزاحمت کے بعد کنارے پر قبضہ ہو گیا، اس کے بعد حضرت سعدؓ نے حکم دیا کہ پورا لشکر دریا میں داخل ہو جائے اور یہ کلمات وردِ زبان رکھے "نستعین باللہ ونتوکل علیہ، حسبنا اللہ ونعم الوکیل، واللہ لینصرن اللہ ولیہ ولیظہرن دینہ ولیہزمن عدوہ ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم" دریا عبور کرتے وقت لشکر کی ترتیب اس طرح رکھی گئی تھی کہ دو دو شخص باہم ملے ہوئے اور باتیں کرتے ہوئے جائیں۔ حضرت سعدؓ کے رفیق حضرت سلمان فارسیؓ تھے، حضرت سعدؓ بار بار ان کلمات کو دہرا رہے تھے، حضرت سلمانؓ نے فرمایا اسلامی لشکر جس طرح داخل ہوا ہے اسی طرح پار ہو گا طبری اور ابن الاثیر کے بیان کے مطابق ساٹھ ہزار شہسواروں کی یہ فوج تیز و تند دریا میں پھیلی ہوئی تھی اور ساتھی ایک دوسرے سے اس طرح باتیں کرتے جاتے

تھے گویا باغ کی روِشوں پر چہل قدمی کر رہے ہیں، تاریخ گواہ ہے کہ ان لشکریوں میں نہ کوئی شخص غرق ہوا، نہ کسی کی کوئی چیز ضائع ہوئی، صرف ایک شخص جس کا نام عرقدہ تھا گھوڑے سے پانی میں گرے، ان کے ساتھی قعقاع نے انھیں فوراً نکال لیا، دریا کو ایسی طغیانی کی حالت میں ہزاروں سواروں کا اس طرح اطمینان و سکون سے باتیں کرتے ہوئے پار کر لینا ایک عجیب و غریب بات تھی، گھوڑے اگرچہ دریا میں تیر سکتے ہیں مگر اتنے گہرے اور وسیع و عریض دریا کو جس میں عام حالات میں بھی جہاز چلتے ہوں، جوش و طغیانی کی حالت میں پار کرنا گھوڑوں کی طاقت سے باہر اور عام عادت کے خلاف تھا، اسی وجہ سے اہل مدائن نے اس حد درجہ غیر معمولی حالت کو دیکھا تو شہر خالی کر کے چلے گئے۔ ایک عرب شاعر نے تائید غیبی کے اس عجیب واقعہ کو اس طرح ادا کیا ہے:

واملنا علی المدائن خیلاً　　　بحرها من برهن اریضا

یعنی ہم نے اپنے گھوڑوں کو مدائن پر جھکا دیا کہ مدائن کا دریا ان کے لیے میدان کی طرح سیر و تفریح کی جگہ ہو گئی تھی۔

نہروان کے پل پر چند لوگوں کو دیکھا گیا کہ ایک خچر کو جس پر دو صندوق لدے ہوئے تھے تیزی کے ساتھ ہانکتے ہوئے لے جا رہے تھے، اس خچر کو پکڑ لیا گیا، ان صندوقوں میں دوسرے قیمتی سامان کے علاوہ "کسریٰ" کا نہایت قیمتی اور مرصع و مطلّیٰ تاج بھی تھا جو کسی بڑے دربار کے موقع پر زیب سر کیا جاتا تھا، اس ولولہ انگیز تاریخی واقعہ کے بہت سے گوشے تفصیلی بیان کے محتاج ہیں جن کو ہم یہاں نظر انداز کر رہے ہیں اور آگے بڑھنا چاہتے ہیں، "طاقِ کسریٰ" کے عبرت انگیز اور سبق آموز مشاہدے کے بعد واپسی میں ہوائی گھر کی تفریح کا لطف اٹھایا اور بغداد واپس آ گئے، ہوٹل پہونچ کر عشاء کی نماز پڑھی اور سو گئے، دوشنبہ ۷ار فروری کا پروگرام نجف اشرف اور

کربلائے معلیٰ کا تھا، نجف میں بہت بڑا دار العلوم ہے، جہاں سیکڑوں طلبہ تعلیم پاتے ہیں ان میں اچھی خاصی تعداد ہندوستانیوں کی بھی ہے، موتمر کا باقاعدہ اجتماع آج "قاعتہ النعمان" کے بجائے نجف کے اسی دار العلوم کے وسیع ہال میں تھا، پروگرام کے مطابق تمام ارکانِ وفد ۸½ بجے "قاعتہ النعمان" پہونچ گئے اور ۹ بجے نجف کے لیے روانہ ہوگئے، بغداد سے نجف کی مسافت کم وبیش ایک سو پچاس کیلومیٹر ہے نئی اور اعلیٰ درجے کی بسوں میں یہ فاصلہ دو گھنٹے میں طے ہوگیا، چھپے ہوئے طے شدہ پروگرام میں اگرچہ "جامع کوفہ" کی زیارت کا نام نہیں تھا لیکن چند منٹ کے لیے یہاں بھی حاضری ضروری تھی، بغداد اور کوفہ کے درمیان "بابل" کے کھنڈر بھی آئے جن کے آس پاس سے ہماری سواریاں گذرتی ہوئی چلی گئیں، جیسے ہی کہا گیا "ہم اب بابل کے کھنڈروں کے قریب سے گزر رہے ہیں چند لمحوں کے لیے سب اسی طرف متوجہ ہوگئے مگر وقت کی تنگی کی وجہ سے گاڑیوں کو ٹھہرایا نہیں گیا اور ٹھہراکر دیکھنے بھی کیا، یہ قدرتی بات ہے کہ دنیا کے اس قدیم ترین تاریخی شہر کا نام سنتے ہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ولولۂ توحید اور نمرود کے غرور الوہیت کی باتیں یاد آگئیں، اور میں غور کرتا رہا کہ سائنس کی ترقی دو قدم اور آگے بڑھ گئی تو فضا ابراہیمؑ و نمرود کے مکالے کو کس طرح روئے زمین پر پھیلائے گی، آج کا پروگرام نہایت مصروف تھا، نجف کے "دار العلوم الاسلامیہ" میں ۱۰ بجے سے اجلاس کی کارروائی شروع ہونے والی تھی ـــــ مگر ہمیں راستے ہی میں گیارہ بج گئے تھے، اسی ہماہمی میں کوفہ کی شہرۂ آفاق مسجد "جامع کوفہ" پہونچے، اس طرح کے غیر معمولی تاریخی مقامات و آثار دیکھ کر جذبات کی ایک عجیب کیفیت ہوجاتی ہے، ہماری بھی ہوئی، لیکن ابھی صحنِ مسجد کا فاصلہ طے کرکے محرابِ علی تک پہونچے ہی تھے کہ واپسی کا تقاضا شروع ہوگیا، "جامع کوفہ" کی حاضری قلتِ وقت کی وجہ سے باقاعدہ پروگرام میں شامل

نہیں تھی پھر بھی رواروی میں اس کے لیے چند منٹ نکال لیے گئے، پروگرام پر اپنا اختیار ہوتا تو کم سے کم ایک روز یہاں کے لیے رکھا جاتا، مگر ایک روز چھوڑ ایک گھنٹے کا بھی موقع نہیں تھا، "محراب علی" کے قریب تحیۃ المسجد کی دو رکعتیں پڑھیں اور بھاگتے دوڑتے حضرت مسلم بن عقیل کے مزار تک پہونچے، مزار کا قبہ شاندار ہے اور دالان وغیرہ بھی وسیع ہیں، یہ عمارت "جامع کوفہ" کے ساتھ ہی لگی ہوئی ہے، اُس وقت عجیب حالت ہو رہی تھی، دل کا تقاضا تھا کہ ان کے مزار کے قریب بیٹھ کر ان کی فداکاری کی یاد تازہ کریں لیکن وہاں تو فاتحہ پڑھنا ہی دشوار ہو رہا تھا، چلیے، چلیے، گاڑیاں روانہ ہو رہی ہیں، اس مفہوم کے عربی فقرے ہر طرف سے سننے میں آرہے تھے، "جامع کوفہ" کے صحن کے وسط میں حوض اور تہ خانے کے طرز کی ایک عمارت ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ کشتیٔ نوح کی تیاری کی اصل جگہ یہی ہے، سیر کرانے والوں سے میں کچھ دریافت بھی کرتا رہا، لیکن اس افراتفری میں ٹھکانے سے کوئی جواب دینے والا بھی نہیں تھا، حالانکہ یہ باتیں اطمینان سے سمجھنے کی ہوتی ہیں، اس شہر کی تاریخی حیثیت کیا ہے، کشتیٔ نوح کے متعلق جدید تحقیقات کیا ہیں یہ اور اسی طرح کے بہت سے سوالات تھے جن پر غور کرنے کی ضرورت تھی مگر باراتوں کی فضا میں ان چیزوں پر کون غور کرتا ہے۔ مجھے تو یہی غنیمت معلوم ہوا کہ چند لمحوں ہی کے لیے سہی اس مسجد پر نظر تو پڑ گئی جس کی رگ رگ میں انقلاباتِ زمانہ کی تجربہ کاریاں سموئی ہوئی ہیں ــــــــ

مسجد کے دروازے کے بالکل سامنے ہانی بن عروہ مذحجی کی قبر تھی اس پر بھی فاتحہ پڑھی، مسلم بن عقیل کو پناہ دینے والے بہادر اور جاں باز ہانی، ابن زیاد کے ہاتوں ان کا سفاکانہ قتل، امام حسین رضی اللہ عنہ کے چچا زاد بھائی حضرت مسلم بن عقیل کی

دردناک شہادت، سب ہی ایسے واقعات تھے جن کی یاد آرہی تھی مگر ہمیں تو جلد سے جلد نجف پہونچنا تھا، جامع کوفہ میں پیش آنے والے بے شمار تاریخی واقعات لوحِ حافظہ میں اُبھر رہے تھے جو اُبھر کر ہی رہ گئے اور گاڑیاں نجف کے لیے روانہ ہوگئیں، کوفہ اور نجف کا فاصلہ مشکل سے چند کیلو میٹر ہوگا، بلکہ شاید درمیان میں صرف ایک طویل و عریض قبرستان ہے جس کے متعلق مشہور ہے کہ دنیا کا سب سے بڑا قبرستان ہے، بسیں ابھی چلی ہی تھیں کہ نجف کی آبادی آگئی۔

مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی
صدر کل ہند مسلم مجلس مشاورت
و ناظم ندوۃ المصنفین - دہلی

یہ مقالہ نفاذِ شریعت کانفرنس اسلام آباد
میں پڑھا گیا۔

اسلام میں تعلیم

تعلیم کی اہمیت کو آج جس شد و مد کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ ماضی بعید میں اسی قدر شد و مد کے ساتھ اس کی مذمت کی جاتی تھی اس سے دور و نفور رہنے کی تلقین کی جاتی تھی۔ اور اس کے علمبرداروں کو نشانۂ ستم بنایا جاتا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ تاریخ میں ایسے بھی ادوار گذرے ہیں جب تعلیم و تعلم کو معاشرہ کا ناسور بتایا جاتا تھا۔ اس سلسلہ میں جب ہم زیادہ تفصیل میں جاتے ہیں تو ہم پر اس کے تعلق سے مختلف قوموں کے حیرت ناک رویوں کا انکشاف ہوتا ہے۔

روم میں عیسائی تسلط کے بعد علم و اہلِ علم پر تباہی کا جو دور گذرا ہے وہ تاریخ کی بدترین مثال ہے۔ دین کے نام پر ہر غیر مسیحی وجود کو فنا کرنے کا عمل شروع کر دیا گیا۔ علوم و فنون کے تمام ذخیرے تلف کر دیے گئے۔ قدیم مصر کے پایۂ تخت منفس اور عین الشمس کے کھنڈرات آج بھی اس قیامت پر نوحہ کناں ہیں۔ مصری شہر اسکندریہ جو کبھی گہوارۂ علم بنا ہوا تھا جب سلطنتِ روما کے زیرِ نگیں ہوا تو اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی۔ ہاں ہیپتیا نام کی ایک عورت اپنے وقت کی مایۂ ناز عالمہ تھی۔ زمانہ کے اعیان و رؤسا اس کی شاگردی کے خواہاں رہتے تھے۔ وہ بھی عیسائیت کے پنجۂ استبداد سے نہ بچ سکی۔

پادریوں نے ہی اپنے مقدس عصائے پطرس کی ضربوں سے اس کے سر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ اور اس کے نازک جسم کا بُری طرح مثلہ کر کے نذرِ آتش کر دیا گیا۔

سکندر مقدونی کی سلطنت اس کے تین سپہ سالاروں میں تقسیم ہوئی تو مصر بطلیموس کے حصہ میں آیا۔ اس کی علم دوست اولاد نے مصر کو علوم و فنون کا مرکز بنانے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ مصر کے پایۂ تخت اسکندریہ میں ایک بے مثال کتب خانہ کی بنیاد رکھی گئی جس میں رفتہ رفتہ سات لاکھ کتابیں جمع ہو گئیں۔ جن میں سے آدھی تو جولیس سیزر نے جلا دیں اور باقی جو کتابیں بچیں وہ عیسائیوں کے دورِ اقتدار میں تلف کر دی گئیں۔ اس کتب خانہ کی تباہی کو مسلمانوں کا عمل قرار دیا جاتا ہے۔ اور اس الزام کو بہت زور شور کے ساتھ اُچھالا بھی جاتا ہے لیکن اسپین کے ایک مورخ اودریس کے سفر نامہ سے اس کی تردید ہوئی ہے۔ اس نے ۴۱۳ء یعنی قبل از بعثت نبوی اسکندریہ کا دورہ کیا۔ اور انتہائی صفائی کے ساتھ اپنے سفر نامہ میں یہ لکھا کہ میں نے کتب خانہ دیکھا الماریاں تو موجود تھیں مگر کتابیں ندارد تھیں۔ ان کتابوں کو اسکندریہ کے عیسائی پہلے ہی آگ دکھا چکے تھے۔

ہندوستان میں برہمنوں نے تعلم و تعلیم پر اپنی اجارہ داری قائم کر رکھی تھی۔ دوسرے طبقات کے لئے علم کی خوشہ چینی ممنوع بلکہ سزا کی بھی موجب بن جاتی تھی۔

یہودیوں میں ربانوں نے علم کو اپنی جاگیر بنا رکھی تھی۔ اور اس جاگیر کے بل پر وہ لوگوں پر حکمرانی بھی کرتے تھے غرضیکہ علم اور تعلیم و تعلم کو عوام کے لئے شجر ممنوع بنا دیا گیا تھا۔

ان واقعات سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ علم کو بہر حال ہر دور کے اعلیٰ طبقہ میں عوامی استحصال کا ذریعہ بنایا گیا۔ اور اسی کے نام پر اپنی خدائی کو قائم کرنے کی کوشش کی گئی۔ اور اسی طرح سے علم کو ہمیشہ کھلوا ڑ بنائے رکھا گیا۔

بلاشبہ یہ اسلام کا کارنامہ ہے کہ اس نے طلب علم کو ایک "فریضہ" قرار دیا "طلب العلم فریضۃ علیٰ کل مسلم" طلب علم کو فرض بھی قرار دے دیا جاتا تو بہت اہم بات ہوتی لیکن فرض نہ کہہ کر

فریضہ کی قید لگادینے سے مفہوم میں جو وسعت اور معنویت پیدا کی گئی ہے اس پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اسلام میں فریضہ کا تصور کچھ اس طرح ہے:-

ایک ایسی ذمہ داری ہے جس سے انسان کسی صورت میں بھی مستثنیٰ نہیں ہو سکتا۔ تمام مشغولیتیں اور صعوبتیں بھی ادائیگی فریضہ میں مانع نہیں بن سکتیں۔

ایسی ذمہ داری جس کی ادائیگی عبادت میں شمار ہوتی ہے اور چونکہ عبادت کے مقتضیات میں امانت و دیانت طہارت و نظافت اور اخلاص نیت و صفائی قلب بھی شامل ہے۔ ایسے ہی تحصیل علم کے فریضہ کی ادائیگی میں بھی امور ضروری متصور ہوں گے۔

فریضہ کی ادائیگی انسان کو اس کے خالق سے قریب تر کرنے کا سبب بنتی ہے طلب علم بھی ایک فریضہ ہے لہٰذا اس کی انجام دہی سے خدا کی قربت کا احساس جان گزیں ہونا ناگزیر ہے۔

اسلام میں تعلیم و تعلم دونوں کی کس قدر اہمیت ہے۔ حدیث ذیل سے اس کی بخوبی وضاحت ہوتی ہے۔

"جاہل کو سزاوار نہیں ہے کہ وہ اپنی جہالت پر تکیہ کئے رہے اور نہ عالم کو سزاوار ہے کہ وہ اپنے علم کو پوشیدہ کئے رہے"۔ ایک اور مختصر سی حدیث میں فرمایا گیا ہے "علم خزانے ہیں اور سوال ان کی کنجیاں ہیں۔" اس موقع پر حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کا قول نقل کر دینا مناسب ہوگا فرماتے ہیں:-

تعلموا العلم فان تعلمہ للہ خشیۃ وطلبہ عبادۃ۔ مذاکرتہ تسبیح والبحث عنہ جہاد وتعلیمہ لمن لا یعلمہ صدقۃ (الترغیب والترھیب)

علم سیکھو کہ اس کا سیکھنا خوفِ خدا کا موجب ہے، اس کی جستجو کرنا عبادت ہے اس کی ممارست و مشغولیت تسبیح میں شمار ہوتی ہے اور اس کی تلاش و تحقیق (میں مشقت اٹھانا بھی) جہاد ہے۔ اس کا استعمال یعنی اس سے استفادہ تقرب الٰہی کا ذریعہ بنتا ہے اور ناواقفوں کو علم سے

بہرہ مند بنانا کارِ خیر ہے۔

قرآنِ کریم کی متعدد آیات سے علم و اہلِ علم کے مرتبے پر روشنی پڑتی ہے سورہ زمر میں فرمایا گیا ہے:۔

قل ھل یستوی الّذین یعلمون والّذین لا یعلمون

(اے محمدؐ) آپ کہہ دیجئے کہ اہلِ علم اور جاہل برابر نہیں ہو سکتے

سورہ مجادلہ میں فرمایا گیا ہے:۔

یرفع اللہ الّذین اٰمنوا والّذین اوتوا العلم درجات۔

تم میں سے اللہ انہیں کے درجات بلند کرتا ہے جو اہلِ ایمان و اصحاب علم ہیں۔

اسلام کی انہی تعلیمات کا نتیجہ تھا کہ جہاں کہیں اس کے پیروؤں کی حکومتیں قائم ہوئیں علم کے چرچے بھی عام ہوئے۔ مکاتب مدارس کا جال پھیلا۔ اور وہ علاقے جو کبھی غیر متمدن تھے مدنیت وحضارت کا مرکز بن گئے۔ مرحوم اندلس بغداد و بصرہ موصل و کوفہ اور قاہرہ جیسے مختلف شہروں کی علمی و تمدنی تاریخ پر ہم بجا طور پر ناز کر سکتے ہیں۔

اسلام سے پہلے زیادہ تر انحصار عقلی و نظری علوم پر کیا جاتا تھا لیکن اس کی آمد کے بعد سے جہاں بہت سی تبدیلیوں نے جنم لیا وہاں ایک سب سے بڑی تبدیلی یہ تھی کہ اسلامی تعلیمات کے طفیل علوم کی دوسری اقسام کی باضابطہ بنیاد پڑی یعنی عمرانی و صنعتی سماجی و معاشرتی علوم کی تدوین ہوئی اور فنی تعلیم کو بھی سنجیدگی کے ساتھ فکر و عمل کا موضوع بنایا گیا۔

قرآنِ کریم کی ابتدائی سورت "اقرأ" میں تعلیم و تعلم کے دو بنیادی ذریعے قرأت اور قلم کے ذکر سے بھی اسلام کے اس بنیادی پہلو کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ انسان کے لئے علم کے نام سے تاریخ نے جو ورثہ چھوڑا ہے وہ اُن ہی دونوں ذرائع کا مرہونِ منت ہے اگر ہم قرأت اور قلم کا سہارا نہ لیں تو ہماری کوئی حیثیت نہ رہے گی۔ سورہ (نٓ) میں دوسری چیزوں کے ساتھ ساتھ قلم کی قسم کھا کر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم مرتبت اور آپ

کی خلقِ عظیم پر صاد کیا گیا ہے۔ ایک پیغمبر جو اپنے لکھے ہوئے نام تک کو نہ پڑھ سکتا ہو وہ بھلا خود کچھ لکھنے پر کیا قادر ہوگا۔ اس کے باوجود اس نے علم کا ایک بڑا بحرِ ذخار قرآن حدیث کی صورت میں آنے والی نسل کے لئے منتقل کر دیا۔ اس سے بڑا اعجاز اور کیا ہو سکتا ہے اور اسی اعجاز کی داد دینے کے لئے ن والقلم وما یسطرون میں قلم کو اور قرطاس پر ثبت ہونے والے اس کے نقوش کو شاہد بنایا گیا ہے۔ یہ شہادت اسلام میں نوشت وخواند اور قرأت وکتابت کے اعلیٰ مقام کی نشاندہی کرتی ہے قرآن میں قرأت کا لفظ متعدد مفہوموں کے لئے آیا ہے اور یہ سب مفاہیم تعلیم کے تمام پہلوؤں پر صادق آتے ہیں۔

قلم وقرأت کی بنیاد پر جو علوم وفنون حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ ان پر بھی نیز وہ علوم بھی جو ہمیشہ سے انسانی ارتقاء کے لئے ضروری سمجھے جاتے رہے ہیں۔ قرآن میں واضح رہنمائی دی گئی ہے اور اُن کے تحصیل وتعلیم کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں سورۂ نور کے دوسرے رکوع کا مطالعہ مفید ہوگا۔

پہلی آیت میں علم حیاتیات کا ذکر کیا گیا ہے۔ دوسری آیت میں نفرت کے سربستہ رازوں کی طرف اشارہ کر کے غور وفکر کی دعوت دی گئی ہے تیسری آیت میں لسانیات اور ان کے اختلافات نیز رنگ ونسل کے ساتھ ان کے خصوصی رشتوں کی طرف توجہ مبذول کراتے ہوئے رنگ ونسل اور زبانوں کے علماء کو دعوت تعلیم وتعلم دی گئی ہے چوتھی آیت میں رات دن کے فرق سے انسان پر پڑنے والے نفسیاتی اثرات کی نشاندہی کر کے اہلِ سمع وبصر کو حرکت میں لانے کی کوشش کی گئی ہے، پانچویں آیت میں علم موسمیات اور اس کی خصوصیات و اثرات کی طرف اہلِ عقل کو متوجہ کیا گیا ہے۔ چھٹی آیت کائنات کے نظام اور انسانوں کے انجام سے اس کے مضبوط اور گہرے رشتہ پر روشنی ڈالتی ہے یہ تمام اختیارات جن کو محض دینیات ومذہبیات سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ درا صل علوم کی مختلف شاخوں سے سود مند استفادہ کی دعوت دیتے ہیں۔ اسی طرح سورہ فاطر کی ۲۷ ویں آیت میں بعض جماداتی اختلافات سے زندگی پر جو اثرات رونما ہوتے ہیں ان کو بیان کر کے ایک بڑی عجیب حقیقت کا

انکشاف کیا گیا ہے وہ ہے انما یخشی اللّٰہ من عبادہ العلماء یعنی لوگوں میں جو اہلِ علم ہیں وہی خدا سے صحیح طور پر خائف رہتے ہیں۔ ان ہی آیات میں اس کا جواب بھی ملتا ہے کہ تعلیم و تعلم کا مقصد کیا ہونا چاہیے۔ یہ ایسا سوال ہے جس کے جواب سے بہت سے مسائل پر بھی اچھی روشنی پڑے گی۔

بعثتِ نبوی کے بعد دنیا دو سائنسی دوروں سے متعارف ہوئی ہے۔ پہلا دور عباسی خلافت کی دین ہے، دوسرا دور یورپ کے عروج سے وابستہ ہے۔ پہلے سائنسی دور میں بھی نت نئی ایجادات ہوتی رہی ہیں لیکن ان کا رُخ ہمیشہ افادی اور مثبت رہا ہے جب کہ دوسرے دور کی بیشتر ایجادات انسان کے مسائل میں زیادہ تر اضافہ کر رہی ہیں۔ پہلے دور کی یہی خوبی کیا کم ہے کہ اس پر دوسرے دور کی بنیاد رکھی گئی لیکن زمامِ قیادت چونکہ ان ہاتھوں میں منتقل ہو چکی تھی جن کے ہاں تعلیم و تعلم کے اغراض و مقاصد متعین نہیں تھے۔ اس لئے اس دور کے تاریک پہلو نسبتاً زیادہ ہیں۔ پہلے دور کی قیادت وہ علماء و سائنسدان انجام دے رہے تھے جن کے ہاں علم کا طلب کرنا ایک فریضہ تھا اور جیسا کہ ہم پڑھ چکے ہیں کہ فریضہ کی ادائیگی میں اخلاص نیت و صفائی قلب، امانت و دیانت اور طہارت و نظافت نیز حق تعالیٰ سے قربت کے احساسات لازمی طور پر پائے جاتے ہیں۔ اس لئے اہلِ اسلام نے اس فریضہ کو انتہائی احتیاط سے ادا کرنے کی کوشش کی۔

انسان تعلیم کسی مقصد سے حاصل کرتا ہے اور پھر مقصد کے تحت ہی اس کا استعمال بھی کرتا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ اصل چیز مقصد ہوئی تعلیم نہیں مقصد پر سارا دارومدار ہے اس حقیقت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا اور مقصد کو سامنے رکھ کر تعلیم و تعلم پر پہرے لگائے جاتے ہیں۔ اسلام اسی حقیقت کے پیشِ نظر تعلیم و تعلم کو سامنے رکھ کر فیصلے دیتا ہے کسی بھی علم کو محض اس وجہ سے حاصل کرنا کہ وہ علم ہے اسلام کے نزدیک ہرگز معیوب نہیں ہے لیکن اسی علم کے حصول کے ساتھ اگر غلط مقصد وابستہ ہو تو اسلام ہرگز روادار نہیں ہوگا یہی رویہ دوسرے علوم و فنون کے ساتھ بھی بتایا گیا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ان علوم کی تحصیل اور ان کے برتنے کے لئے امت کے لئے

کسی طرح کی ممانعت ثابت نہیں ہوتی۔ صرف مقاصد کے تعلق سے چند رہنما اصول مرحمت فرمائے گئے۔ اور مختلف انسانی ضروریات کے پیش نظر ہر فرد کو ان کی تعلیم و تعلم کا مجاز قرار دیا گیا ہے۔ ارشادِ نبویؐ ہے انتم اعلم بامور دینا کم "تم اپنے دنیاوی امور کے زیادہ بہتر جاننے والے ہو"۔

ایک حدیث ہے اطلبوا العلم ولو بالصین "علم حاصل کرو خواہ اس کے لئے چین ہی جانا پڑے"۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ آں حضرتؐ کے دور ہی میں جب خالص دینی علوم کے لئے کسی دوسری جگہ جانے کی چنداں احتیاج نہیں تھی۔ تو پھر چین کے ذکر کا مقصد اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ کہ آدمی کو دنیاوی علوم کی تحصیل کے لئے بھی وقت اور مال و مشقت کے صرف کرنے کی ترغیب دی جا رہی ہے۔ یہ حدیث اصولِ حدیث کی رو سے مختلف فیہ ہے لیکن امام رازی اور امام غزالی نیز امام ابن عبدالبر نے بھی اس حدیث سے استناد کیا ہے۔ اور اسی وجہ سے مذکورہ حدیث قابلِ اعتماد ہے۔

غزوہ بدر کے موقع پر جو کفار قید ہوئے تھے، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی رہائی کے لئے یہی شرط رکھی کہ ان میں سے ہر پڑھا لکھا قیدی کسی مسلمان کو پڑھنا لکھنا سکھائے جب شرط پوری کر دی گئی تو ان کو رہا کر دیا گیا۔

امام رازی نے تعلیم پر بحث کرتے ہوئے احیاء العلوم میں لکھا ہے کہ علوم کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) علوم شرعیہ اور (۲) علوم غیر شرعیہ۔

علوم شرعیہ سے مراد وہ علوم ہے جو انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام سے براہِ راست حاصل ہوئے ہیں۔ ان کی طرف عقل کی رہنمائی اس طریقہ سے نہیں ہو سکتی جس طریقہ سے عقل کے ذریعہ علم حساب سکھایا جاتا ہے نہ وہ تجربے حاصل ہوتے ہیں جیسے علمِ طب کی تدوین ہوتی ہے اور نہ محض سننے سے ان کا حاصل کرنا ممکن ہے جیسے علم لغت سے حاصل کیا جاتا ہے۔

اس کے بعد جو علوم غیر شرعیہ ہیں ان میں سے بعض پسندیدہ ہیں اور بعض غیر پسندیدہ اور بعض ایسے ہیں جو صرف درجہ مباح رکھتے ہیں۔

پسندیدہ علوم وہ ہیں جن سے دنیاوی اُمور کی مصلحتیں وابستہ ہوتی ہیں جیسے علمِ طب اور حساب وغیرہ اور پھر ان علوم میں بعض ایسے ہیں جن کا حاصل کرنا فرض کفایہ ہے بعض ایسے ہیں جن کا حاصل کرنا افضل ہے۔ اور بعض ایسے ہیں جن کو حاصل کیا جا سکتا ہے۔ مگر ان کی تحصیل ضروری نہیں ہے۔

مزید تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ فرض کفایہ وہ علوم ہیں جن کے ہم دنیاوی زندگی اور کاروبار کے قائم اور باقی رکھنے میں محتاج ہیں۔ جیسے علمِ طب۔ علمِ حساب کاشتکاری، باغبانی۔ پارچہ بافی اور دوسرے صنعتی علوم۔

وہ علوم جن کا حاصل کرنا اگرچہ فرض نہیں ہے مگر افضل ضرور ہے جیسے علمِ حساب و علمِ طب وغیرہ میں تخصص و تحقیق کہ اس کے بغیر انسان زندگی تو ضرور گذار سکتا ہے لیکن اس سے بہرہ مند ہونے کے بعد مزید خوشگوار نتائج سامنے آجاتے ہیں۔

مباح علوم کے ذیل میں شعر و ادب جو فحاشی پر مبنی نہ ہو اور علوم تاریخ وغیرہ آتے ہیں۔ اور ناپسندیدہ علوم میں سحر، شعبدہ بازی وغیرہ شامل ہیں۔ (احیاء العلوم اوّل)

آگے چل کر مزید فرماتے ہیں۔ جو علم سب میں افضل ٹھہرا تو اس کی تحصیل بھی سب سے افضل ہوگی نیز دوسروں کو اس سے بہرہ مند کرنا بھی سب سے افضل نیکی شمار ہوگی۔ انسان کی پیدائش کے مقاصد دین اور دنیا دونوں کے مجموعہ پر مشتمل ہیں کیونکہ دین کا انتظام جب تک دنیاوی نظام نہ ہو قائم نہیں ہو سکتا اور دنیاوی معاملات کا انتظام انسانوں کے کاموں اور مشاغل (پیشوں) پر موقوف ہے انسانی پیشے تین قسم کے ہیں ۔

ایسے پیشے جو انسانی زیست کے لئے بنیاد کا درجہ رکھتے ہیں وہ چار ہیں :۔

۱۔ زراعت۔ ۲۔ پارچہ بافی۔ ۳۔ عمارت سازی اور ۴۔ خاندان و ملک کے انتظام اور اسبابِ معیشت کی فراہمی نیز ان کی حفاظت کے لئے سیاست۔

دوسری قسم کے پیشے وہ ہیں جو پہلی قسم کے پیشوں کے لئے معاون کا درجہ رکھتے ہیں۔ جیسے

طباخی و خیاطی تیسری قسم میں وہ پیشے آتے ہیں جو نجی کہے جاسکتے ہیں۔

ان سب میں سے پہلی قسم کے پیشوں کو فضیلت حاصل ہے خاص طور پر علم سیاست کی فضیلت زیادہ ہے کہ اس سے نظم وضبط کا وجود عمل میں آتا ہے اور اس کے ذریعے سے مخلوق کی اصلاح کی جاتی ہے اور انھیں حق (فلاح) کی راہ دکھائی جاتی ہے۔

علم دین اور مذکورہ علوم کی تحصیل کرنے والوں کے فرق کو واضح کرتے ہوئے ایک جگہ امام رازی نے لکھا ہے علم دین حاصل کرنے والوں کی مثال ان مجاہدوں کی سی ہے جو جہاد کے میدانوں میں اپنا سر ہتھیلی پر لئے دین کی حمایت میں لڑ رہے ہیں اور دوسرے علوم کو حاصل کرنے والوں کی مثال فوج کے ان دستوں کی سی ہے جو سرحد کی حفاظت کے لئے متعین ہوتے ہیں۔

(احیاء العلوم جلد ۱ صفحہ ۹۵)

مفتی صاحبؒ کی ایک ریڈیائی تقریر

رسولِ خدا کا کردار واخلاق

دنیا وجود میں آئی تو اس کی ہدایت ورہنمائی کے لئے خدائے بزرگ وبرتر نے اپنے پاکیزہ اور بلند کردار بندے بھی بھیجے۔ انھیں ہستیوں کو پیغمبر اور نبی ورسول کہا جاتا ہے۔ یہ برگزیدہ انسان خدا کی تعلیم اور منشار کو دوسرے انسانوں تک پہنچانے کا اہم اور نازک فرض انجام دیتے ہیں۔ دنیا میں نیکی اور پاکیزگی کی جو شعاعیں پھیلی ہوئی ہیں وہ اللہ تعالٰے کے انہی بھیجے ہوئے رسولوں کا صدقہ ہے فلسفیوں اور دانشوروں نے اپنی قوتِ فکر اور عقلِ رسا سے اگرچہ انسانی زندگی کی بڑی بڑی گتھیاں سلجھانے کی کوشش کی ہے، مگر حق یہ ہے کہ وہ اعلیٰ اخلاق وکردار اور انسانیت کے نظامِ رشد وہدایت کا کوئی عملی نقشہ اس لئے پیش نہیں کر سکے کہ ان کی نکتہ سنجیوں اور بلند خیالیوں کے پیچھے جوشِ عمل اور حسنِ کردار کا کوئی قابلِ ذکر نمونہ نہیں تھا۔ فکری حیثیت سے نہیں عملی حیثیت سے کائناتِ انسانی کے سرمایہ میں کامیاب اور پرمسرت زندگی کے جو اثرات ونتائج پائے جاتے ہیں وہ اسی مقدس گروہ کی جدوجہد کی برکتیں ہیں۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم پیغمبروں کی اس جماعت کے سردار ہیں اس لئے قدرتی طور پر آپؐ کے کردار اور حسنِ عمل کا قالب بھی نہ صرف دل آویز ومکمل ہے بلکہ انسانی فطرت کے جلوۂ صدرنگ کا عجیب وغریب مظہر ہے۔ آیئے یومِ ولادت کی تقریب کی ان متبرک اور نورانی ساعتوں میں حضورؐ کے پیغمبرانہ اخلاق وکردار پر ایک ہلکی سی نظر ڈالیں۔

حضورؐ کی شخصیت میں ہم کو بے مثال جامعیت اور ہمہ گیری ملتی ہے۔ اور آپؐ کی سیرت میں زندگی اور اس کی ضرورتوں کے تمام ہی گوشے ابھرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ آپؐ کی زندگی میں ظلم وجبر کے پہاڑ بھی ٹوٹے، آزمائشوں اور مصیبتوں کی آندھیاں بھی آئیں، ناکامیوں کا اندھیرا بھی چھایا اور فتح مندیوں کے شادیانے بھی بجے، جنگیں بھی لڑیں اور صلح وسلام کے عہدنامے بھی کئے، دن دن بھر روزے بھی رکھے اور رات رات بھر نمازیں بھی پڑھیں۔ غارِ حرا میں خلوت گزیں بھی رہے

اور بڑی بڑی سیاسی گتھیاں بھی سلجھائیں، خانگی زندگی کا بھی لطف اٹھایا اور
حق کے ہادی اور مبلغ کا بھی فرض انجام دیا۔ کہاں نرمی سے کام لینا چاہیئے، کہاں
سختی سے، اس کے موقع محل کی پہچان بھی حضورؐ کو ایسی تھی کہ تاریخ عالم کی
بڑی بڑی شخصیتوں میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ جہاں حدودِ الٰہی کی حفاظت
کا مرحلہ ہوتا ان کی حفاظت کے لئے فولاد سے بھی زیادہ سخت ہو جاتے اور جہاں
اپنی ذات کا سوال ہوتا ریشم سے بھی زیادہ نرم ہو جاتے۔ ایک دفعہ مسجدِ نبوی میں
ایک بے پڑھا لکھا گاؤں کا آدمی آیا، اسے پیشاب کی ضرورت ہوئی تو وہیں مسجد
میں پیشاب کرنے لگا۔ صحابہؓ نے یہ دیکھا تو چاروں طرف سے اس پر ٹوٹ پڑے آپؐ
نے ان کو سختی سے روکا اور فرمایا "انما بعثتم میسرین ولم تبعثوا معسرین" یعنی
تم نرمی کے لئے بھیجے گئے ہو سختی اور درشتی کے لئے نہیں۔ پھر آپؐ نے حکم دیا کہ اس
کو پانی سے بہا دو۔ اس کے بعد آپؐ نے اس بدوی کو بلا کر سمجھایا کہ مسجد عبادت کی
جگہ ہے یہاں نماز پڑھی جاتی ہے۔ آپؐ نے عام لوگوں کو زکوٰۃ و خیرات کا حکم دیا
جس کے معنی یہ تھے کہ اپنی کمائی کا کچھ حصہ ضرورت مندوں کو دے کر خدا کا حق ادا کیا
جائے مگر خود آپؐ کا عمل یہ تھا کہ جو آیا خدا کی راہ میں خرچ کر دیا۔ حضرت ابن عباسؓ
کا بیان ہے کہ آپؐ سب لوگوں سے زیادہ سخی تھے۔ سب سے زیادہ سخاوت ماہِ
رمضان المبارک میں فرمایا کرتے تھے۔ اور آپؐ نے تمام عمر کسی سوال کے جواب میں
"نہیں" کا لفظ نہیں فرمایا۔ حضرت ابوذرؓ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ میں رات کو
آپؐ کے ساتھ ایک راستہ سے گزر رہا تھا، راہ چلتے آپؐ نے فرمایا: ابوذر! اگر اُحد کا یہ
پہاڑ میرے لئے سونا ہو جائے تو میں کبھی پسند نہ کروں گا کہ تین راتیں گزر جائیں اور
اس میں سے ایک دینار بھی میرے پاس باقی رہے۔ آپؐ نے زہد و قناعت کی تعلیم
بھی ایک خاص متوازن قالب میں دی۔ ساتھ ہی آپؐ کے طرزِ زندگی کا عملی نقشہ یہ
تھا، رہائش کے لئے ایک حجرہ جس میں کچی دیوار اور کھجور کے پتوں اور اونٹ کے
بالوں کی چھت تھی۔ آپؐ اکثر فرماتے کہ انسان کے لئے دنیا میں اتنا ہی کافی ہے
جس قدر ایک مسافر کے لئے زادِ راہ، اس قول کے ساتھ عمل مبارک یہ تھا کہ ایک
دفعہ کچھ خدام حاضرِ خدمت ہوئے تو دیکھا کہ دونوں جہان کے سردار کے پہلو میں
چٹائی کے نشانات پڑ گئے ہیں۔ جاں نثاروں نے عرض کیا حضورؐ! ہم ایک نرم

گدا بناکر حاضر کرنا چاہتے ہیں۔ فرمایا: مجھ کو دنیا سے کیا غرض؟ مجھے تو دنیا سے اتنا ہی تعلق ہے جتنا اُس سوار کو جو راستہ چلتے کچھ دیر کے لئے کسی سایہ میں آرام کرتا ہے۔

حضورؐ نے ساری عمر کسی سے بدزبانی نہیں کی، مدت العمر کسی سے ذاتی انتقام نہیں لیا، کبھی کسی کا سوال رد نہیں کیا مگر سوال کی عادت کو اچھا بھی نہیں جانا' آپ کی تعلیم یہ تھی کہ اگر کوئی شخص لکڑی کا گٹھا پیٹھ پر لادلائے اور اس کو بیچ کر گزارہ کرے تو یہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے بہتر ہے۔ چنانچہ ایک دفعہ کسی نے حضورؐ سے سوال کیا تو آپؐ نے پوچھا کیا تمہارے پاس کچھ بھی نہیں ہے؟ اس شخص نے جواب دیا ایک چادر ہے جسے آدھا بچھاتا ہوں اور آدھا اوڑھتا ہوں اور پانی پینے کا ایک پیالہ ہے۔ حضورؐ نے فرمایا: یہ دونوں چیزیں لے آؤ۔ وہ لے آئے تو حاضرین سے فرمایا کتنے میں خریدتے ہو۔ دونوں چیزوں کے دو درہم وصول ہوئے۔ ارشاد ہوا۔ ایک درہم کا کھانے پینے کا سامان گھر پہنچا دو اور ایک درہم کی رسی خرید دو اور جنگل سے لکڑیاں باندھ کر لاؤ اور انھیں فروخت کرو۔ دو ہفتے کے بعد یہ صحابی جب دوبارہ حاضر ہوئے اور کہنے لگے کہ اب میرے پاس دس درہم ہیں تو حضورؐ نے فرمایا: سوچو یہ اچھا ہے یا وہ اچھا تھا کہ قیامت کے دن اُٹھتے تو گدائی کا داغ چہرے پر لگا ہوتا۔ حضورؐ جب کسی سے بیعت لیتے تھے تو دوسری باتوں کے ساتھ یہ بھی فرماتے تھے "لوگوں کے سامنے ہاتھ نہ پھیلانا" ایک دفعہ ایک صحابی حکیم بن حزام سے فرمایا "حکیم! استغنا میں برکت ہے اور حرص و طمع میں محرومی، حرص و طمع کی مثال ایسی ہے کہ کوئی کھائے چلا جائے اور کسی طرح اُس کا پیٹ نہ بھرے۔ یاد رکھو! دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔ سب مل کر کام کرتے تو حضورؐ ان کے ساتھ برابر کے شریک رہتے تھے' یہاں تک کہ حضورؐ کو یہ بات بھی ناپسند تھی کہ خود سوار ہوں اور ساتھی پیدل چلیں۔ ایک مُہم میں سواریوں کی کمی تھی۔ طے پایا کہ تین آدمی باری باری ایک اونٹ کی سواری لیں۔ حضورؐ نے اپنے ساتھ بھی دو آدمیوں کو شریک کیا، جب ان لوگوں کی باری آئی تو انھوں نے اپنی باری چھوڑنی چاہی، حضورؐ نے فرمایا تم مجھ سے زیادہ پیادہ پا نہیں چل سکتے اور میں ثواب کا بھی تم سے کم حاجت مند نہیں ہوں۔ اللہ کو وہ شخص

بُرا لگتا ہے جو ہمراہیوں میں نمایاں ہونے اور ممتاز بننے کی کوشش کرے۔ ایک دفعہ حضورؐ وضو فرما رہے تھے۔ بعض صحابہ نے یہ کیا کہ وضو کا پانی زمین پر نہیں گرنے دیا، اپنے ہاتھوں میں لے کر منہ پر مَل لیا۔ آپؐ نے دریافت فرمایا یہ کیا کر رہے ہو۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ اللہ اور اللہ کے رسول کی محبت حاصل کرنے کے لئے ایسا کر رہے ہیں، ارشاد ہوا، اللہ اور اللہ کے رسول کی محبت حاصل کرنے کا یہ طریقہ نہیں سچ بولا کرو، امین بنو اور پڑوسیوں سے اچھا سلوک کرو، اللہ اور اس کے رسول کی محبت حاصل کرنے کا یہی راستہ ہے۔

دراصل یہی وہ عظیم الشان اسلوبِ تعلیم و تربیت ہے جس کے طفیل اصحابِ کرام کی ایسی سوسائٹی وجود میں آئی جس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ ایک مختصر سی مدت میں لاکھوں جاں نثار آپؐ کے اخلاقی کمالات کے امین بن گئے اور دیکھنے والوں نے دیکھ لیا کہ تعلیم و تربیت کے اصول کا جو نقشہ آپؐ نے بنایا تھا اُس پر کتنی پاکیزہ اور کتنی دلکش زندگی بنتی ہے۔ اندازِ تربیت کا ایک اور رُخ بھی دیکھتے چلئے! اللہ تعالےٰ نے حضورؐ کو عزم و استقلال اور صبر و رضا کا پیکر بنایا تھا۔ قیامِ مکہ کے یاس انگیز دور میں حالات کی تلخیوں اور ناگواریوں کے اثر سے بعض ساتھیوں کی زبان پر کچھ مایوسی کے الفاظ آگئے۔ یہ الفاظ سُن کر حضورؐ کا چہرۂ انور غصہ سے سُرخ ہو گیا۔ فرمایا: کیا کہتے ہو تم سے پہلے ایسے بھی حق پرست گزرے ہیں جن کو آروں سے چیرا گیا اور ان کی کھالیں نوچی گئی ہیں، یقین کرو حق ایک دن کامیاب ہوگا اور صنعا اور حضر موت کے درمیان کا سارا پُر خطر راستہ ایک شخص تنِ تنہا اس طرح طے کرے گا کہ اس کو خدا کے سوا کسی کا کوئی خوف نہ ہوگا ۔

بے شمار درود و سلام اُس ذاتِ گرامی پر جس کو اللہ تعالیٰ نے تمام کائنات کے لئے رحمت بنا کر بھیجا۔

وہ دانائے سُبُل ختم الرسلؐ مولائے کُل جس نے ۔ غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیِ سینا
نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر ۔ وہی قرآں وہی فرقاں وہی یٰسیں وہی طٰہٰ

۸ر ستمبر ۱۹۶۰ء

مفتی صاحبؒ کی ———— ایک اور نشری تقریر

شبِ براًت کی اہمیت

آج شعبان کی پندرہ تاریخ ہے۔ اس مہینہ کی پندرھویں رات کو"شب برأت" کہا جاتا ہے یعنی معصیتوں اور گناہوں سے چھٹکارا پانے اور بے تعلق و بے زار ہونے کی رات۔ یہ رات مجرموں کی رہائی اور گنہگاروں کی معافی کے لئے خاص طور پر چنی گئی ہے اس لئے اِس کا نام لیلتہ البرأت ہے۔ اِسی رات میں قضا و قدر کے حکیمانہ فیصلوں کا بندوبست ہوتا ہے، جن کی مصدقہ نقل لوحِ محفوظ سے لے کر شعبۂ تکوینیات کے فرشتوں کے حوالے کردی جاتی ہے اور پھر آنے والی عظیم الشان رات"شبِ قدر" تک ان تمام فیصلوں کی آخری تکمیل ہوتی ہے۔ یہ رات آگئی تو سمجھ لینا چاہیئے کہ دلوں کو زندگی اور روحوں کو بالیدگی بخشنے والے دستور العمل"قرآن مجید" کی سالگرہ کا مقدس مہینہ "رمضان المبارک" آگیا اور اس کی برکتوں اور عظمتوں کی صبح نمودار ہوگئی۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجئے کہ ظلمتِ شب کے پردے چاک ہوگئے اور اب تھوڑی ہی دیر میں انسانوں کی ہدایت اور رہنمائی کے آفتاب کی کرنیں چمکنے والی ہیں۔ جس کا اثر قدرتی طور پر یہ ہوگا کہ نفسانی خواہشیں روحانیت کی گرفت میں آجائیں گی۔ مادّی جذبات کی کثافتوں کو رُوحانی لطافتوں کی طاقت سے روند دیا جائیگا اور زندگی کے معمولات میں ایک لطیف قسم کی پاکی اور نفیس قسم کا ہلکا پن محسوس ہونے لگے گا، یہاں تک کہ اس عالمِ ناسوت ہی میں عالمِ ملکوت کی جھلک نظر آجائے گی' جہاں تک اِس رات کے فضائل و برکات کا تعلق ہے آنحضرتؐ کے ارشادات میں ان کا بیان مختلف طریقوں سے آیا ہے۔ مشہور صحابی حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک دن حضورؐ نے خطبہ میں اعلان فرمایا: لوگو! شعبان کا روزہ رکھ کر اپنے جسموں کے قالب کو رمضان المبارک کے روزوں کیلئے ہموار اور صاف ستھرا کرلو۔

ایک دوسری حدیث میں حضرت اُسامہؓ کا بیان ہے' کہتے ہیں میں نے آنحضرتؐ سے عرض کیا: حضورؐ جتنے روزے شعبان میں رکھتے ہیں کسی مہینہ میں نہیں رکھتے ارشاد ہوا اسامہ! یہ بڑا مبارک مہینہ ہے جس کو رجب المرجب اور رمضان المبارک کے درمیان میں رکھا گیا ہے۔ اس میں انسانوں کے اعمال نامے پروردگارِ عالم کے حُضور

پیش کئے جاتے ہیں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میرے عمل ایسی حالت میں پیش ہوں کہ میں روزے سے ہوں۔

صدیقہ عائشہؓ فرماتی ہیں، ایک دفعہ ایسا ہوا کہ رات کو میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا حضورؐ اپنے بستر پر نہیں ہیں، مجھے تشویش ہوئی اور میں حضورؐ کی جستجو میں گھر سے نکل کھڑی ہوئی، کیا دیکھتی ہوں کہ آنحضرتؐ بقیع میں (یہ مدینہ طیبہ کے مشہور و متبرک قبرستان کا نام ہے) تشریف رکھتے ہیں اور آنکھیں آسمان پر جمی ہوئی ہیں۔ مجھے دیکھ کر پہلے کچھ ضروری نصیحتیں فرمائیں پھر فرمایا، عائشہؓ! یہ رات برکتوں والی نورانی رات ہے، اس میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر خاص توجہ فرماتے ہیں جس کے نتیجہ میں ان کی لغزشیں آبِ رحمت کے قطروں سے دھل جاتی ہیں اگرچہ وہ قبیلۂ بنی کلب کی بھیڑ بکریوں کے بالوں کی تعداد سے بھی زیادہ کیوں نہ ہوں (قبیلۂ بنو کلب اپنی بکریوں کی کثرت کے لئے عرب میں مشہور تھا)۔

امیر المومنین حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا شعبان کی پندرہویں شب میں اپنے پروردگار کو خاص طور پر یاد کرو، رات کو دل لگا کر خوب نمازیں پڑھو اور دن کو روزہ رکھو، دیکھو! اس رات میں اللہ تعالیٰ کی شانِ رحمت ایک خاص انداز سے جلوہ گر ہوتی ہے، آسمانِ دنیا سے اعلانِ عام ہوتا ہے، ہے کوئی معافی چاہنے والا کہ میں اس کو اپنی آغوشِ رحمت و شفقت میں لیکر معاف کر دوں! ہے کوئی رزق مانگنے والا کہ اُس کو روزی دوں اور اس کی مانگ پوری کردوں، ہے کوئی مصیبت کا مارا تکلیفوں اور اذیتوں میں پھنسا ہوا کہ اس کی تکلیف اور مصیبتوں میں کام آؤں۔ اِس پوری رات میں رحمت و رافت کے دریا میں اسی طرح موجیں اُٹھتی رہتی ہیں یہاں تک کہ صبح صادق کا نورانی چہرہ چمکنے لگتا ہے۔ اس موقع پر یہ نکتہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اسلام کے عقیدہ کے مطابق پروردگارِ عالم نہ تو آسمانوں کی بلندیوں میں چھپا ہوا ہے اور نہ مٹی چونے کی کسی چہار دیواری میں بند ہے، وہ ہر جگہ ہے اور ہر وقت ہر جگہ سے پکارا جا سکتا ہے۔ مانگنے والا کسی واسطے اور وسیلے کے بغیر اس سے بے جھجک اپنی مرادیں مانگ سکتا ہے، خشکی، تری، جنگل، پہاڑ، بلندی و پستی سب اس کی تجلیوں اور کار فرمائیوں سے معمور ہیں۔ اس کے باوجود اس کی مصلحتِ رحمت کا یہ تقاضا ہوا کہ اس نے اپنے بنائے ہوئے انہی

وقتوں اور ساعتوں میں بعض ساعتوں کو اجابت و قبولیت کے شرفِ خاص سے نوازدیا، زبانِ وحی نے اس حقیقت کو اس پیرایہ میں ظاہر کیا ہے:۔

اللہ تعالیٰ کے لئے اس کے بنائے ہوئے دنوں میں بعض لمحے اس کی نوازشِ خاص کی بارش کے ہوتے ہیں، لوگو! ہوشیار رہو اور رحمت و برکت کے ان لمحوں اور بخشش و کرم کی ان ساعتوں کو خاص طور پر دھیان میں رکھو!

شعبان المعظم کی پندرھویں شب کا شمار بھی انہی خاص لمحاتِ برکت اور نفحاتِ رحمت میں کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس رات کی دعاؤں میں مقبولیت کی ایک خاص شان اور کیفیت پائی جاتی ہے۔ خوش قسمت اور نیک انجام ہیں وہ بندے جو لطفِ خاص کی ان گھڑیوں کی قیمت پہچانتے ہیں اور معبودِ برحق سے اپنی وفاداری کا پیمان استوار کرتے ہیں۔ صحابہ کرام کا معمول یہ تھا کہ اس رات کی برکت اور تقدس کے حقیقی مقصد کو سامنے رکھ کر شعبان کے پورے مہینہ میں عبادتوں اور ریاضتوں کا غیر معمولی اہتمام کرتے تھے اور اس یقین کے ساتھ کرتے تھے کہ اس مہینہ کی یہ ریاضتیں آنے والے ماہِ مبارک کی کٹھن اور نازک ذمہ داریوں کو پورا کرنے کیلئے ایک عمدہ مشق اور کامیاب ریہرسل کا کام دینگی جس کے معنی ہوئے ایک اعلیٰ اور بلند مطمحِ نظر کی خاطر پہلے سے اپنے آپ کو آمادہ و مستعد کرلینا اور ایسی مشق بہم پہنچا لینا جس کے بعد صبر و برداشت کے اس مہینہ کی زبردست آزمائشوں میں ثابت قدم رہا جاسکے۔

آنحضرتؐ کے خادمِ خاص حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں: جیسے ہی شعبان کا مہینہ آتا ہم مسلمان تلاوتِ قرآن پاک کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کرتے اور اپنے مال کی زکوٰۃ نکالنے کی اس لئے کوشش کرتے کہ بے وسیلہ اور نادار لوگوں کو فریضۂ رمضان مبارک کے ادا کرنے میں کمک پہنچائیں۔

یہ ہے اس متبرک رات کی روحانی خصوصیتوں کا ایک مختصر سا خاکہ۔ اب آیئے اس تقریب کے دوسرے گوشوں پر بھی غور کرتے چلیں۔ شبِ برات اپنے ساتھ چند خاص طرح کی رسمیں لاتی ہے جن کو عوام کا ایک طبقہ قومی تہوار کے رنگ میں منانے کی کوشش کرتا ہے اور صورت کچھ ایسی ہوگئی ہے کہ رسوم و قیود کی ان پابندیوں کے علاوہ عام لوگوں کے دماغوں میں شبِ برأت کا کوئی دوسرا نقشہ ہی باقی نہیں رہا'

وہ جب تک ان رسموں پر دل کھول کر عمل نہیں کر لیتے ان کی تشنگی دور نہیں ہوتی. کیونکہ اُن کے خیال میں شبِ برأت نام ہی ان رسموں پر عمل کرنے کا ہے اور اُن کے غور و فکر کی کل کائنات ہی یہ ہے۔ معلوم نہیں حماقت و جہالت کے خمیر سے گندھی ہوئی یہ رسمیں اس رات کی برکتوں میں کب سے شامل ہوئیں، شامل بہرحال ہوگئیں اور اب اِس بگڑی ہوئی صورت کی اصلاح کیلئے جرأت، احتیاط اور حکمت عملی سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ آتش فشانیوں کے اِس ہنگامۂ حماقت اور قومی سرمایہ کی اس بھیانک بربادی کے جواز کی کوئی توجیہہ نہیں کی جاسکتی۔ آتش بازی کی رسم کو ایک لمحہ کے لئے بھی باقی نہ رہنا چاہیئے۔ معاشی اور اقتصادی بدحالی کے اِس دَور میں آگ سے کھیلنے کے اِن خطرناک تماشوں پر بے ضرورت لاکھوں کروڑوں روپے خرچ کرنا ہوش کی بات نہیں ہو سکتی۔ وقت کی آواز یہ ہے کہ اس سرمایہ کو قوم کی تعلیمی اور سماجی ضرورتوں اور سوسائٹی کے بے وسیلہ اور نادار افراد کی نگہداشت پر صَرف کیا جائے۔

قومی تقریبوں اور سماجی کردار میں گہرا تعلق ہے۔ کسی قوم کا تہوار اس کے سماجی کردار کا آئینہ ہوتا ہے جس میں افرادِ قوم کے مزاج اور طبعی خصوصیات کو صاف طور پر دیکھا جاسکتا ہے اور اندازہ لگایا جاتا ہے کہ زندگی اور اس کی ذمہ داریوں سے متعلق اُن کے احساسات و رجحانات کیا ہیں۔ یہی ہے وہ پیغام جو آپ نور کے سانچے میں ڈھلی ہوئی اس رات کی زبان سے سُن سکتے ہیں اور توفیق کے مطابق عمل کر سکتے ہیں۔

"خوشخبری ہو اُن کیلئے جو بات ٹھکانے سے سُنتے ہیں اور اچھی باتوں کی پیروی کرتے ہیں یہی لوگ ہیں جن کو خدا نے سیدھی راہ دکھائی اور یہی ہیں جن کو عقل و فہم کی دولت سے نوازا گیا ہے۔" (قرآنِ کریم)

۲ فروری ۱۹۹۱ء

مولانا ابو الاعلیٰ مودودی مفتی صاحبؒ کی نظر میں

از: انیس الحسن

بانیٔ جماعت اسلامی ہند مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی دہلوی کی شخصیت اپنے مخصوص انداز فکر و تحریر کے لحاظ سے علماء دیوبند کے لیے رد و کد کا ایک مستقل موضوع بن گئی تھی۔ مودودی صاحب کی بعض نگارشات پر سخت ردِّ عمل ہوا اور تحریر و تقریر میں بہت کچھ لے دے ہوئی۔ اُن کی صفائی یا حمایت میں بھی اور برملا مخالفت میں بھی بہت کچھ کہا اور لکھا گیا۔ حضرت مفتی صاحبؒ بجائے خود دیوبندی مکتب فکر کے مسلم نمائندہ اور نقیب تھے اور بڑے معتدل اور متوازن فکر و شعور کے ساتھ اپنی کوئی رائے قائم کیا کرتے تھے۔ چنانچہ بعض مباحث میں مودودی صاحب کے آراء و افکار سے اختلاف رکھتے ہوئے بھی مفتی صاحبؒ نے مودودی صاحب کی ممتاز صلاحیتوں اور عظیم خدمات کو سراہنے میں کسی تنگ دلی سے کام نہیں لیا بلکہ کھلے لفظوں میں اُن کو خراج تحسین پیش کیا۔

ذیل میں ہم مفتی صاحبؒ کی دو تقریروں کا خلاصہ پیش کر رہے ہیں جو انھوں نے مولانا مودودی کی وفات کے بعد تعزیتی اجتماعات میں کی تھیں۔

پہلی تقریر مسلم مجلس مشاورت کے تعزیتی جلسۂ عام میں

"ہم سب مرحوم کی جدائی سے مغموم ہیں۔ آج وہ دنیا میں نہیں ہیں مگر اُن کے کارنامے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے ..... انھوں نے ایک فکر دیا اور اس کی بنیاد پر ایک جماعت قائم کی۔ اُن کا شمار شروع ہی سے بہترین صحافیوں اور انشاء پردازوں میں ہوتا تھا۔ وہ ایک زمانہ تک اخبار الجمعیۃ کے چیف ایڈیٹر رہے۔ اُن ہی دنوں کی بات ہے کہ اخبار الجمعیۃ میں قتل مرتد پر قسط وار ایک طویل مضمون شائع ہوا تھا۔ یہ مضمون اخبار میں حضرت مفتی محمد کفایت اللہ کے نام سے نکلا تھا لیکن درحقیقت اُس کے لکھنے والے یہی سید ابوالاعلیٰ مودودی تھے۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے اُن کو کچھ نوٹ لکھ کر ضرور دیے تھے اور ضروری ہدایات بھی تھیں مگر مضمون کے اصل مرتب اور لکھنے والے مودودی صاحبؒ ہی تھے۔ اس مضمون کی بہت دھوم ہوئی تھی اور عام طور پر اس عالمانہ اور محققانہ تحریر کو بڑی قدر و تحسین کی نگاہ سے دیکھا گیا تھا۔"

....

دوسری یادگار تقریر ۱۲ اکتوبر کو پنجاب یونیورسٹی لاہور کے وسیع ہال میں انگلینڈ، امریکہ، یورپ، ممالک اسلامیہ و عربیہ سے آئے ہوئے ہزاروں ارباب علم و فضل کے اجتماع میں!

"مولانا مودودی مرحوم نے ایک باشعور مبلغ اور داعی کی حیثیت سے تقریباً نصف صدی تک مغربی افکار و خیالات کی اسلام پر یورش اور نکتہ چینی کا جس پامردی کے ساتھ اور مؤثر انداز میں دفاع کیا اُس کی مثال مشکل سے ملے گی نوجوانوں اور مغربی تعلیم یافتہ ذہنوں پر اُن دل پذیر و دل نشین تحریروں کا غیر معمولی

اثر ہوا جس کا اندازہ خود آج کے اس عظیم اجتماع سے بھی ہو سکتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مرحوم نے اپنے زورِ قلم اور اندازِ نگارش سے اسلام اور اُس کی پاکیزہ تعلیمات کو جس دل نشین انداز میں دنیا کے سامنے پیش کیا وہ ان ہی کا حصہ تھا۔ وہ تصنیف و تالیف کے بحرِ ذخار تھے۔ ہو سکتا ہے کہ اُن کی بعض تحریروں سے کسی اسلوبِ تحریر یا تعبیر سے کسی کو اختلاف ہو مگر جس قابلیت اور دلسوزی کے ساتھ انھوں نے اسلام کے مقدس پیغام کو جدید اسلوب اور دلپذیر قالب میں پیش کیا۔ اس پر آفریں نہ کہنا انصاف کے خلاف ہے۔ تفہیم القرآن کی چھ ضخیم جلدوں میں انھوں نے معارفِ قرآنی کے بیان میں جس کاوشِ فکر و نظر اور دیدہ وری سے کام لیا ہے وہ اسلامی لٹریچر کا ایک قیمتی اثاثہ ہے...... اُن کی خدمات اور کارنامے ہماری تاریخ میں بھلائے نہ جا سکیں گے۔"

رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر

مفتی عتیق الرحمن صاحب کی نظر میں

مولانا محمد علی سے کئی بار ملنے کا اتفاق ہوا۔ یاد آتا ہے کہ ان سے سب سے پہلی ملاقات ۱۹۲۰ء میں ہوئی تھی۔ اس سے پہلے جلسوں میں کہیں دیکھا ہوگا۔ مولانا محمود الحسن کا دہلی میں ڈاکٹر انصاری کے مکان پر انتقال ہوا تھا۔ ان کا جنازہ دیوبند لایا گیا تھا۔ صبح کی نماز میں مسجد میں مولانا محمد علی موجود تھے کس وقت آئے، کیسے آئے، کیسے اس قدر جلد پہنچے، کچھ معلوم نہیں۔ یہ بڑے جوش و خروش کا زمانہ تھا، خلافت تحریک زوروں پر تھی، مولانا سبز عبا پہنے ہوئے تھے، داڑھی ان کے چہرے پر بڑی بھلی لگ رہی تھی۔

بعد میں دار العلوم میں تشریف لائے اور فرمائش کے بغیر تقریر کی، حسب عادت اپنی تقریر میں قرآن پاک کی آیتوں کے حوالے دیئے، ان کے ترجمے اور تشریح کی، گلا پڑا ہوا تھا، ایسا پڑ گیا تھا کہ صاف ہونا مشکل تھا مگر اس کی کوئی پروا نہ تھی۔ میری عمر تقریباً بیس سال تھی۔ میں نے بھی مصافحہ کیا۔

کچھ دنوں بعد دار العلوم دیوبند کے بزرگوں میں اختلاف پیدا ہوگیا تھا تاریخی سلسلے میں۔ ہم چند طالب علم ان کی خدمت میں دہلی حاضر ہوئے۔ کوچہ چیلان میں آصف علی مرحوم کے مکان کے قریب ہمدرد پریس تھا۔ اوپر کے

حصے میں خود رہتے تھے۔ لمبا چوڑا پھاٹک تھا (اب میں نے دیکھا تو وہاں کا نقشہ ہی بدل گیا ہے) صبح کا وقت تھا مولانا چارپائی پر بیٹھے تھے۔ ہم نے عرض کیا کہ دیوبند آنا ہے اور اس اختلاف کو دور کرانا ہے۔ کہنے لگے کہ علماء کا معاملہ ہے، میں اس میں کیا کر سکتا ہوں مگر تھوڑی ردوکد کے بعد راضی ہو گئے۔ دیوبند تشریف لائے، معاملے کی اس طرح تحقیق کی جیسے کوئی لائق و فائق جج کرتا ہے۔ حیرت اس بات پر ہوئی کہ دو دن پہلے جو بات ان سے دہلی میں ہوئی تھی انھیں یاد تھی۔ ہم پر بڑا اثر ہوا

۱۹۲۷ء میں پشاور میں جمعیۃ العلماء کا اجلاس تھا۔ سائمن کمیشن کا زمانہ تھا۔ مولانا محمد علی اور مولانا حسرت موہانی میں سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کے سوال پر اختلاف پیدا ہو گیا تھا۔ حسرت موہانی آزادی ہند کے زبردست مجاہد تھے۔ اس کے لیے بڑی سختیاں برداشت کی تھیں۔ مگر وہ سمجھتے تھے کہ سائمن کمیشن کا بائیکاٹ سیاسی لحاظ سے مناسب نہیں ہے۔ جمعیۃ العلماء کی مجلس مرکزیہ کا اجلاس تھا۔ ڈائس پر سبھی لوگ موجود تھے۔ مولانا محمد علی حسرت پر چوٹیں کر رہے تھے اور حسرت موہانی ہنس رہے تھے۔ مولانا محمد علیؒ نے حسرت کا شعر بھی مذاقاً دہرایا ؎

چکی کی مشقت بھی، باکاٹ سے نفرت بھی
ہے طرفہ تماشا حسرت کی طبیعت بھی

سبھی لوگ لطف اندوز ہو رہے تھے۔

کراچی میں علماء نے فتویٰ دیا کہ فوج کی ملازمت حرام ہے۔ مولانا محمد علی پر مقدمہ چلا، سزائیں ملیں۔ اس مقدمے میں مولانا حسین احمد مدنی مرحوم بھی ماخوذ تھے۔ عدالت میں مولانا حسین احمد مدنی نے جو بیان دیا تھا اس سے خوش

ہو کر مولانا محمد علی نے بھری عدالت میں ان کے قدم چوم لیے تھے۔

خلافت تحریک کے زمانے میں مولانا محمد علی نے گاندھی جی کے ساتھ جو نا گپی دورے کیے اس سے کانگریس کی تحریک میں بڑی جان آئی اور اس میں مولانا محمد علی کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ گاندھی جی کہتے تھے کہ میں ان دونوں بھائیوں کی بڑی قدر کرتا ہوں۔ اس وقت مختلف سیاسی جماعتیں ضرور تھیں مگر سبھی پلیٹ فارم سے ملک کی آزادی کا مطالبہ کیا جاتا تھا اور مولانا محمد علی نے ہر پلیٹ فارم سے یہی آواز بلند کی۔ آزادی کے لیے انھوں نے جو جدوجہد کی ہے اس کی تاریخ اس ملک کے سینے پر لکھی ہوئی ہے۔ ان کی آخری تقریر یاد کیجیے۔

"میں یہاں سے آزادی لے کر واپس جاؤں گا، ورنہ زندہ واپس نہیں جاؤں گا"

آپ کو محسوس ہو گا کہ ملک کی آزادی کا جذبہ سب سے غالب جذبہ تھا مولانا کی زندگی میں تحریک آزادی بہت سے نشیب و فراز سے گزری مگر آخر دم تک انھیں وطن کی آزادی بے چین کیے رہی، وہ آزادی کے بہت بڑے حامی اور ہمارے بہت بڑے لیڈر تھے مجھے یقین ہے کہ اس ملک کی تاریخ نکھرے گی اور جب اس میں نکھار پیدا ہو گا تو مولانا محمد علی کا صحیح رول سامنے آئے گا۔

مؤتمر اسلامی کی کانفرنس میں شرکت کے لیے جدہ گیا تھا تو بیت المقدس بھی حاضر ہوا اور مولانا محمد علی کی قبر پر فاتحہ پڑھی۔ قبر بہت اچھی حالت میں ہے کتبہ بھی لگا ہوا ہے۔ رئیس الاحرار مولانا محمد علی، اور غالباً یہ شعر بھی کندہ ہے جس کا پہلا مصرعہ ہے ؎

عالم کو رشک ہے جو ہر کی موت پر

وہ بڑی مقدس جگہ پر دفن ہیں، وہ سرزمین پیغمبروں کا مسکن رہی ہے اللہ انھیں غریق رحمت کرے۔ آمین!

حضرت مفتی صاحبؒ کا ایک یادگار پیغام جس کا ایک ایک فقرہ مخلصانہ نصیحت و بصیرت کا ایک مرقعہ ہے یہ پیغام کل ہند مسلم مجلس مشاورت کی تاسیس کے کچھ عرصہ بعد ملت کے عام ردعمل کو دیکھتے ہوئے جاری کیا گیا تھا ——— مرتب

"شکوہ و ماتم کسی زندہ ملّت کا شیوہ نہیں"

شکوہ و ماتم کسی زندہ ملت کا شیوہ نہیں بلکہ اسے قدم قدم پر اپنی زندگی کا ثبوت خود ہی پیش کرنا ہوتا ہے، مجھے اس سے انکار نہیں کہ حالات بہت پیچیدہ اور سخت ہیں اور ہمارے دل پر بہت سے گھاؤ ثبت ہیں مگر ان کا علاج کسی دوسرے کے کیے سے نہیں ہوسکتا بلکہ جو کچھ کرنا ہوگا خود ہی کرنا ہوگا۔

آپ نے قرآن مجید میں قوموں کی زندگی اور انقلاب کا یہ ضابطہ پڑھا ہوگا کہ خدا کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلا کرتا جب تک کہ وہ قوم خود ہی اس کا ارادہ نہ کرلے۔ مومن اور غیر مومن کسی کے سلسلہ میں اللہ کے اس ضابطہ میں کوئی امتیاز نہیں ہے۔ یہ دنیا اسباب و علل کے قانون پر قائم ہے جو انسانی گروہ ارادہ و عمل کے جوہر سے عاری ہوگا اسے زوال نصیب ہوگا۔ خواہ اس کی تعداد کم ہو یا زیادہ اور جس میں یہ صفات پائی جائیں گی اسے کامیاب ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

میں ہندوستان کے مسلمانوں سے قطعاً مایوس نہیں۔ ان کی ایک

ایک بستی میں ایسے سیکڑوں دل موجود ہیں جو اسلام کو چلتی پھرتی حالت میں اور مسلمانوں کو اس کا عملی نمونہ دیکھنا چاہتے ہیں مگر سوال یہ ہے کہ ان تڑپتے ہوئے دلوں کو کس طرح جوڑا جائے۔ ہمارے یہاں الحمدللہ مسلمانوں کی متعدد تنظیمیں کام کر رہی ہیں اور ان ہیں لاتعداد ایسے افراد موجود ہیں جن کے تقدس اور تقوی کی قسم کھائی جا سکتی ہے۔

میں اس زوال اور افلاس کے عالم میں بھی پورے دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ مخلص اور بے لوث کارکنوں کا جو سرمایہ مسلمانانِ ہند کے پاس موجود ہے اس کی مثال اس ملک میں کسی گروہ یا جماعت کے پاس نہیں پائی جاتی۔ لیکن امت ان جماعتوں سے کہیں زیادہ وسیع ہے اور اس کی ذمہ داریاں ان سے زیادہ وسیع ہیں جو اب تک ہماری تمام تنظیموں نے لے رکھی ہیں۔ اس لیے ہم نے چاہا تھا کہ ہماری ان تمام تنظیموں اور ان سے ماوراء ہمارے تمام مسالک اور مکاتب خیال کے اکابر کا ایک فورم ایسا ضرور ہونا چاہیے جہاں ہم سب بیٹھ کر اپنے حالات کا جائزہ لے سکیں، ایک دوسرے کے کاموں میں ہاتھ بٹا سکیں اور مشترکہ امور میں مل جل کر آگے بڑھ سکیں۔ مسلم مجلس مشاورت اسی فورم کا دوسرا نام ہے۔

یہ بڑی بدقسمتی کی بات ہے کہ غیر مسلموں کے ایک حصے نے اس اجتماع کو اپنا حریف سمجھا، ادھر مسلمانوں کے بھی ایک طبقہ کو یہ اندیشہ ہے کہ مجلس مشاورت کہیں انھیں اپنے اندر جذب نہ کر لے اور ان کا جداگانہ وجود اور قیادت خطرہ میں نہ پڑ جائے۔ حالاں کہ یہ اجتماع نہ کسی کا حریف تھا اور نہ کسی کی انفرادیت کو ختم کرنے والا ــــ اپنے ملک کے غیر مسلموں کو ہم ایک طرح سے مظلوم سمجھتے ہیں وہ عام مسلمانوں سے کچھ مخصوص تاریخی پس منظر کی وجہ سے بدگمان ہیں اور اس

بدگمانی کے باعث ان کی اکثر صلاحیتیں اور قوتیں ان مسائل پر صرف ہوتی رہتی ہیں جو صرف ایک پسماندہ اور آپس میں پھٹی ہوئی قوم کا خاصہ ہیں۔

ان کی اس سے بھی بڑی مظلومیت یہ ہے کہ ان کی رہنمائی کی باگ ڈور کسی اخلاقی قیادت کے بجائے سیاسی مفادات، زبان و ذات کی خود غرضی اور گروہی اغراض رکھنے والے لوگوں کے ہاتھوں میں جا چکی ہے۔ ایک عام غیر مسلم کے دل پر پھاہے رکھنے والا کوئی نہیں۔ ہماری تمنا تھی کہ مسلمان اس طرح آگے آتے کہ ان غیر مسلموں کے دلوں میں بھی ڈھارس پیدا ہوتی اور وہ سمجھتے کہ چشتی اور محبوب الٰہی بلکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے واقعات بیان کرنے والے محض تاریخ انسانی کا کوئی باب نہیں بلکہ مشاہدہ کی آنکھ آج بھی اس سیر و کردار کو دیکھ سکتی ہے۔

رہا مسلم تنظیموں کا معاملہ تو انھیں بھی یہ سمجھنا چاہیئے تھا کہ جماعتوں کے تنگ دائرے سے نکل کر انھیں امت کا وسیع تر دائرہ میسر آرہا ہے اور اس طرح ان کی صلاحیت کار کو ایک عظیم میدان فراہم ہو رہا ہے جہاں وہ باہمی تعاون سے اپنی استعداد اور قربانی کی حد تک آگے بڑھ سکتے ہیں۔ کام اصلاح کا ہو یا دعوت و تبلیغ کا، تعلیمی ہو یا اقتصادی اور اس کا دائرہ سیاست تک پھیلا ہوا ہو یا علم و دانش کے ارتقاء تک، ہر ایک کو اپنی اپنی دلچسپیوں کے لحاظ سے پھیلاؤ، وسعت اور گہرائی و گیرائی ملتی جاتی اور نئے نئے رفقائے کار فراہم ہوتے، تاہم یہ غلط فہمیاں غیر فطری بھی نہیں۔ جن لوگوں کی بدگمانی دور ہو گئی ہے وہ اس فورم کی اہمیت کو سمجھتے ہیں اور جو ابھی اس سے دور ہیں ان کی غلط فہمیاں بھی انشاء اللہ دور ہو جائیں گی۔ البتہ جن کی نیتوں میں کوئی کھوٹ ہے، ان کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔

***

مولانا غلام محمدؐ نور گت کے نام

(بعض ذاتی خطوط کا اقتباس)

مخلص و محترم جناب مولانا دام مجدہم!

السلام علیکم و رحمۃ اللہ برکاتہ

گرامی پہونچا۔ پچھلا لفافہ مل گیا تھا جواب میں زیادہ تاخیر ہوگئی، معذرت خواہ ہوں۔ طبیعت خراب رہتی ہے اور کاموں کا بھی ہجوم رہتا ہے۔ ۱۲ر ستمبر کو کلکتہ کا سفر ہوا اور ۳ر اکتوبر کو واپسی ہوئی۔ اس دفعہ یہ سفر تین چار ماہ موخر ہوگیا تھا۔ یوں ہی آج کل ہوتی رہی اور موقع نہ ملا، کلکتہ سے آکر بخار آگیا۔ اسی حالت میں دیوبند کا سفر ہوا وہاں ۱۱ر، ۱۲ر اکتوبر کی دارالعلوم کی مجلس شوریٰ تھی، غنیمت ہے خیریت سے ہوگئی ورنہ ارباب تقدس ہنگاموں پر اتر آتے ہیں۔ ایک صد روپے کا ڈرافٹ مولانا احمد علی صاحب قاسمی کو دیدیا گیا تھا۔ شاید ان کا خط بھی ملا ہو۔ کہتے ہیں اخبار برابر جاتا ہے۔ ہوسکتا ہے ڈاک کی گڑبڑ ہو؟ میری رائے میں تو ندائے مشاورت نکال کر مولانا نے ناتجربہ کاری کا ثبوت دیا ہے۔ پہلے صرف نمونے کا پرچہ نکالنا چاہیئے تھا پھر وسائل مہیا ہونے کے بعد ہمت کرنی چاہیئے تھی۔ بہرحال کارکنوں کا بھی لحاظ کرنا پڑتا ہے۔ میں اپنے حالات میں گرفتار ہوں۔ محمد ایوب کا کیا رہا؟ توقع ہے خرچ بھیج رہے ہوں گے۔

محمد اسحاق نے ٹھیک ہی کیا۔ خیال تو ہے اور یہ بڑی چیز ہے۔ لندن والے کی اہلیہ کمال کرتی ہے۔ اس کے لیے دل سے دعا نکلتی ہے۔ یہ معلوم ہوکر کہ مانگرولیا صاحب اور فاطمہ بہن عمرے کے لیے گئے ہیں۔ خوشی ہوئی۔ اچھا ہے ہندوستان بھی آجائیں، ان کے لیے کیا مشکل ہے۔ صرف ارادے کی دیر ہے، روپیہ کے انبار ہیں اور خرچ کے موقعے محدود ہیں۔ میں نے گزشتہ سال حاجی حسام الدین صاحب کے حج بدل کے لیے عرض کیا تھا۔ آپ خاموش ہوگئے۔ اس وقت تو لکھا تھا کہ آئندہ سال دیکھا جائے گا۔ بات یہی ہے کہ ہر چیز کا وقت مقرر ہے۔ انسان از خود کچھ نہیں کرسکتا۔ عمید الرحمٰن سے کفایت المفتی کے لیے کہدیا تھا۔ پھر تقاضا کردوں گا۔ پیسوں کا حال مولوی محمد ظفر احمد صاحب کے کسی عزیز سے معلوم ہوگا۔ کٹرودڑ کے حالات تعلق خاطر ہے۔ ان شاء اللہ سب کام رفتہ رفتہ ہوں گے۔ زرنا کی کیفیت مفتتم ہے، شاید زمین کا وہ معاملہ اب تک نہیں ہوسکا۔ مُنّی سلام عرض کرتی ہے آپ کی خدمت میں بھی اور اہلیہ محترمہ کی خدمت میں بھی۔ حالات اور خیریت سے مطلع فرماتے رہا کریں۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی بات بھی ہوکر رہ گئی، ان کے لیے صرف ایک سال کا انتظام ہوجاتا۔ کالج کے آدمی ہیں اور نہایت لائق و فائق شخص ہیں۔ مولوی محمد سورتی صاحب کہیں نظر آجائیں تو ان کو بھی سلام پہونچے۔

عتیق الرحمٰن عثمانی

۱۷ اکتوبر ۱۹۸۰ء — برہان آفس اردو بازار دہلی ۶

مخلص و محترم جناب مولانا دام مجدہم العالی السلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہ

گرامی ملا، شدید انتظار تھا، اُس روز تو کمال ہی ہوگیا۔ظہر کے بعد آپ کا لایا۔
آپ کے بھیجے ہوئے آدمی کا انتظار کیا۔یہاں تک کہ مغرب ہوگئی۔ اگرچہ مایوسی ہوگئی تھی،
پھر بھی خیال ہوا کہ شاید اسٹیشن پہنچ جائیں۔ٹرین میں بیٹھ چکا تھا کہ لکھنؤ جانے والا ایک شخص
مل گیا اور میں آپ کی برتھ پر گیا۔ پیسے اگرچہ اُس نے سادہ ٹکٹ کے دیئے۔لکھنؤ
میں بھی آپ کا شدید انتظار تھا۔آپ کا دوسرا خط ایسے وقت پہونچا تھا کہ اس کا
جواب آپ کو نہیں مل سکتا تھا، بہرحال —— امید ہے کہ آپ بہ ہمہ وجوہ بخیرو
ہوں گے۔مجھے تو یہی خبر نہیں تھی کہ قاری رمضان خاں حج کو گئے ہیں۔شاید
ابھی تک واپس نہیں ہوتے۔ورنہ برائے ملاقات آتے۔محمد یونس کے حالات
معلوم ہوکر افسوس ہوا سپرد کردہ امانت کی بات سمجھ میں نہیں آئی۔شبیر احمد کی اہلیہ کے لئے
دعا کرتا ہوں۔ اللہ نے اس کو اولادِ نرینہ سے نوازیں۔انشاء اللہ یہ دولت ملے گی۔محمد ایوب
کی طرف سے تردّد ہے۔تازہ صورت تحریر فرمائیں۔مولوی سلیمان نورگت مرحوم کے
بچوں کے حالات معلوم ہوکر مسرت ہوئی جب بھی خط تحریر فرمائیں میری طرف سے دعا
لکھیں۔مرحوم یاد آتے ہیں۔حاجی ابراہیم مانگرولیا اور فاطمہ بہن کو بھی سلام تحریر فرمائیں
ان کے یہاں تو اس طرح کے سفر معمولی بات ہے۔مولوی محمد سورتی صاحب کی بات آپ نے
ٹھیک تحریر فرمائی ہے۔اظہر شاہ لکھوں گا۔لکھنا ہی مشکل ہوتا ہے۔نگاہ موٹی ہوگئی ہے۔سورتی صاحب
کو بہت بہت سلام۔ حد درجہ مخلصانہ تعلق رکھتے ہیں اور مضبوط شخص ہیں۔ان کے
دوروزات میں گاندھی نگر کا ایک چکّر ہونا چاہیئے۔ میری طبیعت پچھلے دنوں زیادہ
گڑبڑ رہی۔ اب غنیمت ہے۔ کمزوری بہرحال بڑھ رہی ہے۔مُنّی کی طرف سے

آپ کو اور اہلیہ محترمہ کو آداب وسلام، آپ کے حالات سے ہمیشہ ہی تعلق خاص رہتا ہے۔ اس دفعہ کارڈ ہی سامنے تھا وہی لکھدیا۔ آپ نے حاجی حسام الدین صاحب کی طرف توجہ نہیں فرمائی۔ صالح شخص ہیں اور حج بدل کے متمنی۔

برہان آفس اردو بازار دہلی	فقط والسلام
۱۰ر نومبر ۱۹۸۰ء	عتیق الرحمٰن عثمانی

مخلص ومحترم جناب مولانا دام مجدہم العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گرامی نامہ وقت پر پہونچ گیا۔ آپ کا پہلا خط جس میں میاں محمد ایوب کے حالات تحریر فرمائے تھے ٹھیک ایک مہینہ کے بعد غالباً ۲ر اپریل کو پہنچا تھا۔ میاں محمد ایوب کے تازہ حالات سے بے خبر تھا۔ اس لیے آپ سے کوئی ذکر ہی نہیں آیا، بہرحال سخت افسوس ہوا۔ سنا ہے کوئی راستہ نکلا ہے، اللہ تعالیٰ بہتر فرمائے، میری طبیعت خراب چل رہی ہے۔ کچھ بہتر ہوا تھا کہ مسلم پرسنل لا بورڈ کی میٹنگ میں حیدر آباد کا سفر پیش آگیا۔ موسم سخت اور سفر طویل تھا برداشت نہ ہوسکا اور یہاں پہنچ کر نقرس کا شدید دورہ ہوگیا۔ کل سے کچھ فرق ہے، مگر ابھی کافی ہے اور کھنچاؤ تناؤ بھی۔ واقعہ یہ ہے اب سفر ناقابل برداشت ہوگیا آپ کے لیے بہرحال حاضر ہوں، جو حکم دیں۔

امید ہے آپ بہ ہمہ وجوہ بخیر وعافیت ہوں گے۔ دعائے خیر وبرکت کرتا ہوں۔ ری یونین کا خط رکھا رہ گیا تھا۔ کئی روز بعد ڈالا گیا۔ خیال ہو رہا

ہے کہ فرانس کے انتخاب کا "ری یونین" کے معاملات پر اثر پڑ سکتا ہے ۔ مولوی محمد یوسف نے یوں ہی راستہ ناپا بے کار گئے اور آ گئے"۔ مفتی ضیاء الحق صاحب مدرسہ امینیہ سے بے تعلق ہو گئے ہیں ۔ حالات بہت خراب ہو گئے تھے ۔ میں حیدر آباد تھا کہ مزید کام خراب ہو گیا ۔ ان حالات کے باوجود مفتی صاحب "ری یونین" کا ارادہ کر رہے ہیں ۔ اب چندہ مدرسہ امینیہ کے لیے تو نہیں ہو سکتا ۔ قبرستان مہندیان میں ایک مدرسہ قائم کر رہے ہیں ۔ شاید ضیاء العلوم کے نام سے ، مدرسہ امینیہ کے اکثر اساتذہ مفتی صاحب کے خلاف ہو گئے ہیں اور مجلس کے بعض ممبران سے بھی ان کی سخت جھڑپ ہو گئی ہے ۔ مفتی صاحب برداشت سے کام لیتے تو شاید یہ نوبت نہ آتی ۔ معاملہ یہ تھا کہ مفتی صاحب کا کہنا تھا "یا تو مجھے مستقل کرو ورنہ علیحدہ کر دو ۔ جو ممبر مفتی صاحب کے مخالف ہیں ۔ انہوں نے کہا ابھی تعلیم کے دو ماہ باقی ہیں ۔ نتیجہ دیکھ کر استقلال کا فیصلہ ہوگا ، افسوس کوئی صورت نہ بنی اور مفتی صاحب نے استعفا دے دیا ۔ مفتی صاحب کے استعفے کا طبیعت پر بہت اثر ہے ، اپنے رفیق خاص ہیں ۔ کام کے آدمی ہیں مگر مصلحت اندیش نہیں ہیں ۔ اس وقت کڑوا گھونٹ پی لیتے اور کام کرتے رہتے ۔

ادھر ری یونین کے سفر کی بھی الجھن پیش آئی ۔ ممبران نے سفر کی اجازت نہیں دی جو میری رائے میں دینی چاہیے تھی ۔ ان دنوں مولوی عبدالحق میاں صاحب یہیں ہیں ، آج صبح دیوبند گئے ہیں آج واپس ہوں گے خیریت اور تازہ حالات سے مطلع فرمائیں ، میاں محمد ایوب کا کیا حال ؟ محمد اسحاق سلمہ کا خط آیا ہوگا اور ان شاء اللہ ان کا کام ٹھیک ہی ہوگا "ری یونین" سے میرا خط پہنچنے کی اطلاع آئے تو مجھے تحریر فرمائیں ۔ مانگرولیا صاحب اور فاطمہ بہن کو سلام لکھیں ——— حالات سے سخت پریشان ہوں ۔ آخر یہ گاڑی کیسے چلے گی "

مُنّی کی طرف سے سلام آداب کہتی ہے، مولانا آئے بھی اور واپس بھی ہو گئے اور میں کوئی خدمت نہ کر سکی، اہلیہ محترمہ کو سلام، ببرا بھی اور منّی کا بھی والسلام

۱۳ رمئی ۱۹۸۱ء
عتیق الرحمٰن عثمانی

دفتر برہان، اردو بازار، دہلی

خط کی خرابی کی معذرت، یہ سطریں خود ہی لکھی، مولانا محمد سورتی صاحب کو سلام پہنچا دیں اور حافظ داؤد کو بھی۔

مخلص و محترم جناب مولانا زید مجدہم تعالیٰ السلام علیکم ورحمتہ اللہ برکاتہ۔ مکرمت نامہ پہنچا تھا۔ جواب میں تاخیر ہو گئی۔ پچھلے دنوں تین چار روز کے لیے علی گڈھ جانا ہوا تھا وہاں یونیورسٹی کے نازک مسائل چل رہے ہیں۔ علی گڈھ ہی میں بائیں ٹانگ میں درد شروع ہو گیا تھا۔ یہاں آتے آتے بڑھ گیا۔ وہی نقرس کی تکلیف ہے۔ دس بارہ روز تک معذوری رہی کیونکہ درد گھٹنے کے جوڑ میں تھا۔ بیٹھنا اور سجدہ کرنا دشوار ہو گیا تھا۔ شکر ہے دو تین روز سے افاقہ ہے۔ روزے بہرحال ہوتے رہے۔ مولانا علی میاں سے علی گڑھ میں بات ہوئی تھی، فرماتے تھے جن دنوں ممبئی میں قیام ہو۔ وہیں سے ترکیسر کا پروگرام بن سکتا ہے۔ خیال رکھوں گا اور آپ کے ساتھ چلوں گا ایوب سلمہٗ کے حالات معلوم ہو کر اطمینان ہوا۔ انشاء اللہ کامیابی کی توقع ہے۔ آپ کی وجہ سے بہت خیال رہتا ہے ——— حالات سے سخت پریشان ہوں۔ قاسم غالباً واپس ہو گئے ہوں گے۔ مفتی ضیاء الحق صاحب ری یونین سے واپس آگئے تھے۔ ان دنوں مہتمم صاحب کے ساتھ ممبئی ہیں۔ شاہ ولی اللہ کے قبرستان مدرسہ قائم کیا ہے۔ جدوجہد کے آدمی ہیں۔ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ زرنا اور کردو

کے حالات معلوم ہوئے اور کرود کی تعمیر مسجد کی تکمیل سے مسرت ہوئی انشاءاللہ جلد اس کے دیکھنے کا موقع ملے گا۔ مولانا سلیمان نورگت کے بچوں کو دعا لکھیں، شیخ الحدیث غالباً افریقہ چلے گئے ہوں گے۔ فاطمہ بھی اور حاجی مانگرولیا صاحب کو بھی سلام تحریر فرمائیں۔ امید ہے محمد اسحاق سلمہٗ کا کام اور بڑھے گا اور وہ آپ کی بھرپور خدمت کرسکیں گے۔ کھیتی باڑی کا کیا حال ہے۔ مجھے اکثر یہ خیال آتا ہے کہ ماشاءاللہ آپ کے گھر کے اخراجات بہت ہیں اور اس نسبت سے آمدنی کم ہے اللہ کارساز مطلق ہیں، اللہ تعالیٰ نے آپ کو بڑا دل دیا ہے اور یہ بڑی نعمت ہے پچھلے دنوں مولانا محمد سورتی کھڑے کھڑے برائے ملاقات آئے تھے۔ بہت خوش تھے کہتے تھے، کیبنٹ منسٹر ہونے کی توقع ہے۔ گاندھی نگر کی دعوت دے گئے تھے، تعلق اخلاص رکھتے ہیں۔ ایک دفعہ ان کے دور میں گاندھی نگر جانا چاہیے، مناسب وقت پر پروگرام بنالیں۔ منّی آپ کی خدمت میں اور والدہ محمد اسحاق کی خدمت میں سلام عرض کرتی ہے۔ صرف اس غریب بچّی کی وجہ سے گھر کھلا ہوا ہے۔ حالات اور خیریت سے مطلع فرمائیں۔ موقع ملے تو علی میاں کو بھی خط تحریر فرمادیں۔ یاد دہانی ہوجائیگی۔

فقط والسلام   عتیق الرحمٰن عثمانی

دفتر برہان، اردو بازار دہلی   ۳ رمضان المبارک ۱۴۰۱ھ مطابق ۶ جولائی ۱۹۸۱ء

مفتی صاحبؒ کے نام اہم اور تاریخی شخصیتوں کی
کچھ اہم اور تاریخی تحریریں ۔

خطوط شیخ محمد عبداللہ
خطوط ڈاکٹر سید محمود
خطوط مولانا محمد مسلم (سابق مدیر دعوت، دہلی)

CHIEF MINISTER
JAMMU AND KASHMIR

سری نگر
نمبر cms/ l.ud-27/80 F
۵؍ اگست ۱۹۸۰ء

مکرم مفتی صاحب!

السلام علیکم!

آپ کا خط مورخہ ۱۴ جون ۱۹۸۰ء موصول ہوا۔ اس کے ساتھ اکیڈمی آف اجتہاد کا جو میمورنڈم تھا وہ میری نظر سے گزرا ہے جیسا کہ آپ نے خط میں خود بھی اعتراف کیا ہے، یہ معاملہ انتہائی نازک ہے اور اس کے ساتھ بحیثیت مجموعی پوری امت مسلمہ کی ذہنی و جذباتی وابستگی ہے۔ تاریخ اسلام اس بات کی شاہد ہے کہ اجتہاد کے نام پر کئی تحریکیں پیدا ہوئیں اور اس طرح کی بعض کوششیں بالآخرامت کی تفریق اور تقسیم پر جاکر ختم ہوگئیں۔ ظاہر ہے ایک ایسی امت جو پہلے ہی کئی فرقوں اور خانوں میں بٹی ہوئی ہے اور جس کی اجتماعی قوت کا سراغ صدیوں سے غائب ہے، اس میں اجتہاد کی کوئی بھی نئی آواز مزید تفرقات پیدا کر سکتی ہے۔ ایسے ملکوں میں جہاں حکومت مسلمانوں کی اپنی ہے، وہاں اگر اس قسم کا کوئی خیال ابھرے تو حق بجانب ہوگا، لیکن ہمارے ملک میں جہاں کہ مسلمانوں کی اقلیت ... معاشی، اقتصادی اور سماجی مسائل میں الجھی ہوئی ہے اور جسے اپنا حال اور مستقبل چاروں طرف سے ابر آلود دکھائی دیتا ہے، اس طرح کی کوشش کے منفی نتائج ہی برآمد ہوں گے۔ اس کی وجہ سے مسلمانوں کے درمیان نئے نئے اختلافات سر ابھاریں گے جس کی وجہ سے مسلمانوں کی اجتماعی صلاحیت پر حرف آنے کا احتمال بھی ہوسکتا ہے۔

جیسا کہ میں کئی بار آپ کو لکھ چکا ہوں، اس وقت ہندوستانی مسلمانوں کے لئے سب سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ وہ متحد ہوکر اپنے دینی و ملی مفادات کا تحفظ کریں اور اقتصادی و سماجی سطح پر ان کے ساتھ جو کچھ بھی نابرابری ہے اسے دور کرنے کے لئے حکومت سے رجوع کریں۔ اس کے لئے پُرامن طور پر جد وجہد کا راستہ اپنانا ہوگا اور ایسا کرتے وقت مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے درمیان اختلافات کو پس پشت ڈال کر ایک اجتماعی سوچ کی آبیاری کرنی ہوگی۔ اس سلسلے میں ہمارے دانشور اور علماء بہت ہی بہتری خدمات انجام دے سکتے ہیں۔ اس وقت بدقسمتی سے حالات کی جو ناسازگار صورت ہے اس کے لئے بڑی حد تک میں خود مسلمانوں کو ہی ذمہ دار سمجھتا ہوں کیوں کہ وہ اپنی اقتصادی و سماجی ابتری کا احساس کرنے کی بجائے ایسے الجھے مسائل میں الجھ جاتے ہیں جن کی افادیت بدلتے ہوئے حالات میں بہت ہی کم ہے۔ اسی نکتہ نظر سے میں اکیڈمی آف اجتہاد کے قیام کی سعی کو بھی دیکھتا ہوں۔ میمورنڈم میں جن باتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے میں ان کی اہمیت سے انکار نہیں کرتا، لیکن یہ باتیں اس پُرآشوب دور میں ہندوستانی مسلمانوں کی کیا مدد کر سکیں گی، ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب شاید ہی مل سکے۔

مجھے امید ہے کہ میری ان معروضات کی سچائی کو آپ بخوبی محسوس کریں گے۔ زیادہ حد ادب!

آپ کا مخلص
(دستخط)
(شیخ محمد عبداللہ)

جناب مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی
۴۳۰۳، اردو بازار، جامع مسجد
دہلی ۱۱۰۰۰۶

CHIEF MINISTER
JAMMU AND KASHMIR

CMS/Gen1-27/79

سرینگر
تیوڈیسے (توی)
۶ جنوری ۱۹۷۹ء

محترم مفتی صاحب!

السلام علیکم!

آپ کا خط مؤرخہ ۱۱ دسمبر ۷۸ء موصول ہوا جس میں آپ نے اسلامک سنٹر کے قیام سے متعلق میری تجویز پر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ جب میں نے یہ تجویز ملت کے وسیع تر مفاد میں پیش کی تھی میری خواہش ہے کہ یہ سنٹر ایک ٹرسٹ کی صورت میں قائم ہو اور اس میں سبھی ریاستوں کو مسلم آبادی کے تناسب کے لحاظ سے نمائندگی ملے اس طرح یہ اسلامک سنٹر ملت کی اجتماعی فلاح کا مرکز بن جائے گا اور اسی بات کو سامنے رکھتے ہوئے ٹرسٹ کے لئے وسائل جمع کرتے وقت سبھی ریاستوں میں یکساں کوشش ہونی چاہئے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس نیک کام میں شریک ہوسکیں۔ اس سلسلے میں ہر ایک ریاست میں حسب استطاعت مالی وسائل جمع کرنے کی کوشش ہونی چاہئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ پہلے مرحلے کے طور پر یہی کرنا ضروری ہوگا اور جب پورے وسائل کا اندازہ ہوجاتا ہے تو پھر دوسری باتوں کا تعین زیادہ آسانی سے ہوسکے گا۔

جہاں تک ادارۂ ابوالسوسائٹی کے دفتر کا تعلق ہے یہ بھی سنٹر کی عمارت میں ہوسکتا ہے لیکن اس کا حتمی فیصلہ ٹرسٹ کو کرنا ہوگا۔ دراصل اس طرح کے سبھی امور ٹرسٹ کے قیام کے بعد اجتماعی فیصلے کی صورت میں طے ہوں گے۔

آپ نے شہر شاہی مسجد کی جو تجویز رکھی ہے وہ بھی نہایت مناسب ہے۔ مستقبل میں اس ادارے کے فروغ کے پیش نظر اس کے لئے زیادہ سے زیادہ زمین حاصل کی جانی چاہیے۔ بہرحال آپ خود موقعہ پر موجود ہیں اور اس سلسلے میں بہتر فیصلہ کرسکتے ہیں۔

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

آپ کا مخلص

(دستخط)

(شیخ محمد عبداللہ)

جناب مفتی عتیق الرحمان عثمانی،
جامع مسجد،
دہلی ۶-۱۱۰۰۰۶

ڈاکٹر سید محمود کا ایک بصیرت افروز مکتوب

مرحوم ڈاکٹر سید محمود اپنی ممتاز علمی شخصیت رکھنے کے ساتھ تحریک آزادی ہند کے صف اول کے رہنماؤں میں سے تھے تقسیم ہند سے پہلے وہ برسوں نہرو، خان عبدالغفار خاں، پٹیل، کرپلانی اور مولانا آزاد وغیرہ کے ساتھ کانگریس ہائی کمانڈ کے رکن رہے۔ آزادی کے بعد کئی سال تک نہرو وزارت میں وہ وزیر خارجہ بھی رہے اور پارلیمنٹ کے بزرگ ممبر بھی۔ وسط ہند میں کٹنی، جبلپور، ساگر وغیرہ کے ہولناک فسادات کے بعد ۱۹۶۱ء میں مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ نے جب پہلا کل ہند مسلم کنونشن نئی دہلی میں بلایا تھا (جس پر پنڈت نہرو بھی تلملا کر رہ گئے تھے) اُس کی صدارت ڈاکٹر سید محمود ہی نے فرمائی تھی۔

مسلم مجلس مشاورت کی تاسیس اور اُس کی صحت مند رہنمائی میں ڈاکٹر صاحب کی دل سوزیوں کا بڑا دخل تھا۔ مجلس کے پہلے صدر بھی وہی تھے۔ چند برسوں کے بعد اپنی صحت اور حالات سے مجبور ہو کر انھوں نے مجلس سے یکسوئی اختیار کر لی تھی۔ اور مفتی صاحب کو مجلس کی ذمہ داری سپرد کرتے ہوئے اپنے دل کی واردات ایک طویل خط میں تحریر فرمائی تھی جو ذیل میں شریک اشاعت کیا جا رہا ہے۔ یہ خط بڑی درد انگیز

اور سبق آموز حقیقتوں کا ایک یادگار مرقعہ ہے ــــــ انیس الحسن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محترمی جناب مفتی صاحب! السلام علیکم

آج آپ کا گشتی خط ملا کہ آپ مرکزی مجلس مشاورت کا ایک ہنگامی جلسہ لکھنؤ میں ۲۰ر۲۱ر اپریل کو کرنا چاہتے ہیں اور مجھے مدعو کیا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ مارچ ۱۹۶۷ء سے یعنی گزشتہ الکشن کے فوراً بعد میں نے مجلس مشاورت کے کاموں سے بالکل دل چسپی لینا چھوڑ دیا اور آپ کو کاموں کا پورا چارج دیدیا اس وقت سے جو کچھ مجھ سے ہوسکا آپ کا ذکر کرتے رہے۔ میں نے کئی بار استعفاء بھی پیش کرنا چاہا، لیکن آپ اور مولانا سید علی میاں صاحب اور حضرت مولانا ابو اللیث صاحب نہایت اصرار کے ساتھ مانع آتے رہے۔ آپ حضرات کا اصرار شدید تھا۔ آپ لوگ سمجھتے تھے کہ استعفاء شائع کرنے سے ملت میں اختلاف برپا ہوگا اور شاید گروہ بندیاں ہوجائیں گی، میں عملاً تو مجلس کے کاموں سے ایک سال سے علیحدہ رہا۔ لیکن پبلک میں اپنا استعفا مجلس کی صدارت سے پیش نہ کیا۔ چاہے یہ بھی میرا قصور تصور ہو۔ مجھے اس کے مان لینے میں کوئی عذر نہیں، آپ بزرگانِ وقت ٹالتے رہے کہ آج نہیں کل، کل نہیں پرسوں۔ چوں کہ آپ صاحبان کی بزرگی، فضیلت و علمیت اور قومی درد کا مجھے پورا احترام تھا اور ہے، اس لئے میں آپ حضرات کے فرمانے کی تعمیل کرتا رہا اور آپ کے اس اصرار کو ملت کی بھلائی کا باعث سمجھ کر تعمیل کرتا رہا، چاہے اس تعمیل سے مجھے اذیت ہی کیوں نہ پہنچی ہو۔ اس کے بعد آپ صاحبان کئی مختلف قسم کی تجویزیں بھی پیش کرتے رہے مگر وہ تجویزیں صرف گفتگو تک محدود رہیں، کبھی عملی جامہ نہ پہنا۔ اب میں مجلس مشاورت

کی صدارت سے ادب اور دلی افسوس کے ساتھ استعفا پیش کرتا ہوں.
اس کے وجوہ کا آپ حضرات کو پورا پورا علم ہے۔ یہ ایک طولانی قصہ ہے، مختصر یہ کہ ہم الیکشن کا شکار ہو گئے۔ لکھنؤ میں جس بلند و اخلاقی عزم و ارادہ کو لے کر اٹھے اور جو وعدے ملک و قوم سے کیے تھے اور جس کا عملی جامہ پہنانے کے لیے نقشہ بنا، دو برس تک ملک کا دورہ کرتے رہے، اس خواب کی تعبیر کا وقت اب آیا تھا، مگر افسوس الیکشن کا وقتی جوش اس بلند اخلاقی و تعمیری کام کے جوش پر غالب آ گیا۔

ہمارا آخری دورہ جس شان کا ہوا اور وہاں کے ہندو مسلمانوں نے جس جوش و خروش اور ہم آہنگی سے ہمارا خیر مقدم کیا اور ہم کو معزز ہندو صاحبان نے 'ملک کا آئندہ ثالث' کہہ کر اس کام پر مبارک باد دی۔ مگر آپ جانتے ہیں ہمارا وہ دورہ، الیکشن کا دورہ تھا گو اس سے ہم شروع میں لاعلم تھے۔ دوسری جگہ کانگریس دشمنی یا نفرت کا جذبہ اس وقت غالب آ گیا اور اس حد تک غالب آ گیا کہ مرکزی مشاورت کے لاجواب اور اخلاقی حیثیت سے بلند رزولیوشن کی مخالفت ہوئی جو الیکشن کے بارے میں تھا۔ بعض مشہور انگریزی اخبارات نے مرکزی رزولیوشن کے متعلق UNEXCEPTIONABLE کہا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ آج تک کسی مسلم یا کسی سیاسی پارٹی نے ایسا رزولیوشن الیکشن کے بارے میں پاس نہ کیا تھا۔ اس رزولیوشن کی عملی مخالفت نے مجلس مشاورت کے اعلیٰ و بلند اخلاقی کردار کو ختم کر دیا، اور مجلس مشاورت بھی ایک معمولی الیکشن کی پارٹی بن کر رہ گئی۔

مرکزی مجلس مشاورت کا عوامی منشور ایک بلند پایہ اخلاقی و سیاسی میل ملاپ کی دستاویز تھا جس میں بعد میں ایسے اضافے ہو گئے جو چاہے کتنا

ہی صحیح رہے ہوں لیکن قوم کو اور مجلس کو ہماری بلند اور اونچی سطح سے نیچے پہنچا گئے۔ اس منشور کے متعلق کلکتہ یونیورسٹی کے تاریخ کے ایک پروفیسر نے کہا تھا کہ ہندوستان میں پہلی بار کسی مسلم جماعت نے ایسا منشور پیش کیا وغیرہ وغیرہ۔ عوامی منشور اور مرکزی مجلس کے رزولیوشن سے متعلق تعریفیں اور تنقیدیں تو ہم الیکشن کے بعد میں سنتے اور پڑھتے پھر دیکھتے کہ مشاورت کہاں سے کہاں پہنچ جاتی۔

دوسری طرف مجلس مشاورت اس بلند اخلاقی ارادے اور کردار کے باوجود ایک فرقہ پرست جماعت تھی ایسا الزام دینے میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک تھے۔ اگر ہم مجلس کے منشور کی منشا اور مرکزی رزولیوشن پر عمل کرتے تو یہ الزام بڑی حد تک دور ہو جاتا۔ مجھے اس پر اس قدر یقین تھا کہ وقت آنے پر مطلع صاف ہو جائے گا اور الزام کا بادل خود بخود چھٹ جائے گا۔ پنڈت سندرلال کا تو کیا ذکر، وہ تو ہمارے ایک معزز رفیق و مبلغ تھے ہی، لیکن پارلیمنٹ کے جو ہندو حضرات بھی ہمارے ساتھ دورہ میں گئے وہ ہمارے مبلغ ہو گئے انھوں نے مجلس مشاورت کو تائید غیبی بتایا۔ زیادہ تعداد میں مختلف مجبوریوں کے باعث ہم اپنے ساتھ نہ لے جا سکے تھے۔ مگر الیکشن کے بعد یہ آسان ہو جاتا۔ اگر عوامی منشور سے پُراثر اور میل ملاپ کی ضرورت کے بہترین پیراگراف نکالے نہ گئے ہوتے تو منشور ملک میں بہت چمکتا۔

خلافت کی تحریک میں قربانیاں مسلمانوں نے پیش کیں، اس کے باعث مسلمان ملک پر اور کانگریس پر چھا گئے تھے۔ ایسا معلوم ہونے لگا تھا کہ ملک کی آزادی شاید تنہا مسلمان ہی حاصل کریں گے۔ جب گاندھی جی نے عدم تعاون کی تحریک کو چورا چوری کے باعث واپس لے لیا اس وقت بہت لوگوں کے

دلوں میں شبہات پیدا ہوئے، مجلس مشاورت کے بانیان دوبارہ اُنھیں لائینوں پر مسلمانوں کو لے جانا چاہتے تھے۔

ملک کی تقسیم کو نہ صرف کانگریس، بلکہ ہندو مہاسبھا و دیگر پارٹیوں نے بھی منظور کر لیا تھا۔ کانگریس نے سب سے دریافت کیا تھا اور سب نے تقسیم کو منظور کرنے کی تائید کی۔ یہ بات پنڈت جواہر لال نے اپنی ایک تقریر میں بھی کہی تھی۔ جب کہ اب صرف کانگریس پر الزام لگایا جاتا ہے۔ حالاں کہ سب سے دریافت کر لیا گیا تھا۔ اس تقریر کا خلاصہ ابھی حال میں ندائے ملت نے اپنے صفحہ اول پر شائع کیا ہے۔

گاندھی جی نے اور مولانا آزاد نے اس کے خلاف کوشش کی مگر ناکامیابی ہونے پر اپنے دوستوں پر چھوڑ دیا۔ اُن کی آنکھوں نے تقسیم کے جو نقصانات دیکھے تھے وہ سب ہمارے سامنے ہے۔ ابھی معلوم نہیں آئندہ ملک کو کیا کیا نقصانات برداشت کرنے ہوں گے۔ آج کی ساری خرابیاں تقسیم کے باعث پیدا ہوئی ہیں پھر سے مسلمانوں کو ایک گروہ کی طرف سے ملک بدر کرنے کی کوشش شروع ہے۔ یہ ممکن تو نہیں ہے لیکن کہیں اگر ایسا ہو جائے تو اکثریت کے اپنے بھائیوں کو پتہ چل جائے گا کہ مسلمان ملک کا کتنا قیمتی سرمایہ ہیں۔ یک جہتی کے لیے مسلمان ایک بڑا عنصر ہے اور مسلمان کے بغیر ملک کا بام ترقی پر پہنچنا مشکل ہے۔ شری ڈاکٹر بھٹناگر نے بڑی خوبی سے اس مطلب کو یوں ادا کیا ہے۔

مزہ تو جب ہے کہ ہندو کہے مسلمان سے
بغیر آپ کے ہندوستان کیا معنی

لفظ 'کیا معنی' نے اپنے سارے یقین وجذبات نیز ہند کی تاریخ کو کہہ دیا ہے۔ 'ہند چھوڑو' کے مصنف نے یہ کہا ہے کہ آزادی وقت سے پہلے آئی۔

'ہندوستان چھوڑو' پر دوبارہ غور کر رہے تھے کہ کیا یہ نعرہ و تحریک خلافت صرف اسلامی خلافت کے احیا کے لیے نہ تھے بلکہ ملک کی آزادی اور بہت بڑے پیمانے پر ملکی یک جہتی کے لیے تھے۔ ۱۹۲۱ء میں موپلاؤں نے جو قربانیاں دیں وہ ملک کی آزادی کے لیے مسلمانوں کی قربانیوں کا اہم جزو ہیں، جس کے باعث بہادر موپلا قوم تباہ و برباد کر دی گئی۔ پھر ۱۹۳۰ء کی تحریک آزادی میں سرحد کے پٹھانوں نے جو قربانیاں دیں وہ بھی ملک کی آزادی کے لیے مسلمانوں کی قربانی کا بڑا نمایاں پہلو ہے۔ خلافت کی بلند پایہ تحریک کو، بعض بڑے لیڈروں کی مدد سے موپلا کا بہانہ بنا کر ختم کر دیا اور ملک میں پھر سے فتنہ و فساد برپا ہو گیا۔ اس وقت گاندھی جی و دیگر بڑے بڑے لیڈران جیل میں تھے۔ جب جیل سے نکلے تو تحریک فرقہ وارانہ فساد کی نذر ہو چکی تھی۔ مولانا محمد علی و مولانا شوکت علی وغیرہم نے پانچ چھ برس تک میل ملاپ کی تحریک کو گاندھی جی کی مدد سے پروان چڑھایا جس کو آئندہ کا مورخ ضرور سراہے گا۔

گاندھی جی نے تقسیم کے بعد ایک موقعہ پر کہا تھا کہ اگر صحیح معنوں میں ہندو مسلم مفاہمت نہ ہو تو ملک و ہندو دونوں تباہ ہو جائیں گے۔ میں نے سوال کیا "کیا اب بھی؟" جواب ملا کہ "اب بھی!" اس وقت میں نے اس بات کو کوئی اہمیت نہ دی اور یہ سمجھا کہ چوں کہ یہ بات اُن کے دل کو لگی ہوئی ہے اس لیے ایسا کہتے ہیں مگر بعد کے واقعات نے بتلایا کہ اُنھوں نے جو کچھ کہا تھا وہ صحیح ہے۔ ان کی رائے کے خلاف تقسیم کو مان کر اور خوشی سے منظور کر کے اس کا نتیجہ ہم آج تک بھگت رہے ہیں۔

اسی طرح مسلمانوں کی موجودہ بلاوجہ مارکاٹ ملک کو شدید نقصان پہنچا رہی ہے۔ جسم کے ایک جزو لاینفک کو بے کار کیا جا رہا ہے۔ مسلمان

بحیثیت دست کار کے ملک کی بڑی خدمت کر رہے ہیں۔ اگر آج وہ امتحان مقابلہ پاس کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے لیکن ایڈمنسٹریشن میں کار نمایاں دکھلا سکتے ہیں جس کی اس وقت اشد ضرورت ہے۔ آج ہم جس طرح تقسیم کا نتیجہ بھگت رہے ہیں اُسی طرح کچھ عرصہ بعد مسلمانوں کی مارکاٹ کا نتیجہ ہمارے سامنے آئے گا۔ جمشید پور، راوڑکیلا کے واقعات کے بعد مجھے اور آپ سب کو یہ خیال پیدا ہوا کہ نافہم اکثریت نہ صرف مسلمانوں کو بلکہ ملک کو برباد کر رہی ہے۔ اس خیال کو لے کر ہم نے لکھنؤ میں وہ بلند پایہ عزم و ارادہ کیا کہ اقلیت میں ہونے کے باوجود اس حالت کو ہم خاموشی سے نہیں دیکھ سکتے۔ اب ہم کو خود میدان میں آنا چاہیے اور باہمی یکجہتی ملک میں بپا کرنے کے لیے اپنی جان تک لڑا دینا چاہیے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم کو اور آپ کو اس بات کا یقین تھا کہ ہندو کثیر تعداد میں بہت اچھے ہیں وہ بلوہ و فساد نہیں چاہتے مگر وہ خاموش ہیں یا تو ان کو ہماری طرف سے کچھ شبہ ہے یا وہ لڑنے والے گروہ سے ڈرتے ہیں اور مقابلہ کی ہمت نہیں رکھتے۔ یکجہتی کی تحریک جسے خلافت کی تحریک نے ادھورا چھوڑا تھا، اس کو ہم نے نئے سرے سے جگایا اور پورا کرنے کے ابتدائی دور میں تھے کہ الیکشن کے جوش نے ہم کو آدبوچا اور ہم اس کے شکار ہو گئے۔

خبر گرم ہے کہ سیاسی تحریک شروع ہو گی اور تنظیمی تحریک بھی جاری ہے ہر ناکامیابی کے بعد پہلے بھی مسلمانوں نے تنظیمی تحریک شروع کی چنانچہ خلافت کے بعد بھی تنظیمی تحریک بڑے زور شور سے ڈاکٹر سیف الدین کچلو جیسے بلند پایہ لیڈر نے شروع کی مگر وہ شرمندۂ تعبیر نہ ہوئی۔ سیاسی تحریک یعنی کونسلوں کے ذریعے کام کرنے کی کوشش تو آپ کو یاد ہو گا۔ سنہ ۲۱ء کی

ناکامیابی کے بعد کانگریس میں اس مسئلہ میں شدید اختلاف پیدا ہوا اور دو گروہ بن گئے۔ چینجز اور نو چینجز، ایک سال کی لڑائی کے بعد گاندھی جی کے گروہ نے کانگریس کو کونسل کے حامیوں کے حوالہ کر دیا کہ اچھا آزما لو۔ سنہ ۲۲ء سے سنہ ۲۹ء تک کونسل کا طریقہ آزمایا گیا اور ناکامیابی کے بعد سب نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور کونسل کے طریقۂ کار کو چھوڑ دیا اور لاہور میں خود مختاری حاصل کرنے کا عدم تعاون کے ذریعہ اعلان کر دیا۔ اس وقت تو جداگانہ انتخاب تھا۔ ایک خیال کے مسلمان منتخب ہو سکتے تھے۔ اب مخلوط انتخاب کا ذریعہ ہے۔ اس طریقے میں ممکن نہیں کہ سارے مسلمان صرف ایک مسلمان کے گروہ کا ساتھ دیں اور ایک ہی خیال کے مسلمان منتخب ہوں۔

اقلیت کے لیئے ایک مذہبی سیاسی پارٹی مضر ثابت ہو گی۔ سابق مسلم لیگ کی کامیابی جداگانہ انتخاب کے باعث تھی۔ اکثریت کے اُس گروہ کو جو ہمارے خلاف ہے، اکثریت کو ہمارے خلاف ابھارنے کا موقعہ ملے گا۔ جنوب میں جو تھوڑی بہت کامیابی ہے وہ کیرالا کے باعث ہے، اس سے ہم غلط فہمی میں نہ پڑیں۔

مرکزی مشاورت کے رزولیوشن کی تائید اور حفاظت کرنا میرا فرض تھا، جس کو میں نے پورا کرنے کی کوشش کی اور اس کے لیئے اپنے بعض ساتھیوں سے اختلاف پر اخبار میں بیان دیا مگر بد قسمتی سے وہ بیان انگریزی اخبارات تک محدود رہا۔ شاید اردو اخبارات میں نہ آیا۔

اس بیان میں میں نے خوف ظاہر کیا تھا اور ایک طرح پر پیش گوئی کی تھی کہ "کنگ لاگ" کو ہٹا کر "کنگ شارک" کو لا بٹھانا مسلمانوں کو شدید نقصان پہنچائے گا۔ چنانچہ ویسا ہی ہوا۔

اب آخری سوال یہ رہ جاتا ہے کہ کردار کو ختم کرنے کا الزام کس پر ہے اور اب کیا کرنا ہے؟

اول الذکر سوال کا جواب مختصر یہ ہے کہ سب میرا قصور ہے۔ مجھ میں یہ طاقت و اہلیت نہ تھی کہ میں اپنے اُن ساتھیوں کو ان کے کرنے سے باز رکھتا مگر میں نہ کرسکا۔ اس لیے میں ہی موردِ الزام ہوں۔ ایسی حالت میں مجھے صدارت سے علیحدہ ہو جانا چاہیے۔

اب رہا دوسرا سوال، اس کے جواب سے معذور ہوں۔

آخر میں آپ اور مولانا ابو اللیث صاحب کا تہ دل سے ممنون و مشکور ہوں کہ آپ دونوں نے ہمیشہ میرے خیالات کا ساتھ دیا۔

علی میاں صاحب کی فضیلت و علمیت و خطابت کا میرے دل میں بڑا احترام ہے۔ اس کے علاوہ ان کے جد حضرت سید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ بریلوی میرے خاندانی پیر تھے۔

مولانا منظور صاحب بھی اول دن سے شریک کار رہے اور بانیوں میں تھے مگر ۱۳ر دسمبر کے بعد سے میری ان کی گفتگو زیادہ تر پرائیویٹ تھی اس لیے اس کا ذکر کرنا نامناسب ہے۔

جناب مسلم صاحب بھی اول دن سے ساتھ تھے اور بانیوں میں سے تھے ان کا بھی تہ دل سے مشکور ہوں کہ ان سے ہر طرح کی مدد اور مشورے ملتے رہے

جن بعض بھائیوں سے میرا اختلاف ہوا اُن سے بھی مجھے کوئی ذاتی شکایت نہیں ہے اُن کی ایمانداری میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمارے دلوں میں وسعت پیدا کریں

(ڈاکٹر) سید محمود

انبالہ جیل سے

ایک شریف النفس صحافی کے دو خط

"بادش بخیر" ایمرجنسی کے زمانہ میں روزنامہ دعوت دہلی کے سابق ایڈیٹر اور اُردو کے ممتاز صحیفہ نگار مرحوم محمد مسلم صاحب نے اپنی نظربندی کی حالت میں انبالہ جیل سے حضرت مفتی صاحب کو دو خط لکھے تھے یہ خطوط اگرچہ ذاتی نوعیت کے تھے لیکن وہ مرحوم محمد مسلم صاحب کی عالی ظرفی اور تعمیری انداز فکر کے آئینہ دار ہیں اور اس دور کی تلخ کامیوں کی یادگار مفتی صاحبؒ سے اُن کو قلبی تعلق تھا اور اسی داعیے کے پس منظر میں یہ خطوط لکھے گئے تھے جو ہم شریک اشاعت کر رہے ہیں۔

مرتب

سنٹرل جیل، انبالہ

معظمی وگرامی مفتی صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

عرصے سے آپ کی خیریت معلوم نہیں ہوسکی، میں بھی شروع اپریل میں دہلی سے یہاں آگیا تھا جس کے بعد دلی نہیں جانا ہوا۔ اس عرصے میں صدیقی صاحب اور فارقلیط صاحب کے دو سانحے ایسے گزرے جن کا اثر عرصے تک دل پر رہے گا، ایسے صاحب بصیرت جری متحرک اور دیانت دار صاحب بیان

ہمارے یہاں انگلیوں ہی پر گنے جا سکتے ہیں، اللہ تعالیٰ انھیں اپنی بے پایاں رحمتوں سے نوازے اور ابرار و صلحا کی صف میں شامل کرے، میں یوں تو راضی برضا ہوں اور یہ سمجھتا ہوں کہ یقیناً اس موجودہ افتاد میں ضرور بالضرور خدا کی کوئی ایسی مصلحت ہو گی جسے فی الوقت ہم نہیں سمجھ سکتے پھر بھی بسا اوقات یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ایسے لوگ جو سرتاپا قانون کے پابند ہوں اور جن کا مطلوب یہ رہا ہو کہ تعمیر و اصلاح کی جانب لوگ مائل ہوں، شورش انگیزی ختم ہو انھیں قید و بند میں ڈال کر کیا فائدہ اٹھایا گیا ہے، اگر یہ محض توازن کے لیے ہے تو چاہے اسے وسیع تر مصلحت کی خاطر گوارا کر لیا جائے مگر انصاف پسندی اسے قبول کرنے کے لیے تیار نہیں، میری خواہش تو یہ تھی کہ ہمارے دستور پالیسی اور کارکردگی سب کا جائزہ لے کر کوئی یہ انگلی تو رکھتا کہ تم نے یہاں غلطی کی ہے، انسان سے غلطی تو ممکن ہے مگر اسے معلوم تو ہونا چاہیے کہ اس نے کہاں ٹھوکر کھائی ہے۔ مرکز میں بہرحال ایسے معقول لوگ ہیں جو اس سلسلے میں مطمئن ہو بھی سکتے ہیں اور کر بھی سکتے ہیں، دستور کی تحریریں بھی بہرحال وحی الٰہی تو نہیں کہ جن میں رد و بدل نہ کیا جا سکے۔ میں خیال کرتا تھا کہ صدیقی صاحب یہ کام کر سکیں گے مگر اللہ تعالیٰ انھیں اب آرام دینا چاہتا تھا اس لیے وہ بھی ہم میں سے اٹھ گئے اور یہ تو خیر ایک چھوٹا سا مقصد تھا بڑا مقصد تو یہ تھا کہ ہم بحیثیت ملت کے یہ سوچتے اور کچھ کوشش کرتے کہ حالات کو معمول پر لایا جائے اور صف آرائی کی جگہ مذاکرات کا آغاز ہو۔ غلطی کی نشاندہی کرتے ہوئے کسی کو بھی معصوم نہیں قرار دیا جا سکتا۔ ایک سال پہلے واقعی لوگوں نے انتشار اور افراتفری کا ماحول پیدا کر دیا تھا لیکن اس کا صحیح علاج یہ ہے کہ حالات کو درست کیا جائے اور ہم اس میں کوئی تعمیری رول ادا کریں۔ بعض سمجھ دار لوگوں کے بارے میں خیال تھا کہ وہ

حالات کو سدھارنے میں مددگار ہوں گے مگر ان کا مبلغ فکر سطحی باتوں سے آگے پہنچتا ہی نہیں ایسے ہی ایک صاحب شاید اب گائے کا سوال چھیڑے ہوتے ہیں جس سے سوائے مذہبی جذبات اُبھارنے کے اور کوئی کام نہیں ہوگا، وہ توازن و اعتدال جو ایک صحت مند معاشرے کے لیے لازمی ہے بدقسمتی سے اس سے کوئی بھی بہرہ ور نہیں ہے کچھ کام اگر کر سکتی تھی تو بس ملت سے امید تھی مگر اسے اس کا موقع ہی نہیں ملنے پا رہا ہے۔ یہاں انبالہ آکر بچوں کے لیے ملنا خاصا دشوار ہے اور مہنگا بھی، پھر بھی مہینے میں ایک بار اور کبھی دو بار کوئی چکر لگا ہی جاتا ہے گھر سے خطوط بھی آتے رہتے ہیں جن سے خیریت معلوم ہوتی رہتی ہے۔ یہ رجب کا مہینہ ہے بڑا جی چاہتا ہے کہ کچھ اور نہ ہو تو رمضان تک دلی ہی میں منتقل ہو جائیں، حالاں کہ صحیح بات شاید یہ ہے کہ یہاں رہنے میں ہم زیادہ اجر کے مستحق ہوں گے، یہاں ہم لوگوں کی صحت الحمدللہ اچھی ہے، امید ہے کہ آپ بھابی صاحبہ اور سب لوگ اچھی طرح ہوں گے۔ خاں صاحب سلام کہتے ہیں۔ والسلام

محمد مسلم نظربند سنٹرل جیل، انبالہ

سنٹرل جیل، انبالہ

گرامی و معظمی، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

صدیقی صاحب (مرحوم محمد یوسف صدیقی ایڈیٹر ریڈیئنس ویکلی دہلی) کے انتقال نے ایک بڑا خلا پیدا کر دیا ہے اور کہنے کو تو کہا جا سکتا ہے کہ یہ خلا آسانی سے پُر ہونے والا نہیں لیکن اسے پُر کرنا ضروری ہے کہ وہ ملی اجتماعیت کی علامت ہے اور اس ضمن میں انھوں نے بڑا کام کیا ہے میرا خیال ہے کہ شیخ عبداللہ صاحب وغیرہ سے مشورہ کر کے مشاورت کی عاملہ کی نشست بلانے کی ضرورت ہے جس میں موجودہ حالات پر غور کر کے یہ فیصلہ ضروری ہے کہ کن دائروں میں تعاون

کیا جا سکتا ہے اور اس کی کیا شکلیں ہو سکتی ہیں اسی طرح ملکی اجتماعیت میں جو جمود پیدا ہو چکا ہے اور صف آرائی کی شکل اب تک پائی جارہی ہے اسے تعمیر کی طرف کس طرح موڑا جائے۔ خاندانی منصوبہ بندی کا مسئلہ بھی کافی اہمیت رکھتا ہے جس میں جذبات سے بالاتر ہو کر توازن کے ساتھ رائے قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ اس مؤخر الذکر معاملے کا فیصلہ ایک دن میں ہونا تو مشکل ہے۔ البتہ اس کے لیے سوالنامہ جاری کیا جا سکتا ہے تاکہ اس پر اطمینان بخش طور پر جو سب کو مطمئن کرنے والا ہو اور عقلی و نقلی دلائل پر مبنی ہو کوئی واضح بات سب کے سامنے آسکے ویسے تو اس مسئلے کا حق تھا کہ اس پر دنیا بھر کے علما غور کر کے کوئی رائے قائم کرتے کیوں کہ یہ مسئلہ صرف یہیں کا نہیں بلکہ ساری دنیا میں پیش آرہا ہے، میں کل ہی اپنے ملک کی ایک اقتصادی رپورٹ پڑھ رہا تھا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے یہاں تقریباً ۱۲، ۱۴ کروڑ ایکڑ قابل کاشت زمین بے کار پڑی ہے اسی طرح سمندروں اور دریاؤں اور تالابوں سے مچھلی اور پہاڑوں و ریگستانوں میں گائے بکری کی کئی گنا زیادہ پیداوار حاصل کی جاسکتی ہے۔ ہمارے یہاں فی کلومیٹر ۱۷۶ افراد آباد ہیں اگر بڑے شہروں کو چھوڑ دیا جائے تو یہ تناسب ۵۰، ۶۰ افراد فی کلومیٹر رہ جاتا ہے ایک حوصلہ مند قوم ان مسائل پر غور کرے تو وہ ملکی پیداوار میں بہت کافی اضافہ کرنے کی باتیں سوچ سکتی ہے البتہ اس کے لیے افراد کو سخت جدوجہد کرنی ہوگی، دوسری طرف ریاست کی مشکلات بھی لائق توجہ ہیں اور وہ بھی نیک نیتی کے ساتھ اپنی کچھ ذمہ داریاں سمجھ رہی ہے اس لیے ان پر بھی غور کرنا ہوگا اور کوئی عملی فارمولا سوچنا ہوگا۔ آپ پر کاموں کا جو بوجھ ہے وہ یقیناً بہت زیادہ ہے اس لیے صدیقی صاحب کی جگہ کو سر دست نہ پُر کیا جائے

توبھی دفتری کاموں کے لیے کسی کو نامزد کرنا مفید ہی ہوگا، صغیر صاحب اس کے لیے موزوں ہوتے مگران کا دستیاب ہونا آسان نہیں، رضوی صاحب کو سوچا جا سکتا ہے بہرحال افراد کوئی بھی ہوں ضرورت حرکت و عمل کی ہے۔ عابدی صاحب پر بھی غور کیا جا سکتا ہے انھیں سفر کی بھی سہولتیں حاصل ہیں۔

میں بحمدہ اچھا ہوں، معلوم ہوا ہے کہ فیملی الاؤنس کی رٹ کی آئندہ جولائی میں سماعت ہوگی۔ کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک، اس پر مستزاد یہ ہے کہ دلی والوں کو گھروں سے اتنا دور پھینک دیا ہے کہ یہ بھی ایک طرح سے سزا ہی ہوگئی ہے، بچے اگر مہینے میں ایک بار آنے کی کوشش بھی کریں تو خیال گزرتا ہے کہ ملاقات کی بجائے یہ رقم گھر کی ضروریات پر ہی صرف کی جاتی، خیر این ہم اندر عاشقی بالائے غم ہائے دگر، بچے الحمدللہ سب ہی کامیاب ہوگئے اور سب سے زیادہ قابل قدر اسلم ہیں کہ دوسری مشکلات اور کئی ماہ کی مسلسل علالت کے باوجود انھوں نے ایم اے میں کامیابی حاصل کرلی اگرچہ ڈویژن سیکنڈ آیا ہے مگر اتنی ساری مشکلات کے باوجود ایک نئے مضمون میں یہ کامیابی غیر معمولی ہے۔ میں نے تو مجبوراً یہ سوچا تھا کہ وہ باہر چلے جائیں اور وہیں قسمت آزمائی کریں مگر پاسپورٹ کی دقت اور کچھ اپنے ملک میں رہ کر کام کرنے کے جذبے کی وجہ سے انھوں نے اسے پسند نہیں کیا۔ آپ مشورہ دیجیے کہ کیا کشمیر وغیرہ کے محکمۂ تعلیم میں یہ کھپ سکتے ہیں یا علی گڑھ میں، یہاں گرمی کا اصل موسم ابھی ۴، ۵ دن سے شروع ہوا ہے اور لوہ چلنے لگی ہے تاہم رات آرام سے گزرتی ہے، کمر کا درد جو شاید کسی پرانے جھٹکے کی وجہ سے ہے قائم ہے اب دوا کی بجائے آسن کر رہا ہوں دیکھنا ہے کہ اس کا کیا اثر ہوتا ہے، آپ کے پاؤں کے درد کا کیا حال ہے۔

محمد مسلم نظربند سنٹرل جیل، انبالہ

چوتھا حصّہ

سیاسی، علمی، دینی اور صحافتی شخصیتوں کے تاثرات اور پیغامات

مولانا انیس الحسن ہاشمی	تعارف
مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند	تجویز
مسلم پرسنل لابورڈ	〃
جامعہ حسینیہ راندیر	〃
دارالعلوم مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ	〃
"ترجمان" اہل حدیث	اداریہ
کل ہند مسلم مجلس مشاورت	تجویز
"ہماری زبان" دہلی	اداریہ
"مستقبل"، بمبئی	〃
"دین دنیا"، دہلی	〃
نائب صدر، ہدایت اللہ	پیغام
وزیراعظم اندرا گاندھی الحاج ذوالفقار اللہ	
ہیم وتی نندن بہوگنا ابراہیم سیٹھ	

پیغامات

عقیل محمد میرٹھی	مکتوب
"الفرقان"	اداریہ
ماہنامہ "معارف" اعظم گڈھ	〃
مولانا بدرالحسن قاسمی	〃
ماہنامہ "طیب" دیوبند	〃
"مسلم انڈیا" دہلی	〃
شیام لال یادو	پیغام
مولانا سعید احمد اکبرآبادی	مضامین
مولانا محمد سعید مسعودی ۔ مولانا نسیم احمد فریدی	پیغامات
میرواعظ مولانا محمد فاروق ۔ عبدالرحمٰن کوندو	پیغامات

مے بھی ہے، مےکش بھی ہیں، ساغر بھی ہے، ساقی نہیں
جی یہ چاہتا ہے لگا دیں آگ میخانہ کو ہم

●●●●●●●●●●●●●●●●

مفتی عتیق الرحمن صاحب کی وفات نے "موتُ العالِم موتُ العالَم" کا پورا پورا نقشہ نگاہوں کے سامنے کھڑا کر دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کی وفات ایک فرد واحد کی موت و وفات نہ تھی بلکہ اسلاف اور ان کی روایات کے ایک پورے عہد کا خاتمہ تھا علوم نبوت و انوار وحی الٰہی کی ایک شمع فروزاں تھی جو یکایک بجھ گئی۔ محاسن اخلاق و کردار کا ایک مینار تھا جو منہدم ہو گیا۔ خدمت خلق اور دردمندی عام وخاص کی ایک انجمن تھی جو ویران ہو گئی۔ ان کو بجا طور پر "خاتم الطائفہ" کہا گیا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اعلاء کلمۃ اللہ اور علم و اتقار کی جو محفلیں شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور حافظ امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے ہاتھوں آباد ہوئی تھیں، مفتی عتیق الرحمنؒ ان کی آخری بہار تھے اور ان کی وفات نے پوری ملت کو ایک دریا محرومی اور سوز غم کے آغوش دیدیا جعل اللہ الجنۃ مثواہ وانا للہ وانا الیہ راجعون۔

چنانچہ اس حادثہ جانکاہ کی کسک ہندوستان بھر کے دینی اور علمی اداروں، مدرسوں، تعلیم گاہوں۔ دانش کدوں۔ اسکولوں۔ کالجوں۔ سیاسی وسماجی حلقوں میں دور دور تک محسوس کی گئی۔ اس کا اندازہ ان بے شمار تعزیتی خطوط۔ برقیوں۔ بیانات اور جہاں تہاں ہونے والے جلسوں اور ان کی قراردادوں سے ہوتا ہے۔ جن میں سے کچھ آنے والے صفحات میں آپ کی نظر سے گزریں گے۔ اسی طرح برصغیر ہند و پاکستان میں پھیلے ہوئے اردو۔ انگلش ہندی اخبارات کی رپورٹوں اور ادارتی شذرات میں بھی اس درد و غم کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے جو مفتی صاحب

کی وفات پر لکھے گئے۔

ان اخبارات وجرائد میں خاص طور پر قابل ذکر یہ ہیں

روزنامہ مشرقی آواز دہلی
" انقلاب بمبئی
" عوام دہلی
" ہندوستان ٹائمز دہلی
" جنگ کراچی
" حریت "
" نوائے وقت "
" عزائم لکھنؤ
" آزاد ہند کلکتہ
" قومی آواز لکھنؤ
سہ روزہ دعوت دہلی
ہفت روزہ دیوبند ٹائمز۔ دیوبند
" اخبار نو دہلی
" ریڈینس دہلی

ہفت روزہ نئی دنیا دہلی
" ترجمان الحدیث "
" نقیب پھلواری شریف
" نوائے اسلام دہلی "
" دین دنیا "
ماہنامہ الفرقان لکھنؤ
" معارف اعظم گڑھ
" مسلم انڈیا دہلی
" طیب دیوبند
" مستقبل بمبئی
" الثقافۃ الاسلامیہ (عربی) دیوبند
پندرہ روزہ
گلشن مالی گاؤں
۔ ہماری زبان علی گڑھ

ان میں سے چیدہ چیدہ جرائد کے شذرات اور آرٹیکل آنے والے صفحات میں پیش خدمت کئے جارہے ہیں۔

تعزیتی پیغامات بھیجنے والوں میں الحاج جنرل ضیاء الحق صدر مملکت پاکستان
الشیخ عبداللہ النصیف امین عام رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ

وزیر اعظم ہند شریمتی اندرا گاندھی
مسٹر ہدایت اللہ سابق چیف جسٹس آف انڈیا
بیگم شیخ عبداللہ (مرحوم) سابق وزیر اعظم کشمیر
خطیب کشمیر میر واعظ مولانا محمد فاروق (سرینگر)
سربراہ جماعت بوا ہر سیدنا ملا برہان الدین (بمبئی)
ڈاکٹر شہزادہ یوسف نجم الدین (بمبئی)
ڈاکٹر فاروق عبداللہ وزیر اعظم کشمیر
الحاج محمد عثمان عارف (گورنر اترپردیش (لکھنؤ)
الحاج عبدالستار یوسف شیخ (بمبئی)
ڈاکٹر محمد عزیز اللہ اسلامک سینٹر (حیدرآباد)
سیٹھ محمد قاسم جادوت (کلکتہ)
سید کمال حسن شیرازی (کراچی)
مولانا منت اللہ رحمانی امیر شریعت بہار
الحاج سیٹھ یوسف پٹیل (بمبئی)
الحاج غلام محمد میمن (بڑودہ)
ابن یوسف قاری محمد الیاس (کراچی)
مولانا سید آفتاب المدنی (مدینہ منورہ)
ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی (لکھنؤ)
الحاج مفتی سید عبدالرحیم لاجپوری (راندیر)
مولانا غلام محمد نورگت (تدکیسر)
مولانا الحاج محمد عبداللہ مہتمم جامعہ فلاح دارین (ترکیسر)

الحاج ڈاکٹر سید ظفر علی شاہ (بھوپال)

الحاج مولانا سید عبدالحق قادری آف عطرستان (سورت)

کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں، ان تعزیتی خطوط اور پیغامات کا بھی ایک سیلیکشن ان صفحات میں شامل اشاعت کیا جارہا ہے

ماہنامہ الثقافتہ الاسلامیہ دیوبند کا عربی مقالہ اور ماہنامہ مسلم انڈیا کا انگلش متن جوں کا توں ہم اپنے صفحات پر نقل کر رہے ہیں کہ اصل عبارت کی حلاوت اور سلاست سے ناظرین کرام لطف اندوز ہوسکیں۔

مرحوم شیخ محمد عبداللہ وزیر اعظم و رہبر کشمیر کو عمر کی آخری دو دہائیوں میں حضرت مفتی صاحب سے بہت قرب رہا۔ اس تعلق خاطر کی ابتدا، حرم بیت اللہ کی مقدس فضاؤں میں ہوئی تھی جہاں یہ دونوں حضرات ۱۹۶۵ء میں خاص ایام حج کے موقع پر رابطہ عالم اسلامی کے اجلاس میں شرکت کے لیے جمع ہوئے تھے۔ وقتاً فوقتاً ان دونوں رہنماؤں میں ملکی اور ملی مسائل پر ملاقاتوں کے علاوہ مراسلت بھی ہوتی رہتی تھی، چنانچہ ان ہی صفحات میں مفتی صاحب کے نام مرحوم شیخ کے دو خط بھی آپ کے مطالعہ سے گزرینگے جو اجتماعی اور ملی معاملات میں شیخ صاحب کی دردمندیوں اور تعمیری انداز فکر کے ترجمان ہیں۔

(انیس الحسن)

تجویز تعزیت

مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند

حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نہ صرف برصغیر کے بلکہ عالم اسلام کے نہایت ممتاز عالم دین، صاحب نظر مفتی، بہترین سیاست داں، اور غیر معمولی طور پر معاملہ فہم، اور صاحب فہم و فراست تھے۔ اس لئے ان کا حادثہ وفات جو ۱۰ شعبان ۴ ۱۴۰ھ مطابق ۱۲ مئی ۸۴ء کو ایک طویل علالت کے بعد دہلی میں پیش آیا۔ عالم اسلام کا عموماً اور دارالعلوم دیو بند کے لیے خصوصاً ایک عظیم حادثہ فاجعہ ہے اور اس کا جس قدر بھی غم کیا جائے کم ہے۔

دارالعلوم دیو بند کے ساتھ حضرت مرحوم کا نہ صرف ذاتی اور شخصی طور پر بلکہ خاندانی حیثیت سے بھی بہت گہرا ربط اور تعلق تھا۔ حضرت مرحوم کے دادا مولانا فضل الرحمٰن صاحبؒ دارالعلوم دیو بند کے بانیوں کے ہمراہ تھے پھر آپ کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ شیخ المشائخ و مفتی اعظم دارالعلوم دیو بند اور آپ کے اعمام محترمان حضرت مولینا شبیر احمد صاحب عثمانی شیخ الاسلام پاکستان۔ اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی مہتمم دارالعلوم دیو بند، ان تینوں کا شمار اکابر علما دارالعلوم دیوبند میں ہوتا ہے۔ اور تینوں حضرات کی جو گراں قدر علمی، دینی اور روحانی خدمات ہیں وہ اظہر من الشمس ہیں۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ان بزرگوں کی روایات کو پوری آب و تاب کے ساتھ قائم رکھا، اور ان کو جلا دی۔ چنانچہ آپ نے ایک عرصہ تک نہایت ممتاز مدرس کی حیثیت سے دارالعلوم دیو بند کی خدمات انجام دیں۔ اور پھر ایک عرصہ تک دارالعلوم دیو بند کی مجلس شوریٰ کے اہم رکن کی حیثیت سے آپ نے

جو خدمات انجام دی ہیں وہ دارالعلوم دیوبند کی تاریخ کا روشن باب ہے۔
آپ کی فہم و فراست معاملہ فہمی، اور سنجیدہ آرا کا مجلس شوریٰ ہمیشہ احترام کرتی رہی ہے اور اس نے آپ کی خدمات سے پورا فائدہ اٹھایا ہے۔
حضرت مفتی صاحب کو دارالعلوم دیوبند سے اس درجہ عمیق قلبی روحانی تعلق تھا کہ جب تک صحت نے اجازت دی مجلس شوریٰ کی میٹنگ میں پابندی اور اہتمام سے آتے تھے۔ اور اسکی کارروائیوں سے مکمل طور پر دلچسپی لیتے تھے
مجلس شوریٰ اس حادثۂ فاجعہ پر اپنے قلبی رنج والم کا اظہار کرتی ہے۔ اور دعا کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت مرحوم کو جنت الفردوس میں ابرار و صلحاء کا مقام عطا فرمائے۔ اور حضرت مرحوم کے پسماندگان کے ساتھ اظہار ہمدردی کرتی ہے۔

مسلم پرسنل لا بورڈ کی قرارداد

مجلس عاملہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا یہ اجلاس حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی رح کے حادثۂ وفات پر اپنے انتہائی غم کا اظہار کرتا ہے۔ حضرت مرحوم کے اعزا کے ساتھ ہمدردی اور تعزیت کا اظہار کرتے ہوئے، اللہ تعالیٰ سے دست بدعا ہے کہ وہ حضرت رح کو بلند مدارج عطا فرمائے۔ اور جنت الفردوس میں جگہ عنایت فرمائے ——— آمین۔
حضرت مفتی صاحب رح عالی دماغ مفکر زبردست عالم دین، جنگ آزادی کے مجاہد اور ملت اسلامیہ کے عظیم قائد و رہنما تھے مسلم پرسنل لا کے تحفظ کے لئے شروع سے فکرمند رہے۔ اور مسلم پرسنل لا بورڈ کے قیام میں حضرت مرحوم نے قائدانہ حصہ لیا۔ اور شروع سے بورڈ کے نائب صدر رہے۔ اور بورڈ کی قیادت و رہنمائی کرتے رہے۔ یہ اجلاس محسوس کرتا ہے کہ حضرت مرحوم کے

حادثۂ وصال سے جو خلا پیدا ہوا ہے اس کا پُر ہونا مشکل ہے۔
عاملہ کا یہ اجلاس پھر حضرت مرحوم کی مغفرت اور ترقیٔ درجات کے لیے دُعا کرتا ہے۔

جامعہ حسینیہ راندیر (گجرات)

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے نصف صدی تک قوم و ملّت کی خدمات جلیلہ انجام دیں۔ آپ ایک وقت جمعیۃ علمائے کے صدر اور تادمِ وفات مجلس مشاورت کے صدر رہے۔ ان کی وفات ملتِ اسلامیہ کا زبردست نقصان ہے اور یہ سانحہ فاجعہ قومی، ملّی خادثہ ہے۔

جامعہ حسینیہ راندیر سورت گجرات بھی مولانا کے سانحۂ وفات کو ایک نقصان عظیم سمجھتا ہے۔ اور مولانا کے متعلقین کے ساتھ اس غم میں شریک ہے۔ میں اپنی طرف سے اور جامعہ کی طرف سے تعزیت اور اظہار ہمدردی کرتا ہوں۔ دُعا ہے کہ خداوند کریم مولانا مرحوم کو جنت الفردوس میں درجاتِ عالیہ عطا فرمائے اور جملہ پسماندگان کو صبرِ جمیل مرحمت فرمائے۔

اسمٰعیل حافظ احمد

دارالعلوم حرم مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ

مخدوم و مکرم و محترم حضرت مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی زاد مجدہ
سلام مسنون۔ ابھی قلوب حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی جدائی کے صدموں سے یکسو نہیں ہوئے تھے کہ قافلۂ اکابر کا ایک اور راہبر و امت مسلمہ کو داغ مفارقت دے گیا۔ اللہ تعالیٰ حضرت مفتی صاحب قبلہ رحمۃ اللہ علیہ کو آخرت کے اعلیٰ مقامات سے نوازے۔ اور ان کے لگائے ہوئے درختوں ندوۃ المصنفین اور برہان کو ہمیشہ

سرسبز و شاداب رکھیے کہ آپ ماشاء اللہ روزِ اول سے ان کے ان کار ہائے جلیلہ میں شریکِ عمل ہے۔ مفتی صاحب قبلہ کی وفات سے تقسیم سے قبل قرول باغ کی ہزاروں یادیں اور نقوش تازہ ہو گئے۔ جس طرح چند ماہ قبل آپ کی تشریف آوری سے رُوح جھوم جھوم اٹھی تھی، بے اختیار دل چاہ رہا ہے کہ ان پرانے نقوش اور یادوں کو قلمبند کر دوں۔ والسلام

محمد مسعود شمیم۔ ناظم مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ

مسلکِ اہلِ حدیث کا ترجمان دہلی کا اداریہ

(جون ۱۹۸۴ء)

مفتی صاحب مرحوم دیوبند میں پیدا ہوئے۔ دارالعلوم دیوبند میں انہوں نے تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد وہ گجرات بھی گئے۔ ۱۹۳۷ء میں وہ کلکتہ سے دہلی تشریف لائے جہاں انہوں نے مولانا آزاد مرحوم کے مشورے پر مولانا حفظ الرحمٰن صاحب مرحوم کے ساتھ ندوۃ المصنفین کی بنیاد ڈالی۔ جس نے گذشتہ نصف صدی میں تفسیر، سیرت، تاریخ، ادب، لغت پر سینکڑوں کتابیں شائع کی ہیں۔ اس کا رسالہ برہان اپنے معیار کے اعتبار سے ہند و پاکستان کے ممتاز علمی جرائد میں سے ایک ہے۔

مفتی صاحب جمعیۃ علمائے ہند کے ممتاز اراکین میں سے تھے۔ ایک زمانے میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب مرحوم، مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی اور مولانا محمد میاں صاحب کو ہی جمعیۃ علمائے ہند سمجھا جاتا تھا۔

ڈاکٹر سید محمود صاحب کے بعد انہوں نے ہندوستانی مسلم جماعتوں کے مشترکہ

پلیٹ فارم آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت کی باگ ڈور سنبھالی۔ اور تا حیات اس کے صدر رہے۔ وہ مختلف جماعتوں اور افراد کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے میں بہت ہی اچھا رول ادا کرتے تھے۔

مسلم پرسنل لاء بورڈ کی تاسیس اور اس کے کام و پروگرام کو آگے بڑھانے میں پوری دلچسپی لیتے تھے۔ اور آخر تک اس سے وابستہ رہے۔

مرحوم دارالعلوم دیو بند کی مجلس شوریٰ کے رکن تھے۔ اور قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم کے زبردست حامی تھے۔ انہوں نے دارالعلوم کی نئی انتظامیہ یا مجلس شوریٰ سے اتفاق نہیں کیا تھا۔ اپنی علالت کے دوران بھی مرحوم دارالعلوم کا بار بار تذکرہ کرتے رہتے تھے۔

ان کا دفتر ندوۃ المصنفین ہمیشہ بڑے لوگوں کی آماجگاہ بنا رہتا تھا۔ مفتی صاحب کی میٹنگیں بھی اسی دفتر میں ہوتی تھیں۔

وہ بہت عمدہ خطیب، دور اندیش مشیر، اور حلیم الطبع انسان تھے۔ ملی مسائل میں بھرپور دلچسپی لیتے تھے۔ سرکاری عہدوں کے کبھی قریب نہیں گئے۔ جمعیت علمائے ہند میں شخصیت پرستی کی خرابی و کمزوری آجانے سے حضرت مفتی صاحب کی شخصیت کا وزن نہیں محسوس کیا گیا۔ اسی طرح دارالعلوم دیو بند میں ان کے ساتھ انصاف نہیں ہوا۔ جس کی وجہ سے مفتی صاحب شخصیت پرستوں سے الگ تھلگ رہنے لگے۔

اللہ تعالےٰ مرحوم کی نیکیاں قبول فرمائے۔ ان کی مغفرت فرمائے۔ اور ملت کیلئے جو کام اور پروگرام انہوں نے جاری کئے تھے۔ انہیں ترقی بخشے۔ آمین

کل ہند مسلم مجلس مشاورت کا خراجِ عقیدت

کل ہند مسلم مجلس مشاورت کی مجلس عاملہ کا یہ اجلاس حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰنؒ عثمانی کے انتقال پُرملال کو مسلمانانِ ہند کے لیے ایک عظیم سانحہ قرار دیتا ہے۔ حضرت مفتی صاحبؒ ایک معروف عالمِ دین، جنگِ آزادی کے بے لوث مجاہد اور مسلمانانِ ہند کے سچے ہمدرد و بہی خواہ تھے۔ آپ نے حادثات کے سلسلہ میں ہمیشہ بالخصوص ۴۷ء کے بعد مسلمانوں کی تمام اجتماعی و ملی تحریکات میں قائدانہ رول ادا کیا۔ ۱۹۶۴ء میں مسلم مجلس مشاورت کے قیام سے لے کر تادمِ واپسیں اس سے وابستہ رہے۔ اور ڈاکٹر سید محمود صاحبؒ کے بعد مشاورت کی صدارت و سرپرستی فرماتے رہے۔ مختلف مکتبۂ فکر سے تعلق رکھنے والے افراد اور جماعتوں کو جوڑے رکھنے کی بے پناہ صلاحیت اللہ نے انھیں عطا کی تھی۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ آپ مسلمانوں کے تمام ہی طبقات کے دہلی میں آخری مرجع تھے۔ مسلم و غیر مسلم، سیاسی و غیر سیاسی رہنماؤں سے ہمیشہ آپ کا ربط رہا۔ اور وہ بھی حضرت مفتی صاحبؒ سے استفادہ کرتے رہے امانت و دیانت، صبر و قناعت کے پیکر تھے۔ اور جاہ و منصب اور مال و دولت کیلئے خواہاں کبھی ہوتے ہی نہیں۔ اپنی اجتماعی و ملی سرگرمیوں کے ساتھ آپ ندوۃ المصنفین کے ذریعہ علماء اور دانشوروں کی خاموش تربیت بھی فرماتے رہے۔ ایک اچھے عالم، مفکر اور عظیم ملی رہنما سے آج ملتِ اسلامیہ ہند محروم ہو گئی مشاورت کے عہدیدار و اراکین تمام مسلمانوں کے ساتھ موصوف کے ورثاء کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔

یہ اجلاس حضرت مفتی صاحبؒ کی مغفرت اور ترقی درجات کے لیے دعا کرتا ہے۔ اور وارثین سے اظہارِ تعزیت کرتا ہے۔

پندرہ روزہ ہماری زبان کا اداریہ

۱۲ ارمئی ۸۴ء کی دوپہر تقریباً سوا تین بجے علم و فضل کا روشن ترین آفتاب ڈوب گیا۔ یعنی مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کا انتقال ہوگیا۔ مرحوم کافی عرصے سے فالج کے شکار تھے۔ اور اسی لیے لگ بھگ ڈیڑھ سال سے صاحب فراش تھے۔ ۱۳ رمئی صبح ۸ بجے جامع مسجد میں شاہی امام مولانا عبد اللہ بخاری نے نماز جنازہ پڑھائی۔ مفتی صاحب کا جنازہ مٹیا محل اور ترکمان گیٹ کے راستے قبرستان مہندیان لے جایا گیا۔ یہ وہ قبرستان ہے جہاں حضرت شاہ ولی اللہؒ ان کے خاندان کے دوسرے افراد اور مومن خاں مومنؔ جیسے شاعر یہاں مدفون ہیں جنازے کے ساتھ ہزاروں کی تعداد میں لوگ شامل تھے۔ اس علاقے کے لوگوں نے احتراماً دکانیں بند کر دی تھیں۔ ٹھیک دس بجے مرحوم کی تدفین عمل میں آئی۔

مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کی ابتدائی تعلیم دیوبند ہی میں ہوئی مفتی صاحب کی خوش نصیبی تھی کہ انھیں اپنے والد کے علاوہ حضرت شیخ الہند اور علامہ انور شاہ کشمیری سے شرف تلمذ حاصل ہوا۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد مفتی صاحب کافی عرصے تک دیوبند ہی میں درس و تدریس میں مصروف رہے۔ اس کے بعد گجرات کی مشہور دینی درسگاہ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں استاد مقرر ہوئے۔ جہاں کئی سال تک فقہ، حدیث اور تفسیر کی تعلیم دیتے رہے۔ سیاسی وجوہ سے مفتی صاحب کو گجرات چھوڑ کر کلکتہ آنا پڑا۔ جہاں انہوں نے تقریباً ۵ سال مذہبی تعلیم دی۔ کلکتہ سے جب نکلے تو مفتی صاحب نے کبھی ملازمت نہیں کی کلکتہ کے قیام کے دوران ہی مفتی صاحب نے ندوۃ المصنفین جیسے تاریخی ادارے کی بنیاد رکھدی تھی۔ مفتی صاحب نے سوچا کہ اس طرح کا ادارہ

اگر دہلی منتقل کر دیا جائے تو کام کرنے کی بہتر سہولتیں فراہم ہو جائیں گی۔

۱۹۳۷ء میں یہ ادارہ قائم ہوا اور اس ادارے کے قائم کرنے والوں میں مفتی صاحب کے علاوہ مولانا حفظ الرحمن، مولانا حامد الانصاری غازی، مولانا سعید احمد اکبر آبادی اور مولانا بدر عالم شامل تھے۔ تقریباً انہی دنوں ایک ماہنامہ "برہان" کے نام سے جاری کیا گیا۔ جو اب تک بڑی پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔ ندوۃ المصنفین نے بے شمار ایسی کتابیں چھاپی ہیں جو اسلامی علوم کے فنون، تاریخ، سیرت اور تصوف پر بہترین اور اعلیٰ درجے کی کتابیں سمجھی جاتی ہیں۔

مفتی صاحب ہندوستانی سیاست میں بھی حصہ لیتے تھے۔ جب مفتی صاحب گجرات میں تھے تو گاندھی جی نے نمک ستیا گرہ کی تحریک شروع کی۔ اس تحریک کے حق میں مفتی صاحب نے ایسا فتویٰ دیا کہ تحریک میں غیر معمولی جان پڑ گئی۔ اس فتوے کی مفتی صاحب کو سزا یہ ملی کہ انھیں گجرات چھوڑنا پڑا۔ مفتی صاحب قوم پرور، سیکولر اور خدا پرست انسان تھے۔ مسلمانوں پر جب بھی کبھی ظلم ہوتا مفتی صاحب اس ظلم اور ناانصافی کے خلاف آواز بلند کرتے اور عملی طور پر جو کچھ کر سکتے تھے اس سے کہیں زیادہ کرتے۔

مفتی صاحب مسلم پرسنل لا بورڈ کے نائب صدر تھے۔ ایک طرف انہوں نے مسلم پرسنل لا کی افادیت اور اس کے تحفظ کی ضرورت کو مسلمانوں کے ذہن نشین کرایا اور دوسری طرف حکومت کو مجبور کیا کہ وہ مسلم پرسنل لا میں مداخلت نہ کرے۔ اگر مسلم پرسنل لا ابتک بدستور باقی ہے تو اس میں سب سے زیادہ مفتی صاحب کی کوششوں کو دخل ہے۔ مفتی صاحب مجلس مشاورت کے صدر بھی تھے۔ مفتی صاحب کی وجہ سے مجلس فرقہ واریت کی شکار نہیں ہوئی بلکہ اپنے ابتدائی دور میں اس تنظیم نے ہند مسلم فسادات کے خلاف زبردست جدوجہد کی اور مسلمانوں میں پیدا ہونے والی ایسی مایوسی اور ناکامی کے احساس کو دور کیا جو ہولناک فسادات اور بربادیوں کا ایک گونہ قدرتی نتیجہ تھی۔

مفتی صاحب تعلیمی، علمی اور ادبی اداروں میں غیر معمولی دل چسپی لیتے تھے۔ اور بہت سے اداروں سے وہ وابستہ تھے۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کے لائف ممبر تھے۔ اور تقریباً پچھلے تیس سال سے انجمن سے وابستہ تھے۔ مرحوم کی وفات سے بہت سے ادارے ایک ہمدرد اور دردمند انسان کی رہنمائی سے محروم ہو گئے۔

بیان جذبات

ماہنامہ "مستقبل"، بمبئی

حقیقت یہ ہے کہ ان کے انتقال سے ملت اسلامیہ کا ایک عظیم ستون گر گیا اور مسلمانان ہند ایک عظیم مذہبی رہنما ایک عظیم مفکر اور ایک عظیم روشن خیال شخصیت سے محروم ہو گئے۔

ادارۂ "مستقبل" کے لیے یہ بات عزت و افتخار کا باعث ہے کہ وہ شروع سے ہی اس کے مشاورتی بورڈ سے وابستہ رہے۔ مرحوم نے بیماری کی حالت میں بھی "مستقبل" کو ہمیشہ قیمتی مشوروں سے نوازا اور مسلمانان ہند میں بیداری اور سماجی شعور پیدا کرنے کے سلسلے میں "مستقبل" کی کوششوں کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا ہی نہیں، انہوں نے انتہائی پیچیدہ مسائل خصوصاً فیملی پلاننگ کے موضوع پر شرع اور حدیث کی روشنی میں کھل کر مدلل طریقے سے اپنے اعلیٰ خیالات کا اظہار کیا اور مسلمانوں کے ذہن سے مختلف قسم کی بدگمانیوں کو دور کیا۔ صاف ذہن رکھنے والے مسلمانوں نے ان کے خیالات سے روشنی حاصل کی اور اپنی زندگی سے تاریکیوں کو دور کیا، لیکن افسوسناک پہلو یہ ہے کہ تنگ نظر افراد نے ان کی ہمہ جہت شخصیت کو سمجھنے کے بجائے انہیں شک و شبہ کی نظر سے دیکھا اور انکی ذات گرامی پر رکیک حملے بھی کئے۔ یہ بات بلاجھجک کہی جا سکتی ہے کہ آج مسلمانوں کے کسی بھی فرقے میں مرحوم مفتی صاحب جیسا روشن خیال مذہبی رہنما موجود نہیں ہے۔

آپ نے وطن کی تحریک آزادی میں سرفروشانہ حصہ لیا اور اپنی پرجوش ولولہ

انگیز تقریروں سے لوگوں کے دلوں میں آزادی کے جذبوں کی چنگاریاں روشن کیں
جمعیۃ علماء ہند میں تقریباً پچاس سال تک سرگرمی، جانفشانی اور خلوص کے ساتھ ملّی خدمات انجام دیں۔ آپ جمعیۃ علماء ہند کے صف اول کے رہنماؤں میں شمار کئے جاتے تھے۔ جمعیۃ کے علاوہ تمام مُسلم تنظیموں اور بے شمار تعلیمی وسماجی اداروں میں آپ کی صلاحیتوں باصابت رائے اور دانشمندانہ مشوروں کا اعتراف کیا جاتا تھا اور آپ کی رہنمائی سے فائدہ اٹھایا جاتا تھا۔ کُل ہند مُسلم مجلس مشاورت اور آل انڈیا مُسلم پرسنل لا بورڈ کے لئے تو آپ کی ذاتِ گرامی دل اور دماغ کی حیثیت رکھتی تھی۔ ان تنظیموں کو قائم رکھنے، پروان چڑھانے اور ان کو زیادہ سے زیادہ مؤثر اور فعّال بنانے میں آپ کی شخصیت کلیدی حیثیت رکھتی تھی۔ آپ دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے اہم ممبر تھے۔ کئی بار سینٹرل حج کمیٹی کے چیرمین رہے۔ سینٹرل وقف کونسل اور وقف بورڈ اور مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کے کورٹ کے ممبر رہے۔

ندوۃ المصنفین (دہلی) جیسے باوقار ادارہ کو قائم کرکے آپ نے ملّت اسلامیہ عالم اور دُنیائے علم وادب اور دین ومذہب کی ناقابل فراموش خدمات انجام دیں۔ اہل فکر ونظر تسلیم کرتے ہیں کہ سخت اور دشوارکن حالات میں حضرت مفتی صاحب نے ایسا علمی کارنامہ انجام دیا ہے، جس کا مقام تاریخ وادب میں بہت بُلند ہے۔ بے شمار موضوعات پر مشتمل ٹھوس علمی وتحقیقی لٹریچر اس ادارے سے شائع ہوا ہے۔

اخلاق وشرافت، شائستگی وتہذیب، بلند حوصلگی، وسعت قلب وفکر، وضعداری وپاسداری کی ایسی پاکیزہ خصوصیات آپ میں پائی جاتی تھیں۔ جن کی وجہ سے آپ نہ صرف مسلمانوں کے تمام طبقوں، بلکہ ملک وبیرونِ ملک دوسرے لوگوں میں بھی نہایت عزت واحترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ آپ صحیح معنوں میں انسانی ہمدردی اور خدمت خلق کا بہترین مجسمہ اور نکھرا ہوا نمونہ تھے۔ ملک میں نہ جانے

ایسے کتنے نوجوان موجود ہیں، جنہوں نے حضرت مفتی صاحب کی فکر رہنمائی کی روشنی میں اپنی زندگی کی راہوں کو روشن کیا ہے اور نہ جانے کتنے لوگوں کا مستقبل آپ کی بدولت روشن ہوا ہے۔

آپ تحریر وتقریر کے میدان کے کامیاب شہسوار تھے۔ زبان وقلم میں بلا کی شگفتگی ودلدوزی تھی آپ کی تقریروں میں علم وروحانیت، فکر وبصیرت اور تحقیق وکاوش کے جوہروں کے ساتھ ساتھ ادب کی چاشنی اور اسلوب کی دلآویزیاں چمکتی نظر آتی ہیں۔ کئی اہم کانفرنسوں کی صدارت فرماتے ہوئے آپ نے جو خطبۂ ہائے صدارت پیش کئے ہیں، وہ بھی آپ کی ملی دردمندیوں، فکر وشعور کی پختگی، علم ودانش کی روشنی اور بلند پایہ تجربوں کا گراں قدر اور قابل استفادہ نچوڑ ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو سے دینی ومذہبی موضوعات پر آپ کی تقریریں کتابی صورت میں چھپ چکی ہیں۔

درحقیقت حضرت مفتی صاحب کی ذات گرامی قدیم روایات صالحہ کی قیمتی یادگار تھی۔ عالمانہ تہذیب وشائستگی کی ایک ایسی فلک بوس عمارت آپ کے انتقال سے زمین پر آرہی، جو بڑی دل کش، بڑی بلند پایہ اور قابل حفاظت تھی۔

اللہ تعالیٰ آپ کی بال بال مغفرت فرمائے اور آپ کے پسماندگاں کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

آہ! مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی

ماہنامہ "دین دنیا" دہلی

نہ صرف مسلمانان ہند بلکہ پورے ملک کی یہ انتہائی بدبختی ہے کہ "حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی ڈھائی سال کی طویل علالت کے بعد ۱۲ رمئی کو ہم سے جدا ہو گئے۔ اور اور ۱۳ رمئی کو حضرت شاہ ولی اللہ حضرت شاہ عبدالعزیز حضرت شاہ رفیع الدین اور

حضرت شاہ عبدالقادر جیسے بلند پایہ عالموں کے پہلو میں جاکر اس قبرستان مہندیان میں آرام فرما ہوگئے جسے بقول مولانا سعید احمد اکبر آبادی "شاہ ولی اللہ دہلوی اور آپ کے خانوادہ گرامی نے برصغیر ہند کا جنت البقیع بنا دیا ہے۔" گویا آپ زندگی میں بھی علمار میں گھرے رہے اور مرنے کے بعد بھی حلقہ علمار میں بدستور شامل رہے۔

حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کی شخصیت اس قدر ہمہ گیر اور ہمہ صفت ہے جس کی مثال شاید اس زمانے میں ناپید ہے آپ ایک شب زندہ دار بزرگ بھی تھے اور عالم باعمل بھی آپ ایک سحر بیان مقرر بھی تھے اور بے مثال اہل قلم بھی آپ کو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی دینی فہم بھی عطا کی تھی اور دنیاوی شعور بھی۔ آپ صف اول کے سیاستداں بھی تھے اور پاکیزہ اخلاق کا مجسمہ بھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ کے کردار میں صحابہ کرام کی تقلید کی پوری جھلک پائی جاتی تھی۔

حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی نے چونکہ دارالعلوم دیوبند کی اس فضا میں تعلیم و تربیت حاصل فرمائی تھی جو دینی قلعہ کے علاوہ جنگ آزادی کا ملک میں سب سے بڑا مرکز تھا اس لئے وہ ایک بلند پایہ عالم دین ہونے کے ساتھ جنگ آزادی کے سالاروں میں سے بھی تھے۔ اور اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انہوں نے اس ملک کے مسلمانوں میں سچی اور ایماندارانہ حب الوطنی کی اسپرٹ پیدا کرنے میں اس قدر نمایاں حصہ لیا ہے جسے ہمارے ملک کی جنگ آزادی کی تاریخ قیامت تک فراموش نہیں کرسکتی۔

ہمارا اندازہ یہ ہے کہ وہ ہندوستان کی آخری اور واحد ہستی تھے جن کی حق پسندی کو اس ملک کے سرکاری اور قومی حلقوں میں یکساں قدر و منزلت کے ساتھ دیکھا جاتا تھا حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن کا سیاسی رجحان اگرچہ دوسرے علمار دیوبند کی طرح کانگریس کی جانب رہا ہے لیکن وہ کانگریس کی کوتاہیوں کی بھی برابر نشاندہی

کرتے رہتے تھے۔ اور ان کی اس حق گوئی اور صداقت شعاری کو ملک کی دوسری سیاسی جماعتوں میں بھی بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ چنانچہ ہندوستان کی تقریباً سب ہی سیاسی پارٹیوں کے رہنما مفتی صاحب کی حق گوئی اور صداقت شعاری کی بنا پر ان کا بے حد احترام کرتے تھے اور مفتی صاحب کی سیاسی بصیرت سے فائدہ اٹھاتے تھے۔

مفتی صاحب مرحوم نے جہاں دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے ایک ممبر کی حیثیت سے۔ اور مسلم پرسنل لا بورڈ کے نائب صدر کی حیثیت سے ملت اسلامیہ کی اہم خدمات انجام دی ہیں وہاں انہوں نے مجلس مشاورت کو آگے بڑھانے میں بڑی دل سوزی سے کام کیا ہے مفتی صاحب کی دلی تمنا تھی کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے جتنے بھی الجھے ہوئے مسائل ہیں وہ کسی نہ کسی طرح حل ہو جائیں اور اسی مقصد کے تحت انہوں نے ڈاکٹر سید محمود کی وفات کے بعد "مجلس مشاورت" کے صدر کی ذمہ داری قبول کر لی تھی۔ مفتی صاحب چاہتے تھے کہ ہندوستان کی سب ہی مسلم جماعتوں کے رہنما اپنی سیاسی پالیسی کو برقرار رکھتے ہوئے مسلمانوں کے مشترک بنیادی مسائل کے حل کرنے میں متحد ہو جائیں اور ایک ہی پلیٹ فارم سے مسلمانوں کے پیچیدہ مسائل کے حل کی تحریک پوری مضبوطی سے چلائیں۔ لیکن افسوس کہ مفتی صاحب مرحوم اس نیک مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکے۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر ہمارے ملک کی مسلم جماعتوں کے رہنماؤں نے مفتی صاحب کی رائے کے مطابق مسلمانوں کے متفقہ مسائل کے بارے میں متحد ہو کر کام کیا ہوتا تو شائد آج مسلمانان ہند کی وہ حالت نہ ہوتی جو اس وقت موجود ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ملک اور وطن پر نیز مسلمانان ہند پر حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کے اس قدر احسانات ہیں جنہیں کسی طرح بھی نہیں بھلایا جاسکتا۔

सत्यमेव जयते

उप राष्ट्रपति, भारत
नई दिल्ली
VICE-PRESIDENT
INDIA
NEW DELHI

۱۷ مئی 19۸۴

مکرمی! سلام و رحمت

حضرت مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کے سانحۂ ارتحال کی
خبر سن کر مجھے بے حد رنج ہوا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون
مفتی صاحب ایک عظیم مفکر، ایک عالم دین، ایک محب وطن
اور نہایت سادہ مزاج انسان تھے۔ خدائے پاک ان
کی روح کو اپنی آغوش رحمت میں جگہ عطا فرمائیں اور
پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق دے۔

والسلام

مخلص
ہدایت اللہ

سابق وزیراعظم ہند اندرا گاندھی کا اظہارِ غم

حضرت مفتی صاحبؒ کی وفات کی خبر سن کر اس وقت کی وزیراعظم اندرا گاندھی نے کہا ـــــــــ (ہندوستان ٹائمز، دہلی)

"مجھے اس خبر کے دلی صدمہ پہنچا، مرحوم ایک ممتاز عالم
قوم پرست مفکر تھے، اُن کا اٹھ جانا پورے ملک
اور قوم کے لیے ناقابل تلافی نقصان ہے۔"

الحاج ذوالفقار اللہ صاحب (سابق وزیر حکومت ہند)

مکرمی منیب الرحمٰن صاحب۔ اسلام علیکم

اخبارات سے جناب کے والد صاحب قبلہ مفتی عتیق الرحمٰن کے انتقال کی خبر معلوم ہو کر بیحد رنج ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ تعالیٰ ان کو غریق رحمت فرمائیں اور بلند درجات عطا فرمائیں۔ نہایت نیک خصلت اور ملت کے بڑے دردمند بزرگ تھے، میرے بڑے کرمفرما۔ بیماری کے درمیان بھی جب میں دہلی جاتا تھا برابر ملاقات کرتا تھا۔

اپنے سب بہن بھائیوں اور دیگر خاندان والوں سے میری طرف سے تعزیت کر دیجئے۔

والسلام۔ محمد ذوالفقار اللہ

۱۵ رمئی ۱۹۸۴ء

※

لوک دل لیڈر ہیم وتی نندن بہوگنا ایم۔پی (سابق وزیر حکومت ہند)

جناب مجیب صاحب!

حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کی خبر سنکر قلبی رنج ہوا۔ مفتی صاحب نے ملک کی جنگِ آزادی میں جس سرگرمی سے حصہ لیا۔ اُسے بھلایا نہیں جا سکتا۔ مہاتما گاندھی نے جب نمک اندولن شروع کیا۔ تو مفتی صاحب نے انگریزوں کے خلاف فتویٰ صادر کر کے ملک کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ علم دین کی ترویج واشاعت کے لئے انھوں نے جو عملی اقدامات کئے، اُن کی ہمیشہ ایک سرمایہ کی طرح حفاظت کی جائے گی۔ مسلمانوں کے کاز کے لئے مرحوم نے ہمیشہ تعمیری رُخ اپنایا۔ مسلم پرسنل لا کی حفاظت کے لئے مرحوم نے بڑی اہم خدمات انجام دیں۔ ان کے انتقال سے جو خلا پیدا ہوا ہے بڑی مشکل سے پُر ہو سکے گا۔

موت وحیات اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ ہرانسان کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔ آپ لوگوں کی خوش قسمتی ہے کہ مرحوم کا سایہ دیر تک قائم رہا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں جگہ دے۔ نیز آپ سب متعلقین کو صبر جمیل سے نوازے۔ آمین

آپکا مخلص

ہیم وتی نندن بہوگنا

٭

الحاج ابراہیم سلیمان سیٹھ صدر انڈین مسلم لیگ وممبر پارلیمنٹ

آج ہی مالابار علاقے سے انتخابی مہم کے بعد واپس آیا۔ حضرت مولانا مفتی صاحب کے انتقال پُرملال کی خبر ملی۔ بے حد صدمہ ہوا۔ مفتی صاحب کا رحلت کرجانا ملّت اسلامیہ کا ایسا عظیم نقصان ہے جس کی تلافی ناممکن ہے۔ آپ نے نہایت ہی صبر آزما دور میں مسلم مجلس مشاورت کے صدر کی حیثیت سے مسلمانانِ ہند کی جس انداز سے قیادت فرمائی اس کی نظیر تاریخ میں ملنی مشکل ہے۔ آپ میں تمام جماعتوں کو اپنے ساتھ لے چلنے کی جو بے پناہ صلاحیت تھی اس کا اعتراف نہ کرنا حقیقت کی پردہ پوشی ہوگی۔

حضرت مولانا مفتی صاحب کے تبحرِ علمی اور ان کی مسائل پر گہری نظر کا اعتراف لازمی ہے۔ اس کے ساتھ جو محبت وخلوص میں نے ان میں پائی اس کی دوسری کوئی مثال نہیں ہے ہمارے بیس سالہ تعلقات کے دوران جو شفقت آمیز سلوک میرے ساتھ ان کا رہا ہے۔ اس کی یاد تڑپاتی رہے گی۔ اور ان کے لئے بے اختیار احترام کا جذبہ اُبھر آتا ہے۔ حضرت مولانا سے تعلقات میرے لئے ایک قابل فخر بات ہے۔

حضرت مولانا مفتی صاحب کی ذات خود ایک انجمن تھی اور ایسا بلند مقام اور ایسی اعلیٰ قابلیت رکھنے والی شخصیتوں میں آخری شمع تھی۔ اب ایسی شخصیت کا پانا صدیوں

تک محال و مشکل ہوگا۔ ایسی عظیم المرتبت شخصیتوں کے تعلق ہی سے علامہ اقبال نے فرمایا تھا۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

ابھی دو ہفتہ پیشتر ملاقات پر کیرلا کے دورے کا ذکر فرمایا تھا۔ اور انھیں پندرہ سال پُرانی ہر بات یاد تھی۔ دار العلوم کے سلسلہ میں ہمیشہ فکرمند رہتے تھے۔ مسلم مجلس مشاورت تو ان کی زندگی کا مشن بن چکی تھی۔ مسلم پرسنل لا بورڈ کے نائب صدر کی حیثیت سے بورڈ کی ذمہ داریوں کو پوری طرح آخر دم تک انجام دیتے رہے۔

آپ سے، تمام بھائیوں اور پورے خاندان سے اپنے گہرے جذباتِ ہمدردی کا اظہار کرتا ہوں۔ حضرت مولانا مفتی صاحب پوری ملّت کے ہمدرد اور خیر خواہ تھے۔ آج پوری ملت سوگوار ہے۔

اللہ تعالیٰ آپ تمام متعلقین کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ اور حضرت مفتی صاحب کو جنّت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔

مثلِ ایوانِ سحر مرقد فروزاں ہو ترا
نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا

شریکِ غم
ابراہیم سلیمان (۱۵ر مئی ۱۹۸۴ء)

※

عقیل محمد صاحب وکیل میرٹھی۔ مہاجر و مقیم مدینہ منورہ

عزیزم عبید الرحمٰن سلمہٗ السلام علیکم

اتوار کے روز بذریعہ مولانا آفتاب سلمہٗ یہ صدمہ انگیز خبر موصول ہوئی۔ کہ آپ کے

والد بزرگوار جناب حافظ حاجی مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب اس دار فانی سے کوچ فرما گئے
إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ چونکہ ایک ماہ قبل سے حضرت موصوف کی شدید علالت کی
خبریں مل رہی تھیں اس لئے حادثۂ ناگہانی تو نہیں کہا جا سکتا۔ تاہم مجھے ایسا محسوس ہوا کہ
خود میرے سر پر سے ایک سایہ اُٹھ گیا۔ میں ہمیشہ ان کو اپنا خاص مشفق مربّی تصور کرتا تھا۔
عجیب اتفاق ہے کہ وہ میرے بزرگ محترم بھی تھے اور بے تکلف دوست بھی تھے جب سے
میں مدینہ منورہ حاضر ہوا۔ حضرت موصوف کو برابر یہ فکر رہتی تھی۔ کہ یہاں میری معاش کا کیا انتظام
ہوگا۔ اور خطوں میں یہ دریافت فرماتے تھے۔ کہ مجھے عربی بول چال کی مشق ہوگئی کہ نہیں حقیقت
یہ ہے کہ حضرت موصوف کی ہستی ایسی تھی کہ اُن کی وفات صرف میرا یا آپ کا نقصان ہی نہیں ہے
بلکہ دہلی اور ہندوستان کے مسلمانوں کا بڑا نقصان ہوا۔ یہاں جو خدّام سلسلہ ہیں انھوں
نے قرآن شریف کے ختم کرائے ہیں۔ اور مکہ معظمہ میں بھی ختم قرآن ہوئے ہیں۔ نہ معلوم کس
طرح پر حرم نبوی میں وفات کی خبر پھیلتی جا رہی ہے۔ مجھے حرم شریف میں ایسے غیر متعلق
لوگ ملے جنہوں نے دوسرے ذرائع سے خبر کی تصدیق حاصل کی اور بطور خود ختم قرآن کرائے۔

آپ کے والد بزرگوار کی وفات سے پوری ایک بساط اُلٹ گئی۔ اور ہمارے بزرگوں
کا ایک دور ختم ہوگیا۔ اور اب آگے اندھیرا ہی نظر آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ رحم فرمائے۔ اور
آپ سب متعلقین کو صبر و سکون مرحمت فرمائے۔ میری جانب سے اپنی والدہ محترمہ کی
خدمت میں اور سب بھائیوں کو کلمات تعزیت پہنچا دیجئے۔

میرے یہاں قیام کو اب نواں سال چل رہا ہے۔ دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ یہیں ایمان
پر خاتمہ نصیب فرمائے۔

خادم: عقیل محمد

معرفت پوسٹ بکس ۳۲۲

مدینہ منورہ سعودی عرب

مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی الی رحمۃ اللہ

مولانا محمد منظور نعمانی
مدیر ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

۱۰ر شعبان (۱۲ر مئی) شنبہ کا دن تھا، راقم سطور نماز مغرب سے فارغ ہوا تھا کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے استاذ اور اس کے عربی ماہنامہ البعث الاسلامی کے مدیر مولانا سعید الرحمٰن اعظمی نے فون پر بتلایا کہ دہلی سے ٹیلی فون سے اطلاع ملی ہے کہ مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی صاحب انتقال فرما گئے۔ خبر سن کر قرآن مجید کی تعلیم و تلقین کے مطابق یہی کلمہ زبان پر آیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ (جس کا سیدھا سا مطلب یہ ہے کہ ہم سب اللہ ہی کے ہیں، وہی ہمارا خالق و پروردگار اور مالک و حاکم ہے اور ہماری حیات و موت اور سب کچھ اسی کے اختیار میں ہے اور ہم سب یہاں کی زندگی پوری کر کے اسی کی طرف لوٹنے والے اور اسی کے حضور میں حاضر ہونے والے ہیں) اس کلمہ نے اپنی موت بھی آنکھوں کے سامنے کر دی اور سوچنے لگا کہ یہی دن (بظاہر جلدی ہی) میرے لیے بھی آنے والا ہے، اُس وقت میری سب سے بڑی طلب اور حاجت یہ ہوگی کہ رب کریم رحم و کرم کا معاملہ فرمائے۔ اس خیال کے آتے ہی اللہ تعالیٰ کی توفیق سے مفتی صاحب کے لیے اور خود اپنے لیے مغفرت و

رحمت کی دعا میں مشغولیت نصیب ہوگئی ۔ اس عاجز نے اسی کو اُن کے ساتھ دیرینہ تعلق کا حق اور اُس دوسرے عالم میں جہاں وہ پہنچ گئے، اُن کی ممکن خدمت اور راحت رسانی کا وسیلہ سمجھا ، اللہ تعالیٰ آئندہ بھی اُن کے حق کے مطابق اس کے اہتمام کی توفیق عطا فرمائے ۔ رب اغفر وارحم و انت خیر الراحمین

مفتی صاحبؒ سے تعارف اور تعلق

اب سے اکسٹھ سال پہلے ۱۳۴۳ھ میں جب راقم سطور ایک طالب علم کی حیثیت سے دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوا تو پہلی دفعہ اسی وقت مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کو دیکھا تھا ۔ وہ اُس وقت ۲۳ ۔ ۲۴ سال کے جوان تھے ۔ دو سال پہلے ۱۳۴۱ھ میں دارالعلوم سے فراغت حاصل کر چکے تھے ۔ اُس وقت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ عہدہ کے لحاظ سے دارالعلوم دیوبند کے نائب مہتمم تھے لیکن اہتمام کا سارا کام وہی انجام دیتے تھے ۔ اس لیے عملاً گویا وہی مہتمم تھے ۔ ان کا دستور تھا کہ دارالعلوم کے فضلا و فارغین میں جو بھی استعداد کے لحاظ سے ممتاز ہوتے وہ معین المدرس کی حیثیت سے ان کو دارالعلوم میں لے لیتے اور ابتدائی درجات کی تعلیم و تدریس کا کام ان سے لیتے ۔ مفتی عتیق الرحمٰن صاحب علمی استعداد کے لحاظ سے بہت ممتاز تھے ، تعلیم کے آخری سال یعنی دورۂ حدیث میں انھوں نے اپنی پوری جماعت میں اعلیٰ نمبر حاصل کر کے امتیاز کے ساتھ کامیابی حاصل کی تھی ، اس لیے ان کو معین المدرس کی حیثیت سے دارالعلوم میں لے لیا گیا ان کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ اس زمانہ میں دارالعلوم کے مفتی تھے مفتی عتیق الرحمٰن صاحب ان کی نگرانی میں افتاء (فتویٰ نویسی) کا کام بھی کرتے تھے ۔ اس وجہ سے ان کو نائب مفتی بھی کہا جاتا تھا ۔

میرے مزاج میں فطری طور پر کم آمیزی ہے جو دارالعلوم کی طالب علمی کے اس زمانہ میں حد سے بڑھی ہوئی تھی، بے ضرورت کسی سے ملنے ملانے کا بالکل معمول نہیں تھا۔ میں اپنی طالب علمی کے آخری مرحلے میں دیوبند گیا تھا۔ اس لیے صرف انہی اکابر اساتذہ سے اس زمانہ میں اس عاجز کا تعلق رہا جن کے یہاں میرے اسباق ہوتے تھے۔ اس لیے اس زمانہ میں مفتی عتیق الرحمٰن صاحب سے کوئی خاص تعلق نہیں رہا۔ بس اتنا ہی جانتا تھا کہ یہ حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب کے صاحبزادے ہیں۔ معین المدرس اور نائب مفتی ہیں۔

شعبان ۱۳۴۵ھ میں دارالعلوم کی میری طالب علمی کا دور ختم ہوگیا اور میں دورۂ حدیث کا امتحان دے کر مکان آگیا۔ اپنی جس فطری کم آمیزی کا اوپر ذکر کیا ہے اس کی وجہ سے میں اس بات سے تقریباً بے خبر رہا کہ دارالعلوم میں اوپر کی سطح پر کچھ اختلافات ہیں، یہ میرے مکان پہ آجانے کے بعد جلد ہی اخبارات اور بعض دوسرے ذرائع سے معلوم ہونے لگا کہ ان اختلافات نے سنگین صورت اختیار کرلی اور اس کے نتیجہ میں اس وقت کے صدر المدرسین اور شیخ الحدیث استاذنا حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی اور ان کے ساتھ دیگر متعدد اکابر اساتذہ نے دارالعلوم سے تعلق قطع کرلیا۔ ان حضرات کے ساتھ جن نوجوان اساتذہ نے دارالعلوم سے قطع تعلق کیا تھا اُن میں مولانا بدر عالم میرٹھی مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی اور مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی بھی تھے۔

کچھ عرصہ کے بعد یہ سب حضرات گجرات ضلع سورت کی بستی ڈابھیل کے مدرسہ تعلیم الدین میں اجتماعی طور پر بلائے گئے اور اس کے بعد سے وہ مدرسہ جامعہ اسلامیہ ہوگیا اور اس طرح دارالعلوم کے اختلاف کے اس شر سے یہ خیر پیدا ہوا کہ گجرات میں کم از کم تعلیم کی سطح پر دارالعلوم دیوبند جیسا ہی ایک جامعہ اسلامیہ قائم ہوگیا۔

حضرت مفتی عزیزالرحمٰن عثمانیؒ اس وقت اس قافلہ کے ساتھ تشریف نہیں لے گئے دیوبند ہی میں اپنے مکان پر اور اپنی مسجد کے حجرہ ہی کو اپنی قیام گاہ بنالیا، لیکن مفتی عتیق الرحمٰن صاحب قافلہ کے ساتھ تشریف لے گئے اور جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں تدریس کے علاوہ افتار کی ذمہ داری بھی اُن کے سپرد رہی —— کچھ عرصہ کے بعد آب و ہوا کی ناموافقت کی وجہ سے جامعہ اسلامیہ ڈابھیل سے مستعفی ہوکر چلے آئے اور پھر چند سال کلکتہ میں قیام فرمایا، یہاں درس قرآن اور خطابت و موعظت خاص مشغلہ رہا۔ کلکتہ کے اس قیام ہی کے زمانے میں ایک تصنیفی اشاعتی ادارے کے قیام کا خاکہ بنایا اور پھر اس کام کے لیے مستقل دہلی آگئے اور اپنے قدیم رفقاء مولانا بدرعالم میرٹھی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مولانا سعید احمد اکبرآبادی کے اشتراک و تعاون سے یہ ادارہ ندوۃ المصنفین کے نام سے قرول باغ دہلی میں (۱۳۵۷ھ ۱۹۳۸ء) میں قائم کیا اور اس کا ماہنامہ برھان جاری کیا۔ ادارہ کے انتظام کی ذمہ داری خود سنبھالی۔

الفرقان ۱۳۵۳ھ (۱۹۳۴ء) میں بریلی سے جاری ہوچکا تھا لیکن کئی سال تک اس کی طباعت دہلی میں ہوتی تھی۔ راقم سطور ہر مہینہ اس کی کاپیاں لے کر چھپوانے کے لیے خود دہلی جاتا تھا۔ ندوۃ المصنفین قائم ہوجانے کے بعد سے مفتی صاحب اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ کا قیام قرول باغ ہی میں رہتا۔ یہ عاجز اُس زمانے میں جب بھی دہلی جاتا، ان حضرات کی ملاقات کے لیے قرول باغ ضرور جاتا اور کبھی کبھی دن کا زیادہ وقت وہیں گزرتا۔

ملک کی تقسیم کے فیصلہ کے بعد ۱۹۴۷ء میں دہلی میں جو فسادات ہوئے اور دہلی کے مسلمانوں پر جو قیامت ٹوٹی اس میں ندوۃ المصنفین بھی برباد ہوگیا تھا۔ قرول باغ مسلمانوں سے بالکل خالی ہوگیا تھا اور بظاہر اسبا ب

ندوۃ المصنفین کے بقا کی کوئی صورت باقی نہیں رہی تھی لیکن فی الحقیقت اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے اور بظاہر اسباب مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کی دانشمندی، عزم وہمت اور مولانا حفظ الرحمٰن کی جد وجہد سے وہ پھر قائم ہوا۔ جامع مسجد کے علاقہ میں اس کے لیے ایک مناسب مکان حاصل کرلیا گیا۔ بفضلہ تعالیٰ وہ اسی میں قائم ہے۔ اس کا ماہنامہ برہان مولانا سعید احمد اکبرآبادی کی ادارت میں جاری ہوا تھا، اب تک انہی کی ادارت میں جاری ہے بعد کے اس دور میں بارہا ایسا ہوا کہ کسی ضرورت سے دہلی جانا ہوا تو ندوۃ المصنفین ہی میں قیام کیا۔

راقم سطور ۱۳۶۳ھ ۱۹۴۴ء میں دار العلوم کی مجلس شوریٰ کا رکن منتخب کرلیا گیا اس کے ۴۔ ۵ سال بعد ۱۳۶۸ھ میں مفتی صاحب بھی اس کے رکن منتخب ہوگئے۔ اُس وقت سے دار العلوم کی مجلس شوریٰ اور عاملہ کے جلسوں میں برابر ساتھ شرکت ہوتی رہی۔ ۱۹۶۵ء میں مجلس مشاورت قائم ہوئی اس میں بھی اس وقت تک ساتھ رہا جب تک کہ راقم سطور اور اس کے اصل بانی ڈاکٹر سید محمود نے استعفا دے کر بے تعلقی اختیار نہیں کی۔

قریباً نصف صدی کے اس قریبی تعلق میں میں نے مفتی صاحب کے بارے میں جو کچھ جانا اس کو مختصر الفاظ میں اس طرح عرض کیا جاسکتا ہے کہ وہ نہایت ذہین، فہیم وفطین اور معاملہ فہم عالم دین تھے۔ تقریر اور تحریر پر یکساں قدرت تھی۔ موقع پر ضرورت کے مطابق بات کرنے کی اللہ تعالیٰ نے خاص صلاحیت عطا فرمائی تھی اگر ندوۃ المصنفین کی انتظامی ذمہ داری نہ سنبھالی ہوتی اور اپنے کو انھوں نے تدریس وتصنیف جیسے علمی کاموں میں مشغول کیا ہوتا تو وہ حدیث وتفسیر وغیرہ علوم دینیہ کے درجۂ اول کے اساتذہ اور صفِ اول کے مصنفین

میں ہوئے لیکن ماشاء اللہ کان وما لم یشاء لم یکن

وہ حافظ قرآن بھی تھے اور قرآن مجید بہت ہی اچھا پڑھتے تھے۔ رمضان مبارک میں وہ تراویح تو قریب کی مسجد میں قرآن مجید سنانے والے امام ہی کے پیچھے پڑھتے تھے لیکن نوافل میں اپنا قرآن مجید ختم کرنے کا معمول تھا جو غالباً اُن کی اس علالت تک جاری رہا جس کا انجام اب ان کے سفر آخرت پر ہوا۔

قریباً سوا دو سال ہوتے دار المصنفین اعظم گڑھ میں اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر عالمی مجلس مذاکرہ تھی۔ مفتی صاحب نے اس میں شرکت فرمائی تھی۔ وہ اس سے فارغ ہو کر باوڑہ، دہرہ دون ایکسپریس سے واپس آرہے تھے۔ دوسرے رفقاء سفر کے علاوہ ان کے خاص رفیق مولانا سعید احمد اکبرآبادی بھی ساتھ تھے۔ بارہ بنکی کا اسٹیشن آنے سے پہلے بات کرتے کرتے مفتی صاحب پر فالج کا حملہ ہوگیا۔ ٹرین جب بارہ بنکی اسٹیشن پہنچی تو مولانا اکبرآبادی نے فون کے ذریعہ لکھنؤ کے اسٹیشن ماسٹر کو مفتی صاحبؒ کے بارے میں بتلایا اور کہا کہ ان کو لکھنؤ اتار کر اسپتال پہنچانا ہوگا۔ اس لیے جب ہماری گاڑی لکھنؤ پہنچے تو اسٹیشن پر ڈاکٹر اور ایمبولنس موجود ہو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا جب گاڑی لکھنؤ اسٹیشن پہنچی تو مفتی صاحب کو اتار کر ایمبولنس کے ذریعہ یہاں کے بلرامپور اسپتال میں داخل کیا گیا۔ مولانا علی میاں جو اعظم گڑھ سے مفتی صاحب سے پہلے تشریف لاچکے تھے اور دار العلوم ندوہ میں مقیم تھے، ان کو اسی وقت اطلاع ہوگئی وہ اسی اسپتال تشریف لائے اور دار العلوم کے چند سعادت مند طلبہ کی ڈیوٹی مفتی صاحب کی خدمت و تیمارداری کے لیے مقرر کردی۔ مجھے دیر رات کے بعد دار العلوم ہی سے اس کی اطلاع ملی۔ میں صبح بعد نماز فجر ان کو دیکھنے کے لیے اسپتال گیا۔ اس وقت ان کی حالت بہت ہی نازک اور بظاہر مایوس کن تھی، بول بالکل نہیں

سکتے تھے۔ اپنے ارادہ سے جسم کے کسی حصہ کو حرکت بھی نہیں دے سکتے تھے۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ انھوں نے مجھ کو پہچان لیا۔ میں نے اس وقت تسلی کی جو بات کہنا مناسب سمجھی وہ کہی اور اندازہ ہوا کہ انھوں نے میری بات سمجھ لی۔ قریباً ایک ہفتہ لکھنؤ کے اس اسپتال میں قیام رہا۔ حالت کچھ بہتر ہوگئی۔ ان کے صاحبزادے اور داماد اطلاع ملنے پر دوسرے ہی دن آگئے تھے۔ یہاں کے ڈاکٹروں کے مشورہ سے طے ہوا کہ مزید علاج کے لیے ان کو دہلی لے جایا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ طویل عرصہ تک دہلی کے ایک اسپتال میں زیرِ علاج رہے اور حالت تدریجاً بہتر ہوتی رہی، یہاں تک کہ اسپتال سے ان کو گھر لے آیا گیا اور آنے جانے والوں سے معلوم ہوتا رہا کہ نقل و حرکت تو اب بھی مشکل ہے لیکن دماغ صحیح کام کرنے لگا ہے اور بات بھی کرتے ہیں۔

جب وہ لکھنؤ اسپتال میں تھے تو ان کی حالت دیکھ کر شدت کے ساتھ یہ احساس بار بار ہوا کہ قریباً نصف صدی کے اس تعلق کے زمانہ میں مختلف معاملات کے بارے میں رائے کا اختلاف بھی ہوا، اور اس کا کافی امکان ہے کہ میری کسی بات سے ان کو اذیت پہنچی ہو، یا میں نے ان کی غیبت کی ہو یا سنی ہو، یا دل میں کوئی بدگمانی آئی ہو، اس لیے حتی الوسع زندگی ہی میں آخرت کے لیے اپنے معاملہ کو صاف کر لینا چاہیے۔ لیکن یہ خطرہ ہوا کہ اس طرح کی بات سے اُن کو یہ محسوس نہ ہو کہ ہم لوگوں کو اُن کے بارے میں مایوسی ہے۔ اس لیے اس وقت دل کے اس داعیہ کو دبایا اور کچھ عرض نہیں کیا۔ پھر جب عرصہ کے بعد یہ معلوم ہوگیا کہ وہ دہلی میں اسپتال سے گھر لے آئے گئے ہیں اور حالت کافی بہتر ہے تو میں نے ان کی خدمت میں اس سلسلہ میں عریضہ لکھا اور آخرت کے لیے معافی کی صفائی اور معافی کی درخواست کی۔ قریباً تین مہینے کے بعد

مفتی صاحب کا لکھایا ہوا عنایت نامہ ملا جس میں انھوں نے لکھایا تھا کہ آپ کا خط تو وقت پر پہنچ گیا تھا لیکن گھر والوں نے اب سے پہلے مجھے دینا مناسب نہیں سمجھا، آج ہی میں نے دیکھا ہے۔ آگے مفتی صاحب نے وہ لکھایا تھا جو اُن کے شایان شان تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کو اس احسان کی بہتر سے بہتر جزا عطا فرمائے۔

اب سے کچھ دنوں پہلے ان کی طبیعت پھر زیادہ خراب ہوئی۔ معلوم ہوا تھا کہ ضعف بڑھ رہا ہے ــ ۱۰ ارشعبان ۱۲ ارمئی کو اچانک وہ اطلاع ملی جو اوپر ذکر کی جاچکی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ مغفرت و رحمت کا خاص معاملہ فرمائے۔ ناظرین کرام سے بھی اسی کی دعا درخواست ہے۔ اس عاجز پر بھی احسان ہوگا۔ ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین

کلماتِ تعزیت (مولانا مسعود احمد صدیقی، اجین)

ابھی ابھی اخبارات میں یہ جانکاہ خبر پڑھی کہ حضرت مفتی صاحب دنیا سے رخصت ہو گئے۔ انا للہ۔۔۔ کیسی المناک خبر ہے واحسرتا! کیسی عظیم الشان شخصیت، تقریر و تحریر کا بادشاہ متانت و وقار، معاملہ فہمی اور عالی ظرفی کا پیکر مجسم، فریادی ہوں کہ میں یتیم ہو گیا، میری قوم یتیم ہو گئی، میرا پورا وطن بے نور ہو گیا۔ آہ! ثم آہ!!!

نقشِ تحریر مولانا سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب

مدیر ماہنامہ معارف اعظم گڈھ

۱۲ مئی ۱۹۸۴ء کو ہندوستان کے نامور عالم مولانا مفتی عتیق الرحمان فالج کے موذی مرض میں ایک طویل مدت تک مبتلا رہ کر ۸۴ سال کی عمر میں اس دار فانی سے رحلت گرائے عالمِ جاودانی ہوئے۔

ان کے اس مرض کی المنا کی دار المصنفین سے بھی بڑی حد تک وابستہ ہے' اس لیے اس ادارہ کے خدام ان کی وفات حسرت آیات سے بہت سوگوار ہیں' فروری ۱۹۸۲ء میں یہاں "اسلام اور مستشرقین" پر جو سیمنار ہوا تھا اس میں وہ شرکت کے لیے تشریف لائے تھے' تین روز یہاں بہت ہنسی خوشی سے گذارے' اس کے ایک اجلاس کی صدارت بھی کی' خوش خوش یہاں سے اور شرکاء کے ساتھ روانہ ہوئے تو ریل ہی میں بارہ بنکی کے پاس ان پر فالج کا سخت حملہ ہوا' انکے ہم سفر مولانا سعید احمد اکبر آبادی اور مولانا سجاد حسین نے ان کو کسی طرح لکھنؤ کے ہسپتال میں داخل کیا' ان کی طبیعت کچھ سنبھلی تو پھر دہلی لے جائے گئے' اس وقت سے اپنی وفات تک تقریباً سوا دو سال تک بستر ہی پر رہے' خیال ہوتا ہے کہ وہ دار المصنفین کا سفر نہ کرتے تو اس موذی مرض میں مبتلا نہ ہوتے' مگر مشیتِ ایزدی یہی تھی' راقم ان کی عیادت کے لیے کئی بار ان کی خدمت میں حاضر ہوا ان کا جسم تو بے کار ہو چکا تھا' مگر دماغ بیدار رہا' گفتگو میں وہی روانی اور شیرینی ہوتی' جو ان کی طبیعت کا مخصوص

رنگ تھا، ہر قسم کے مسائل پر گفتگو کرتے، مگر زیادہ تر دارالعلوم دیوبند کے قضیۂ نامرضیہ پر اظہار خیال کرتے، ایسا معلوم ہوتا کہ وہاں کا المیہ پیش نہ آتا تو اس مرض میں مبتلا نہ ہوتے اور ہوتے بھی تو اتنے دنوں تک بستر علالت پر پڑے نہ رہتے، دارالعلوم دیوبند سے ان کا لگاؤ فطری تھا، کیونکہ ان کے جد امجد مولانا فضل الرحمن رح اس کے بانیوں میں سے تھے۔

ان کی زندگی ان کے گوناگوں مشاغل سے معمور رہی، دارالعلوم دیوبند کے ان علمار میں شمار کیے جاتے جن پر بجا طور سے اس کو فخر ہو سکتا ہے، دیوبند اور ڈابھیل کے مدرسوں میں کچھ دنوں درس و افتار کی خدمت انجام دی، پھر کلکتہ کی کولوٹولہ اسٹریٹ کی بڑی مسجد کے خطیب رہے، جہاں اپنے درس قرآن سے بھی لوگوں کو مستفیض کیا، وہاں سے دہلی آکر ندوۃ المصنفین قائم کیا، اور اسی کو حرزِ جاں بنا کر اپنی پوری زندگی گزار دی۔

سیاست میں بھی برابر حصہ لیتے رہے، بڑے خوش بیان مقرر تھے ہندوستان کی آزادی کی جنگ لڑنے کے لیے انڈین نیشنل کانگریس کے جاں باز سپاہی بنے تو اپنی وضع داری میں آخر وقت تک اس کے ساتھ رہے، مگر وہ ان کانگریسی مسلمان رہنماؤں میں نہ تھے جو ہندوؤں اور حکومت میں تو بہت محبوب سمجھے جاتے ہیں، لیکن اپنے ہم مذہبوں میں معتوب ہوتے ہیں، ان کا سیاسی ذہن بہت صاف تھا، اس لیے غیر کانگریسی رہنماؤں سے بھی ان کا میل ملاپ رہا، ان سے اپنے تعلقات کے آبگینے میں کسی قسم کی ٹھیس لگنے کو پسند نہ کرتے، اونچے خاندان کے چشم و چراغ تھے، اس لیے خاندانی وراثت میں جو اوصاف پائے تھے، ان کو اپنی سیاسی زندگی میں بھی برقرار رکھا، اپنے معاصروں سے بہت ہی محبانہ طور پر ملتے، خواہ ان کا سیاسی مسلک کچھ بھی ہوتا، اپنے چھوٹوں سے مربیانہ انداز کی گفتگو کر کے ان کے

دلوں کو موہ لیتے، اپنے نا قدروں بلکہ مخالفوں سے بھی شریفانہ برتاؤ رکھتے ان کی ان خوبیوں کی وجہ سے مجلسِ مشاورت کے اربابِ حل وعقد نے ان کو اس کا صدر بنایا، تو آخر وقت تک وہ اس منصب پر قائم رہے، مگر ۱۹۴۷ء کے بعد مسلمان کچھ ایسے غیر متحرک ہو گئے ہیں کہ ان کا جمود ختم ہوتا نظر نہیں آتا، اس لیے مجلس مشاورت میں بھی وہ حرکت پیدا نہ ہو سکی جس کی توقع کی جا سکتی تھی، اس کا افسوس عام مسلمانوں کے ساتھ خود مولانائے مرحوم کو بھی رہا۔

ان پر جہاں عام مسلمانوں کو اپنے ملی معاملات میں اعتماد رہا، وہاں حکومت ہند کو بھی ان کے وطنی جذبہ پر پورا بھروسہ رہا، ملک کے دینی مدرسوں، علمی انجمنوں، اور علمی تحریکوں میں ان کی رکنیت اور شمولیت باعث فخر سمجھی جاتی، اسی طرح حکومت کی بعض اہم کمیٹیوں کے بھی رکن رہے اور کبھی بیرونی وفود میں حکومت کی نمایندگی بھی کی، دینی علمی اور سیاسی مجلسوں میں اپنی خطیبانہ شان سے اثر انداز ہوتے، اور ان کے مخلصانہ مشوروں کی قدر کی جاتی۔

ان کا زندہ جاوید کارنامہ ندوۃ المصنفین ہے جس کی تاسیس انھوں نے ملک کے مشکل حالات اور اردو زبان کے صبر آزما ماحول میں ۱۹۳۸ء میں کی، اس وقت سے اب تک اس کی طرف سے تقریباً دو سو کتابیں مذہب، تفسیر، حدیث، تاریخ، سیاست، اور دوسرے علوم وفنون پر دیدہ زیب کتابت وطباعت بڑی اچھی جلد اور گرد وپوش سے شائع ہو چکی ہیں، ان سے اردو لٹریچر میں بڑا وزن اور وقار پیدا ہو گیا ہے، نشر واشاعت کا ادارہ قائم کرنا اور اس کے معیار کو برقرار رکھ کر مقبولِ عوام وخواص بنانا صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا، مگر مولانائے مرحوم نے اس جوئے شیر کو رواں رکھنے میں اپنی پوری زندگی گذار دی، اردو کے علم وفن کی تاریخ میں ان کا یہ کارنامہ

ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

وہ خود تو بہت سی کتابوں کے مصنف نہیں ہوئے، انھوں نے شروع میں علامہ ابن تیمیہ کی الکلم الطیب پر تشریحی نوٹ لکھے، اور علامہ ابن جوزی کی صید الخاطر کا ترجمہ بھی اردو میں کیا، قرآن مجید کی مختصر تفسیر دو جلدوں میں لکھنی چاہتے تھے، لیکن لکھ نہ سکے، ان کی ریڈیائی تقریروں کا ایک مجموعہ "منارِ صدا" کے نام سے شائع ہوا ہے، وہ جیسی میٹھی گفتگو کرتے ویسی ہی میٹھی تحریر بھی لکھتے اپنے سیاسی مشاغل اور ندوۃ المصنفین کے اہتمام کے ترخشوں کی وجہ سے خود تو بہت سی کتابوں کے مصنف نہ بن سکے، لیکن مصنف گر ضرور ہوئے، ان کے ادارہ کی وجہ سے بہت سے اہلِ قلم مصنف بن گئے اور ان کی دبی صلاحیتیں ابھریں، ورنہ یہ دبی رہ جاتیں تو علوم و فنون کا کتنا بڑا نقصان ہوتا۔

ندوۃ المصنفین کا ترجمان مجلہ برہان ہے، جو جولائی ۱۹۳۸ء سے اب تک ہر مہینہ بڑی پابندی سے نکل رہا ہے، اس کی قلمی گل کاریوں، ادبی زمزمہ سنجیوں، مذہبی موشگافیوں، علمی نکتہ آفرینیوں اور اس کے مختلف مضامین کی مشاطہ گری کی کاوشوں کا زرّیں سہرا تو مولانا سعید احمد اکبر آبادی کے سر ضرور ہے لیکن اس کی کتابت، طباعت ٹھیک وقت پر اشاعت اور اس کے مالی ذرائع کی کمی کو پورا کرنے کی محنت و ریاضت کا جو نمونہ مولانائے مرحوم کے ذریعہ سے عمل میں آیا وہ عملی اور تعمیری سرگرمیوں کی ایک قابلِ تقلید مثال ہے۔

وہ اب وہاں ہیں جہاں ایک روز سب کو جانا ہے، مگر جن لوگوں کو ان کے ساتھ کام کرنے، یا ان سے ملنے جلنے کا موقع ملا، وہ ان کے کھلنسا ہٹ مرنجاں مرنج انداز طبع، اختلاف کے موقع پر شریفانہ برتاؤ، مسلمانوں کی

سیاسی مصیبتوں کے وقت ان کے اندرونی مضطربانہ جذبات اور ان کے سیاسی مستقبل کو سنوارنے کی خاطر ان کے فکری رجحانات کو یاد کرکے دل سے دعائیں کریں گے، کہ ان کی زندگی کے روشن کارنامے اُن کے لیے توشۂ آخرت بنیں، اور وہ بارگاہ ایزدی میں کہہ رہے ہوں، ربّ اغفر وارحم وانت خیر الرّاحمین۔

پروفیسر
خلیق احمد نظامی سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

نظامی ولا ۔ علی گڑھ

۱۸ مئی ۱۹۸۲ء عزیز مکرم، سلام مسنون

مفتی صاحب کے سانحۂ ارتحال سے بے حد رنج ہوا۔ اُن کے ساتھ ایک دور ختم ہوگیا۔ بڑی خوبیوں کے انسان تھے۔ اللہ تعالیٰ اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور جملہ متعلقین کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ مجیب میاں کہاں ہیں؟ میں اُن کو بھی لکھنا چاہتا تھا لیکن اُن کا پتہ معلوم نہیں۔

جو خلا اس حادثہ سے ہماری قومی اور ملی زندگی میں پیدا ہوگیا اس کا پر ہونا مشکل نظر آتا ہے۔

مخلص
خلیق احمد نظامی

مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ

ایک مثالی شخصیت ایک غیر معمولی انسان

(مولانا بدرالحسن قاسمی)

مفتی صاحب کی ذات مختلف جماعتوں کے درمیان ربط واتحاد برقرار رکھنے کی ایک علامت تھی۔ اس لئے موجودہ حالات میں ان کا رخصت ہو جانا ایک بہت بڑا سانحہ ہے۔ ان کے چلے جانے سے نہ صرف عظمت وعبقریت کی بساط اُلٹ گئی ہے بلکہ اس انجمن کا شیرازہ منتشر ہو گیا ہے جو ہر طرح کی گروہی عصبیتوں دینی اور سیاسی اختلافات اور جماعتی دھڑے بندیوں کے رجحان سے ماورا ہو کر ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک اکائی سے منسلک رہنے اور مشترک مسائل کے حل کے لیے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہونے کا سبق دیتی تھی۔

مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی صاحبؒ نے عمر کی ۸۳ بہاریں دیکھیں، ان کی پیدائش اس صدی کے بالکل آغاز میں ایک ایسے دینی وعلمی خانوادہ میں ہوئی تھی جس کا برصغیر کی مذہبی وسیاسی تاریخ پہ بڑا گہرا چھاپ ہے۔ ان کے والد حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن ہندو پاک کے نامور فقیہ اور بلند پایہ مفتی تھے دار العلوم دیوبند میں مسند افتا انھیں کے دم سے قائم ہوا تھا۔ اور تقریباً نصف صدی تک ان کے فتووں کو سکہ رائج الوقت کی حیثیت حاصل رہی۔ ان کا صرف ایک حصہ چودہ پندرہ جلدوں میں شائع ہوا ہے مفتی صاحب کے چچا شیخ الاسلام پاکستان حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی کے علمی مقام، شان خطابت اور تحریک پاکستان میں ان کے کارنامہ سے تو ایک دُنیا آگاہ ہے ان کی تحریر کردہ صحیح مسلم شریف کی ضخیم عربی شرح فتح الملہم تمام علمی دُنیا سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہے۔ مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی اسی خاندان کے چشم وچراغ تھے

انہوں نے جس وقت آنکھ کھولی اس وقت برصغیر مختلف علم وفن کے ماہرین اور اکابر رجال سے کف گلفروش بنا ہوا تھا۔ تقریباً تمام مذہبی و سیاسی نامور ہستیوں کو دیکھنے کا انکو موقعہ ملا، ان کے نامور اساتذہ میں اپنے والد اور چچا کے علاوہ حضرت علامہ انور شاہ کشمیری کا نام سب سے زیادہ نمایاں ہے اور آخر عمر تک انہوں نے اپنے آپکو علمی حیثیت سے ان کا ہی مرہون منت سمجھا اور ان کے وفا کیش رہے۔ ذکاوت و ذہانت تو ان کا خاندانی جوہر تھا، چنانچہ اپنے ہم عصروں میں نمایاں رہے کچھ عرصہ دینی و علمی کام کرنے کے بعد اپنے آپ کو سیاسی اور سماجی کاموں کے لیئے وقف کر دیا۔ انہوں نے شیخ الہند مولانا محمود حسن، حضرت مولانا عبید اللہ سندھی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، عطاء اللہ شاہ بخاری، علامہ شبیر احمد عثمانی اور مولانا ابو الکلام آزاد وغیرہ کو نہ صرف دیکھا تھا بلکہ صحیح طور پر ان کے جانشین تھے۔ مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی مولانا مناظر احسن گیلانی اور مولانا سید سلیمان ندوی وغیرہ سے بھی ان کا قریبی رشتہ رہا۔ اس لیئے ان کی ذات میں پورے ایک عہد کا خلاصہ جمع ہو گیا تھا۔ اور ان کی شخصیت بڑی متوازن بن گئی تھی انہوں نے اپنے زمانہ میں برپا ہونے والی تحریکات اور اشخاص کا بڑی گہرائی سے جائزہ لیا تھا اس لیئے ان کی رائے بڑی وقیع اور باوزن ہوا کرتی تھی۔ انہوں نے جن نامور شخصیتوں کو دیکھا اور برتا تھا اور جن سے کسب فیض کیا تھا ان کا طبعی اثر ان کے مزاج پر یہ تھا کہ ان میں بے پناہ وسعت صدر، اور ہمہ نوازی کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا ان کی ذات ایک سراپا انجمن تھی۔ اور ان کا دفتر ایک بین الجماعتی کانفرنس ہال، یونیورسٹی کے طلبا رہوں یا اساتذہ و منتظمین اور دینی و سیاسی جماعتوں کے سربراہ ہوں یا وزرا، وممبران پارلیمنٹ گذشتہ چند برسوں سے تو مختلف مسائل میں پیچیدگیوں کے حل کے لیئے مفتی صاحب کا آفس ہی ان سبھوں کے لیئے پہلا ٹھکانہ تھا اور مفتی صاحب ایک عامی سے لے کر افسر تک سب کی

باتیں یکساں توجہ سے سننے اور اپنی رائے سے نوازتے رہتے تھے۔

دہلی میں مختلف طبقوں میں ان سے زیادہ ادب واحترام سے کسی اور کو نہ دیکھا جاتا تھا اور نہ ان کی طرح مختلف دینی واجتماعی کاموں کے لیئے اور مختلف کمیٹیوں میں شرکت کے لیئے کسی اور کو بلایا جاتا تھا مفتی صاحب کے پاس صرف مسلمان ہی نہیں دوسری قوم کے لوگ بھی اپنے مسائل حل کرانے کیلئے آیا کرتے تھے بران کی ایسی ہردلعزیزی تھی جس میں کوئی ان کا شریک نہیں تھا۔ اور جو ان کی بے انتہا تواضع اور وضعداری کے باعث ان کو حاصل ہوئی تھی۔

ان کو ہندوستان کی طرح پاکستان کی علمی وادبی انجمنوں اور دینی حلقوں میں بڑی عزت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ انہوں نے سعودی عرب، انڈونیشیا، وسط ایشیا، اور بعض دوسرے ملکوں میں علمی ودینی کانفرنسوں میں بھی متعدد بار شرکت کی تھی۔ اور ہر جگہ اپنے علم وفضل کا اثر چھوڑ کر آئے۔

مفتی صاحب کی شخصیت کے اتنے پہلو ہیں کہ ان سبھوں کو اجاگر کرنا تو مستقل کتاب کا موضوع ہوسکتا ہے یہاں تو محض ان کی زندگی کے چند نقوش ظاہر کئے جاسکتے ہیں۔ وہ ایک عالم دین ایک مفکر، ایک سیاسی قائد اور ایک انسان کی حیثیت سے ایک پوری دنیا اپنے اندر بسائے ہوئے تھے۔ ان کی فقہی یا سیاسی آرا سے اتفاق ہو یا اختلاف ان کا اخلاص ہر شک وشبہ سے بالاتر تھا۔ مہم جوئی یا انقلاب انگیزی ان کی طبیعت میں نہ تھی۔ ان میں تحمل، نرم خوئی اور مشکلات کا بے ضرر اور سنجیدہ حل تلاش کرنے کا رجحان غالب تھا۔ اس لیے ان کی باتوں سے پُرجوش لوگوں کو شکایت ہوتی تھی یا ان کے بارے میں سرد مہری کا خیال ہوتا تھا لیکن حالات کی تلخیوں نے انھیں بجائے اشتعال پیدا کرنے کے ان میں سمندر کی گہرائی اور سکون پیدا کردیا تھا۔

خالص دینی اور قدیم طرز کی تعلیم کے باوجود ان کا میل جول چونکہ ہمیشہ نئے پڑھے لکھے طبقہ کے ساتھ بھی اسی طرح رہا جس طرح قدیم دینی حلقوں کے ساتھ اس لیے وہ نئی تبدیلیوں سے بھی بہت زیادہ آگاہ رہے اس لیے بعض فقہی مسائل میں بھی انکے یہاں توسع پسندی زیادہ تھی. گرچہ ان کی ذاتی زندگی خالص اپنے اساتذہ کے نقش قدم پر رہی۔

سیاسی میدان میں ان کا رشتہ مختلف رُجحانات کے لوگوں سے رہا جس کی وجہ سے وسیع المشربی آجانا ایک طبعی بات تھی اور آزادی کے بعد خاص طور پر ہندوستان کے حالات بھی ایسے ہی رہے۔ کسی ایک رُخ پر زیادہ سختی سے جمنے کا موقع باقی نہیں رہ گیا تھا۔

سیاسی و اجتماعی کاموں میں الجھاؤ کے باوجود علمی و ادبی کاموں سے کبھی کنارہ کش نہیں ہوئے ۱۹۳۸ء میں انہوں نے عظیم علمی و ثقافتی ادارہ "ندوۃ المصنفین" کی اپنی چند دوسرے ساتھیوں کے ساتھ بُنیاد رکھی تھی۔ جس میں مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی اور مولانا سعید احمد اکبر آبادی کا نام قابل ذکر ہے۔ اور علمی ماہنامہ برُہان کا اجرا کیا ۴۷ء میں جب قتل و خونریزی کا بازار گرم ہوا، تو جان کے لالے پڑ گئے، ندوۃ المصنفین جو قرول باغ میں واقع تھا جلا کر خاکستر کر دیا گیا۔ کئی دن حیات و موت کی کش مکش میں گزارنے کے بعد جب خدا نے جان بچائی تو دیکھا کہ دنیا ہی بدلی ہوئی ہے محلے کے محلے ویران ہوگئے ہیں۔ ہر طرف کُشتوں کے پُشتے لگے ہوئے ہیں۔ خاندانوں کے خاندان اس طرح تہ تیغ کر دیئے گئے ہیں کہ ان کا نام و نشان نہیں ملتا۔ ندوۃ المصنفین تو خیر مسلمانوں کے خون کے اس سیلاب کے درمیان ایک معمولی سی چیز تھی جو خاک کا ڈھیر بن گئی۔

جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا
کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے؟

حالات کچھ بدلے تو دوبارہ جامع مسجد دہلی سے قریب ندوۃ المصنفین کا آفس قائم کر دیا گیا اور انتہائی بے سروسامانی کے ساتھ کسی نہ کسی شکل میں مفتی صاحب نے اسے تقریباً نصف صدی تک قائم رکھا اور ایسی کتابیں وہاں سے شائع ہوئیں جو عصر حاضر کی زبان اور ذوق و مزاج کے مطابق ہیں اور جن میں مغرب کی جدید ذہنی یورش سے مقابلہ کا پورا سامان موجود ہے۔ ماہنامہ برہان کا بھی وقار و اعتبار علمی حلقہ میں قائم رہا۔

عجیب بات یہ ہے کہ مفتی صاحب کو قدرت نے اردو نثر لکھنے کا جتنا پاکیزہ ذوق دیا تھا۔ اور علمی حیثیت سے وہ جس پایہ کے آدمی تھے اس کے بالکل برعکس انھوں نے ہمیشہ دوسروں کو بڑھانے اور خود کو انشاء پردازی کے میدان میں پیچھے رکھنے کی سعی کی اور شاذ و نادر ہی اور انتہائی مجبور کن حالات ہی میں کچھ لکھا۔ غالباً بعد کے سالوں میں انہوں نے صرف وہ مقالہ توجہ سے لکھا تھا جو اپنے استاد علامہ انور شاہ کشمیریؒ سے متعلق سرینگر میں منعقد ہونیوالے سمینار میں خود ہی پڑھ کر سنایا تھا۔ اور اس میں شک نہیں کہ وہ انکی دقت نظر اور خالص فقہی و اصولی مسائل میں ان کی ژرف نگاہی کی بیّن دلیل ہے۔ ان کی اتفاقیہ لکھی ہوئی تحریروں کو دیکھ کر خیال ہوتا تھا کہ کاش ان کی ذہنی صلاحیت دوسرے خرخشوں میں الجھنے کے بجائے صرف علمی کاموں کے لئے وقف ہوتی۔ لیکن وہ اجتماعی کاموں میں ہی لذت محسوس کرتے تھے۔ چنانچہ وہ مصنف بننے کے بجائے مصنف گر ہی رہے۔ ندوۃ المصنفین کو ان کی خدمات جلیلہ کا شاہکار کہا جا سکتا ہے جس نے بہت سے نامور مصنفین کو زیادہ تر ان کی شخصیت کے وزن اور بے نفسی کی وجہ سے ان کے ساتھ مربوط کر دیا تھا۔ اور وہ کام ہو گیا جو بڑے سرمایہ سے بھی ہونا مشکل ہوتا ہے۔

۱۹۶۴ء میں بھیانک ہندو مسلم فسادات ہوئے جس نے مسلمانوں کے ذہن میں اسی طرح کی دہشت طاری کر دی جو ۱۹۴۷ء میں پیدا ہو گئی تھی۔

یہی پس منظر تھا جس میں آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت قیام عمل میں آیا۔ اور فساد زدہ علاقوں کا دورہ شروع کیا گیا۔ ڈاکٹر سید محمود مرحوم کے ساتھ اس مہم میں مفتی عتیق الرحمن صاحب عثمانی، مولانا ابوالحسن علی ندوی اور مولانا ابو اللیث اصلاحی وغیرہ تھے۔ جس کا خوش گوار اثر ہوا۔ اور سید محمود صاحب کے بعد مفتی صاحب ہی اس کے صدر قرار پائے۔ بعد میں مجلس زیادہ طاقت ور کبھی نہیں ہوئی۔ جس کی وجہ حضرت مفتی صاحب کی نرم خوئی اور مختلف زعمائے ملت جن کے اشتراک سے مسلم مجلس مشاورت کا ڈھانچہ بنتا ہے۔ ان کی اپنی جماعتی اور ذاتی مصالح ہیں لیکن نام کی حد تک مسلمانوں کے ایک فورم کی حیثیت سے مفتی صاحب نے اس کا ڈھانچہ قائم رکھا۔ جو سنگین حالات میں مسلم لیڈروں کو یکجا کرنے کا ایک عنوان بنا رہا مفتی صاحب میں قائدانہ طنطنہ نہیں تھا یا دوسرے لفظوں میں مفتی صاحب اپنے آپ کو توڑ جوڑ کی اس سطح پر لانے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔ جس کے دم پر لیڈروں کی لیڈری اس وقت قائم ہے۔ اور غالباً مفتی صاحب کی عظمت کا راز اسی میں پنہاں ہے۔ انہوں نے کبھی اپنی شخصیت پر مصنوعی خول چڑھانے کی کوشش نہیں کی۔ دل اور زبان کا رشتہ انکے یہاں کبھی منقطع ہونے نہیں پایا۔ انہوں نے جو کچھ سوچا اسکا اظہار کسی نہ کسی پیرایہ میں ضرور کیا۔ زخم کھانے اور شکست قبول کرنے کی ان کو گویا عادت سی ہو گئی تھی اس لئے انہوں نے ہمیشہ سخت سے سخت موقف کو صبر و تحمل سے انگیز کیا۔ لیکن کبھی کسی سے آویزش مول نہیں لی۔ بھونکنے والوں کو کبھی پلٹ کر نہیں دیکھا تیر اندازی کرنے والے بھی جب ان کے سامنے آتے ان کو سینہ سے لگایا۔ ظاہر ہے کہ اس درجہ کا تحمل جہاں ایک طرف انتہائی اخلاقی کمال ہے وہیں دیکھنے والوں کی نظر میں ہمیشہ ایک طرح کی کمزوری کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے لیکن مفتی صاحب کو کبھی اس کی پرواہ نہیں ہوئی۔

مفتی صاحب کے خانگی احوال ان کے لئے مستقبل سوہان روح تھے لیکن

سالہا سال ساتھ بیٹھنے والوں نے کبھی ان سے ایک حرف شکایت بھی نہیں سنا۔ اچھے اچھے باعزیمت لوگوں کو یہ کہتے سنا کہ اگر کوئی دوسرا ان کی جگہ پہ ہوتا تو ذہنی توازن کھو بیٹھتا۔ گویا انہوں نے ہر حال میں نباہ کیا زندگی کے ساتھ نہ کبھی تقدیر کا ماتم کیا اور نہ لوگوں کے ظلم وستم کا گلہ۔

آخری عمر میں ان کو واسطہ کچھ ایسے لوگوں سے پڑا۔ جو بہت چھوٹے ہیں اور اپنے اندر بعض غیر انسانی اوصاف رکھنے کے باوجود خود کو عصر حاضر کی نامور روحانی شخصیات کی شکل میں پیش کرنے کا ڈرامہ کھیل رہے ہیں۔ دھوکہ اور فریب کی کوئی راہ ایسی نہ تھی۔ جو ان لوگوں نے نہ اپنائی ہو۔ مفتی صاحب سارا کھیل حیرت کی نگاہوں سے دیکھتے رہے کبھی نہایت ظریفانہ انداز میں فرماتے" میاں پیشہ ور مجرموں سے تو بچا جاسکتا ہے لیکن تہجد گزار مجرموں سے کس طرح آدمی اپنے آپ کو بچائے"

اس سے زیادہ بڑا ناسور ان کے لیئے یہ تھا کہ ان کے ان ساتھیوں نے جو درحقیقت انہیں کے ساختہ وپرداختہ تھے اور جن کے ساتھ زندگی بھر کے لئے اپنے آپ کو مٹا کر پیمان وفا باندھا تھا انہوں نے بھی انھیں آنکھیں دکھلانی شروع کیں۔ اور معمولی منفعت کی خاطر عمر بھر کی دوستی وتعاون کا بھی پاس ولحاظ نہیں رکھا۔ اس صورتحال نے ان پر بالکل وہی کیفیت طاری کردی تھی جس کا اظہار کسی عربی شاعر نے کہا ہے۔

ذھب الذین یعاش فی أکنافھم ۔ وبقیت فی خلف کجلد الأجرب

یعنی وہ لوگ جن کی آغوش میں زندگی گزاری جاسکتی ہے وہ سب رخت سفر باندھ چکے اور میں تنہا خارشتی اونٹ کی کھال کی طرح پیچھے رہ گیا ہوں۔ (چنانچہ نہ زندگی ہی کا لطف ہے اور نہ موت ہی اپنے وقت سے پہلے آسکتی ہے۔)

درحقیقت واقعہ یہ ہے کہ درویش کے لباس میں مکروفریب کا حربہ جتنی کامیابی سے اپنایا جاسکتا ہے کسی اور رنگ میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔

اس راز کو عصر حاضر کی بعض مثالی شخصیتوں نے پالیا تھا جن کو اپنے بارے میں تواضع کے سارے مظاہر اختیار کرنے کے باوجود کائنات کا عطر ہونے کا احساس ہمہ وقت طاری رہتا ہے۔ تقویٰ کی ہمہ دم رٹ، موقع کے لحاظ سے آنسو بہانے پر قدرت تحریروں میں مناظرانہ پختگی لیکن جب کبھی کسی اجتماعی معاملہ میں "انا" کو ذرا ٹھیس لگے بہیمیت کا ظہور اس شدت سے ہونے لگتا ہے کہ بے حیائی کو بھی حیا آنے لگتی ہے۔

مفتی صاحب کو اس طرح کی فنکاری سے سخت نفرت تھی، چنانچہ برملا تنقید فرماتے تھے اور نہایت لطیف پیرائے میں خود مفتی صاحب کا اپنا حال یہ تھا کہ گالیاں سُن رہے ہیں اذیتیں سہہ رہے ہیں نقصانات برداشت کر رہے ہیں لیکن اُف تک زبان پر نہیں ہے لیکن اس درجہ کے تحمل کے لیے بڑا دل گُردہ چاہیئے۔ خاص طور پر رفقاء واحباب کی بے وفائیوں کو سہنا تو بڑا صبر آزما کام ہوتا ہے لیکن مفتی صاحب انتہائی حساس دل اور غیر معمولی ذکاوت رکھنے کے باوجود برداشت کی غیر معمولی قوت بھی رکھتے تھے۔

ان کی ایک عجیب وغریب ادا ان کی بے انتہا تواضع تھی۔ اپنے چھوٹوں کے سامنے بھی وہ اس طرح بچھ جاتے تھے کہ شرمندگی ہوتی تھی۔ بڑی محبت سے ہر ایک سے ملتے سب کا دکھ درد سنتے اپنی استطاعت کی حد تک پریشانی دور کرنے میں کوشاں ہوتے۔ گھر میں ہوں یا کسی اجتماع میں یا سر راہ ان کی وضعداری اور محبت میں کبھی فرق محسوس نہیں ہوتا تھا یہ انکی شخصیت کا بڑا کمال تھا۔ ان کے یہاں اپنے اور غیر کا کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ ساری دُنیا ان کی اپنی تھی۔ غیر کوئی نہیں تھا۔

خدا نے ان کو جتنا زرخیز دماغ، جیسی دور اندیشی اور حکمت، بولنے اور لکھنے کی جیسی صلاحیت اور لوگوں میں جس طرح کی مقبولیت دی تھی اور خود اپنے والد اور دوسرے بزرگوں کے ماننے والوں کا جیسا حلقہ دیا تھا۔ اگر وہ چاہتے تو اپنے لیے

دنیوی عیش و راحت کا بہت کچھ سامان کر سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے ہمیشہ اسے ایک خُرد تر بات سمجھا اور ساری عمر کسٹوڈین کی طرف سے کرایہ پر ملنے والے ایک معمولی سے مکان میں گزاری جبکہ ان کے سامنے پیدا ہونے والے ان کے ساتھ ناروا معاملہ کرنے اور طرح طرح سے ان کی شخصیت کو مجروح کرنے کی سعی کرنے والوں نے دیکھتے ہی دیکھتے عالی شان محلات تعمیر کر لیئے۔ تقوٰی کی دوکان آباد کر لی قوم کا سارا سرمایہ اپنی حیثیت منوانے کے لیئے وقف کر لیا اور پھر بھی رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی

مفتی صاحب کا ایک بڑا وصف ان کی غیر معمولی امانت داری تھی۔ صرف انہیں کی ذات ہم نے ایسی دیکھی کہ بڑی سے بڑی رقم بطور امانت رکھنے کے بعد سالہا سال گزرنے پر بھی اگر واپس کی جائیں تو وہی رکھے ہوئے نوٹ اور اسی لفافہ میں سب کی امانتیں نام بنام الگ الگ اس زمانہ میں یقیناً یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔

یوں تو ان کی صحت کافی عرصہ سے مضمحل چل رہی تھی۔ لیکن مشاورت کا اجلاس ہو۔ دار العلوم دیوبند اور ندوۃ العلما کی مجلس شورٰی ہو مسلم پرسنل لا ر بورڈ کی میٹنگیں ہوں پابندی اور اپنی شخصیت کے پورے وزن کے ساتھ شرکت کرتے تھے۔ اور ظریفانہ ایک دو جملوں میں جلسہ کا رُخ موڑ دینے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ ان کی کاٹ سے سبھی گھبراتے تھے۔ خاص طور پر کم و بیش ان کی جیسی ہی عمر رکھنے والے لوگ۔ دو سال قبل اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر دار المصنفین اعظم گڑھ میں ایک عالمی سمینار منعقد کیا گیا وہ اپنی کمزوری کے باوجود مولانا علی میاں صاحب کی دعوت پر تشریف لے گئے واپسی میں فالج کا حملہ ہوا علاج کے بعد حالت بہتر ہو گئی تھی۔ اور چلنے پھرنے بھی لگے تھے کہ ۱۲ مئی کو خدا کی رحمت نے آغوش میں لے لیا اور جان جاں آفریں کے سپرد کر دی اس طرح پون صدی کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا خدا ان کی مغفرت فرمائے اور صالحین کے زُمرہ میں ان کا حشر فرمائے۔ آمین

نقشِ اوّل

ماہنامہ طیب دیوبند

مفکرِ ملّت حضرت مفتی عتیق الرّحمن عثمانیؒ

دوسال کی طویل علالت کے بعد بالآخر مورخہ ۱۲ مئی ۱۹۸۴ء کو مفکرِ ملّت حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی بانی ندوۃ المصنفین دہلی و رکن شوریٰ دارالعلوم دیوبند اپنے ربِّ حقیقی سے جا ملے، نوراللہ مرقدہٗ ورفع درجاتہٗ۔

دوسال قبل حضرت مفتی صاحبؒ پر فالج کا حملہ ہوا تھا، عمر کی نویں دہائی میں بھی ضعف کے باوجود اس مرض کا مقابلہ کرتے رہے، اسی اثنار میں ان کو موذی مرض کینسر بھی لاحق ہوگیا جس سے وہ جاں بر نہ ہوسکے۔ سخت ترین مرض کے باوجود بھی ان کا ذہن کبھی ذہول کا شکار نہیں ہوا۔ بستر علالت پر پڑے رہے لیکن اس دوران ان کے فکر و ذہن میں وہی صلاحیت برقرار رہی جس کے لیے وہ معروف تھے۔

دیوبند میں عثمانی خاندان کی ایک عظمت ہے، اس خاندان کے علمی کارنامے ہیں، مفتی صاحب ملکی اور ملی خدمات کے امین اس عثمانی خاندان کے چشم و چراغ تھے جن میں نمایاں ترین شخصیتیں گذری ہیں، شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ حضرت مولانا حبیب الرحمن عثمانیؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کے برادر حقیقی حضرت مفتی عزیز الرحمن عثمانیؒ کے فرزند، علمی ماحول میں پرورش پائی۔ اور یکتائے روزگار محدثِ عصر مولانا انور شاہ کشمیری سے شرف تلمذ حاصل کیا۔

حضرت مفتی صاحب خداداد ذہانت اور اعلیٰ صلاحیت کے مالک تھے دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کی صدارت بیشتر آپ ہی فرماتے تھے۔

طبیعت میں اعتدال۔ رائے میں توازن، فکر میں گہرائی، اور معاملات میں دور اندیشی آپ کا طرّہ امتیاز تھی۔ موقع پرستی کی سیاست سے دور، حصولِ اقتدار کے لیے ضمیر فروشی سے بیزار اور ذاتی مفاد کے لیے ملّت کا سودا کرنے کی لعنت سے آپ ہمیشہ پاک وصاف رہے۔

صبر و قرار ہے نہ حواس اور ہوش ہے
اب زندگی میں کوئی حرارت نہ جوش ہے
دنیا سے وہ مفکّرِ ملّت چلا گیا
ہر شخص جس کے واسطے ماتم بدوش ہے
داغِ فراق وصحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

مفتی صاحب صبر و استقامت کا پہاڑ اور اپنے عزم وارادہ کے انتہائی پختہ مردِ آہن تھے، حالات نے کتنی ہی کروٹیں بدلیں۔ ملک کی سیاست میں کئی انقلاب آئے۔ دارالعلوم دیوبند بھی تہ وبالا ہوا لیکن حضرت مفتی صاحب کو اپنی جگہ سے کوئی بھی نہ ہلا سکا۔ انھوں نے پہلے دن جو موقف اختیار کیا تھا آخر تک اسی پر قائم رہے۔

حضرت مفتی صاحب اپنی وضع کے پابند۔ اخلاق و شرافت کا مجسّمہ اور علم و حلم کا پیکر تھے ان کی وفات پر ملّی سیاست اور دینی قیادت کو جو زخم عظیم لگا ہے اور عظیم خلاء پیدا ہوا ہے اس کا پُر ہونا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔

دارالعلوم دیوبند کے وہ فاضل باکمال کہ اب ہند و پاک میں جن کا کوئی ثانی نہیں، دیوبند کے علوم و نظریات، اس کی تہذیب و شائستگی اور شرافت و وضعداری کی آخری یادگار، حلم و بردباری اور حق شناسی و حق گوئی کے خوگر، خورد نوازی، اعتدال پسندی، اور مسلمانوں کی ہر جماعت کو ساتھ لے کر چلنے کی مشکل ترین روش کے حامل، قدیم افکار و علوم اور روایات صالحہ کے پیکر، جدید مسائل اور نئی نسل کے لیے رہنما، علوم و معارف کے دریائے بیکراں، تقریر و تحریر کے ماہر، لطیف اندازِ گفتگو کے باوجود مشکل ترین معاملات کو حل کرنے کی صلاحیت رکھنے والی عظیم شخصیت۔

دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد حضرت مفتی صاحب اپنے استاذ علامہ کشمیریؒ کے ساتھ ڈابھیل چلے گئے۔ ایک عرصہ تک ان سے استفادہ کیا پھر کچھ عرصہ کلکتہ میں گذارنے کے بعد مستقل طور پر دہلی میں جم گئے۔ تقسیم ہند سے قبل ہی انھوں نے ممتاز فضلائے دارالعلوم پر مشتمل ایک علمی ادارہ کی تشکیل دی، قرول باغ دہلی میں ندوۃ المصنفین کا باضابطہ دفتر تھا اپنی لائبریری تھی، ابھی اس ادارہ نے علمی میدان میں ارباب علم و دانش کی نظریں اپنی طرف متوجہ کی ہی تھیں کہ ۱۹۴۷ء کا وہ خونیں دور آیا جس میں ندوۃ المصنفین کی عمارت جل گئی اور اس کا سارا سرمایہ لٹ گیا، ان کا وہ آشیانہ ہی اجڑ گیا جس کو انھوں نے بڑی جد و جہد اور تگ و دو کے بعد بنایا تھا تقسیم ملک کے بعد پھر تنکا تنکا جمع کرکے اپنے آشیاں کی تعمیر میں لگے رہے۔ ندوۃ المصنفین کے لیے ملک کے پہلے وزیر اعظم جواہر لال نہرو کی پیش کش مالی تعاون کو بھی مسترد کر دیا اور ارباب حکومت کے دلوں میں اس کی عظمت کا سکہ بٹھا دیا کہ جو اکابرین اور پیش رو علماء کی مثال رہی ہے۔

موجودہ نصف صدی میں ہندوستان میں قائم ہونے والے تصنیفی اور تحقیقی اداروں میں ندوۃ المصنفین دہلی اور دار المصنفین اعظم گڈھ یہی دو ادارے ایسے ہیں جنھوں نے صحیح معنوں میں خالص علمی اور تحقیقی کتابوں کا عظیم ذخیرہ مسلمانوں کو دیا۔ چنانچہ ندوۃ المصنفین حضرت مفتی صاحب کی وہ عظیم خدمت ہے جو ان کے علم وکمال کا بین ثبوت ہے۔

نہ صرف یہ کہ حضرت مفتی صاحبؒ علمی اور تصنیفی امور میں منہمک رہے بلکہ ملک وملّت کی ہر خدمت انجام دیتے رہے۔ جنگ آزادی کے مردِ مجاہد بنے تو جمعیۃ علمائے ہند کے سرگرم رکن رہ کر مسلمانوں کی رہنمائی بھی کرتے رہے۔ مسلم مجلس مشاورت کے صدر، مسلم پرسنل لاء بورڈ کے نائب صدر دار العلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رہنما ممبر اور نہ جانے کتنے اداروں کے رہبر رہے۔

حضرت مفتی صاحبؒ بحیثیت صدر مسلم مجلس مشاورت تمام مسلم جماعتوں اور تنظیموں کو ایک پلیٹ فارم پر جوڑے رکھنے کی کوشش کرتے رہے اور ان کی ہی وہ ماہر الامتیاز خصوصیت ہے جس کی وجہ سے ہر جماعت اور تنظیم مفتی صاحبؒ کی رائے اور ان کے مشوروں کو بڑی حیثیت دیتی تھی اور ہر حلقہ میں وہ احترام وعقیدت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیّب صاحبؒ اور مفکرِ ملّت حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ دونوں حضرات اپنی گوناگوں خصوصیات اور علمی، دینی وملی خدمات کی وجہ سے برصغیر میں تمام مسلمانوں کے مقتدر اور پیشوا مانے جاتے تھے۔ یکے بعد دیگرے دونوں اہم شخصیتوں کے انتقال سے ملّت اسلامیہ کے حلقوں میں ایک زبردست خلا پیدا ہو گیا۔

یہاں یہ ذکر بے جا نہ ہوگا کہ حضرت مفتی صاحبؒ کا انتقال ۱۲ رمئی ۱۹۸۴ء

کو دوپہر میں ہوا، دیوبند میں اس کی اطلاع فون کے ذریعہ ۴ بجے تک پہونچ گئی تھی۔ فوری طور پر دارالعلوم جامع مسجد سے اعلان نشر کیا گیا، لیکن افسوس کہ دارالعلوم دیوبند سے رات بھر تک کوئی اعلان نہیں ہوا، پھر نہ جانے کسی مصلحت سے دوسرے دن ۹ بجے دارالعلوم کے لاؤڈ اسپیکر سے انتقال کی خبر نشر کی گئی اور نصف یوم کی تعطیل کی گئی۔ حالانکہ حضرت مفتی صاحب مرحوم اخیر عمر تک دارالعلوم کی مجلسِ شوریٰ وعاملہ کے اہم رکن رہے جس مجلس کو موجودہ انتظامیہ ہیئت حاکمہ بھی تسلیم کرتی ہے۔

حضرت مفتی صاحب نے علم سیاست اور ملک وقوم کی جو طویل بے لوث خدمت انجام دی اس پر یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں جگہ نصیب فرمائے گا۔

A CONDOLENCE MESSAGE FROM DR FAROOQ ABDULLAH CHIEF MINISTER JAMMU & KASHMIRF

...

I AM GRIEVED TO HEAR ABOUT THE SAD PASSING AWAY OF MUFTI ATIQUL REHMAN SAHIB WHO WILL BE REMEBERED FOR HIS CONTRIBUTION TO ISLAM (.) HE WAS A VETERAN SCHOLAR AND AN OUTSTANDING PUBLIC FIGURE (.) ON BEHALF OF THE PEOPLE OF JAMMU & KASHMIR KINDLY ACCEPT MY DEEP CONDOLENCES (.)

Atiqur Rahman Usmani (1901-1984)

Islamic Scholar, Nationalist, Unifier of Men, Synthesizer of Ideas

MUSLIM INDIA JUNE 1984

Born in 1901, Atiqur Rahman, Usmani, popularly known as Mufti Saheb, came from an eminent family of Ulema. His father Mufti Maulana Azizur Rahman Usmani was an eminent Mufti who had pronounced more than 1,18,000 Fatwas and was associated with the Darul-Uloom, Deoband. His grand-father was one of founders of the Darul-Uloom.

Mufti Saheb studied at the Darul Uloom and became Hafiz at the age of 9. He graduated at the age of 22 and initially taught at Deoband and then at Madrasa Islamia, Dhabel, Gujarat, for five years. From 1933-37 he was Khatib, Coolotola Mosque at Calcutta and during this period he came close to Maulana Abul Kalam Azad. In 1938 he shifted to Delhi and set up Nadwatul Musannefeen, an institution for Islamic research and publication which he served to his end. During this period, he translated into Urdu, with explanatory notes, Ibne Taimia's al-Kalam al-Tayyab and Ibne Jozi's Sadratul Khatir. He also began publishing the monthly journal 'Burhan' which has by now achieved a position of eminence in the Sub-continent.

Nationalist and Freedom-Fighter

In 1930, he came into contact with Gandhiji during his Dandi March, and gave the famous Fatwa declaring 'haraam' the auction-purchase of properties confiscated by the British for violation of the Salt Act. Mufti Saheb identified himself with the Freedom Movement and the Indian National Congress and was associated with Jamiat-Ul-Ulema-i-Hind. Though his own uncle Maulana Shabbir Ahmad Usmani supported the Pakistan movement and left Jamiat, Mufti Saheb maintained his association and emerged as one of its leaders. After Independence, he became a close collaborator of Maulana Hifzur Rahman and subsequently served as the Working President of the Jamiat after the demise of Maulana Ahmad Sayeed who had succeeded Maulana Hussain Ahmad Madni. When Jamiat faced internal bickering, Mufti Saheb preferred to dis-associate himself in 1963 rather then take part in the factional fight.

In 1964, along with Dr. Syed Mahmood he founded the All India Muslim Majlis-e-Mushawarat. Later he succeeded Dr. Faridi as its President.

A Pillar of Secularism

In 1947, Mufti Saheb was himself a victim of the communal disturbance and had to shift from Karol Bagh and take refuge in Gali Katra Nizamul Mulk near Jama Masjid. Yet, there was not the slightest trace of bitterness in him and he continued to struggle against communalism whatever its religious label.

Mufti Saheb was equally at home in the company of scholars and of politicians and equally acceptable among the modern intelligensia and the orthodox Ulema. Even in the political field he enjoyed the confidence of all political parties. In his own characteristic way, Mufti Saheb served as a bridge between generations and as the confluence of many streams of thoughts, religious as well as political. Mufti Saheb never permitted personal relations to be overshadowed by political considerations, never used strong language against his worst detractors, and treated even those who differed with him with consideration and affection. His genuis lay in the capacity for synthesis, for reconciliation and for finding areas of agreement.

A man of keen perception and high intelligence, Mufti Saheb went to the heart of a problem, cutting a difficult knot in one stroke and produced a solution acceptable to all concerned. This helped him in

keeping the Muslim Majlis-e-Mushawarat alive.

In his political thinking Mufti Saheb was essentially a nationalist and a moderate in tone and style. His nationalism not only stood for equality of all citizens but also for respect to the identity of all social groups which composed the nation. His main object in the post-partition period when he pursued as a close-associate of Maulana Hifzur Rahman was to ensure for the Muslim community a place of dignity in the council of the nation.

Mufti Saheb was associated with practically all Muslim institutions in the country. He was a life-long member of the Majlis-e-Shoora of the Darul Uloom, Deoband, as well as Nadwatul Ulema, Lucknow and Darul-Musannefeen, Azamgarh. He served as member of the Aligarh Muslim University Court and always took keen interest in its affairs. Jamia Millia Islamia and other Muslim educational, cultural and religious institutions in Delhi sought his guidance and patronage.

He was one of the founder members of the All India Muslim Personal Law Board and served as its Vice-President.

From its inception he was a member of the Central Wakf Council and on several occasions served as a member of the Haj Committee, Bombay, as well as of the Central Haj Advisory Board.

He had life-long interest in the promotion of Urdu language and literature and associated himself with Anjuman Taraqqi-e-Urdu and with several other Urdu organisations in Delhi.

Mufti Saheb represented the Waliullah tradition and quietly encouraged every initiative towards 'ijtihad' in order to find solution to the problems and dilemmas thrown up by the process of modernisation, in the light of the Quran and the Sunnah. He was one of the founder members of the Islam and Modern Age Society founded by Dr. Abid Hussain as well as of the Indian Institute of Islamic Studies, founded by Hakim Abdul Hamid. He also patronised such initiatives as the Baitul Hikmat, an organisation set up by Muslim scientists and intellectuals in Delhi. Mufti Saheb's greatness lies in making a clear distinction between the essentials of Islam and its superficial manifestations. In his personal life he was an orthodox Muslim but never judged anyone on the basis of the degree of his adherence to orthodox norms.

In his social life Mufti Saheb was approachable and affectionate to all and had a kind word of encouragement and sympathy for anyone who had had an original thought and came up with a new idea.

Foreign Travel

In his later years Mufti Saheb visited many countries. Apart from Haj, he visited Saudi Arabia as well as Pakistan and other countries to attend International Conferences sponsored by Rabita al-Alam-al-Islami, Makka, Motamar al-Alam al-Islami, Karachi, and other organisations. He attended the Afro-Asian Islamic Conference in Jakarta as a representative of the Goverment of India. He also participated in many academic seminars and symposia in India and abroad. On his visit to the USSR he studied the status of the Muslims of Central Asia particularly in relation to cultural and educational development.

In his speech and writing Mufti Saheb reflected the balance, moderation and precision of his personality. His speech and writing were equally marked by felicity of diction, command of subject-matter, logical arrangement of ideas, brevity, wit and by the spirit of universalism. A collection of his radio speeches has been published.

Last Days

About three years ago, while returning from the International Seminar of Orientalists organised by Darul Musannefeen, Azamgarh, he suffered a paralytic stroke. He never fully recovered from it but retained his memory, intelligence and interest, right upto his end. From his sick bed he directed the affairs of the Mushawarat and other institutions associated with him. Many of his friends and admirers who saw him during this period could not restrain their tears but Mufti Saheb never showed pain, never complained. So resigned was he to the will of Allah!

A few months before his death a swelling in his nose was diagnosed as malignant cancer. It spread rapidly and he passed away on the 12th May, 1984 and was buried in Qabristan Mehdiyan, near the grave of Shah Waliullah.

Last of the great nationalist Ulema thrown up by the Freedom Movement, Mufti Saheb's passing away is indeed the end of an era and creates an irreparable void. May he rest in eternal peace! — Editor

سماحة المفتي عتيق الرحمن العثماني

في ذمة الله

فقد العالم الاسلامي بتاريخ ١٢-٥-١٩٨٤م علما بارزا وشخصية اسلامية كبيرة حيث توفي في دلهي سماحة المفتي عتيق الرحمن العثماني عن عمر يناهز الثالثة والثمانين، وقد كان رئيس المجلس الاسلامي لعموم الهند ونائب رئيس هيئة الاحوال الشخصية للمسلمين وامين عام ندوة المصنفين ومن الاعضاء البارزين في عشرات من المجالس العلمية للجامعات والمجامع العلمية والثقافية. وعاش حياة حافلة بالخيرات العلمية والاجتماعية والسياسية، والحديث عنه حديث عن عصر كامل وعن شخصية مثالية تترك آثارها في النواحي الفكرية والسياسية المختلفة.

كان العثماني سليل كرام بررة، اسرته اسرة علم وفضل ودين وصلاح، فكان ابوه الشيخ عزيز الرحمن العثماني من كبار الفقهاء والعلماء الربانيين، وعمه هو المحدث الفذ النابغة شبير احمد العثماني الذي عرف بشيخ الاسلام في باكستان وكتابه "فتح الملهم بشرح صحيح الامام مسلم" اشهر من نار على علم، ومساهمته في انشاء باكستان ثم تدوين دستور اسلامي له والدعوة الى تطبيق الشريعة الاسلامية فيه معروفة

ولد الشيخ العثماني في ديوبند حيث كان ابوه رئيس هيئة الافتاء في جامعتها واكمل الدراسة فيها وتخرج على ايدي النوابغ والاعلام وكان من ابرز اساتذته المحدث الكبير الشيخ محمد انور شاه الكشميري الذي اعتبر حقا استاذ الجيل في علم الحديث الشريف، وعمه العلامة شبير احمد الذي كان من ابرز قادة رابطة المسلمين ومن خطبائها المفوهين وكان قد هاجر الى باكستان بعد نشأتها.

نبغ الشيخ عتيق الرحمن العثماني وكان حاد الذكاء دقيق النظر غزير العلم اشتغل فترة وجيزة في تدريس علوم الكتاب والسنة ثم انقطع للاعمال الاجتماعية والسياسية، وشارك في حرب استقلال الهند وجاهد لحقوق المسلمين.

ومن مآثر اعماله انشائه مع بعض زملائه مجمعا علميا باسم "ندوة المصنفين" في عام ١٩٣٨م، وقد اصدر هذا المجمع العلمي ما

يزيد عن مائة وخمسين كتابا تعالج القضايا الفكرية المعاصرة و تدافع عن الاسلام و توضح معالم الحضارة الاسلامية و فضلها على الحضارة الغربية ، و تعتبر خير عدة للباحث في مواجهة الغزو الثقافي الجديد .

و كل ذلك في صمت و اخلاص و بامكانية مالية زهيدة و مازالت مجلة ندوة المصنفين " برهان " احدى المجلات العلمية الراقية

و في عام ١٩٤٧ و في اعقاب استقلال الهند حينما انفجرت مجازر دموية رهيبة في دلهي فكان الشيخ وزملاؤه رغم كل تضحياتهم في حرب الاستقلال بين المتضررين فقد احرقت جميع كتب ندوة المصنفين و نهبت سائر ممتلكاتها و تحولت بنايتها الى الى كومة من رماد ، و لولا فضل الله و عنايته لكان الشيخ وزملاؤه بين القتلى حيث كان يطارد من الهندوس الحاقدين من منزل الى منزل . و لم يفقد الشيخ عزيمته ففتح مكتب " ندوة المصنفين " في مكان آخر قرب المسجد الجامع و استمر في العمل الى ان لفظ انفاسه الاخيرة .

و في عام ١٩٦٤ حينما حدث مقتل رهيب يذهل كل عاقل ، وقتل من الرجال و النساء و الاطفال من لا يحصيهم الا الله حتى شعر بعض زعماء الهندوس ايضا بالاشمئزاز لهول المنظر و بشاعة اساليب التقتيل و تمثيل الجثث و كاد ان يغلب على المسلمين الاحباط النفسي قام الشيخ عتيق الرحمن العثماني مع زملائه الآخرين ، و من بينهم السيد محمود والشيخ ابو الحسن الندوي ، و الشيخ ابو الليث الاصلاحي بانشاء المجلس الاستشاري لمسلمي عموم الهند ، و بدأت جولة تاريخية في الاماكن المتضررة و كانت لها آثار طيبة في نفوس المسلمين المنكوبين و رفع معنوياتهم ، و منذ سنوات كان الشيخ المفتي عتيق الرحمن العثماني هو رئيس المجلس الاستشاري بالاجماع بين القادة و الزعماء لما كان يتمتع به من اوصاف خلقية عالية .

مات الراحل العظيم و بقي الاوساط الدينية و السياسية تتذكر مدة طويلة خصائص شخصيته العملاقة شمائله التي تكاد تكون منفردة فقد عرف بكونه شخصا سالما ، جم التواضع ، رزينا ، حليما ، كبير العقل حاضر البديهة ، شديد الحرص على توحيد الصف وجمع كلمة المسلمين ، و قلما حظي احد باحترام مثله بين الفئات المتحاربة المتناقضة ، فقد كان مجلسه يجمع الوزراء و العلماء و رجال الفكر و الصحفيين و الشعراء من المسلمين وغيرهم و خويتايل الجميع بالتواضع و الابتسام .

ومنذ سنوات كان متفرغاً للاستماع الى مشاكل الناس والسعي لحلها ضمن طلاب الجامعات الى المتضررين فى الاضطرابات الى رؤساء الجماعات الدينية الى اعضاء البرلمان ووزراء البرلمان كل يري حل معضلته عند المفتى عتيق الرحمن العثمانى وهو يستمع الى هذا وذلك دون كلل او ملل ليعمل ما يستطيع۔

وفى الندوات والاجتماعات كل كان يتهيب لحضور بديهته ومقدرته على ادارة الاجتماعات ورده للفحم على القضايا المثارة، والذين يعرفونه عن كثب يشهدون له بالامانة والتواضع وانكار الذات فكان الانسان يسترد من عنده نفس النقود التى اودعها مع الظرف الذى وضعها فيه ولو بلغت مئات الالوف ومرت عشرات السنين وكان يقابل من هر درنحيده فى العمر باحترام وتواضع.

لولا بدائع صنع الله ما نبتت   تلك الفضائل فى لحم وفى عصب

وبموته انتهى الملتقى الذى كان يجمع فى دلهى كل القيادات الاسلامية فقد كان مكتبه بمثابة ديوانية يرتادها امراء الجماعات الاسلامية و رؤساء الجامعات الدينية والعصرية ورجال ينتمون الى فئات واحزاب مختلفة، فا

فالى الجميع ننعى الفقيد العظيم ونسأل الله سبحانه ان يتغمده برحمته ويمطر عليه شآبيب رحمته ورضوانه ويعوض الأمة بامثاله، وما ذلك على الله بعزيز۔ ○○

श्याम लाल यादव
उपसभापति
राज्य सभा

दूरभाष : कार्यालय : 381171
निवास : 376455
कार्यालय : 32, संसद भवन
नई दिल्ली
निवास : 4, अकबर रोड
नई दिल्ली

जून 20, 1984

मुझे यह जानकर बेहद सदमा पहुँचा कि मौलाना मुफ्ती अतीकुर्रहमान उस्मानी का विसाल हो गया । वे हिन्दुस्तान ही नहीं दुनिया के जाने माने आलमेदीन थे और वे-हिन्दुस्तान की शान थे । उनके इन्तकाल से जो नुकसान हुआ है उसे पूरा करना मुश्किल है । मैं दिल्ली से बाहर था इसलिये अपनी ताजीयत पेश करने में देरी हुयी ।

आपका
(श्याम लाल यादव)

مفتی صاحبؒ کی کہانی

مولانا سعید احمد اکبر آبادی (مرحوم) کی زبانی

مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی سے میری پہلی ملاقات تو اس وقت ہوئی جب میں طالب علمی کی غرض سے دیوبند حاضر ہوا۔ لیکن مفتی صاحب کے خاندان سے میرے خاندان کے تعلّقات اور روابط میری پیدائش (۱۹۰۸ء) سے بھی پہلے سے تھے) اور اس کی صورت یہ ہوئی کہ مفتی صاحب کے ماموں حافظ عبدالحیٔ صاحب اور ان کے پھوپھا حافظ سید عنایت حسین صاحب یہ دونوں سرکاری ملازمت میں ہونے کے ناطے آگرہ میں، مع متعلقین کے رہتے تھے اور والد صاحب قبلہ کے ان دونوں بزرگوں سے بڑے گہرے مراسم تھے، ان کے اہلِ خانہ ہمارے گھر آتے اور میری والدہ ماجدہ ہم دونوں بہن بھائیوں کو لے کر ان کے گھر جاتیں) اور بعض مرتبہ دو دو تین تین دن قیام رہتا۔ اور ہاں یاد آیا، مفتی صاحب کے ایک اور پھوپھا ڈپٹی محمد اشفاق تھے، وہ بھی آگرہ میں ڈپٹی مجسٹریٹ نہر تھے، والد صاحب کا ان سے بھی گہرا ربط و تعلق تھا، کم از کم ہفتہ میں ایک دن ملاقات ضرور ہوتی تھی، جب والد صاحب اور یہ حضرات جمعہ کی نماز پابندی سے جامع مسجد میں پڑھتے اور اس سے فراغت کے بعد امام صاحب کے کمرہ میں آدھ گھنٹہ بیٹھ کر لطف صحبت و ملاقات اٹھاتے۔

ان رشتہ داریوں کی وجہ سے حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا گاہے گاہے آگرہ آنا جانا رہتا اور مفتی صاحب بھی اُن کے ہمراہ ہوتے، حضرت مفتی صاحب جب کبھی آگرہ آتے ہمارے گھر بھی تشریف لاتے اور والد صاحب قبلہ آپ کی بڑی شاندار

دعوت کا اہتمام کرتے تھے، مجھے یاد پڑتا ہے ایک مرتبہ مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی کی بڑی بہن عطیہ بھی ہمارے گھر آئی تھیں اور میں اُن کے اور چند اور خواتین کے ساتھ تاج محل دیکھنے گیا تھا، ایک مرتبہ مفتی صاحب سے آگرہ کا ذکر آیا تو بولے: ابّا جی (حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ) (کا کشف قبور کا علم بہت بڑھا ہوا تھا) قیام آگرہ کے دنوں میں ایک روز بادشاہ اکبر کے مقبرہ سکندرہ تشریف لے گئے تو قبر پر پہنچتے ہی آپ کی حالت متغیر ہوگئی اور طبیعت پر وحشت اور گھبراہٹ طاری ہوگئی اور فرمایا: جلد چلو، عذاب الٰہی نازل ہو رہا ہے، اس کے برعکس تاج محل میں شاہجہاں اور ممتاز محل کی قبروں پر آئے تو وہاں اطمینان سے فاتحہ پڑھی۔

مفتی صاحب نے ایک مرتبہ یہ واقعہ بھی سنایا: ایک مرتبہ ابّا جی میرے ماموں حافظ عبدالحیٔ صاحب کے ساتھ مغرب کے بعد تشریف لے گئے، گھومتے پھرتے جمنا کی طرف جو فصیل ہے اس پر چادر بچھا کر بیٹھ گئے، اس وقت فضا بڑی دلکش اور سہانی تھی۔ موسم نہ گرم نہ سرد بڑا خوشگوار تھا، چاندنی چھٹکی ہوئی اور سبک و خنک ہوائیں موج زن ——— حافظ عبدالحی صاحب دراز قامت، گورے چٹے وجیہہ و مقبول صورت بزرگ تھے، سینہ چوڑا چکلا اور جسم ورزشی رکھتے تھے، عابد و زاہد اور نہایت متقی اور پرہیزگار اس درجہ تھے کہ کلکٹری میں سرشتہ دار کے عہدہ پر فائز ہونے کے باوجود کیا مجال تھی کہ ایک پیسہ بھی رشوت کا گھر میں آسکے، حافظ قرآن اعلیٰ درجہ کے تھے، قرآن سے ان کو عشق تھا، اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے تلاوت کرتے رہتے تھے، فن تجوید سے واقف تھے یا نہیں! اس کا تو مجھے علم نہیں ہے، البتہ ان کی آواز میں اس درجہ درد اور لب و لہجہ میں اس غضب کا سوز و گداز تھا کہ سامعین پر ایک وجد اور سرشاری کا عالم طاری ہو جاتا تھا ——— مفتی صاحب کا بیان ہے: تاج محل کی اس ولولہ انگیز فضا میں بیٹھ کر ابّا جی (حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ) نے حافظ عبدالحی صاحب سے قرآن مجید سنانے کی

فرمائش کی، وہاں تعمیل میں کیا عذر ہو سکتا تھا، باوضو تو وہ ہر وقت رہتے اور سبحہ گردانی کرتے ہی رہتے تھے، فوراً سورۂ واقعہ شروع کر دی، سورت کے مضامین اور ان کا وہ اسلوب اور آہنگ اور پھر حافظ صاحب کا وہ لحن داؤدی! اک سماں بندھ گیا۔ اباجی پر استغراق کا عالم دیر تک طاری رہا۔

حضرت مفتی صاحب کے علمِ کشف قبور کا ذکر ابھی آیا ہے، اس سلسلہ کا ایک واقعہ اور سُن لیجئے، ایک دن مفتی صاحب نے ذکر کیا: ایک مرتبہ اباجی مجھے ساتھ لے کر مدراس تشریف لے گئے جہاں آپ کے مریدوں اور عقیدت مندوں کا وسیع حلقہ تھا۔ اس سفر میں ہم سرنگاپٹم بھی گئے۔ یہاں اباجی جب سلطان ٹیپو شہید کے مزار پر پہونچے تو آپ بیٹھ گئے اور دیر تک مراقب ہو کر ایصال ثواب کرتے رہے جب فارغ ہو کر اٹھے تو چہرہ پر بشاشت ونشاط کا عجیب عالم تھا اور فرمایا: اس مزار میں جو شخص دفن ہے، اللہ کے ہاں اسے شہادت کا بڑا اونچا مقام ملا ہے، رحمت باری کا نزول مسلسل ہو رہا ہے۔

بہر حال یہ تھی نوعیت ان تعلقات کی جو مفتی صاحب کے اور میرے خاندانوں میں میری پیدائش سے بھی پہلے سے تھے۔

اب میرے ابتدائی حالات سنیئے تاکہ مجھ کو اکابر مشائخ وعلمائے دیوبند کے ساتھ اللہ کے فضل وکرم سے جو قرب واختصاص رہا ہے اس کا پس منظر آپ کے سامنے آسکے۔

اگرچہ میرا ددھیال بچھراؤں ضلع مرادآباد اور ننھیال سیوہارہ ضلع بجنور ہے لیکن والد ماجد ڈاکٹر محمد ابرار حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ بسلسلۂ ملازمت سرکاری پہلے اترپردیش کے مختلف شہروں میں اِدھر اُدھر رہے، پھر آخر میں آگرہ پہونچے تو یہاں ایسا جمے کہ یہیں سے پنشن یاب ہوئے اور یہیں رہ پڑے، میری پیدائش آگرہ کی ہے اس لیے اکبرآبادی کہلاتا ہوں[1] والد صاحب آگرہ کے نامی گرامی ڈاکٹر تھے اس لیے سرکاری تنخواہ کے علاوہ

---

[1] میں پہلے نام کے ساتھ "اکبرآبادی" نہیں لکھتا تھا، یوں کبھی بھولے بسرے (باقی اگلے صفحہ پر)

پرائیوٹ پریکٹس کی آمدنی بھی بہت معقول رکھتے اور بڑی فراخی اور کشادہ دستی سے گذر بسر کرتے تھے اور میں ان کا اکلوتا بیٹا تھا اس لیے رسم و رواج زمانہ کے مطابق انھیں چاہیئے تھا کہ مجھ کو انگریزی تعلیم دلاتے، لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا اور اس کی وجہ سے دوستوں میں مطعون ہوئے اور سارے آگرہ میں نکّو بنے، مسٹر اختر عادل آگرہ کے مشہور ایڈوکیٹ تھے اور بعد میں پاکستان گورنمنٹ کے ایڈوکیٹ جنرل ہو گئے تھے۔ والد صاحب سے ایک مرتبہ انھوں نے خود میرے سامنے کہا: ڈاکٹر صاحب! آپ کو یہ کیا سوجھی کہ لڑکے کو مُلّا بنا رہے ہیں، آپ اس کو انگریزی پڑھاتے، ذہین بچہ ہے، بڑا اچھا بیرسٹر ہوتا، ڈاکٹر تصدق حسین آگرہ کے بڑے نامور ڈاکٹر تھے، ایک روز انہوں نے ارشاد فرمایا: ڈاکٹر صاحب! آپ سعید کو انگریزی پڑھوا کر میڈیکل ایجوکیشن میں بھیجتے بڑا

(پچھلے صفحے کا بقیہ) سے لکھدیا ہوا اس کا اعتبار نہیں، چنانچہ میری تمام اسانیہ، ابتدائی تصنیفات اور خود برہان کے ٹائیٹل پیج پر صرف میرا نام درج ہے، لیکن ۱۹۴۸ء میں مولانا ابوالکلام آزاد نے گورنمنٹ مغربی بنگال کو میری کلکتہ مدرسہ کی پرنسپلی کے بارہ میں خط لکھا تو اس خط میں مولانا نے میرے نام کے ساتھ اکبرآبادی کا بھی اضافہ کر دیا اور اس کی وجہ سے تمام سرکاری کاغذات میں اکبرآبادی میرے نام کا جزء لاینفک ہو گیا، اس سلسلہ میں یہ ایک واقعہ بھی لائق ذکر ہے کہ ۱۹۶۳ء میں جب میں کناڈا سے نیویارک (امریکہ) گیا اور وہاں سے ایک دن کے لیے پرنسٹن یونیورسٹی بھی آیا تو جب میں یونیورسٹی کی لائبریری میں گھوم پھر رہا تھا اچانک لائبریرین میرے پاس آئے اور میری کتاب "فہم قرآن" کا جو نسخہ ان کے ہاتھ میں تھا اس کی طرف اشارہ کر کے پوچھا "جناب! کیا اس کتاب کے مصنف آپ ہی ہیں"۔ جب میں نے اثبات میں جواب دیا تو انھوں نے فوراً کتاب کی لوح پر میرے نام کے آگے اکبرآبادی کا لفظ بڑھا دیا تاکہ یہ Surname کی حیثیت سے مستعمل ہو۔

ہونہار لڑکا ہے، بہت کامیاب ڈاکٹر ہوگا، عربی پڑھ کر اسے کیا ملے گا! سید نیاز احمد صاحب کوتوال شہر حضرت ریاض خیرآبادی کے برادر خورد اور خود بھی صاحب دیوان شاعر والد صاحب قبلہ کے جگری دوست تھے، ایک دن بولے: ابرار (والد صاحب کا نام) تمہارے پاس کمی کس چیز کی ہے، سعید کو انگریزی کی تعلیم دلاکر مقابلہ کے امتحان میں بٹھاتے، بڑا اچھا ڈپٹی کلکٹر یا مجسٹریٹ ہوتا، یہ عربی تعلیم کس کام آئے گی؟ غرض کہ جتنے منہ اتنی باتیں اور "فکر ہر کس بقدر ہمت اوست" ایسے موقعوں پر والد صاحب کا عام جواب یہ ہوتا: اللہ کا حکم اور مشیت ہی یہ ہے۔ اس کی مشیت کے بغیر تو کوئی کام ہوتا نہیں ہے، لیکن یہ سوال پھر بھی باقی رہتا ہے کہ آخر والد صاحب نے ایسی تعلیم کا فیصلہ کیوں کیا جس کی اس زمانہ میں کوئی قدر ومنزلت نہیں تھی اور جو مولانا شبلی کے لفظوں میں "آنچہ باہیچ نیرزد بجہاں" کا مصداق تھی!

ایک روز احباب خاص کی مجلس میں والد صاحب قبلہ نے فرمایا:

"سعید میاں کی پیدائش سے پہلے میرے ایک لڑکی تھی، قمر النساء نام تھا۔ یہ بچی دس برس کی تھی کہ آگرہ میں طاعون پھیلا۔ خدا کی شان ہے اس مرض کے کتنے ہی بیمار میرے ہاتھوں اچھے ہو گئے تھے، لیکن خود میری اپنی بچی اس کا شکار ہوگئی، قمر کے بعد میرے ہاں کوئی اور بچہ پیدا نہیں ہوا تھا، اس لیے اب کیا توقع ہوسکتی تھی، میرا جی دنیا سے اچاٹ ہوگیا اور میں نے ہجرت کا پکا ارادہ کرلیا، لیکن اجازت طلبی کے لیے جب میں نے اپنے پیرومرشد حضرت قاضی عبدالغنی صاحب[1] منگلوری کو خط لکھا تو انھوں نے جواب میں ہجرت نہ کرنے کا حکم دیا اور ساتھ ہی لکھا:

---

[1] بچپن میں متعدد بار خاکسار کو حضرت قاضی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت بابرکت میں حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوا ہے، آپ حضرت مولانا محمد اسماعیل منگلوری جو مشہور عالم اور بزرگ تھے ان کے فرزند ارجمند تھے، شروع میں لاابالیانہ زندگی بسر کرتے تھے لیکن (باقی اگلے صفحے پر)

تم گھبراؤ نہیں اور مایوس نہ ہو، اللہ تعالیٰ تم کو "فرزند سعید" عطا فرمائے گا چنانچہ اس بشارت کے کئی برس بعد یہ بچہ پیدا ہوا، اس کے علاوہ ایک واقعہ یہ ہوا کہ اس بچہ کی ولادت سے دو تین گھنٹے پہلے میں نے خواب میں دیکھا کہ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی تشریف لائے ہیں، میں نے انہیں دیکھا تو سروقد کھڑا ہو گیا، علیک سلیک کے بعد عرض کیا: حضرت تشریف رکھیے، ادھر سے ارشاد ہوا: ڈاکٹر! فرزند سعید مبارک ہو، ہم بیٹھیں گے نہیں، اسی مبارکباد کی غرض سے آئے تھے۔" بس یہ فرمایا اور رخصت ہو گئے۔"

والد صاحب نے اس کے بعد فرمایا:

"پیر و مرشد کی بشارت اور پھر یہ خواب اور دونوں میں فرزند سعید کے الفاظ مشترک میں نے غور کیا تو میں سمجھا کہ یہ سب کچھ اشارہ غیبی ہے اس امر کی طرف کہ میں بچہ کا نام سعید رکھوں اور

(بقیہ صفحہ گذشتہ) پدر بزرگوار کی وفات کے بعد اچانک آپ میں انقلاب پیدا ہوا، ایک کوٹھری میں بند ہو کر چالیس دن کا چلّہ کھینچا جس میں جو کی دو ٹکیوں کے علاوہ کچھ اور نہ کھاتے تھے، مقررہ مدت کے بعد چلہ سے باہر آئے۔ تو اب عالم ہی دوسرا تھا، جذب اور استغراق کا عالم طاری رہتا تھا۔ نگاہوں میں عجب کشش تھی، ان کے کشف اور کرامتوں کا چرچا عام تھا۔ مریدوں کا حلقہ کافی وسیع تھا۔ اس میں سرکاری افسروں اور امراء و روساء کی تھی، حضرت اصغر گونڈوی اور جگر مراد آبادی بھی آپ کے جاں نثار مرید تھے، زندگی شاہانہ تھی، سات مشکی گھوڑے میں نے خود ان کے اصطبل میں گنے ہیں، بدعات کے سخت دشمن تھے، اتباع سنت پر ہمیشہ زور دیتے تھے۔ ایک مرتبہ مجھ سے فرمایا: تو میری دعاؤں سے پیدا ہوا ہے، اپنے باپ اور ماں کی طرح تو بھی میرا مرید ہو جا۔" میں بزرگوں کی مجلس میں گستاخ ہمیشہ کا ہوں، فوراً عرض کیا: حضرت مجھ پر تو ابھی نماز بھی فرض نہیں ہے۔ والد صاحب اس گستاخی پر مجھے سرزنش کرنا چاہتے تھے، لیکن حضرت قاضی صاحب نے روک دیا اور ہنس کر فرمایا: شاباش! ایسا ہی صاف گو ہونا چاہیے۔

دیوبند میں اسے عربی اور دینی تعلیم دلاؤں۔

جب والد صاحب قبلہ نے میری تعلیم کے بارہ میں یہ قطعی فیصلہ کر لیا تو اب انہوں نے اس کا اہتمام بھی اس درجہ کیا کہ کوئی اولاد کی انگریزی تعلیم کا بھی کیا کرے گا، میری بسم اللہ کے لیے حضرت قاضی صاحب کو منگلور لکھا تو آپ نے اسی مقصد کے لیے اپنے ایک عزیز میاں محمد افضل کو بھیج دیا۔ یہ اگرچہ عالم نہیں تھے، لیکن نیم مجذوب تھے اور مشہور تھا کہ مادرزاد ولی اور مستجاب الدعوات ہیں، اس کے بعد ایک حافظ اور ایک مولوی صاحب کا تقرر کر دیا گیا جن سے میں نے علی الترتیب قرآن مجید پڑھا اور اردو اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔

اب عربی کی تعلیم شروع کرنے کا وقت آیا تو والد صاحب نے حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانی کو دیوبند لکھا کہ مجھے اپنے بچہ کی عربی تعلیم کے لیے ایک اتالیق کی ضرورت ہے، ازراہ کرم کسی اچھے عالم کا انتخاب کر کے بھیج دیجئے۔ تنخواہ معقول دوں گا، لیکن عالم کا متقی پرہیز گار ہونا ضروری ہے، کیونکہ بچہ کی ذہنی اور اخلاقی تربیت بھی ان کے سپرد ہوگی۔ دیوبند کے شیوخ میں سے ایک صاحب مولوی خورشید علی نام کے تھے، دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل تھے اور آج کل دارالافتاء میں کام کر رہے تھے، عمر پچاس پچپن کے لگ بھگ ہوگی، گورے چٹے اور نورانی شکل وصورت کے انسان تھے، حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مراد آبادی کے خلیفہ مولانا عبدالکریم صاحب سے بیعت تھے اس لیے اوراد و وظائف کے بھی پابند تھے، حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے میرے لیے ان کا انتخاب کیا اور انھیں آگرہ بھیج دیا۔[1]

---

[1] مولوی خورشید علی صاحب کے والد مولوی فرزند علی دیوبند کے وکیل یا مختار تھے، دارالعلوم دیوبند کا مکان جس میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رہتے تھے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

مولوی صاحب کی تنخواہ کیا تھی؟ اس کا تو مجھے علم نہیں ہے، البتہ یہ معلوم ہے کہ موصوف ہمارے مکان (واقع لوہا منڈی) کے قریب ہی ایک مکان کرایہ پر لے کر مع متعلقین کے رہتے اور اچھا کھاتے اور اچھا پہنتے تھے، ان کے متعلقین میں ایک عمر سے ڈھلی ہوئی خوبصورت بیوی، دو جوان لڑکیاں، رضیہ اور فاطمہ اور ایک جوان لڑکا حسن۔ اس طرح لے دے کے کل پانچ آدمیوں کا یہ کنبہ تھا، یں وَالَّذِیْنَ لَمْ یَبْلُغُوْا الْحُلُمَ۔ کا مصداق تھا، اس لیے پردہ و زدہ کسی سے نہیں تھا، بے تکلف گھر میں آنا جانا تھا۔

والد صاحب قبلہ اس سے بے خبر نہیں ہو سکتے تھے کہ صرف فارسی اور عربی کی تعلیم کافی نہیں ہے، بلکہ بعض اور اہم مضامین کی تعلیم بھی ضروری ہے، چنانچہ انھوں نے میرے لیے ایک قابل ہندو گریجویٹ، مسٹر مکٹ بہاری لال ماسٹر کا بھی تقرر کیا اور اب پروگرام یہ ہو گیا کہ صبح چار گھنٹے مولوی خورشید علی صاحب مجھ کو عربی اور اس کے متعلقات کی تعلیم دیں گے اور شام کو دو گھنٹے ماسٹر صاحب انگریزی، حساب اور تاریخ وجغرافیہ پڑھائیں گے، مولوی صاحب کے سپرد یہ کام بھی تھا کہ وہ دونوں وقت کھانا میرے ساتھ کھائیں گے، مسجد میں اپنے ساتھ مجھ کو بھی لے جائیں گے اور صبح شام کی ہوا خوری میں بھی وہ میرے ساتھ ہوں گے۔

مولوی خورشید علی صاحب محبت اور توجہ سے پڑھاتے تو تھے ہی، بڑی بات یہ ہے، جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، ان کو تصوف کا بڑا ذوق تھا، مثنوی مولانا روم کے عاشق تھے۔ اس لیے اکثر بزرگان اور اولیائے کرام کے قصے سناتے اور قرآن مجید

(بقیہ صفحہ گذشتہ) دراصل انھیں مولوی فرزند علی کا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد جب مولوی خورشید علی اس کے مالک ہوئے تو باپ چونکہ قرض بہت کافی چھوڑ گئے تھے اس لیے مولوی خورشید علی صاحب نے یہ مکان دارالعلوم کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔

کے احکام کی حکمتیں بیان کرتے رہتے تھے، اس سے یہ فائدہ ہوا کہ دین کی عظمت اور بزرگانِ دین کی محبت بچپن میں ہی دل میں بیٹھ گئی اور اتالیق رکھنے سے دراصل والد صاحب کا مقصد بھی یہی تھا، میری عربی کی تعلیم کافیہ تک ہوئی تھی کہ مولوی خورشید علی صاحب چلے گئے اور ان کی جگہ دیوبند سے ہی مولوی غلام نور صاحب آئے جو سرحدی اور نہایت قابل آدمی تھے، وہ ہمارے ہاں نو دس ماہ رہے ہوں گے لیکن اس مدت میں مشق و تمرین کے ذریعہ انھوں نے صرف و نحو کے قواعد دماغ میں کالنقش فی الحجر کرا دیے جس کا اثر میں اب تک محسوس کرتا ہوں اور چونکہ مشق و تمرین کے لیے مولوی صاحب سب مثالیں قرآن مجید سے لیتے تھے اس لیے ابتدا میں ہی قرآن مجید سے مناسبت اور کچھ شدبد پیدا ہو گئی، علاوہ ازیں مجھ کو نحو ایسے خشک اور بے مزہ فن سے ایسی دلچسپی ہو گئی کہ بعد میں کتاب سیبویہ اور النحو الوافی کا مطالعہ میں نے خود اپنے شوق سے کیا۔

کم و بیش چار برس تعلیم کا سلسلہ اسی طرح چلتا رہا۔ کافیہ، قدوری وغیرہ تک پڑھ چکا تھا اس کے بعد والد صاحب نے میری انگریزی تعلیم موقوف کر دی کیوں کہ اب دونوں قسم کی تعلیم ساتھ نہیں چل سکتی تھی اور مقصد اصل عربی تعلیم کی تکمیل تھا۔ علاوہ ازیں اب والد صاحب نے مجھ کو مدرسہ میں داخل کرنے کا ارادہ بھی کر لیا، چنانچہ مراد آباد کے مدرسہ امدادیہ میں داخل کر دیا گیا۔ مراد آباد میں میرے اعزا و اقربا کافی تعداد میں تھے، لیکن والد صاحب نے کسی کے مکان پر میرے تنہا رہنے کو پسند نہیں فرمایا، ایک مکان کرایہ پر لیا اور دو نوکروں کے ساتھ میری والدہ اور ہمشیرہ خورد کو بھی میری خاطر مراد آباد بھیج دیا، مدرسۂ امدادیہ مراد آباد کے صدر مدرس مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب چاند پوری تھے، اور مدرس مولوی محمد اسحاق صاحب کانپوری اور مولوی محمد حنیف صاحب امروہوی تھے میری کتابیں شرح جامی، شرح وقایہ وغیرہما ان تینوں حضرات کے پاس تھیں، تعلیمی سال کے ختم پر مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب چاند پوری امدادیہ مدرسہ چھوڑ دارالعلوم دیوبند آگئے

تو اب والد صاحب نے مجھ کو بھی دیوبند بھیجنے کا ارادہ فرمالیا، یہ غالباً ۱۹۲۱ء، یا ۱۹۲۲ء کی بات ہے۔

لیکن والد صاحب نے جو اہتمام مراد آباد میں کیا تھا وہی یہاں کیا، مفتی صاحب کے ماموں حافظ عبدالحیٔ صاحب مرحوم ومغفور آگرہ کی سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہو کر دیوبند میں سکونت پذیر ہو گئے تھے، یہاں محلہ شاہ ابو المعالی میں ان کا ایک ذاتی مکان تھا اس میں رہتے تھے، اسی مکان کی بغل میں حافظ صاحب کا ایک اور مکان تھا والد صاحب نے یہ مکان جس کا اصل دروازہ بھی پہلے مکان کے اندر ہی تھا حافظ صاحب سے کرایہ پر لے لیا اور میرے ساتھ آگرہ کا پورا گھر بار مع دو نوکروں کے اس گھر میں منتقل کر دیا، اور صرف یہی نہیں بلکہ چھ ماہ کی رخصت لے کر خود بھی دیوبند آ گئے، میں نے اگر شروع میں کہا ہے کہ والد صاحب قبلہ نے میری عربی تعلیم کا اہتمام اتنا کیا کہ کوئی انگریزی تعلیم کا بھی کیا کرے گا۔ تو فرمائیے میں نے کیا غلط کہا۔ والد صاحب کی پریکٹس کی آمدنی کا اوسط اگر کم سے کم ایک ہزار روپیہ ماہوار بھی مان لیا جائے تو مہینے کی رخصت کے یہ معنی ہوئے کہ انھوں نے چھ ہزار کا نقصان کیا۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی مہتمم دارالعلوم دیوبند سے والد صاحب کی ملاقات ہوئی تو انھوں نے فرمایا: ڈاکٹر صاحب! آپ لڑکے کو طالب علمی کرانے لائے ہیں یا نوابی کرنے، والد صاحب نے جواب دیا: حضرت! بچہ بہت لاڈ اور پیار کا پالا ہوا ہے، کبھی گھر سے باہر نکلا نہیں ہے اس لیے مہربانی فرما کر صرف ایک برس کی اجازت دے دیجیے، بات رفت گذشت ہوئی دارالعلوم میں میرا داخلہ ہو گیا، اور میں پورے گھر کے ساتھ محلہ شاہ ابو المعالی میں رہنے لگا۔

مفتی صاحب کے اور میرے تعلق کی داستان کا نقطۂ آغاز یہی ہے۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا معمول تھا کہ اکثر وبیشتر عصر کی نماز کے بعد اپنے بہنوئی یعنی حافظ عبدالحی صاحب مرحوم کے گھر تشریف لاتے تھے اور مفتی صاحب،

آپ کے فرزند اکبر آپ کے ہمراہ ہوتے، ہمارا مکان بغل میں تو تھا ہی، وہاں سے اٹھ کر حضرت مفتی صاحب ہمارے گھر آتے اور کچھ دیر والد صاحب کے پاس بیٹھ کر واپس تشریف لے جاتے۔ ایک مرتبہ تو ایسا ہوا کہ والد صاحب سخت بیمار ہو گئے اور علالت کا سلسلہ طویل ہو گیا جس کے باعث ہم سب لوگ سخت پریشان تھے، اس زمانہ میں دیکھا کہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ بڑی پابندی سے ہمارے گھر آتے اور والد صاحب پر کچھ پڑھ پڑھ کے دم کرتے رہتے تھے، میں سمجھتا ہوں کہ یہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی توجہ خاص اور ان کی دعاؤں کا اثر تھا کہ جس روز والد صاحب کی رخصت ختم ہونے والی تھی اور ہم لوگ سخت پریشان اور فکر مند تھے کہ اگر رخصت کے ختم ہونے تک والد صاحب شفا یاب نہ ہوئے تو ان کی سرکاری ملازمت کا کیا ہوگا۔ اس کے دو دن پہلے اچانک خود بخود ایسے صحت یاب ہوئے کہ گویا کبھی بیمار ہی نہ ہوئے تھے۔

مجھ میں اور مفتی صاحب میں فاصلہ بہت کافی تھا، کیونکہ وہ عمر میں مجھ سے سات برس بڑے، میں متوسطات کا طالب علم اور وہ معین المدرسین۔

اس قدرتی فاصلہ کے باعث شروع شروع میں میرے اور ان کے درمیان یک گونہ حجاب سا رہا لیکن مفتی صاحب کی روزانہ آمد ورفت اور غیر معمولی توجہ اور کرم نے مجھ کو جلد بے تکلف بنا دیا۔

وقت گذرنے کے ساتھ بے تکلفی بڑھتی رہی اور ہم دونوں ایک دوسرے سے اتنے قریب ہو گئے کہ میں مفتی صاحب کے خاندان کا ایک فرد ہو گیا اور مفتی صاحب میرے خاندان کے، چنانچہ ایک مرتبہ اماں جی (مفتی صاحب کی والدۂ محترمہ، جن کی وفات پر میں نے مہاجرین میں ایک مضمون بھی لکھا تھا) مجھ سے فرمایا: میرے دو نہیں بلکہ تین بیٹے ہیں، عتیق، جلیل اور سعید۔ لیکن اس تمام بے تکلفی اور قربت کے باوجود مفتی صاحب

اور میرے درمیان سن و سال اور مرتبہ و مقام کا جو فاصلہ تھا اس کو میں نے ہمیشہ ملحوظ رکھا۔ چنانچہ میں ان کو اپنا برادرِ بزرگ سمجھتا تھا اور وہ مجھ کو برادرِ خورد جانتے تھے، لیکن ایسا برادر جو دوست بھی ہو، کسی نے ایک عقلمند سے پوچھا: بھائی بہتر ہوتا ہے یا دوست؟ اس نے جواب دیا: وہ بھائی کس کام کا جو دوست نہ ہو، اور میں دوست بھی تھا اور بھائی بھی، اس لیے یہ رشتہ بہت قوی تھا اور مضبوط بھی۔

میں ایک برس والدہ صاحبہ وغیرہا کے ساتھ محلّہ ابوالمعالی میں رہا، پھر سب لوگ آگرہ چلے گئے، تو میں بڑے بھائیوں کے محلہ میں ایک مکان میں رہنے لگا۔

اس کے بعد میں نے مدرسہ کے اندر رہنے کا ارادہ کیا تو مدرسہ کے صدر دروازے کے اوپر جو ایک کمرہ بنا ہوا ہے اس میں حضرت مولانا سراج احمد صاحب رشیدی، جن کا شمار اکابر اساتذہ دارالعلوم میں ہوتا تھا رہتے تھے۔ اس کمرہ کی بغل میں ایک کمرہ ہے، والد صاحب قبلہ کی خواہش کے مطابق مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی نے میرے لیے یہ کمرہ تجویز کیا کہ میں ایک طرف خود ان کی اور دوسری جانب مولانا سراج احمد صاحب رشیدی کی براہ راست نگرانی میں رہوں، اس طرح بسلسلۂ طالب علمی میرے قیام دارالعلوم کے تین دور ہیں، دورِ اول میں میں گوشہ نشین رہا۔ گھر سے مدرسہ اور مدرسہ سے گھر، بس یہ میری دنیا تھی، طلباء سے خلا ملا بالکل نہیں تھا، البتہ جیسا کہ میں پہلے کہہ آیا ہوں مفتی صاحب سے تقریباً روزانہ ہی ملاقات ہوتی تھی، دورِ ثانی میں تعلقات کا حلقہ وسیع ہوا۔ میں نے طلباء کی انجمنوں کے جلسوں میں شرکت اور ان میں تقریر کرنا شروع کر دیا۔

اس سلسلہ میں ایک مرتبہ یہ دلچسپ واقعہ پیش آیا کہ حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ کے ہاں ان کی بیٹھک میں روزانہ مغرب سے عشاء تک مجلس ہوتی تھی جس میں خالص علمی اور دینی گفتگو ہوتی تھی۔ وقتاً فوقتاً میں بھی اس مجلس میں شریک ہوتا تھا، ایک روز میں اور مفتی صاحب ہم دونوں اس مجلس میں حاضر ہوئے تو حضرت الاستاذ

میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: میاں سعید! تم تقریر کی مشق بھی کرتے ہو؟ میں نے عرض کیا: جی ہاں! جمعیت محمودیہ کا جلسہ ہر جمعرات کو عشاء کے بعد ہوتا ہے، میں اس میں شریک ہوکر تقریر کرتا ہوں، مفتی صاحب کو بھانجی مارنے میں مزہ آتا تھا، فوراً بول پڑے: یہ تقریر کیا کرتے ہیں، بس مولانا ابوالکلام آزاد کی کسی تقریر کے ایک جز کو رٹ لیتے ہیں اور جلسہ میں آکر اسے اُگل دیتے ہیں۔ حضرت الاستاذ نے یہ سنا تو بے ساختہ ہنس پڑے، پھر فرمایا: شروع شروع میں یہ عادت بری نہیں، اچھی ہے، کیوں کہ اس طرح ایک نامور ادیب وخطیب کے خاص خاص جملے اور الفاظ زبان زد ہو جاتے ہیں اور مقرر اپنی تقریریں انھیں الٹ پلٹ کرتا رہتا ہے اور اس طرح ایک دن وہ خود صاحب طرز اچھا مقرر بن جاتا ہے، لیکن یہ عادت مستقل ہرگز نہ ہونی چاہیے یہ بات تو ختم ہوگئی، لیکن لیکن اس کے بعد حضرت الاستاذ نے جو حکیمانہ بات کہی وہ بھی سننے کے لائق ہے، ارشاد ہوا: ہاں میاں! تقریر کی مشق ضرور کیا کرو، یہ سمجھو کہ انسان کا سر ایک صندوق ہے اور زبان اس کی کنجی ہے، اب فرض کرو تمہارے پاس ایک صندوق ہے جو ہیرے جواہرات سے پُر ہے لیکن اگر صندوق کی کنجی تمہارے پاس نہیں ہے تو پھر صندوق کس کام کا؟ اس سے نہ خود تم فائدہ اٹھا سکتے ہو اور نہ کوئی دوسرا، ہاں اگر کنجی تمہارے قبضے میں ہے تو اب صندوق تمہارے لیے بھی کارآمد ہوگا اور دوسروں کے لیے بھی۔

اس زمانہ میں مفتی صاحب کے گھر آنا جانا بھی زیادہ ہوگیا تھا اور اس طرح مفتی صاحب کے ذاتی فضائل وکمالات اور خاص عادات واطوار، جن کا ذکر تفصیل سے آگے آئے گا، ان کے مشاہدہ ومعائنہ کا موقع تو ملا ہی تھا، بڑی بات یہ ہوئی کہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت بابرکت سے مستفید ومستفیض ہونے اور آپ کی نہایت سادہ اور بے تکلف مگر انتہائی عارفانہ زندگی کے احوال وشئون کے

براہ راست اور قریبی مطالعہ کی سعادت نصیب ہونے لگی، حضرت مفتی صاحب کا روحانی مرتبہ ومقام کیا تھا؟ اس کا اندازہ تو میرا ایسا عامی آدمی کیا کرسکتا ہے۔ البتہ جو بات میں اپنے علم ویقین کی روشنی میں جزم اور قطعیت کے ساتھ کہہ سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ فقر ودرویشی جس کو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لیے سرمایۂ فخر فرمایا ہے، اس کا جو عالم میں نے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ذات اقدس میں دیکھا ہے وہ عرب وعجم میں کہیں نظر نہیں آیا، وہ دارالعلوم دیوبند کے مفتیِ اعظم اور شیخِ کامل تھے، ان کے شاگردوں اور مریدوں اور معتقدوں کا حلقہ بڑا وسیع تھا، پھر مدرسہ میں چپراسی اور خدّام بھی کم نہیں تھے، لیکن با اینہمہ صبح کے وقت مدرسہ جانے سے پہلے گھر کا سودا سلف لینے خود بازار جاتے تھے اور بازار جاتے وقت آس پاس کے گھروں کی عورتوں سے پوچھ لیتے تھے تاکہ انھیں کچھ منگانا ہو تو وہ بھی لیتے آئیں۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت وتوجہات عالیہ سے میں نے کیا کچھ حاصل کیا ہے اس کا ذکر آئندہ جستہ جستہ آتا رہے گا۔ یہاں ایک دلچسپ واقعہ سنئے، ایک مرتبہ حضرت موصوف مفتی صاحب کو اور مجھے ساتھ لے کر ایک بیل گاڑی کے ذریعہ دیوبند سے دس بارہ میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں میں پہونچے اور اپنے ایک مرید یا معتقد کے گھر قیام فرمایا، یہ مغرب سے ذرا پہلے جھٹ پٹے کا وقت اور موسم سرما کے آغاز کا زمانہ تھا، عشاء کے بعد کھانا آیا تو وہ باجرے کی روٹی اور چنے کے ساگ پر مشتمل تھا اور شاید کوئی چٹنی یا اچار بھی اس کے ساتھ تھا، یہ دیکھتے ہی مفتی صاحب کے ماتھے پر بل پڑ گیا، ان میں ایک کمال یہ تھا کہ کیسا ہی کوئی مجمع ہو وہ کسی ناگوار سے ناگوار احساس کو ظاہر کیے بغیر نہ رہتے تھے مگر ذرا مسکراتے ہوئے، آنکھوں کی ایک خاص گردش اور معصومانہ لب ولہجہ کے ساتھ اس کا اظہار اس بلیغ انداز میں کرتے تھے،

کہ وہ ایک لطیف طنز ہوتا تھا اور سامعین برا ماننے کے بجائے اچانک ہنس پڑتے تھے، تو پھر بھلا اس موقع پر وہ چوکنے والے کہاں تھے، بولے: ابا جی! کیا تزکیۂ نفس کی ایک شرط باجرے کی روٹی اور چنے کا ساگ کھانا بھی ہے؟ حضرت مفتی صاحب کو ہنسی آ گئی اور نرم اور دھیمی آواز میں فرمایا: میاں عتیق! کھا کے تو دیکھو، کیا مزے کی چیز اور جاڑوں کا تحفہ ہے، پھر حضرت مجھ سے مخاطب ہوئے اور پوچھا: تمہاری کیا رائے ہے! میں نے عرض کیا: حضرت! سبحان اللہ، یہ گرم گرم روٹی اور اس پر خالص گھی چپڑا ہوا اور یہ ساگ خالص گھی میں بگھرا ہوا۔ اللہ کی کتنی بڑی نعمت ہے، ہم شہر والوں کو یہ کہاں نصیب! حضرت مفتی صاحب یہ سن کر خوش ہوئے اور فرمایا: اصل مقامِ شکر ایسی ہی چیزیں ہیں جن کو عرفِ عام میں ادنیٰ اور معمولی سمجھا جاتا ہے، کیونکہ ان چیزوں پر شکر کرنے میں انسان کا اپنے متعلق اعتراف ہیچ میرزی پایا جاتا ہے۔

اس کے بعد حضرت نے ایک ایسی بات کہی کہ اسے سن کر کم از کم مجھے تو ایسا محسوس ہوا کہ گویا میرے دل پر ایک نشتر سا لگ گیا، ارشاد ہوا: یوں تو میں امیروں اور دولتمندوں کے ہاں ان کے مکلف کھانے بھی کھاتا ہوں اور ان کو اللہ کی بڑی نعمت جان کر شکر ادا کرتا ہوں، لیکن سچی بات یہ ہے کہ گھر کا سادہ کھانا کھانے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قرب کے احساس سے قلب میں انشراح اور طمانیت کی جو کیفیت میں محسوس کرتا ہوں وہ مکلف کھانوں میں محسوس نہیں ہوتی، مفتی صاحب پر اس گفتگو کا کیا اثر ہوا؟ یہ تو معلوم نہیں ہو سکا۔ البتہ میں نے یہ دیکھا کہ انھوں نے دیہاتوں میں جانا عموماً ترک کر دیا تھا اور اگر کبھی حضرت مفتی صاحب نے ساتھ چلنے کو کہا بھی تو انھوں نے کہہ دیا: جلیل (قاری جلیل الرحمٰن صاحب مفتی صاحب کے برادر خورد) کو ساتھ لے جائیے، مجھ سے مٹی کے ڈھوبروں میں نہیں کھایا جاتا۔

ہاں تو ذکر میرے قیام دارالعلوم کے دورِ ثانی کا ہو رہا تھا جب کہ میں بڑے بھائیوں نامی محلہ کے ایک مکان میں رہتا تھا جسے مردانہ مکان ہونے کی وجہ سے بیٹھک کہتے تھے، اس بیٹھک میں میرے ساتھ مفتی صاحب کے پھوپھا ڈپٹی محمد اشفاق صاحب کے فرزند ارجمند مولوی محمد آفاق بھی رہتے تھے جو دارالعلوم میں پڑھتے تھے اور اسباق میں مجھ سے جونیر تھے، اس لیے کبھی کبھی یعنی ہفتہ میں تین چار دن مجلس ہمارے ہاں اس بیٹھک میں جمتی تھی جس میں چار پانچ احباب شریک ہوتے تھے اور یہ سب دارالعلوم کی مختلف جماعتوں میں پڑھتے تھے، مجھ سے تعلق کی وجہ سے مفتی صاحب بھی ان مجلسوں میں شرکت کرتے تھے، ارکان مجلس سب ہی فارسی اور اُردو شعر و ادب کا پاکیزہ اور شگفتہ ذوق رکھتے تھے اور خاص طور پر مفتی صاحب کا ذوق تو بہت ہی رچا بسا تھا اور وہ اگرچہ شعر تو نہیں کہتے تھے لیکن سخن فہم اعلیٰ درجہ کے تھے اور اس کی وجہ ایک تو خاندانی خصوصیت تھی اور پھر اکابر دیوبند کی اولاد کی طرح مفتی صاحب نے دارالعلوم کے درجۂ فارسی کے پنج سالہ نصاب کی تکمیل کی تھی اور ان کے استاد مولانا محمد یٰسین صاحب تھے جو اس زمانہ میں فارسی زبان و ادب کی مہارت میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے، اور ان کی تعلیم کا انداز ایسا تھا کہ طالب علم میں فارسی زبان و ادب کا پختہ ذوق پیدا ہو جاتا تھا۔ علاوہ ازیں ایک بات یہ تھی کہ مفتی صاحب کے ایک چچازاد بھائی جو ان کی پھوپھی زاد بہن کے شوہر ہونے کے رشتہ سے بہنوئی بھی ہوئے جمیل الرحمٰن تھے، یہ انگریزی میں بی اے تھے اور سرکاری ملازم بھی تھے، مگر تھے نہایت ذہین اور طباع، اُردو زبان کے بلند پایہ شاعر تھے، طبیعت میں غضب کی روانی تھی، نظم اور غزل دونوں پر یکساں قدرت تھی، جمیل تخلص کرتے تھے اُردو کے علاوہ فارسی اور انگریزی میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے، تپ دق میں بیمار ہو کر جوانی میں چل بسے تھے[1] مفتی صاحب اور مرحوم میں (حاشیہ اگلے صفحے پر)

رشتہ داری کے علاوہ ہم مذاقی کے باعث بہت گہرا ربط و تعلق تھا، اور اول درجہ کے سخن سنج و سخن گو اور یہ اعلیٰ قسم کے سخن فہم و سخن شناس، کوئی نئی غزل یا نظم جب تک مفتی صاحب کو سنا کر اس کی داد نہ لے لیتے انھیں چین نہ آتا تھا۔ پھر پڑھتے بھی بہت خوب تھے۔ مفتی صاحب کا بیان ہے جب وہ مترنم ہوتے تھے ایک سماں بندھ جاتا تھا، مفتی صاحب کو ان کی غزلوں کی غزلیں یاد تھیں۔

اب مفتی صاحب کے ذوقِ شعر و ادب کا یہ پس منظر ذہن نشین کر کے سنیئے ہماری اس مجلس میں گفتگو کا موضوع عموماً شعر و ادب ہوتا تھا، فارسی اور اردو دونوں کا کبھی عرفی اور نظیری پر تنقید ہو رہی ہے اور کبھی غالب کے مشکل اشعار مثلاً:

"ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق"

یا

"مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی"

وغیرہ وغیرہ، ان میں سے کوئی شعر لے لیا اور اس پر بحث شروع کر دی، مفتی صاحب ان گفتگوؤں میں بڑی دلچسپی سے حصہ لیتے اور بڑی جچی تلی بات کہتے تھے جس سے ان کے مخصوص ادبی افکار و نظریات کا علم ہوتا تھا۔ مثلاً فارسی شاعری میں تغزل کے اعتبار سے عرفی اور نظیری کو امیر خسرو سے بڑا شاعر مانتے تھے، کہتے تھے، خسرو میں قدرت کلام اور جرأت فکر بے پناہ ہے، لیکن سوز و گداز اور احساسِ درد و غم جو تغزل کی جان ہے عرفی اور نظیری کے کلام میں خسرو سے زیادہ ہے، اسی طرح مفتی صاحب اُردو شعراء میں غالب کی عظمت و فکر و خیال اور اس کے تیکھے انداز بیان کے معترف تھے لیکن اس کے

(پچھلے صفحے کا حاشیہ) عرصہ دراز ہوا ماہنامہ جامعہ نئی دہلی میں، جبکہ اس کے ایڈیٹر مولانا اسلم جیراجپوری تھے، میں نے مرحوم پر ایک مضمون "اُردو کا ایک جوان مرگ شاعر" کے عنوان سے لکھا تھا۔ میں نے مرحوم کو نہیں دیکھا تھا، مفتی صاحب سے جو کچھ سنا تھا مقالہ کی بنیاد وہی تھا۔

ہاں تو ذکر میرے قیام دارالعلوم کے دورِ ثانی کا ہو رہا تھا جب کہ میں بڑے بھائیوں نامی محلہ کے ایک مکان میں رہتا تھا جسے مردانہ مکان ہونے کی وجہ سے بیٹھک کہتے تھے، اس بیٹھک میں میرے ساتھ مفتی صاحب کے پھوپھا ڈپٹی محمد اشفاق صاحب کے فرزند ارجمند مولوی محمد آفاق بھی رہتے تھے جو دارالعلوم میں پڑھتے تھے اور اسباق میں مجھ سے جونیر تھے، اس لیے کبھی کبھی یعنی ہفتہ میں تین چار دن مجلس ہمارے ہاں اس بیٹھک میں جمتی تھی جس میں چار پانچ احباب شریک ہوتے تھے اور یہ سب دارالعلوم کی مختلف جماعتوں میں پڑھتے تھے، مجھ سے تعلق کی وجہ سے مفتی صاحب بھی ان مجلسوں میں شرکت کرتے تھے، ارکان مجلس سب ہی فارسی اور اُردو شعر و ادب کا پاکیزہ اور شگفتہ ذوق رکھتے تھے اور خاص طور پر مفتی صاحب کا ذوق تو بہت ہی رچا بسا تھا اور وہ اگرچہ شعر تو نہیں کہتے تھے لیکن سخن فہم اعلیٰ درجہ کے تھے اور اس کی وجہ ایک تو خاندانی خصوصیت تھی اور پھر اکابر دیوبند کی اولاد کی طرح مفتی صاحب نے دارالعلوم کے درجۂ فارسی کے پنج سالہ نصاب کی تکمیل کی تھی اور ان کے استاد مولانا محمد یٰسین صاحب تھے جو اس زمانہ میں فارسی زبان و ادب کی مہارت میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے، اور ان کی تعلیم کا انداز ایسا تھا کہ طالب علم میں فارسی زبان و ادب کا پختہ ذوق پیدا ہو جاتا تھا۔ علاوہ ازیں ایک بات یہ تھی کہ مفتی صاحب کے ایک چچازاد بھائی جو ان کی پھوپھی زاد بہن کے شوہر ہونے کے رشتہ سے بہنوئی بھی ہوئے جمیل الرحمن تھے، یہ انگریزی میں بی اے تھے اور سرکاری ملازم بھی تھے، مگر تھے نہایت ذہین اور طباع، اُردو زبان کے بلند پایہ شاعر تھے، طبیعت میں غضب کی روانی تھی، نظم اور غزل دونوں پر یکساں قدرت تھی، جمیل تخلص کرتے تھے اُردو کے علاوہ فارسی اور انگریزی میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے، تپ دق میں بیمار ہو کر جوانی میں چل بسے تھے[1] مفتی صاحب اور مرحوم میں (حاشیہ اگلے صفحے پر)

رشتہ داری کے علاوہ ہم مذاقی کے باعث بہت گہرا ربط و تعلق تھا، اور اول درجہ کے سخن سنج و سخن گو اور بہ اعلیٰ قسم کے سخن فہم و سخن شناس، کوئی نئی غزل یا نظم جب تک مفتی صاحب کو سنا کر اس کی داد نہ لے لیتے انھیں چین نہ آتا تھا۔ پھر پڑھتے بھی بہت خوب تھے۔ مفتی صاحب کا بیان ہے جب وہ مترنم ہوتے تھے ایک سماں بندھ جاتا تھا، مفتی صاحب کو ان کی غزلوں کی غزلیں یاد تھیں۔

اب مفتی صاحب کے ذوقِ شعر و ادب کا یہ پس منظر ذہن نشین کر کے سنیئے ہماری اس مجلس میں گفتگو کا موضوع عموماً شعر و ادب ہوتا تھا، فارسی اور اردو دونوں کا کبھی عرفی اور نظیری پر تنقید ہو رہی ہے اور کبھی غالب کے مشکل اشعار مثلاً:

"ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق"

یا

"مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی"

وغیرہ وغیرہ، ان میں سے کوئی شعر لے لیا اور اس پر بحث شروع کر دی، مفتی صاحب ان گفتگوؤں میں بڑی دلچسپی سے حصہ لیتے اور بڑی جچی تلی بات کہتے تھے جس سے ان کے مخصوص ادبی افکار و نظریات کا علم ہوتا تھا۔ مثلاً فارسی شاعری میں تغزل کے اعتبار سے عرفی اور نظیری کو امیر خسرو سے بڑا شاعر مانتے تھے، کہتے تھے، خسرو میں قدرت کلام اور جرأت فکر بے پناہ ہے، لیکن سوز و گداز اور احساسِ درد و غم جو تغزل کی جان ہے عرفی اور نظیری کے کلام میں خسرو سے زیادہ ہے، اسی طرح مفتی صاحب اُردو شعراء میں غالب کی عظمت و فکر و خیال اور اس کے تیکھے انداز بیان کے معترف تھے لیکن اس کے

(پچھلے صفحے کا حاشیہ) عرصہ دراز ہوا ماہنامہ جامعہ، نئی دہلی میں، جبکہ اس کے ایڈیٹر مولانا اسلم جیراجپوری تھے، میں نے مرحوم پر ایک مضمون "اُردو کا ایک جوان مرگ شاعر" کے عنوان سے لکھا تھا۔ میں نے مرحوم کو نہیں دیکھا تھا، مفتی صاحب سے جو کچھ سنا تھا مقالہ کی بنیاد وہی تھا۔

باوجود ان کے نزدیک تغزل میں مومن کا مرتبہ غالب سے اونچا تھا اور اس کی وجہ وہ یہ بیان کرتے تھے کہ مومن میں جو سوز و گداز اور خود سپردگی ہے وہ غالب کے یہاں اس کی انانیت اور خود پرستی کی وجہ سے مفقود ہے اس سلسلے میں ایک مرتبہ انھوں نے کہا کہ دیکھیے غالب کا ایک شعر ہے:

جانا پڑا رقیب کے در پر ھزار بار
اے کاش جانتا نہ تری رہ گزر کو میں

اس شعر میں کس درجہ انانیت ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ غالب نے خود کہا ہے:

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری

اس کے بالمقابل اب مومن کا شعر دیکھیے۔ کہتے ہیں:

اس نقشِ پا کے سجدے نے کتنا کیا ذلیل
میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

ان دونوں شعروں میں کتنا بڑا فرق ہے ارباب ذوق اس کا اندازہ کرسکتے ہیں۔ ایک مرتبہ مفتی صاحب نے اپنے خاص درد بھرے لہجے میں مومن کی یہ غزل سنائی جس کے تین شعر مجھے اب تک یاد ہیں:

کہتے ہیں تم کو ہوش نہیں اضطراب میں
سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں
بے نالہ منہ سے گرتے ہیں بے گریہ آنکھ سے
اجزائے دل کا نہ حال پوچھ اضطراب میں

ان شعروں کو سنانے کے بعد مفتی صاحب نے بڑی قوت سے کہا کہ غالب کے پورے دیوان میں اس غزل کا کوئی جواب نہیں ہے۔ پھر ایک مرتبہ کہا کہ میں ہی نہیں خود غالب بھی مومن کے قائل تھے اسی وجہ سے تو جب انھوں نے مومن کا یہ شعر

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

سنا تو غالب پھڑک اٹھے اور انھوں نے کہا کہ میں اس شعر کے بدلے میں اپنا پورا دیوان دینے کے لیے تیار ہوں غرض کہ ہماری اس مجلس میں اسی قسم کے ادبی مذاکرے ہوتے تھے اور مفتی صاحب اپنے بلند ذوقِ شعر و ادب کے جوہر دکھاتے رہتے تھے جس سے ہم لوگوں کو بہت فائدہ ہوا۔

دورِ جدید کے اُردو شعراء میں حسرت موہانی، مفتی صاحب کو سب سے زیادہ پسند تھے، وہ ان کے بڑے مدّاح اور معترف تھے، ان کی غزلوں کی غزلیں مفتی صاحب کو یاد تھیں، حسرت کی ایک غزل جس کے دو شعر یہ ہیں:

التفاتِ یار تھا اک خواب آغازِ وفا
سچ ہوا کرتی ہیں ان خوابوں کی تعبیریں کہیں!

بے زبانی ترجمانِ شوق بے حد ہو تو ہو
ورنہ پیشِ یار کام آتی ہیں تقریریں کہیں!

ایک اور غزل ہے جس کے یہ دو شعر اب تک مجھے یاد ہیں:

دامنوں کی نہ خبر ہے نہ گریبانوں کی
قابلِ دید ہے دنیا ترے حیرانوں کی

اے جفاکار ترے عہد سے پہلے تو نہ تھی
کثرت اس درجہ محبت کے پشیمانوں کی

مفتی صاحب کو حسرت کی یہ دو غزلیں بہت پسند تھیں، بہانہ بہانہ سے انھوں نے ان کو اتنی بار پڑھا کہ سنتے سنتے مجھے بھی یاد ہو گئی تھیں، ایک مرتبہ مجھ سے دریافت کیا: تمہیں حسرت کا کون سا شعر سب سے زیادہ پسند ہے؟ میں نے کہا یہ شعر:

تمنا نے کی خوب نظارہ بازی
مزہ دے گئی حسن کی بے شعوری

بولے: اوہو! کیا غضب کی داخلیت ہے۔

حسرت سے مفتی صاحب کی ملاقات بھی عجیب ڈرامائی انداز میں ہوئی، ایک مرتبہ مفتی صاحب نے بیان کیا: تحریکِ خلافت شباب پر تھی، اس کی ایک کانفرنس کراچی میں تھی، اس میں شرکت کے لیے دارالعلوم دیوبند سے میں اور چند ساتھی کراچی کے لیے روانہ ہوئے، راستہ میں صبح کے وقت ہم بیدار ہوئے تو دیکھا کہ ہمارے سروں پر اوپر کی برتھ پر ایک صاحب تشریف فرما ہیں جو فربہ اندام اور پست قامت ہیں، رنگ سانولا۔ چہرہ پر چیچک کے نشان، داڑھی گنجان، آنکھیں درخشاں اور بڑی، پیشانی فراخ اور کشادہ، نہایت موٹے کھدر کی شیروانی اور پاجامہ، سر پر میلی کچیلی ترکی ٹوپی، عمر چالیس پچاس کے درمیان، اب ہم لوگوں کی ان بزرگوار پر اچانک نظر پڑی تو ان سے دلچسپی پیدا ہو گئی، سوال یہ تھا کہ یہ ہیں کون بزرگوار؟ جتنے منہ اتنی باتیں، کسی نے کچھ کہا اور کسی نے کچھ، میں نے کہا: یہ بزرگوار کوئی بھی ہوں مگر ہیں کوئی بڑے آدمی ضرور! اتنے میں ایک بڑا اسٹیشن آگیا اور ہم نے ایک مکلّف ناشتہ کا آرڈر دیا، ناشتہ آگیا تو ہم نے ان صاحب سے کہا: آئیے جناب ناشتہ کر لیجیے، وہ فوراً پھدک کر نیچے تشریف لے آئے اور میرے پہلو میں بیٹھ گئے۔ اور گفتگو شروع ہوئی۔

ہم: جناب کہاں جا رہے ہیں؟

وہ: (منخناتی آواز میں) جی! میں کراچی جا رہا ہوں۔

اب ہمارے کان کھڑے ہوئے اور ہم نے پوچھا: کیا آپ بتا سکتے ہیں "کیوں"

وہ: وہاں خلافت کانفرنس میں شریک ہونا ہے۔

ہم: جناب کا اسم گرامی!

وہ : فضل الحسن میرا نام ہے۔

میں: (اشتیاق دید کی اضطرابی کیفیت کے ساتھ) ارے تو آپ مولانا سید فضل الحسن حسرت موہانی ہیں!

وہ : اب آپ نے پہچان ہی لیا تو میں کیا عرض کرسکتا ہوں۔

یہ سن کر ہم سب کو بڑی خوشی ہوئی اور ہم میں سے ہر ایک نے بڑی عقیدت کے ساتھ مولانا سے مصافحہ کیا، اب مولانا نے کہا: آپ بھی تو اپنا تعارف کرائیں، جب مولانا کو علم ہوا کہ ہم سب دارالعلوم دیوبند سے تعلق رکھتے ہیں اور مدرسہ کی جمعیت الطلبار کے عہدہ دار ہیں تو مولانا بڑے مسرور ہوئے اور ہم سے فرداً فرداً دوبارہ مصافحہ کیا، اب ناشتہ سے فراغت کے بعد ہم اطمینان سے بیٹھے تو میں نے مولانا سے عرض کیا: حضرت! ہم سب آپ کے کلام کے عاشق ہیں، کچھ عطا فرمایئے، مولانا نے فوراً سنانا شروع کردیا۔ پہلے اپنی وہ مشہور غزل سنائی جس کا ایک شعر یہ ہے:

ادب کا ہے یہ تقاضا کہ تیرے شوق کی بات
سنے نہ کوئی، مرے دل میں یا دہن میں رہے

اس کے بعد دو تین غزلیں اور سنائیں، مفتی صاحب کہتے تھے: علاوہ شعر و شاعری کے مولانا کی گفتگو بڑی دلچسپ اور پُر لطف ہوتی تھی۔

مجھے "بڑے بھائیوں" کے محلہ میں رہتے ہوئے دو برس ہی ہوئے تھے کہ رمضان کی تعطیل میں آگرہ آیا تو یہاں حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی مہتمم دارالعلوم جن کی مشفقانہ توجہ اب میری طرف زیادہ ہوگئی تھی ان کا ایک والا نامہ والد صاحب قبلہ کے نام موصول ہوا۔ جس میں تحریر تھا: "سعید دیوبند کے محلہ 'بڑے بھائیوں' میں رہتا ہے، وہاں اس کی صحبت قصبہ کے لڑکوں کے ساتھ رہتی ہے، میں اس کو پسند نہیں کرتا اس لیے اب آپ سعید کو مدرسہ کے احاطہ میں رکھیں۔" والد صاحب نے جواب دیا: "آپ نے بجا فرمایا میں تعمیل

ارشاد کروں گا، مگر درخواست یہ ہے کہ آپ سعید کو ایک کمرہ بلا شرکت غیرے دے دیں اور نیز آپ اس کو براہ راست اپنی یا کسی بڑے استاد کی نگرانی میں رکھ دیں"۔ مہتمم صاحب نے دونوں باتیں مان لیں، چنانچہ مدرسہ یا مسجد کی طرف سے دارالاہتمام میں جانے کے لیے جو زینہ اوپر جا رہا ہے اس کے وسط میں بائیں جانب اس زمانہ میں صرف دو کمرے تھے (اب تیسرا بھی بن گیا ہے) ان میں سے ایک کمرہ جو دروازہ کے سیدھ میں ہے اس میں حضرت مولانا سراج احمد رشیدی رہتے تھے اور دوسرا کمرہ جو اس کی بغل میں ہے اس کو مولانا حبیب الرحمن صاحب نے میرے لیے تجویز فرمایا۔ اس بنا پر رمضان کی تعطیل کے ختم پر میں مدرسہ آیا تو اسی کمرہ میں فروکش ہوا اور رہنے لگا۔

اب میرے قیام دارالعلوم کا تیسرا دور شروع ہوا جو آخری بھی ہے، یہ دور جو تین برس کی مدت پر ممتد ہے، میری تعلیمی زندگی کا نہایت اہم دور ہے، کیونکہ میری تعمیر و تشکیل جو کچھ ہوئی ہے اسی دور میں ہوئی ہے، پہلے میرا ماحول شعری و ادبی تھا، لیکن اب میرا ماحول علمی اور دینی تھا، پہلے میری صحبت چند شہری طلبہ کے ساتھ تھی، اب میں ہر وقت اساتذۂ کرام اور چند نہایت ہونہار اور ذہین و مستعد مختلف صوبوں کے طلبہ کی معیت میں تھا۔ میرا کھانا پینا اور ناشتہ وغیرہ حضرت الاستاذ مولانا سراج احمد رشیدی کے ساتھ تھا، مولانا جو حضرت مولانا گنگوہی سے بیعت بھی تھے، دارالعلوم کے اکابر اساتذہ میں شمار ہوتے تھے، اردو اور فارسی کے پختہ کلام شاعر بھی تھے، طبعاً نہایت شگفتہ مزاج، بذلہ سنج اور مجلسی بزرگ تھے، ہر جمعرات کو ان کے ہاں مغرب کے بعد احباب کی مجلس جمتی تھی جو اپنے گھر سے کھانا لاکر ایک ساتھ ہم طعامی کرتے تھے اور کھانے کے بعد سبز چائے کا دور چلتا تھا جس کا اہتمام مولانا بہت زیادہ کرتے تھے، اس مجلس کے ارکان خاص علامہ محمد ابراہیم بلیاوی،

شیخ الادب مولانا محمد اعزاز علیؒ، مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی، مولانا محمد حفظ الرحمن سیوہاروی اور مولانا محمد بدر عالم صاحب میرٹھی۔ مفتی صاحب 'طباخ' بھی بہت اچھے تھے اور خصوصاً مرغ کا اسٹو پکانے میں تو ان کو بڑا کمال تھا۔ اسی لیے اس مجلس میں کبھی کبھی اپنے ہاتھ کی پکی ہوئی کوئی چیز بھی لے کر آتے، اسی طرح مولانا محمد بدر عالم صاحب بڑے اچھے شکاری تھے، اس لیے وہ کبھی مرغابی یا تیتر سے اس مجلس کی تواضع کرتے۔

مفتی صاحب اس زمانے میں مدرس تھے اور دارالافتاء میں فتویٰ نویسی بھی حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی نگرانی میں کرتے تھے، مفتی صاحب نے جو کچھ پڑھا تھا بڑے شوق، دل کی لگن اور محنت سے پڑھا تھا، پھر ذکاوت و ذہانت خداداد اور فطری اور اساتذۂ کرام اپنے اپنے فن میں یگانۂ روزگار، اس بنا پر ہر علم و فن کی استعداد مفتی صاحب کی پختہ اور اعلیٰ تھی، اس پر مستزاد یہ کہ ان میں ملکۂ تقریر و خطابت اعلیٰ قسم کا تھا، افہام و تفہیم کی صلاحیت قدرتی تھی، اپنے مافی الضمیر کا اظہار بڑی وضاحت اور صفائی سے کرتے جس میں گنجلک یا الجھن نام کو بھی نہ ہوتی تھی، اس بنا پر ان کا درس مقبول تھا، البتہ آواز ان کی بلند تھی اور درس بھی وہ اس بلند آواز سے دیتے تھے کہ ان کی آواز درس گاہ سے باہر دور تک جاتی تھی، مفتی صاحب کو خود بھی اپنی بلند آوازی پر ہنسی آتی تھی، ایک دن ہنستے ہنستے سنانے لگے: ایک مرتبہ جامعہ ازہر، مصر کے ایک استاد یہاں آئے ہوئے اور دارالعلوم کے مہمان خانہ میں مقیم تھے، ایک روز وہ درس گاہوں میں گھومتے پھرتے میری درسگاہ میں بھی آ گئے، میں اس وقت سلم العلوم (منطق) کا درس دے رہا تھا، میں نے مصری عالم کو خوش آمدید کہہ کر اپنے پاس بٹھا لیا اور درس شروع کر دیا اور جب گھنٹہ بجا اور درس ختم ہو گیا تو موصوف مجھ سے مخاطب

ہوئے اور بولے: "یا استاذ واللہ انک لرجل فاضل، ولکنک تجہر جہیر البرق اخاف انک ستکون حمارًا"۔ مفتی صاحب یہ واقعہ سنا کر خود بھی ہنس پڑے اور ہم سب کو بھی ہنسی آگئی۔

جہاں تک مفتی صاحب کی فتویٰ نویسی کا تعلق ہے اس کے متعلق وہ خود بیان کرتے تھے کہ شروع شروع میں وہ استفتا کا جواب بہت طویل لکھتے تھے جس میں موافق اور مخالف دلائل اور اخیر میں قول راجح کے دلائل اور ان کی عبارتوں کی بھرمار ہوتی تھی، لیکن حضرت مفتی صاحب ایسے تمام جوابات قلم زد کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ تمہارا جواب ماقل ودل ہونا چاہیئے، ہر عبارت نقل کے لائق نہیں ہوتی، پھر یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ مستفتی تم سے بحث نہیں کر رہا ہے، بلکہ ایک مسئلہ کے بارے میں صرف ایک حکم شرعی دریافت کر رہا ہے اس لیے تمہارا مطالعہ تو وسیع اور عمیق ہونا ضروری ہے لیکن جواب مختصر ہونا چاہیے جس میں صرف چھنی چھنائی بات کا ذکر ہو۔ مفتی صاحب کہتے تھے: بڑی مشق اور تمرین کے بعد جب مجھ میں یہ صلاحیت اور استعداد پیدا ہوگئی تو حضرت مفتی صاحب نے فرمایا: "ہاں اب تم کو فتویٰ لکھنا آگیا"۔

نیشنلزم یعنی قوم پروری اور استخلاص وطن کی تڑپ جیسے مفتی صاحب کی گھٹی میں پڑی تھی، اس معاملہ میں جتنا سنجیدہ فکر اور پختہ خیال میں نے مفتی صاحب کو پایا ان کے معاصرین میں کسی کو نہیں پایا، اُن کی طالب علمی کے زمانہ میں طلبار کا ایک قلمی اخبار نکلتا تھا جس کا نام یاد نہیں رہا، اس اخبار کی ایک اشاعت میں مفتی صاحب کا ایک طویل مضمون "سودیشی کی ضرورت" شائع ہوا تھا، میں نے یہ مضمون از اول تا آخر پڑھا مضمون نہایت مدلل اور بصیرت افروز، پرزور اور شگفتہ و دلکش زبان میں تھا، میرے دماغ پر مفتی صاحب کے حسن تحریر کا پہلا نقش ان کے اسی مضمون کے مطالعہ سے قائم ہوا تھا، انھوں نے اس مضمون میں جو کچھ لکھا تھا اس کے عملی پیکر وہ خود تھے، چنانچہ اس

زمانہ میں بھی جبکہ دارالعلوم کے "شہزادے" یعنی اکابر دیوبند کی اولاد، نہایت عمدہ ململ، چکن کے کرتوں اور چالیس ہزارہ کے لٹھے کے پاجاموں میں ملبوس نظر آتے تھے ــــ مفتی صاحب اس زمانے میں بھی کھدر پہنتے تھے، وضع کے اتنے پابند تھے کہ ایک کرتہ جو زیادہ لانبا نہیں ہوتا تھا بغیر کالر کے ہوتا اور پاجامہ چوڑے پائنچوں کا اور سیدھی کاٹ کا اور دونوں کھدر کے اور کرتہ کے نیچے بنیان وہ بھی کھدر کی، عمر بھر ان کا لباس یہی رہا، شیروانی پہنتے تھے مگر وہ بھی دیسی کپڑے کی، اس قسم کے وضع دار خال خال ہی ملیں گے۔

مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی میرے ماموں زاد بھائی تھے اور مجھ سے بے حد محبت کرتے تھے، سیوہارہ کے مدرسہ میں تکمیل تعلیم کے بعد دورۂ حدیث کے لیے دیوبند آئے تھے اور جس سال (۱۹۲۵ء) میں خود دورۂ حدیث کا طالب علم تھا اس سال یہ صحیح بخاری کا سماع کر رہے تھے، اس لیے انھوں نے مجھ سے کہا: تم ہمہ تن متوجہ ہو کر حضرت شاہ صاحب (علامہ محمد انور شاہ الکشمیری رحمۃ اللہ علیہ) کی تقریر سنو اور میں تمہارے لیے وہ تقریر لکھتا رہونگا، چنانچہ انھوں نے دو بڑی موٹی کاپیاں لکھی تھیں، جنھیں میں حرز جاں بنائے رکھتا تھا، لیکن جب ۱۹۴۷ء میں میرا گھر لٹا تو یہ کاپیاں بھی گئیں:

کر دیا سفاک نے میدان صاف

مفتی صاحب کی طرح مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی بھی شروع سے ہی جذبۂ استخلاص وطن و قوم پروری سے سرشار تھے اور ملکی و قومی مسائل و معاملات میں دونوں کے افکار و نظریات میں بڑی ہم آہنگی و یک جہتی تھی، اس پر مستزاد یہ کہ مولانا بڑے فعال و متحرک تھے، ان میں لیڈر بننے کے صفات بدرجہ اتم موجود تھے، ہر کام میں پیش پیش رہتے تھے، اس وجہ سے اور بعض دوسرے اسباب کی وجہ سے بھی

مفتی صاحب اور مولانا میں دانت کاٹے کی دوستی تھی، مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی (ثم مہاجر مدنی) کو ملکی سیاست اور قومی معاملات سے کوئی دلچسپی نہ تھی، لیکن وہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھے، اس لیے مفتی صاحب سے خاص تعلق اور ربط رکھتے تھے، اس طرح ہم چار آدمیوں (مفتی صاحب، مولانا محمد حفظ الرحمٰن، مولانا بدر عالم اور راقم الحروف) کا ایک گروپ بن گیا تھا جو اوقات مدرسہ کے بعد عموماً ایک ساتھ رہتا تھا۔

ہم چاروں عصر کی نماز اکثر حضرت مفتی صاحب کی امامت میں ان کی مسجد میں ادا کرتے تھے، اس مسجد میں دو کمرے تھے، ایک اندرون مسجد اور دوسرا بیرون مسجد، پہلا کمرہ حضرت مفتی صاحب کے لیے مخصوص تھا اور دوسرا مفتی صاحب کی نشست گاہ تھا۔ نماز سے فراغت کے بعد اگر ٹہلنے یا کہیں جانے کا پروگرام نہ ہوتا تو مغرب تک اسی کمرہ میں نشست رہتی، مسجد میں امامت عموماً تو حضرت مفتی صاحب ہی کرتے تھے۔ لیکن جہری نمازیں کبھی کبھی وہ مفتی صاحب کو آگے بڑھا دیتے تھے، مفتی صاحب حافظ اور ساتھ ہی قاری تو اول درجہ کے تھے ہی ان کی آواز میں لوچ اور ہلکا ہلکا سا درد بھی غضب کا تھا اس لیے نماز میں بڑا لطف آتا تھا، ایک واقعہ سنیے:

۱۹۳۶ء میں ایم اے کا امتحان دلی یونیورسٹی سے فرسٹ ڈویژن میں پاس کرنے کے بعد مفتی صاحب کی دعوت پر جب میں پہلی بار کلکتہ گیا تو ایک روز مفتی صاحب مولانا محمد حفظ الرحمٰن اور میں، ہم تینوں عصر کے وقت مولانا ابو الکلام آزاد سے ملاقات کے لیے بالی گنج میں ان کی کوٹھی پر گئے۔ مولانا حسب معمول بڑے تپاک اور بے تکلفی سے ملے، باتیں کرتے کرتے مغرب کی نماز کا وقت ہو گیا تو مولانا کے ملازم "احمد" نے وہیں ڈرائنگ روم میں جانمازیں بچھا دیں، مولانا اور ہم باوضو تھے ہی، سیدھے مصلے پر جا کھڑے ہوئے، اب ہم نے مولانا سے امامت کی درخواست کی، لیکن مولانا نہ مانے

اور مفتی صاحب کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھا دیا۔ مفتی صاحب نے سورۂ القارعہ اور سورۂ الہٰکم التکاثر اپنے لحن داؤدی میں تلاوت کیں، سلام پھیرنے کے بعد مولانا آزاد نے دو رکعتیں سنت کی ادا کیں مگر کمال خشوع وخضوع سے، اس کے بعد صوفہ پر بیٹھ گئے آنکھیں بند کرلیں، ایک اونی چادر جو اوڑھے تھے اس سے اپنے تمام جسم اور آنکھوں کو مستغنی کر کے تمام سر اور چہرہ چھپالیا۔ دس منٹ کے بعد جب آنکھیں کھولیں تو مفتی صاحب کو خطاب کر کے فرمایا: "مولوی صاحب! اگر اصول تجوید کی رعایت کے ساتھ حسن صوت نہ ہو تو مخارج صحیح ادا ہوں گے مگر دل پر اثر نہ ہو گا، اللہ جل شانہٗ کا آپ پر بڑا فضل وکرم ہے کہ تجوید کے ساتھ خوش آوازی کی نعمت سے بھی آپ بہرہ ور ہیں۔ اس لیے آپ کی قرارت دل کے دروازہ پر دستک دیتی ہے۔"

ایک مرتبہ اس مسجد میں بڑا عجیب وغریب واقعہ پیش آیا اور وہ یہ کہ ہم چار دن نے حسب معمول عصر کی نماز مسجد میں حضرت مفتی صاحب کی امامت میں ادا کی، ایک بنگالی طالب علم تھا وہ بھی کم از کم عصر کی نماز تو اسی مسجد میں پڑھتا تھا، آج اس نے یہ کیا کہ نماز کا سلام پھیرتے ہی کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا: "حضرات! اب میں دیوبند سے جا رہا ہوں، آپ میرے لیے دعا کریں کہ میرا خاتمہ بخیر اور اسلام پر ہو۔" جب دعا ختم ہوگئی تو حضرت مفتی صاحب اس طالب کی طرف متوجہ ہوئے اور پوچھا: "تم کہاں جا رہے ہو؟" اس نے کہا: "تھانہ بھون" "کیوں؟" حضرت مفتی صاحب نے دریافت فرمایا، "حضرت تھانوی مدظلہٗ العالی سے تصوف کی تعلیم وتربیت حاصل کرنے کے لیے۔" طالب علم نے جواب دیا۔ یہ سنتے ہی حضرت مفتی صاحب کو غصہ آگیا اور سخت لہجہ میں فرمایا: مولانا اشرف علی کو صوفی کون کہتا ہے، انھیں تصوف سے کیا واسطہ! حضرت مفتی صاحب کے یہ الفاظ بہ ظاہر بہت سخت اور حیرت انگیز ہیں، لیکن ان کی وضاحت واقعہ

ذیل سے ہوگی:

اس واقعہ کے چھ سات برس کے بعد جب میں مدرسۂ عالیہ مسجد فتحپوری دہلی میں تھا، ایک روز میں حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحبؒ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ باتوں باتوں میں حضرت تھانوی کا ذکر نکل آیا تو میں نے یہ واقعہ سنایا، مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب اسے سنتے ہی ایک گہری سوچ میں ڈوب گئے اور گردن جھکالی، تھوڑی دیر کے بعد گردن اٹھائی،......... اور تاثراتی لہجہ میں فرمایا:

"میاں سعید! کیا یہ واقعہ سچا اور تمھارا عینی مشاہدہ ہے؟" میں نے عرض کیا: "جی ہاں! اس وقت مفتی عتیق الرحمٰن صاحب اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحب بھی موجود تھے، یہ دونوں حضرات تو یہیں دلّی میں موجود ہیں، آپ ان سے پوچھ سکتے ہیں" یہ سن کر فرمایا: اگر یہ واقعہ صحیح ہے ـــــ اور جب تم کہہ رہے ہو تو یقیناً صحیح ہی ہے ـــــ تو آج میرے دل کی پرانی گرہ کھل گئی اور اس کی تفصیل یہ ہے: تحریک خلافت اور اس کے ضمن میں تحریک ترک موالات بڑے زوروں پر تھی اور جمعیت علمائے ہند کے زیر قیادت بڑی کامیابی سے چل رہی تھی، لیکن مولانا اشرف علی صاحب تھانوی اس تحریک میں نہ صرف یہ کہ شریک نہیں ہوئے، بلکہ اس کی مخالفت میں فتویٰ دیا۔ جمعیت علمائے ہند نے اس کا سخت نوٹس لیا اور طے کیا کہ جمعیت کا ایک سہ نفری وفد تھانہ بھون پہنچ کر براہ راست مولانا سے گفتگو کرے، اس وفد کے لیے تین نام منظور ہوئے: (۱) حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی۔ (۲) مولانا احمد سعید دہلوی اور (۳) میں (حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ) ہم تینوں تھانہ بھون پہونچے اور تین روز مقیم رہے، مولانا سے ہم لوگوں کی گفتگوؤں کا جو حشر ہوا وہ تو سب کو معلوم ہے، دراصل سنانا یہ ہے کہ ایک دن ہم مولانا کی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک ایک شخص آیا اور سلام کرکے بیٹھ گیا، مولانا تھانوی اس کی طرف متوجہ ہوئے اور پوچھا: تم کون ہو؟ اس نے کہا:

حضرت! میں مظاہر العلوم کا ایک طالب علم ہوں، حضرت سے استفادۂ باطنی کی غرض سے حاضر ہوا ہوں، مولانا نے پوچھا کیا تم نے پہلے سے خط کے ذریعہ اس کی اجازت لی ہے، یہ شخص بولا: جی نہیں، اس پر مولانا نے برہم ہوکر کہا کہ تم اٹھ جاؤ، مگر وہ نہیں اٹھا، مولانا نے پھر کہا جاؤ مگر وہ پھر بھی بیٹھا رہا، اس پر مولانا کے پاس ایک رسّی کا بنا ہوا سونٹا رکھا رہتا تھا اس سے مولانا نے اس کو مارنا شروع کیا مگر یہ شخص اتنا ڈھیٹ تھا کہ پٹتا رہا مگر مجلس سے نہیں اٹھا، مولانا نے اس کو اتنا مارا کہ ہم سب کو رحم آگیا۔ اس وقت میرے دل نے کہا کہ مولانا تھانوی سب کچھ ہوسکتے ہیں لیکن صوفی نہیں ہوسکتے اس واقعے کو سنانے کے بعد مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب نے فرمایا کہ میری دل کی آواز عجیب وغریب تھی اس لیے میں نے اس کا کسی سے تذکرہ نہیں کیا اور اپنا احساس اپنے ہی تک محدود رکھا لیکن اب تم نے حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب کا واقعہ سنایا ہے اس سے معلوم ہوا کہ اس احساس میں تنہا میں ہی نہیں ہوں بلکہ حضرت مفتی صاحب بھی اس میں شریک ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ صوفیائے کرام خلقِ خدا کے لیے سراپا رحم وکرم اور مجسم شفقت و محبت ہوتے تھے، ان کی خانقاہوں کا دروازہ ہر وقت ہر شخص کے لیے کھلا رہتا تھا، ان کے یہاں آنے جانے والوں پر کسی قسم کی کوئی پکڑ دھکڑ یا دار وگیر کا ضابطہ نہیں تھا، اس کے برخلاف حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں مسترشدین کے لیے خاص خاص شرائط وضوابط تھے اور جو کوئی شخص ان شرائط وضوابط میں سے کسی ضابطے کی خلافِ ورزی کرتا تھا وہ موردِ عتاب بنتا تھا، اس فرق کی وجہ سے کہا جاسکتا ہے کہ مولانا تھانوی رحمۃ اللہ پر لفظِ صوفی کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔ خود حضرت تھانوی نے متعدد جگہ لکھا ہے کہ میں نہ صوفی ہوں نہ پیر بلکہ میں ایک معلّم اور مصلح ہوں جو شخص میرے پاس آتا ہے میں اس کے لیے اصلاح وتربیت کا کام کرتا ہوں اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہوسکتا

کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بحیثیت معلّم و مصلح اصلاح نفس، اصلاح عقائد، اصلاح معاملات و رسوم اور اصلاح عبادات و اخلاق کے سلسلے میں جو نہایت عظیم الشان علمی اور عملی کارنامے انجام دیے ہیں ان کے پیش نظر ان کو اس صدی کا مجدد بے تکلف کہا جا سکتا ہے اس بنا پر حضرت مفتی عزیز الرحمن اور حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب نے جو کچھ فرمایا اس کو صرف ایک لفظی اصطلاح کا فرق سمجھنا چاہیئے۔

ہمارا بھی لہو ہے شاملِ بنیادِ میخانہ

(نازش پرتاپ گڑھی)

نہ ہو بیگانہ ہم سے اس قدر اے دورِ پیمانہ
ہمارا بھی لہو ہے شاملِ بنیادِ مے خانہ

ہمیں نے خون سے اپنے لکھی تقدیرِ میخانہ
ہمیں سے دور اب تک چل رہا ہے دورِ پیمانہ

نہ مانگے گا کرم کی بھیک! کہہ کر اپنا افسانہ
تِرے احساس کا صرف امتحاں لیتا ہے دیوانہ

مرے خونِ جگر کی سرخیوں کو کاٹنے والو
کہیں مہمل نہ ہو جائے تمہارا پورا افسانہ

میرے حصے کی مے پی جانیوالوں کو خبر کر دو
کہ وہ خود اپنے ہی ہاتھوں ڈھالتے ہیں اپنا پیمانہ

جو ممکن ہو تو تاریخِ چمن کو پھونک اے بجلی
کہ اُسکے ہر ورق پر ثبت ہے میرا اک افسانہ

شکستہ سے کسی ساغر کی صورت ہی سہی لیکن
رہونگا میں ہمیشہ شاملِ تقدیرِ میخانہ

یہ سوکھے لب یہ بدلی تیوریاں، یہ گرسنہ نظریں
کہیں شورش نہ ہو جائے خلافِ پیرِ میخانہ

خلافِ مصلحت تو ہیں میری حق گوئیاں لیکن
زباں سی لوں تو کیا گلزار بن جائیگا ویرانہ

ہمیں تو ہر گھڑی خطرہ ہے برق و بادِ صرصر کا
جئے گا جو، وہ دیکھے گا بہارِ صبحِ گل خانہ

مفتی صاحب کی وفات

ماہنامہ برہان کا تعزیتی شذرہ
مولانا سعید احمد اکبرآبادی مرحوم کے قلم سے

ترکش مارا خدنگ آخری!

اس خامۂ حرماں نصیب نے برہان کے ۴۵ برس کے دور زندگی میں نہ جانے کتنے مشاہیر عالم و ناموران روزگار کی وفات پر ماتم سرائی کی اور درد فراق میں رنج والم کے آنسو بہائے ہیں۔ لیکن واحسرتاہ! آج اسے اس عظیم شخصیت کی جدائی پر نوحہ خوانی کرنا ہے جو خود ندوۃ المصنفین کی بانی مبانی تھی اور جس کا نفس گرم برہان کے اپنے وجود و بقا کا ضامن اور اس کا کفیل تھا یعنی حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی جو طویل علالت کے بعد ۱۲ رمئی ۱۹۸۴ء کو ساڑھے تین بجے بعد ظہر جان جان آفریں کو سپرد کرکے رحلت گزائے عالم جاودانی ہوئے۔ ۱۳ رمئی کو دلی کی جامع مسجد میں ۸ بجے صبح کو نماز جنازہ ہوئی جس میں مسلمانوں کے ہر طبقہ اور ہر جماعت کے ہزاروں عقیدت مندوں نے شرکت کی اور مہندیوں کے قبرستان میں جسے شاہ ولی اللہ الدہلوی اور آپ کے خانوادۂ گرامی نے برصغیر کا جنت البقیع بنادیا ہے تدفین ہوئی۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

مفتی صاحب کی ذات اور شخصیت ایسے اوصاف وکمالات کی جامع تھی جن کا فی زمانا شخص واحد میں جمع ہونا شاذ و نادر ہی ہو سکتا ہے۔ آپ دیوبند کے نامی گرامی خاندان عثمانی کے چشم و چراغ تھے جو اپنے علمی و دینی امتیازات و خصوصیات کے باعث نہ صرف قصبہ میں بلکہ پورے ضلع میں نہایت ممتاز رہا ہے۔ مفتی صاحب کے جدامجد مولانا فضل الرحمٰن دارالعلوم دیوبند کے چار بانیوں میں سے ایک تھے اور خود بڑے صاحب علم وفضل تھے۔ مولانا فضل الرحمٰن صاحب کو اللہ تعالیٰ نے جو اولاد ذکور عطا فرمائی ان میں شیخ المشائخ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی، شیخ الاسلام پاکستان حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی مہتمم دارالعلوم دیوبند بھی تھے جو آسمان علم وفضل اور افق شریعت و طریقت پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے اور ایک عالم کو اپنی ضیا بخشیوں سے منور کر گئے، ان ہر سہ اصحاب ثلاثہ میں موخر الذکر دونوں بزرگ لاولد تھے البتہ حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ کو اللہ تعالیٰ نے دو بیٹے اور متعدد بیٹیاں عطا فرمائیں۔ ان دو بیٹوں میں بڑے صاحبزادہ مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی تھے اور ان کے برادر خورد قاری جلیل الرحمٰن عثمانی ہیں جو دارالعلوم دیوبند میں درجہ تجوید و قراءت کے پرانے استاد ہیں۔

....

مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی بچپن سے ہی بڑے ہونہار تھے نہایت ذہین و ذکی، حافظہ مضبوط، لکھنے پڑھنے کے شوقین، طبیعت کے نیک اور صالح، ان اوصاف کے باعث حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ کو آپ سے بڑی محبت تھی اور آپ نے ان کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ

مبذول فرمائی، چنانچہ سب سے پہلے آپ نے قرآن مجید تجوید و قراءت کے ساتھ حفظ کیا، پھر دارالعلوم کے درجۂ فارسی میں داخل ہوئے تو اس درجہ کے صدر مولانا محمد یسین صاحب تھے، یہ فارسی کے نامور اور بڑے لائق و فاضل استاد تھے، مفتی صاحب نے ان سے خاطر خواہ استفادہ کیا، جس کی وجہ سے ان کا فارسی ادب اور شعر و شاعری کا ذوق اعلیٰ اور رگ رگ میں رچا بسا تھا۔ فارسی درجہ کی پنج سالہ تعلیم کی تکمیل کے بعد مفتی صاحب عربی کے درجہ میں داخل ہوئے تو سبحان اللہ، یہاں کا عالم ہی کچھ اور تھا۔ یہ زمانہ دارالعلوم کے شباب اور اوج کمال کا تھا، ہر استاد اپنے فن میں نابغۂ روزگار اور میدانِ تعلیم و تربیت کا شہسوار، علم و فضل، تقویٰ و طہارت اور علوم کے درس کی وہ گرم بازاری تھی کہ پورا برصغیر اس کے زمزموں سے گونج رہا تھا۔ مفتی صاحب نے اپنی خداداد ذہانت و ذکاوت اور شوق و ذوق طلب علم کے باعث اس سرچشمۂ فیوض و برکات سے سیرابی و کام جوئی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا، نتیجہ یہ ہوا کہ ہر درجہ میں اعلیٰ نمبروں سے کامیاب ہوتے چلے گئے اور آخر میں دورۂ حدیث میں بھی فرسٹ پوزیشن حاصل کی۔

....

طالب علمی سے فراغت کے بعد ان کو درس اور افتاء کی خدمات سپرد کی گئیں، حسن تقریر کا ملکہ خداداد تھا اور استعداد پختہ، جلد ہی مدرس اور مفتی کی حیثیت سے دارالعلوم میں ان کی شہرت ہوگئی، پھر حضرت شاہ صاحب اور اکابر کے ساتھ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں منتقل ہوئے تو وہاں طبقہ علیا کے استاد اور مفتی کی حیثیت سے یہ دونوں خدمات بہ حسن و خوبی انجام دیتے رہے۔ ڈابھیل میں چند برس قیام کے بعد کلکتہ پہنچے، وہاں کولوٹولہ اسٹریٹ

کی مسجد میں برسوں خطیب رہے اور ساتھ ہی درسِ قرآن کا مشغلہ جاری رہا۔
قیامِ کلکتہ کے زمانہ میں ہی انھوں نے اسلامیات پر معیاری کتابوں کی
تصنیف و تالیف اور ان کی عمدہ کتابت و طباعت کے ساتھ اشاعت کی
غرض سے ایک ادارہ قائم کرنے کا منصوبہ بنالیا۔ چنانچہ ۱۹۳۸ء میں وہ دہلی
آگئے اور یہاں ندوۃ المصنفین اور مجلہ برھان کی بنا ڈالی
ان برسوں میں اس ادارہ اور اس کے مجلہ نے علم و ادب اور اسلامیات کی جو
عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں وہ سب پر روشن ہیں۔ یہ سب کچھ بلاشبہ
مفتی صاحب کی غیر معمولی قوتِ عمل، جذبہ، فہم و فراست اور حسنِ نظم و نسق
کے باعث ممکن ہوسکا۔

....

ایک انسان کا زندگی میں عظمت اور کامیابی حاصل کرنا تین چیزوں پر
موقوف ہے۔ جذبہ، شعور اور قوتِ عمل، **مفتی** صاحب میں یہ تینوں اوصاف
بدرجۂ اتم تھے۔ دار العلوم کی روایات کے مطابق استخلاصِ وطن کا جذبہ شروع
سے تھا اس لیے انھوں نے کانگریس کی تحریکِ آزادی اور اس سلسلے میں اس کے
منصوبوں اور پروگراموں کی ہمیشہ تائید و اعانت کی۔ جمعیۃ علماء ہند کے صفِ
اول کے زعما میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ ۱۹۶۳ء میں صدارت کے معاملہ میں ان
کے ساتھ ناانصافی ہوئی تو وہ جمعیۃ سے کنارہ کش ہوگئے اور اب آل انڈیا مجلس
مشاورت ان کی عملی سرگرمیوں کی جولان گاہ بن گئی، **مفتی** صاحبؒ کی
شخصیت اور ملک میں ان کے وقار اور حیثیت سے ہر طبقہ اور ہر جماعت کے
لوگوں نے فائدہ اٹھایا لیکن **مفتی** صاحب جن کھلے دماغ کے انسان
تھے اس کا ساتھ بہت کم لوگ دے سکے اس لیے افسوس ہے کہ مجلس مشاورت میں

کھنڈت پڑگئی اور مجلس کے متعلق مفتی صاحب کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا جس کا رنج ان کو آخر تک رہا۔

....

مفتی صاحب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ ایک نہایت پختہ استعداد کے وسیع النظر عالمِ دین ہونے کے باوصف ایک بلند پایہ سیاسی رہنما بھی تھے، جو بات کہتے دماغ سے اتار کر کہتے تھے، تقریر اور تحریر دونوں کا اسلوب بڑا دل نشین اور موثر ہوتا تھا۔ اسلامی معاشرہ اور عام پبلک میں ان کا بڑا اعتبار تھا اور دوسری جانب گورنمنٹ بھی ان کا بڑا لحاظ رکھتی اور ان کی عزت کرتی تھی، وہ نہایت بے لوث و بے غرض، حد درجہ خوددار حق گو اور بے باک انسان تھے، انھوں نے اپنے اثر و رسوخ سے ہزاروں کو فائدہ پہنچایا مگر کبھی کسی سے فائدہ کی امید نہ باندھی، وہ اگر پسند کرتے تو گورنمنٹ سے انھیں کیا کچھ نہ مل سکتا تھا، لیکن جس رزق سے پرواز میں کوتاہی کا اندیشہ ہو مرحوم کو طبعاً اس سے نفرت تھی، اخلاق و شمائل اور عادات و خصائل کے اعتبار سے وہ بڑے پاکیزہ سرشت اور بلند مرتبہ انسان تھے۔ عمر ۸۴ برس کی ہوئی، ان کی وفات بے شبہ برصغیر کے مسلمانوں کے لیے ایک عظیم حادثہ ہے جس کو جلد نہ بھلایا جاسکے گا۔

از مفکر کشمیر مولانا محمد سعید سعودی مدظلہ العالی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں حضرت مرحوم مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی کو صالحین امت کے زمرہ میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آپ کے وجود میں خلاق کائنات نے گوناگوں فضائل ودیعت کر رکھے تھے۔ علمائے دیوبند کے علمی کمالات، تقویٰ و طہارت اور اخلاقِ عالیہ کا تو آپ ایک نمونہ تھے۔ "ندوۃ المصنفین" کا ادارہ آپ کی ذہنی بلندیوں اور انتظامی قابلیتوں کا زندہ ثبوت تھا۔ اس ادارے نے بلند پایہ علمی ذخائر کی اشاعت کے ذریعہ جو علمی و ثقافتی خدمات انجام دی ہیں، اُن کو بڑی بڑی حکومتوں کی امداد سے چلائے جانے والے ادارات کے مقابلہ میں فخر کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے حضرت مفتی صاحب علماء کی مجلس میں جید عالم، ادیبوں کی محفل میں فصیح و بلیغ ادیب اور اہلِ سیاست حاضرہ کے زمرہ میں نکتہ رس اور صاحب الرائے سیاست داں ثابت ہوتے تھے۔ اس جامعیت کے پہلو بہ پہلو آپ کا حلم اور تواضع بجائے خود دیکھنے کی چیزیں تھیں۔

میرے علم میں یہ بات آئی تھی کہ رسالہ "برہان" کا "مفکرِ ملت نمبر" شائع کر کے

حضرت مفتی صاحب کی حیات اور آپ کے کارناموں کو عوام تک پہنچانے کا انتظام ہورہا ہے۔ ارادہ تھا کہ مرحوم کے بارے میں اپنے علم اور تجربہ کی حد تک اظہارِ خیالات کرکے برہان کے اس نمبر میں چھپنے کے لئے بھیجوں لیکن مسلسل علالت نے مہلت نہ دی۔ کل ہی حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ایک دیرینہ مداح اور رفیق شفیق صاحب حاجی عبدالرحمٰن صاحب کونڈو ملے۔ ان کی زبان سے معلوم ہوا کہ برہان کا یہ نمبر مکمل ہوکر کتابت کے مراحل طے کررہا ہے۔ اس اطلاع سے قلبی مسرت ہوئی میں اس کوشش کو خوش آمدید کہتا ہوں۔

فقط

محمد سعید مسعودی
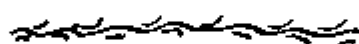
ملتِ ہندیہ کے غم خوار و جاں نثار

مولانا نسیم احمد فریدی امروہہ

حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی، حضرت مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی ۱۸۵۷ء کے بعد ملت ہندیہ پر سب سے سخت ترین وقت ۱۹۴۷ء میں پڑا، ۵۷ء کی طرح دلی ہی اس کا مرکز رہا۔

حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی، حضرت مفتی اعظم کفایت اللہ، حضرت رائے پوری، حضرت مولانا ابوالکلام آزاد، حضرت مولانا محمد زکریا شیخ الحدیث حضرت مولانا احمد سعید دہلوی، حضرت مولانا ابوالمحاسن سجاد، حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندی ثم مرادآبادی، شیخ التبلیغ حضرت مولانا محمد یوسف اس طوفان میں سینہ سپر اور کار فرما رہے۔

حضرت مجاہد ملت اور حضرت مفتی صاحب نے اپنے بزرگوں کی سرپرستی اور رفیقوں کی معاونت سے اس طوفان کو سر کیا۔ حاجی محمد نسیم بٹن والے اور اُن کی گاڑی میں رفیق سفر رہے۔ ملت ہندیہ ان سب بزرگوں سے محروم ہو چکی، ان کی آخری نشانی حضرت مفتی صاحب بھی تشریف لے گئے۔ حضرت مفتی صاحب پر اہل حق لکھ رہے ہیں، اس کے سب سے زیادہ اہل ان دونوں بزرگوں کے خواجہ تاش

حضرت مولانا سعید احمد صاحب مدیر بُرہان تھے، کاش تینوں کی آپ بیتی مرتب فرما دیتے جس کا اُن کو موقع نہیں مل سکا۔

ارث و وقف والے اختلاف میں یہ دونوں حضرات حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب کشمیریؒ کے ساتھ دیوبند سے نکلے، اس وقت سے زندگی کے آخری سانس تک ملت کی غم خواری و چارہ سازی میں لگے رہے۔

جمعیۃ العلماء ہند کے بانی حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے دور سے ہی اس عظیم جماعت سے تعلق قائم ہوا۔ حضرت مولانا مفتی کفایت اللہؒ صدر، مولانا احمد سعیدؒ ناظم کی رفاقت میں خوب سرگرم رہے۔ حضرت شیخ الاسلامؒ کے دورِ صدارت میں نظامت کے فرائض انجام دیے ۴۷ء کے طوفانوں میں حضرت مولانا سید محمد میاںؒ دیوبندی ثم مرادآبادی کو بھی مدرسہ شاہی مرادآباد سے اٹھا کر لائے اور جان توڑ قربانی کے ساتھ لگے رہے جب مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ رخصت ہو گئے تو یہ دونوں حضرات لگے رہے۔ حضرت شیخ الاسلامؒ کی وفات پر مولانا محمد میاں نے حضرت **مفتی** صاحب کو جمعیۃ کی صدارت کے لیے مجبور کیا، اس وقت کچھ حضرات کی مخالفت کی بنا پر مفتی صاحبؒ نے یکسوئی اختیار فرمائی۔ اُس وقت کچھ حضرات نے بہت شدید اصرار کیا کہ دوسری جمعیۃ بنائی جائے مگر حضرت **مفتی** صاحبؒ نے اس افتراق کو گوارا نہیں کیا جب کہ اُس وقت جمعیۃ کے سب کچھ یہی دونوں حضرات تھے حضرت مفتی صاحبؒ کے اس عظیم عمل کو لوگوں نے بھلا دیا۔ یہ واقعہ **مفتی** صاحبؒ کے اخلاص کا بڑا شاہ کار ہے۔ اس کے بعد جس جس طرح ہو سکا ملت کی خدمت گزاری میں لگے رہے حتیٰ کہ مرض الوفات بھی ایک سفر ہی میں شروع ہوا۔

خطیب کشمیر کا پیغام

کشمیر کے مشہور دینی رہنما، میرواعظ مولانا محمد فاروق صاحب
خطیب جامع مسجد سرینگر کے دعائیہ کلمات

قبلہ حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کو اگرچہ ہم لوگوں سے جدا ہوئے تقریباً ڈھائی سال کا زمانہ گزر رہا ہے، تاہم حضرت مفتی صاحب مرحوم کی جو قابل قدر، متنوّع اور گوناگوں علمی، دینی، سماجی، اصلاحی اور سیاسی خدمات تقریباً نصف صدی پر محیط ہیں، لوگوں کے دلوں میں ثبت رہیں گے۔ حضرت مفتی صاحب گفتار سے زیادہ عمل کے قائل تھے اور بے شک مرحوم نے آخری وقت تک ملّتِ اسلامیہ ہندیہ کی ذہنی، فکری، علمی اور ملّی تربیت میں عملی حصّہ لیا ہے۔

یہ جان کر مسرت ہوئی کہ ادارہ ندوۃ المصنّفین کا ترجمان ماہنامہ برہان محترم عمید الرحمٰن عثمانی کی نگرانی میں حضرت مفتی صاحب مرحوم کی یاد میں ایک خصوصی شمارہ ترتیب دے رہا ہے۔

مجھے یقین ہے برہان کا یہ خصوصی شمارہ حضرت مفتی صاحب مرحوم کی زندگی اور حیات و خدمات سے متعلق گراں قدر مضامین اور مقالات کے علاوہ بعض ان گوشوں کو اجاگر کرے گا جو بہت سے لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل اور پوشیدہ ہیں۔

میری نیک خواہشات اور دلی دعائیں ادارہ کے ساتھ ہیں۔ والسّلام

دعاگو

(مولانا) محمد فاروق عفی عنہ

پیغام

جناب عبدالرحمٰن کوندو (سرینگر کشمیر)

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

حضرت مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی علیہ الرحمۃ کے ساتھ سالہا سال سے میرا تعارف تھا۔ پھر جب راقم الحروف نے اُن کے اُستاد مرحوم شیخ الحدیث حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی حیات و کمالاتِ علمی پر "اَلْاَنْوَر" نام سے ایک کتاب مرتب کی تو حضرت مفتی صاحب نے نہ صرف اس کتاب پر نہایت وقیع الفاظ میں "تعارف" تحریر فرمایا بلکہ انھوں نے ازراہِ شفقت اس کتاب کو ندوۃ المصنفین کے اہتمام سے شائع فرمایا۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ کتاب اُونچے درجے کے اہلِ علم تک پہنچ گئی۔

دہلی میں میرے قیام کے دوران حضرت مفتی صاحب سے بار بار ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں اور حضرت مرحوم راقم کو اپنی تمام تر شفقتوں سے نوازتے رہتے تھے، اللہ تعالےٰ ان کے ساتھ رحمت و مغفرت کا خاص معاملہ فرمائے۔

یہ جان کر خوشی ہوئی کہ رسالہ "برہان" اُن پر ایک خصوصی نمبر شائع کر رہا ہے۔ اللہ کرے کہ نمبر بندگانِ خدا کے لئے نفعمند ثابت ہو جائے۔ (آمین)

15 भारत INDIA

जवाबी REPLY

Tabligh office
Tadkeshwar
(Dt Surat)

पिन PIN

عکس تحریر مفتی صاحب

15 भारत INDIA

Tabligh office
Tadkeshwar
(Dt Surat)

पिन PIN
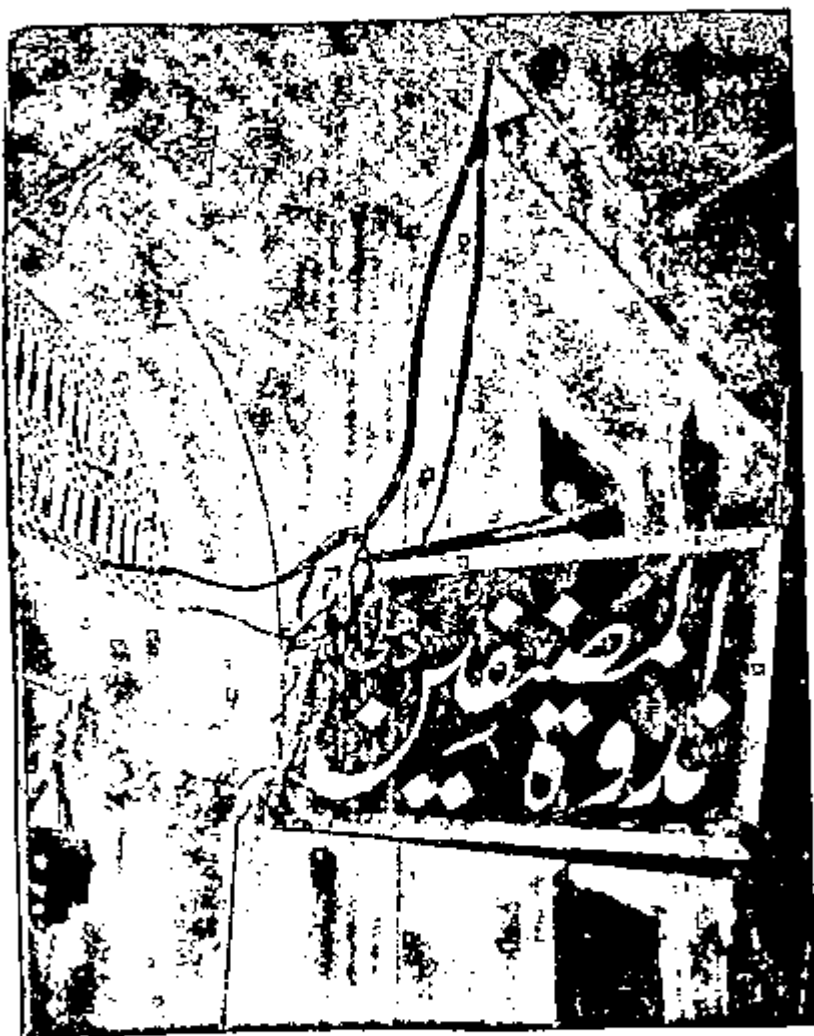
چہرۂ بلڈنگ ادارہ ندوۃ المصنفین دہلی

حضرت مفتی عتیق الرحمٰن صاحبؒ کی علمی اور ادبی خدمات کا مرکز

اس جگہ پر حضرت مفتی صاحبؒ سیاسی و سماجی خدمات قوم سے مخاطب ہو کر کیا کرتے ، گفتگو عام نشست گاہ
حضرت مفتی صاحبؒ

باغیچہ ادارہ ندوۃ المصنفین دہلی

(خاص کمرہ مطالعہ گاہ) حضرت مفتی عتیق الرحمن عثمانیؒ اس جگہ مطالعے و ادارے کی سرگرمیوں میں مصروف ہوتے

دفتر "ندوۃ المصنفین" دہلی

★ محمد سلیمان ظفر القاسمی انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز نئی دہلی

تھا وہ اک قومی مجاہد، قوم کا تھا پاسباں
تھا وہ ہندستاں کی آزادی کا اک قومی نشاں

عقدِ لاینحل و پیچیدہ مسائل کا تھا حل
آہ! اب وہ مفتیٔ اعظم رہا باقی کہاں

آؤ ایسا رشتۂ اخلاق ہم پیدا کریں
جس سے ہو قائم نشانِ عظمتِ ہندوستاں

عمر بھر جس نے جلائے علم و عرفاں کے چراغ
جس نے ہندستاں کی عظمت پر نچھاور کر دی جاں

آج بھی قائم اسی کی یاد میں "برہان" ہے
درمیانِ حق و باطل ہے جو فاروقی نشاں

یا الٰہی! یہ ادارہ تا ابد قائم رہے
ہند کو کرتا رہے روزِ ابد تک کامراں